# نکات القرآن

شیخ زین الدین محمد بن ابی بکر بن عبدالقادر الرازیؒ

قرآن کریم کے بیش قیمت علمی وادبی نکات واسرار، ۱۲۰۰ سوالات کے ہزاروں تشفی بخش جواباً جو قرآن مجید کے علوم و معارف اور رموز کی تشریح وتفہیم میں بے مثال ہیں مفسرین علماء اور طلباء کے لیے ایک نایاب کتاب پہلی بار اردو کے پیرہن میں۔

# نکات القرآن

## (سوالاً۔ جواباً)

## مسائل الرازی واجوبتہا من غرائب آی التنزیل


مصنف

شیخ زید الدین محمد بن ابی بکر بن عبد القادر الرازیؒ (م ۶۶۶ھ)


پیش لفظ

حضرت مولانا انظر شاہ کشمیری سرپرست جامعۃ الامام انور شاہ دیوبند


حافظی بک ڈپو دیوبند ۲۴۷۵۵۴ (یوپی)

HAFZI BOOK DEPOT DEOBAND-247554 (U.P.)

بسم اللہ الرحمن الرحیم


نام کتاب : نکات القرآن

مصنف : شیخ زید الدین محمد بن ابی بکر بن عبد القادر الرازیؒ

اردو ترجمہ : لجنۃ المصنفین

پیش لفظ : حضرت مولانا انظر شاہ کشمیری

باہتمام : عثمانی برادرس

اشاعت : اکتوبر ۲۰۰۵ء

ناشر

حافظی بکڈپو، دیوبند ۲۴۷۵۵۴ (یوپی)

HAFZI BOOK DEPOT

DEOBAND-247554 (U.P.)

Tele-fax (01336) 222311 (24 Hrs.)

Mobile - 9412556171

# سورتوں کی فہرست


| نمبر شمار | سورت | صفحہ | نمبر شمار | سورت | صفحہ | نمبر شمار | سورت | صفحہ |
|---|---|---|---|---|---|---|---|---|
| | صاحب کتاب کا تعارف | ۷ | ۲۲ | سورة الحج | ۲۷۱ | ۴۴ | سورة الدّخان | ۳۵۱ |
| ۱ | سورة الفاتحه | ۱۰ | ۲۳ | سورة المؤمنون | ۲۷۶ | ۴۵ | سورة جاثیه | ۳۵۲ |
| ۲ | سورة البقره | ۱۱ | ۲۴ | سورة النّور | ۲۷۷ | ۴۶ | سورة الاحقاف | ۳۵۳ |
| ۳ | سورة آل عمران | ۳۹ | ۲۵ | سورة الفرقان | ۲۸۲ | ۴۷ | سورة محمّد | ۳۵۴ |
| ۴ | سورة النسآء | ۶۰ | ۲۶ | سورة الشعرآء | ۲۸۵ | ۴۸ | سورة الفتح | ۳۵۵ |
| ۵ | سورة المآئده | ۸۶ | ۲۷ | سورة النمل | ۲۹۱ | ۴۹ | سورة الحجرات | ۳۵۷ |
| ۶ | سورة الانعام | ۱۰۸ | ۲۸ | سورة القصص | ۲۹۷ | ۵۰ | سورة قٓ | ۳۵۹ |
| ۷ | سورة الاعراف | ۱۲۱ | ۲۹ | سورة العنکبوت | ۳۰۰ | ۵۱ | سورة الذّاریات | ۳۶۱ |
| ۸ | سورة الانفال | ۱۳۴ | ۳۰ | سورة الرّوم | ۳۰۴ | ۵۲ | سورة الطّور | ۳۶۴ |
| ۹ | سورة التوبة | ۱۴۴ | ۳۱ | سورة لقمان | ۳۰۷ | ۵۳ | سورة النّجم | ۳۶۵ |
| ۱۰ | سورة یونس | ۱۵۸ | ۳۲ | سورة السّجدة | ۳۱۰ | ۵۴ | سورة القمر | ۳۶۷ |
| ۱۱ | سورة هود | ۱۶۷ | ۳۳ | سورة الاحزاب | ۳۱۳ | ۵۵ | سورة الرّحمٰن | ۳۶۹ |
| ۱۲ | سورة یوسف | ۱۸۳ | ۳۴ | سورة سبا | ۳۲۱ | ۵۶ | سورة الواقعة | ۳۷۱ |
| ۱۳ | سورة الرّعد | ۱۹۲ | ۳۵ | سورة فاطر | ۳۲۳ | ۵۷ | سورة الحدید | ۳۷۴ |
| ۱۴ | سورة ابراهیم | ۱۹۴ | ۳۶ | سورة یٰسٓ | ۳۲۴ | ۵۸ | سورة المجادلة | ۳۷۷ |
| ۱۵ | سورة الحجر | ۲۰۴ | ۳۷ | سورة الصّٰفّٰت | ۳۲۷ | ۵۹ | سورة الحشر | ۳۷۸ |
| ۱۶ | سورة النحل | ۲۰۷ | ۳۸ | سورة صٓ | ۳۳۳ | ۶۰ | سورة الممتحنه | ۳۸۰ |
| ۱۷ | سورة الاسرآء | ۲۲۱ | ۳۹ | سورة الزمر | ۳۳۷ | ۶۱ | سورة الصّف | ۳۸۱ |
| ۱۸ | سورة الکهف | ۲۳۷ | ۴۰ | سورة المؤمن | ۳۴۱ | ۶۲ | سورة الجمعه | ۳۸۲ |
| ۱۹ | سورة مریم | ۲۴۹ | ۴۱ | سورة حٰمٓ السجده | ۳۴۵ | ۶۳ | سورة المنافقون | ۳۸۳ |
| ۲۰ | سورة طٰهٰ | ۲۵۹ | ۴۲ | سورة الشورٰی | ۳۴۶ | ۶۴ | سورة التغابن | ۳۸۴ |
| ۲۱ | سورة الانبیآء | ۲۶۵ | ۴۳ | سورة الزخرف | ۳۴۹ | ۶۵ | سورة الطّلاق | ۳۸۵ |

| نمبرشمار | سورت | صفحہ |
|---|---|---|
| ۶۶ | سورة التحریم | ۳۸۷ |
| ۶۷ | سورة الملک | ۳۹۰ |
| ۶۸ | سورة القلم | ۳۹۱ |
| ۶۹ | سورة الحاقّة | ۳۹۲ |
| ۷۰ | سورة المعارج | ۳۹۳ |
| ۷۱ | سورة نوح | ۳۹۴ |
| ۷۲ | سورة الجن | ۳۹۵ |
| ۷۳ | سورة المزمّل | ۳۹۶ |
| ۷۴ | سورة المدّثر | ۳۹۷ |
| ۷۵ | سورة القیامه | ۳۹۹ |
| ۷۶ | سورة الدهر | ۴۰۰ |
| ۷۷ | سورة المرسلات | ۴۰۳ |
| ۷۸ | سورة النبآء | " |
| ۷۹ | سورة النّازعات | ۴۰۵ |
| ۸۰ | سورة عبس | ۴۰۶ |
| ۸۱ | سورة التکویر | ۴۰۷ |
| ۸۲ | سورة الانفطار | " |
| ۸۳ | سورة المطفّفین | ۴۰۸ |
| ۸۴ | سورة الانشقاق | ۴۰۹ |
| ۸۵ | سورة البروج | " |
| ۸۶ | سورة الطارق | ۴۱۰ |
| ۸۷ | سورة الاعلیٰ | " |
| ۸۸ | سورة الغاشیه | ۴۱۱ |
| ۸۹ | سورة الفجر | ۴۱۲ |
| ۹۰ | سورة البلد | ۴۱۳ |
| ۹۱ | سورة الشّمس | " |
| ۹۲ | سورة اللّیل | ۴۱۵ |
| ۹۳ | سورة الضّحیٰ | " |
| ۹۴ | سورة الانشراح | ۴۱۶ |
| ۹۵ | سورة التّین | ۴۱۷ |
| ۹۶ | سورة العلق | ۴۱۸ |
| ۹۷ | سورة القدر | ۴۱۹ |
| ۹۸ | سورة البیّنة | " |
| ۹۹ | سورة الزلزلة | ۴۲۰ |
| ۱۰۰ | سورة العادیات | ۴۲۰ |
| ۱۰۱ | سورة القارعه | ۴۲۱ |
| ۱۰۲ | سورة التّکاثر | " |
| ۱۰۳ | سورة العصر | ۴۲۲ |
| ۱۰۴ | سورة الهمزة | " |
| ۱۰۵ | سورة الفیل | ۴۲۳ |
| ۱۰۶ | سورة قریش | " |
| ۱۰۷ | سورة الماعون | ۴۲۴ |
| ۱۰۸ | سورة الکوثر | " |
| ۱۰۹ | سورة الکافرون | ۴۲۵ |
| ۱۱۰ | سورة النصر | ۴۲۶ |
| ۱۱۱ | سورة تبّت | ۴۲۷ |
| ۱۱۲ | سورة الاخلاص | " |
| ۱۱۳ | سورة الفلق | " |
| ۱۱۴ | سورة النّاس | ۴۲۸ |

# پیش لفظ

## حضرت مولانا انظر شاہ کشمیری

شیخ الحدیث دارالعلوم (وقف) دیوبند

"القرآن الکریم" خداتعالیٰ کا آخری کلام ہے، اثر وتاثیر، فصاحت وبلاغت، اعجاز وایجاز، میں بے مثال، فقید المثال، اسکی ہدایات احکام کے مطابق، عمل وکردار کے سانچوں نے، کائنات کے دل ودماغ بدل دیئے، خوشگوار انقلاب کی نسیم سحر نے قلوب کی مرجھائی ہوئی کلیوں کو حیات تازہ بخشی، زندگی کا رخ بدل ڈالا، اور جدید معاشرہ جو قرآنی ہدایات کی بنیادوں پر کھڑا ہوا جسکے معمار فِداہُ اَبی وَاُمّی تھے۔ دنیا کے لئے موت کے بعد زندگی، پژمردگی کے بعد تازگی، حیوانیت کے بعد انسانیت کا مکمل درس تھا۔ نادر کتب علمی کتب خانے اپنی رونق وبہجت کی موت بچشم خود دیکھ چکے، لیکن خداتعالیٰ کا کلام بدستور آئینہ حیات وحیات نو کے جام لنڈھا رہا ہے اور یہ فیض رسانی جاوید ہے۔

کون دعویٰ کرسکتا ہے کہ قرآن کو سمجھ لیا یا اسکے اسرار ورموز واشگاف ہوگئے؟ ایک "شرح جامی" کو لیجئے یا اس کا متن "کافیہ" اس کے حل کے لئے "تحریر سنبٹ" "باسولی" "کابلی" "چنگاری" "محرم آفندی" "حاشیہ عصام الدین" لیکن یہ سب کوششیں اس درجہ کی تھیں کہ علمی حلقوں نے تحریر سنبٹ کو تحریر چوپٹ بنادیا وقس علیٰ ہذا میرے مرحوم بڑے بھائی جناب ازہر شاہ صاحب قیصر کے حلقۂ احباب میں ایک فاضل دارالعلوم مولوی عبدالحکیم بہاری تھے فلسفے کے دلدادہ، فلسفیانہ موشگافیوں کے خوگر، ۱۹۴۵ میں دہلی عربک کالج میں مشاعرہ ہورہا تھا۔ جگر مرادآبادی نے اپنے خاص انداز میں جب یہ پڑھا ؎ اے رحمت تمام میری ہر خطا معاف، تو فلسفی موصوف ہم دوستوں سے بولے کہ یہ "رحمت" یا جگر کی ماں کا نام ہے یا بیوی کا۔

ٹھیک یہ ہی حال قرآن فہمی کے دعویداروں کا بھی ہے، تیر کبھی نشانوں پر بیٹھتے ہیں کبھی تکا ثابت ہوتے ہیں، فخر رازی نے نکات کا انبار لگا دیا اور ہر مفسر نے اپنے علم وفن کا مظاہرہ کیا ہے، زیر نظر کتاب ''نکات القرآن'' اصلاً عربی میں ہے اردو مترجم ایک سے زائد، بتاتی ہے کہ قرآن کریم کا ہر حرف ہر لفظ ہر اضافہ ہر نکتہ خدا تعالیٰ کے کلام ہونے کا شاہد اور علیم وحکیم کے اتھاہ علوم کی دلیل قاطع ہے، کتاب کیا ہے؟ گنجینہ علوم ومعارف، خزینۂ اسرار وحکم، در شاہوار، گوہر آبدار اساتذہ کے لئے نعمت بے بہا طلبہ قرآن کیلئے دولت بیش بہا اور قرآنی علوم سے دلچسپی رکھنے والوں کے لئے آب بقا۔

جناب عثمانی صاحب مالک حافظی بک ڈپو دیوبند، کی دیدہ وری وعلم دوستی فیض بخشی وجود سخا، کیسے کیسے نادر خزانوں کو طشت از بام کرتے ہیں اور کن کن مستور خزانوں کو سینۂ زمین چاک کر کے دسترخوان علم پر سجاتے ہیں۔

اَللّٰھُمَّ بَارِکْ فِی عُمْرِہٖ وَتَقَبَّلْ مَسَاعِیَہٗ کہ قبولیت ادھر ہی سے ہے، اور مقبول خاص وعام کر دینا اسی کی لازوال قدرت، رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا اِنَّکَ اَنْتَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ

۲۲ شعبان المعظم ۱۴۲۶ھ

الاحقر الافقر محمد انظر شاہ الکشمیری

سرپرست جامعۃ الامام انور شاہ

عقب عیدگاہ دیوبند

بسم اللہ الرحمن الرحیم

# صاحبِ کتاب کا تعارف

آپ کا نام شیخ زین الدین محمد بن ابی بکر بن عبدالقادر بن عبدالمحسن ،الرزای الحنفی ہے۔ آپ امامِ کبیر، حافظ، علامہ، حجت، ثبت اور صاحبِ تصانیف مفیدہ ہیں۔ آپ کا اصل تعلق ''رے'' سے ہے، جس کی نسبت سے آپ رازی کہلاتے ہیں۔ آپ عظیم المرتبت، صاحبِ تحقیق واتقان اور کثیر معلومات رکھنے والے عالم ہیں، نیز آپ نیک سیرت، نیک نام اور یکتائے روزگار شخصیت کے حامل بزرگ ہیں۔ بہت سے علوم پر کامل دسترس تھی اور آپ فہم وذکاوت اور قوتِ حافظہ میں عجوبۂ روزگار تھے، تقویٰ و پرہیزگاری میں باکمال اور علومِ عربیہ، بالخصوص علم لغت اور علم ادب میں امامت کے درجہ پر فائز تھے۔ اس کے علاوہ زہد وعبادت، ولایت وانقطاع اور کشف وکرامات میں بھی حظِ وافر رکھتے تھے۔

آپ نے بہت سے علوم وفنون میں کتابیں تصنیف فرمائیں، خصوصاً تفسیر، فقہ، لغت اور وعظ میں یادگار اور بے مثال کتابیں تصنیف کیں۔ آپ نے علم کی تلاش میں مصر اور شام کا بھی سفر کیا، آخری سفر قونیہ کا ہوا جو ۶۶۶ھ کو پیش آیا، اسی سال آپ نے رحلت فرمائی۔ ہماری تحقیق کے مطابق آپ کا شمار ساتویں صدی ہجری کے بلند پایہ علماء میں ہوتا ہے۔

## آپ کی چند تالیفات

۱۔ الذهب الإبريز في تفسير الكتاب العزيز

۲۔ روضة الفصاحة في علم البيان والبديع

۳۔ مختار الصحاح (لغت میں) آپ اس کتاب کی تالیف سے رمضان کی اوّل شب ۶۶۶ھ کو فارغ ہوئے۔

۴۔ شرح المقامات الحريرية۔

۵۔ تحفة الملوك۔ یہ ایک مختصر کتاب ہے جو دس ابواب پر مشتمل ہے۔ کتاب کا آغاز طہارت سے ہوتا ہے، پھر نماز کا ذکر ہے، اس کے بعد زکوٰۃ کا، پھر روزے کا اور پھر حج کا اور پھر جہاد کا اور پھر شکار اور قربانی کا ذکر ہے، پھر ممنوع امور کا، پھر فرائض (میراث) کا ذکر ہے۔ علامہ بدرالدین محمود بن احمد العینی نے "منحة السّلوك فی شرح تحفة الملوك" کے نام سے اس کی ایک جلد میں شرح بھی لکھی ہے جس کی تحریر ۸۵۵ھ کو معرضِ وجود میں آئی۔

٦۔ حدائق الحقائق (وعظ میں) یہ بھی ایک مختصر سی کتاب ہے جس کے ساٹھ ابواب ہیں۔ مؤلفؒ نے اس کتاب میں احادیث وآثار اور مواعظ کو جمع کرنے کا اہتمام کیا ہے۔

۷۔ نموذج جليل فى أسئلة وأجوبة من غرائب آى التنزيل۔
(یہ وہی کتاب ہے جو اس وقت ہمارے ہاتھوں میں ہے)۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اللہ تعالیٰ کی رحمت و مغفرت کا محتاج بندہ محمد بن ابی بکر بن عبدالقادر الرازی عرض کرتا ہے:
اللہ تعالیٰ اس کی اور تمام مسلمانوں کی مغفرت فرمائے اور گناہ معاف فرمائے' یہ ایک مختصر سی کتاب ہے جس میں مَیں نے قرآنِ مجید سے متعلق چند سوالات و جوابات کا چھوٹا سا نمونہ جمع کیا ہے۔

کتاب کا کچھ حصہ تو علماء کی کتب سے ہی تنقیح و تہذیب کے ساتھ نقل کیا گیا ہے اور کچھ حصہ اس علمی مذاکرہ کی صورت میں سامنے آیا جو میرے اور میرے دینی مخلص بھائی کے مابین ہوا، اللہ تعالیٰ نے ان کو سلیم الفطرت، نیک اور متقی بھی بنایا ہے اور ذہنِ رسا سے بھی نوازا ہے، یہ محض اللہ تعالیٰ کا مجھ پر فضل ہوا کہ ان جیسا انسانی صفات کا مالک اور کریم الاخلاق شخص میری رہنمائی کے لئے مجھے میسر آیا، میرے اس دینی بھائی کو کتاب اللہ کے معانی و دقائق سے گہری وابستگی، تعلق اور شغف حاصل ہے، ہمارے اس علمی مذاکرہ کے نتیجہ میں ایسے بہت سے عجائب و غرائب سامنے آئے جن کا ذکر نہ کبھی کسی اہلِ علم سے سننے میں آیا اور نہ ہی وہ ان کی کتب میں پائے گئے، چنانچہ خیال پیدا ہوا کہ ان تمام فوائد کو جمع کر لیا جائے۔ یہ علمی سوالات بارہ سو سے متجاوز ہیں اور ان کے جوابات اس سے کہیں زیادہ ہیں۔ اگرچہ قرآنِ حکیم کے عجائب و غرائب کی نسبت سے ہمارا یہ مجموعہ دریا کے ایک قطرہ کی طرح یا آسمانی ستاروں میں سُہا کی طرح ہے۔ نیز ہم نے اس کو مختصر اور عام فہم بنانے کی بھرپور کوشش کی ہے تاکہ اس سے انتفاع زیادہ سے زیادہ ہو سکے۔ اور وہ سوالات جن کا تعلق قرآن کریم کے وجوہِ اعراب یا ان معانی کے ساتھ ہے جو دقیق الفہم اور خفی المراد ہیں، اس کے لئے ہم نے ایک دوسرا مجموعہ تیار کیا ہے، اس مجموعہ میں اس کا کچھ نمونہ ذکر کر دیا گیا ہے، لہٰذا ایسے سوالات کے جوابات کے لئے اس کتاب کو دیکھ لیا جائے۔

میں اللہ تعالیٰ سے ہی امداد کا خواستگار ہوں، اسی پر توکل کرتا ہوں، آخر میں انتہائی تضرع کے ساتھ اللہ تعالیٰ سے دُعا کرتا ہوں کہ وہ میرے علم اور عمل کو صرف اپنی کریم ذات کی رضا کا سبب بنا دے اور مجھے اور میرے نیک بھائی کو اپنی ردائے مغفرت میں ڈھانپ لے، بے شک وہ ذات بڑی بخشنے والی اور مہربان ہے۔

# سورۃ الفاتحہ

**سوال:** امام زجاجؒ کے قول کے مطابق لفظ ''الرَّحمٰن'' وصفِ رحمت میں لفظ ''الرَّحیم'' سے زیادہ بلیغ ہے تو ''الرَّحمٰن'' کو ''الرَّحیم'' پر کیسے مقدم فرمایا' جب کہ مدح وتعریف میں اہلِ عرب کی عادت یہ ہے کہ وہ پہلے ادنیٰ امر کو ذکر کرتے ہیں پھر اعلیٰ امر کو ذکر کرتے ہیں کیونکہ اس ترتیب میں ایک خاص اور نیا فائدہ حاصل ہوتا ہے جو کہ اس کی برعکس صورت میں حاصل نہیں ہوتا؟۔

**جوابِ اوّل:** امام جوہریؒ وغیرہ فرماتے ہیں: ''رحمٰن'' اور ''رحیم' دونوں کا معنیٰ ایک ہی ہے جیسے ندیم اور ندمان ہم معنیٰ ہیں' لہٰذا کوئی سوال وارد نہیں ہوگا۔

**جوابِ ثانی:** ''رحمٰن'' کو ''رحیم'' پر اس لئے مقدم فرمایا ہے کہ ''اللہ'' کا لفظ ایسا ہے جو باری تعالیٰ کے ساتھ مخصوص ہے' یعنی اللہ کے علاوہ کوئی بھی شخص نہ مفرد کی صورت میں اس لفظ کے ساتھ موسوم ہوسکتا ہے اور نہ ہی مضاف کی صورت میں۔ اس لئے ''اللہ'' کا لفظ سب سے پہلے لائے' پھر چونکہ ''الرحیم'' ایسا لفظ ہے جس کے ساتھ غیر اللہ مفرد اور مضاف دونوں طرح موصوف ہوسکتا ہے اس لئے اس کو مؤخر کیا اور ''الرحمٰن'' ایسا لفظ ہے جس کے ساتھ غیر اللہ مضاف ہو کر تو موصوف ہوسکتا ہے لیکن مفرد کی صورت میں صرف باری تعالیٰ کی ذات ہی موصوف ہوسکتی ہے' اس لئے اس لفظ ''الرحمٰن'' کو درمیان میں لائے۔

**سوال:** عبادت کو استعانت پر کیوں مقدم فرمایا' حالانکہ استعانت اس کا مقدمہ ہے' اس لئے کہ بندہ پہلے اللہ تعالیٰ سے عبادت کے لئے مدد طلب کرے گا تب اللہ تعالیٰ عبادت پر اس کی مدد کریں گے؟

**جوابِ اوّل:** واؤ ترتیب پر دلالت نہیں کرتا' **جوابِ ثانی:** عبادت سے مراد توحید ہے۔ ظاہر ہے کہ توحید استعانت پر مقدم ہوتی ہے' کیونکہ جو شخص موحّد نہ ہو وہ عبادات کی ادائیگی کے لئے اعانت کا طلبگار نہیں ہوگا۔

**سوال:** ''الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ'' سے مراد اسلام یا قرآن یا طریقِ جنت ہے' جیسا کہ تفاسیر میں منقول ہے' جب کہ مسلمانوں کو اس کی ہدایت پہلے سے حاصل ہے' لہٰذا ''اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ'' میں طلبِ ہدایت سے کیا مراد ہے' یہ تو تحصیلِ حاصل ہے؟۔

**جوابِ اوّل:** ''اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ'' کا معنیٰ ہے۔ اے اللہ! ہمیں راہِ ہدایت پر

استقامت اور ثابت قدمی نصیب فرمانا' کیونکہ کچھ پتہ نہیں انجام کیسا ہو'نعوذ باللہ من ذلک۔
جیسے اہل عرب ٹھہرنے والے شخص کو کہتے ہیں:قف حتی اتیک:یعنی جب تک میں نہ آجاؤں تم یہیں ٹھہرنا۔اس کا مطلب ہوتا ہے کہ تم دوام اور ثبوت کے ساتھ یہیں ٹھہرے رہنا۔

جوابِ ثانی: ''اِهْدِنَاالصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ'' کا معنی ہے' مزید ہدایت طلب کرنا۔جیسا کہ فرمانِ الٰہی ہے''وَالَّذِيْنَ اهْتَدَوْازَادَهُمْ هُدًى'' نیز فرمانِ باری تعالیٰ ہے:''وَيَزِيْدُ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اهْتَدَوْا هُدًى''۔

سوال: ''وَلَاالضَّآلِّيْنَ'' میں کلمہ ''لا'' لانے کا کیا فائدہ ہے' حالانکہ محض ''ضالین'' سے بھی مقصود ادا ہو جاتا ہے؟

جواب: اس کا فائدہ یہ ہے کہ اس سے وہ نفی مؤکد ہو جاتی ہے جس پر''غیر''دلالت کرتا ہے۔

# سورۃ البقرۃ

سوال: استغراق کے طور پر کیسے فرمایا''لَا رَيْبَ فِيْهِ'' حالانکہ بہت سے گمراہ لوگ اس میں شک کرتے ہیں' اس کی تائید اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد سے ہوتی ہے''وَاِنْ كُنْتُمْ فِىْ رَيْبٍ مِّمَّا نَزَّلْنَا عَلٰى عَبْدِنَا''؟

جوابِ اوّل: ''لَا رَيْبَ فِيْهِ'' کا معنی ہے'یہ قرآن پاک شک کا محل نہیں ہے۔

جوابِ ثانی: ''لَا رَيْبَ فِيْهِ'' کا معنی ہے' یہ قرآن' اللہ' اس کے رسولؐ اور مومنوں کے نزدیک لاریب ہے۔

جوابِ ثالث: یہاں نفی نہی کے معنی میں ہے' یعنی اس قرآن کے منجانب اللہ ہونے میں شک نہ کرو'اس کی نظیر اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے:''وَاِنَّ السَّاعَةَ اٰتِيَةٌ لَّا رَيْبَ فِيْهَا''۔

سوال: یہ کیسے فرمایا:''هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ'' جبکہ متقین تو پہلے سے ہی ہدایت یافتہ ہیں' اس سے تو تحصیلِ حاصل لازم آتی ہے؟

جوابِ اوّل: ''هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ'' کا مطلب ہے: وہ لوگ اس قرآن سے ہدایت حاصل کر کے متقی ہو گئے۔

جوابِ ثانی: یا اس کا مطلب ہے یہ قرآن ان کے لئے ہدایت میں زیادتی اور ثبات کا ذریعہ ہے۔

جوابِ ثالث: متقین کو خاص طور سے اس لئے ذکر کیا کیونکہ اس قرآن کے منافع سے وہی نفع اندوز ہونے والے ہیں' اس لئے کہ انہوں نے اس کا اتباع کیا اور اسے سینہ سے لگایا' جیسا کہ اللہ

تعالیٰ کا ارشاد ہے: ''اِنَّمَآ اَنۡتَ مُنۡذِرُ مَنۡ یَّخۡشٰھَا''۔
جوابِ رابع: مراد تو دونوں فریق ہیں ایک متقی اور دوسرا غیر متقی' مگر ذکر صرف ایک فریق کا کیا گیا۔ جیسے اس فرمانِ خداوندی میں: ''سَرَابِیۡلَ تَقِیۡکُمُ الۡحَرَّ''۔
سوال: ''یُخٰدِعُوۡنَ اللّٰہَ'' سے کیا مراد ہے' اس کا کیا معنی ہے' مخادعہ تو اس شخص کے حق میں متصور ہوسکتا ہے جس پر امور پوشید ہوں تا کہ اس کے حق میں خداع (دھوکہ) کا معنی متحقق ہو' خدعہ اس وقت کہا جاتا ہے جب کوئی شخص کسی کی لاعلمی میں اس کو نقصان پہنچانے کا ارادہ کرے۔ حالانکہ اللہ تعالیٰ کی ذات ایسی ہے کہ کوئی شے اس سے مخفی نہیں' پھر کیسے فرمایا: ''یُخٰدِعُوۡنَ اللّٰہَ''؟
جوابِ اوّل: ''یُخٰدِعُوۡنَ اللّٰہَ'' کا معنی ہے ''یُخٰدِعُوۡنَ رَسُوۡلَ اللّٰہِ'' یعنی اللہ کے رسول کو دھوکہ دیتے ہیں۔ جیسے اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ''اِنَّ الَّذِیۡنَ یُبَایِعُوۡنَکَ اِنَّمَا یُبَایِعُوۡنَ اللّٰہَ'' نیز ارشادِ باری تعالیٰ ہے: ''مَنۡ یُّطِعِ الرَّسُوۡلَ فَقَدۡ اَطَاعَ اللّٰہَ''
جوابِ ثانی: اصل میں ان کے نفاق کو فعلِ مخادع کے ساتھ مشابہ ہونے کی وجہ سے خداع سے موسوم کر دیا گیا۔
سوال: ''اَلَآ اِنَّھُمۡ ھُمُ الۡمُفۡسِدُوۡنَ'' فرما کر فساد کو منافقین میں کیسے منحصر فرما دیا' حالانکہ امر معلوم ہے کہ منافقین کے علاوہ بھی ایسے لوگ ہیں جو فساد مچانے والے ہیں؟
جواب: یہاں فساد سے مراد نفاق کا فساد ہے جو انہیں کے ساتھ مخصوص تھا۔
سوال: اللہ تعالیٰ کے اس فرمان کا کیا مطلب ہے: ''اَللّٰہُ یَسۡتَھۡزِئُ بِھِمۡ'' استہزاء تو عبث اور سخریہ کے باب (قسم) سے ہے' اور یہ قبیح ہے' اللہ تعالیٰ کی ذات اس سے منزّہ ہے؟
جواب: اصل میں استہزاء کی جزاء کو صنعتِ مشاکلہ کے طور پر استہزاء کہہ دیا گیا ہے۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے: ''وَجَزٰٓؤُا سَیِّئَۃٍ سَیِّئَۃٌ مِّثۡلُھَا''۔ معنی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کو ان کے استہزاء کی جزاء دیتے ہیں۔
سوال: اللہ تعالیٰ کے اس فرمان میں کیا حکمت ہے: ''اَوۡ کَصَیِّبٍ مِّنَ السَّمَآءِ'' جب کہ یہ بات سب کو معلوم ہے کہ ''صیب'' (بارش) آسمان سے ہی ہوتی ہے' لہٰذا اس کا فائدہ کیا ہے؟
جواب: اس کا فائدہ یہ ہے کہ ''السَّمَآء'' کو معرفہ ذکر کر کے ''صیب'' کی اس کی طرف اضافت کی گئی تا کہ یہ بات معلوم ہو کہ یہ ''صیب'' آسمان کے جمیع آفاق سے ہے نہ کہ صرف ایک افق سے' اس لئے کہ ہر افق کو ''سماء'' کہا جاتا ہے۔ ایک شاعر کہتا ہے: ''وَمِنۡ بُعۡدِ اَرۡضٍ بَیۡنَنَا وَسَمَآءٍ''

سوال: یہ کیسے فرمایا کہ: "فَلَا تَجْعَلُوْا لِلّٰہِ اَنْدَادًا وَّاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ" مشرکین کو تو اس بات کا علم نہیں تھا کہ اللہ کا کوئی شریک نہیں ہے بلکہ وہ تو اللہ کے لئے شرکاء کا اعتقاد رکھتے تھے؟

جوابِ اوّل: اس کا مطلب یہ ہے کہ اے مشرکو! تم بھی یہ جانتے ہو کہ تمہارے یہ شریک کسی چیز پر قدرت نہیں رکھتے جیسے سابقہ آیت میں اس کا ذکر ہوا۔

جوابِ ثانی: اس کا معنی یہ ہے کہ تمہیں بھی یہ بات معلوم ہے کہ تورات و انجیل میں بھی شریک بنانے کی اجازت نہیں دی گئی۔

سوال: یہ کیسے فرمایا: "فَاتَّقُوا النَّار" یعنی یہاں تو "النَّار" معرفہ لایا گیا اور سورۃ التحریم میں اسے نکرہ لایا گیا ہے' اس کی کیا وجہ ہے؟

جوابِ اوّل: یہاں چونکہ خطاب منافقین کو ہے اور منافقین قرآنِ حکیم کے مطابق جہنم کے سب سے نچلے طبقے میں ہوں گے اور ہر طرف سے جہنم کی آگ ان کو گھیرے ہوئے ہوگی اس لئے لام استغراق یا عہد ذہنی کے ساتھ "النَّار" کو معرفہ لایا گیا' اور جبکہ سورۃ التحریم میں خطاب مومنین کو ہے اور جو گنہگار مسلمان عذابِ جہنم سے دوچار ہوں گے وہ جہنم کے صرف اوپر والے ایک حصہ میں ہوں گے' اس لئے قلیل ہونے کی بناء پر "نار" کو نکرہ لانا ہی مناسب ہوا۔

جوابِ ثانی: سورۃ التحریم والی آیت اس آیت سے پہلے مکہ میں نازل ہوئی ہے لہٰذا یہ نار معروفہ نہ تھی جس کا ایندھن لوگ اور پتھر ہوں گے۔ پھر یہ آیت مدینہ میں نازل ہوئی اور اسے معرفہ لایا گیا تاکہ اس کے ذریعہ اس نار کی طرف اشارہ ہو جائے جس کو وہ پہلے پہچان چکے ہیں۔

سوال: اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان: "وَلَا تَلْبِسُوا الْحَقَّ بِالْبَاطِلِ وَتَكْتُمُوا الْحَقَّ" ایسا ہے کہ اس میں دونوں فعل متغایر نہیں ہیں کہ ان دونوں سے منع کیا جائے بلکہ ان دونوں میں سے ایک دوسرے میں داخل ہے یعنی الباس الحق بالباطل اور کتمانِ حق دونوں فعل متحد المعنی ہیں' متغایر نہیں ہیں؟

جواب: یہ دونوں فعل معنی کے اعتبار سے متغایر ہیں۔ اس لئے کہ تلبیسِ حق بالباطل سے مراد ان کا تورات میں اس چیز کا لکھنا ہے جو اس میں نہیں ہے۔ اور کتمانِ حق سے مراد ان کا یہ قول ہے کہ ہم تورات میں محمد ﷺ کی صفات نہیں پاتے ہیں۔

سوال: "اَلَّذِيْنَ يَظُنُّوْنَ اَنَّهُمْ مُّلٰقُوْا رَبِّهِمْ وَاَنَّهُمْ اِلَيْهِ رَاجِعُوْنَ" یہاں دوسرا جملہ لانے کا کیا فائدہ ہے خود پہلا جملہ اسی دوسرے جملہ کے مفہوم کا تقاضا کرتا ہے اور اس پر دلالت کر رہا ہے؟

جواب: "مُّلٰقُوْا رَبِّهِمْ" کا معنی ہے کہ ان کو اس صبر اور صلوٰۃ پر اپنے رب کے پاس سے اجر و

ثواب ملے گا' اور "وَاَنَّهُمْ اِلَيْهِ رَاجِعُوْنَ" سے مراد ہے کہ وہ لوگ بعث بعد الموت کا یقین کرنے والے ہیں' لہٰذا اس آیت کا سارا مطلب یہ ہوا کہ ان لوگوں کو بعث بعد الموت اور موعود اجر و ثواب کے حصول کا یقین ہے' لہٰذا ان دو آیتوں میں کوئی تکرار نہیں ہے۔

سوال: یہ کیسے فرمایا: "فَبَدَّلَ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا قَوْلًا غَيْرَ الَّذِىْ قِيْلَ لَهُمْ" حالانکہ انہوں نے "غَيْرَ الَّذِىْ قِيْلَ لَهُمْ" کو تبدیل نہیں کیا' کیونکہ ان سے کہا گیا تھا کہ تم "حِطَّةٌ" کہو تو انہوں نے کہا: "حِنطَةٌ"

جواب: اس کا معنی یہ ہے کہ جو قول اور لفظ ان سے کہا گیا تھا اس کو انہوں نے تبدیل کر دیا اور ایسا قول کہا جو ان سے نہیں کہا گیا تھا۔

سوال: "وَلَا تَعْثَوْا فِى الْاَرْضِ مُفْسِدِيْنَ" میں "عثو" کا معنی ہے فساد' تو معنی بن جائیں گے: "وَلَا تُفْسِدُوْا فِى الْاَرْضِ مُفْسِدِيْنَ"؟

جواب: اس کا معنی ہے کہ تم کفر کر کے زمین میں نہ پھرو اور جب کہ تم باقی گناہوں کی وجہ سے فساد مچانے والے ہو۔ یعنی "لاتعثوا فی الأرض بالکفر وانتم مفسدون بسائر المعاصی"۔

سوال: یہ کیسے فرمایا: "لَنْ نَّصْبِرَ عَلٰى طَعَامٍ وَّاحِدٍ" حالانکہ انہیں ایک طعام نہیں بلکہ دو طعام حاصل تھے یعنی من اور سلویٰ؟

جواب: اس طعام سے مراد وہ کھانا ہے جو کبھی تبدیل نہ ہو اور ہمیشہ ایک ہی طرح کا ہو اگرچہ وہ طعام دو نوع کا ہو۔

سوال: یہ کیسے فرمایا: "وَيَقْتُلُوْنَ النَّبِيّٖنَ بِغَيْرِ الْحَقِّ" حالانکہ نبیوں کا قتل ناحق ہی ہوتا ہے؟

جواب: اس آیت کا معنی یہ ہے کہ یہ ان کے زعم اور اعتقاد کے مطابق ناحق ہے' نیز اس لئے کہ ان کے فعلِ قبیح کی صفت کو صراحۃً بیان کرنے میں ان کی خوب مذمت ہے اگرچہ یہ صفت فعل کو لازم ہے' جیسا کہ اس کی برعکس صورت میں ہے جیسے اللہ کا فرمان ہے: "قَالَ رَبِّ احْكُمْ بِالْحَقِّ" یہاں صفت کی تصریح میں مزید معنی کا حصول ہے۔ اس لئے کہ نبی کا قتل کبھی برحق بھی ہوتا ہے۔ جیسے ابراہیمؑ کا اپنے بیٹے (اسماعیلؑ) کو قتل کرنا (یعنی قتل کا ارادہ کرنا) اگر وہ قتل واقع ہو جاتا تو وہ حق ہوتا ناحق نہ ہوتا۔

سوال: یہ کیسے فرمایا: "كُوْنُوْا قِرَدَةً خٰسِـِٕيْنَ" حالانکہ انسانی صورت سے بندر والی صورت کی طرف منتقل ہونا انسانی وسعت سے باہر ہے؟۔

جواب: یہاں امر ایجادی ہے ایجابی نہیں ہے' جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان ہے: "كُنْ فَيَكُوْنُ"

سوال: یہ کیسے فرمایا: ''عَوَانٌ بَیْنَ ذٰلِکَ'' حالانکہ لفظ ''بین'' دو یا دو سے زیادہ چیزوں کا مقتضی ہے لہٰذا لفظ ''بین'' کو ''ذلک'' مفرد پر لانا کیسے جائز ہوا؟

جواب: ''ذلک'' کے ذریعہ مفرد تثنیہ اور جمع سب کی طرف اشارہ کیا جاتا ہے' جیسے فرمانِ الٰہی ہے: ''قُلْ بِفَضْلِ اللّٰهِ وَبِرَحْمَتِهٖ فَبِذٰلِکَ فَلْيَفْرَحُوْا''۔ نیز فرمانِ رب العالمین ہے: ''وَاِنْ تَصْبِرُوْا وَتَتَّقُوْا فَاِنَّ ذٰلِکَ مِنْ عَزْمِ الْاُمُوْرِ'' نیز فرمایا: ''زُيِّنَ لِلنَّاسِ حُبُّ الشَّهَوَاتِ... ذٰلِکَ مَتَاعُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا'' لہٰذا اس کا معنی ہوا ''عوان بین الفارض والبکر'' یعنی بوڑھے اور بچہ کے درمیان۔ اس کی مکمل بحث اس آیت کے تحت: ''لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْ رُّسُلِهٖ'' عنقریب ان شاء اللہ تعالیٰ آرہی ہے۔

سوال: ''وَاِنَّ مِنَ الْحِجَارَةِ لَمَا يَتَفَجَّرُ مِنْهُ الْاَنْهٰرُ وَاِنَّ مِنْهَا لَمَا يَشَّقَّقُ فَيَخْرُجُ مِنْهُ الْمَآءُ'' ان دونوں کلاموں کے درمیان کیا فرق ہے' بظاہر دونوں کلام متحد المعنی ہیں' دوسرے کلام کے لانے کا کیا فائدہ؟

جواب: ''تفجر'' کا لفظ کثرت کے وصف کے ساتھ خروج کے معنی پر دلالت کرتا ہے' اور جب کہ دوسرا لفظ ''یشقق'' نفسِ خروج کے معنی پر دلالت کرتا ہے' ظاہر ہے دونوں چیزیں متغایر ہیں' متحد نہیں' لہٰذا ان میں کوئی تکرار نہیں ہے۔

سوال: اللہ تعالیٰ کے اس ارشادِ مبارک میں: ''فَوَيْلٌ لِّلَّذِيْنَ يَكْتُبُوْنَ الْكِتٰبَ بِاَيْدِيْهِمْ'' کتابت بالید کا لفظ بڑھانے میں کیا فائدہ ہے' کیونکہ کتابت ہاتھ سے ہی ہوتی ہے۔

جواب: اس کا فائدہ یہ ہے کہ اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ تحریف کا یہ عمل خود ان کا کیا ہوا ہے' اس سے ان کے فعلِ تحریف کی مزید قباحت ظاہر ہوئی' کیونکہ کسی کے بارے میں ''کتب فلان کذا'' کہنا بہر صورت صحیح ہے خواہ اس نے بذاتِ خود لکھا ہو یا کسی سے لکھوالیا ہو۔

سوال: یہ کیسے فرمایا: ثُمَّ تَوَلَّيْتُمْ اِلَّا قَلِيْلًا مِّنْكُمْ وَاَنْتُمْ مُّعْرِضُوْنَ'' حالانکہ ''تولّی'' اور ''اعراض'' دونوں کا معنی ایک ہے؟

جواب: اس کا معنی یہ ہے کہ پھر تم نے ایفائے عہد سے تولّی کی اور اس کے انجام میں غور و فکر کرنے سے اعراض کیا۔

سوال: ''وَلَتَجِدَنَّهُمْ اَحْرَصَ النَّاسِ عَلٰى حَيٰوةٍ وَّمِنَ الَّذِيْنَ اَشْرَكُوْا'' یہاں ''وَمِنَ الَّذِيْنَ اَشْرَكُوْا'' کو خاص طور سے لانے میں کیا فائدہ ہے' حالانکہ یہ بھی ''الناس'' میں داخل ہے؟

جواب: یہ اصل میں تخصیص بعد التعمیم کے قبیل سے ہے' یعنی مشرکین کو بعد از عموم خاص طور پر ذکر

کیا گیا' اس لئے کہ وہ ایمان بالبعث نہ ہونے کے سبب حیاتِ دنیوی کے شدید حریص تھے۔
سوال: ''وَمَا اُنْزِلَ عَلَى الْمَلَكَيْنِ'' اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان دو فرشتوں پر سحر کا علم نازل کیا' لہٰذا یہ سحر و جادو حرام نہیں ہے؟
جواب: سحر و جادو پر عمل کرنا حرام ہے' اس لئے کہ وہ دو فرشتے لوگوں کو اس سے بچنے کے لئے سحر سکھاتے تھے' جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ''وَمَا يُعَلِّمٰنِ مِنْ اَحَدٍ حَتّٰى يَقُوْلَآ اِنَّمَا نَحْنُ فِتْنَةٌ فَلَا تَكْفُرْ'' اس کی نظیر یہ ہے کہ اگر کوئی شخص پوچھ لے کہ زنا کیا ہوتا ہے؟ تو زنا کی وضاحت ضروری ہوگی تا کہ وہ اس کی حقیقت جان کر اس سے اجتناب کر سکے۔
سوال: ''وَلَقَدْ عَلِمُوْا لَمَنِ اشْتَرٰىهُ مَالَهٗ فِى الْاٰخِرَةِ مِنْ خَلَاقٍ وَلَبِئْسَ مَا شَرَوْا بِهٖٓ اَنْفُسَهُمْ لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ'' اس کی کیا وجہ ہے کہ پہلے تو ان کے لئے علم کو لامِ قسم وغیرہ لا کر مؤکد طریقہ سے ثابت کیا اور پھر ان سے علم کی نفی کر دی؟
جواب: جو بات ان کے لئے ثابت کی گئی ہے وہ یہ ہے کہ وہ اجمالی علم رکھتے ہیں کہ جو شخص سحر کو اختیار کرتا ہے آخرت میں اس کے لئے کوئی حصہ نہیں ہوگا' اور جس بات کی ان سے نفی کی گئی ہے وہ یہ ہے کہ وہ لوگ آخرت کی حسرت اور وہاں کی محرومی کی حقیقت سے واقف نہیں ہیں' لہٰذا دونوں باتوں میں فرق واضح ہو گیا۔
سوال: یہ کیسے فرمایا: ''وَلَوْ اَنَّهُمْ اٰمَنُوْا وَاتَّقَوْا لَمَثُوْبَةٌ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ خَيْرٌ لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ'' حالانکہ یہ کہنا کہ یہ چیز اس سے بہتر ہے اسی صورت میں درست ہوتا ہے جب دونوں چیزوں میں اچھائی اور بہتری ہو' جب کہ سحر میں تو کوئی خیر نام کی چیز نہیں ہے۔؟
جواب: یہ خطاب ان سے ان کے زعم واعتقاد کے مطابق کیا گیا ہے یعنی ان کے خیال کے مطابق چونکہ اس سحر سے دنیوی اغراض حاصل ہوتی ہیں اس لئے اس کے سیکھنے میں بہتری ہے۔
سوال: یہاں تو (بصورتِ نکرہ) فرمایا: ''رَبِّ اجْعَلْ هٰذَا بَلَدًا اٰمِنًا'' اور سورہ ابراہیمؑ میں فرمایا: ''رَبِّ اجْعَلْ هٰذَا الْبَلَدَ اٰمِنًا'' اس میں کیا نکتہ پنہاں ہے؟
جواب: پہلی دُعا کے موقع پر مکہ غیر آباد اور ویران جگہ تھی اس لئے اللہ تعالیٰ سے دعا کی کہ اسے بَلَدًا اٰمِنًا (باامن شہر) بنا' اور دوسری دُعا کے موقع پر مکہ بلد (آباد جگہ) تو ہو گیا تھا لیکن آمن (باامن) نہیں ہوا تھا اس لئے اس کو معرفہ لا کر اس کے لئے امن مانگا گیا۔ یا وہ بلدِ آمن تھا لیکن اس امن وامان کے دوام وثبات کے لئے دعا کی گئی' اور پھر اس سورت کا مدنی ہونا اور سورۃ ابراہیمؑ کا مکی ہونا اس کے منافی نہیں ہے' اس لئے کہ ابراہیمؑ کا دعائیں کرنا مذکورہ ترتیب کے ہی مطابق تھا'

اور قرآن میں اس کا ذکر اس ترتیب مذکور کے خلاف کیا گیا' یا پھر مکی سورت وہ ہے جو ہجرت سے قبل نازل ہوئی ہو' لہٰذا مدنی وہ ہوگی جو اس سے متاخر ہو۔ اور جبکہ قرآن کا کچھ حصہ وہ ہے جو فتح مکہ کے بعد نازل ہوا اب وہ مدنی سے متاخر ہوگا' پھر کیسے سوال ہوسکتا ہے کہ سورۃ ابراہیم وہ مکی سورت ہے جو قبل از ہجرت نازل ہوئی۔

سوال: اللہ تعالیٰ کے اس فرمانِ عالی میں ''وَاِنَّهٗ فِی الْاٰخِرَةِ لَمِنَ الصّٰلِحِیْنَ'' ابراہیم کو رسالت وخُلّت (خلیل اللہ ہونا) کے علاوہ اور کونسا شرف وفضل حاصل ہے؟

جواب: زجاج کہتے ہیں: ''مِنَ الصّٰلِحِیْنَ'' سے مراد ہے فائزین' یعنی فائز المرام لوگوں میں سے ہوں گے۔

سوال: موت تو انسان کی قدرت وطاقت میں نہیں ہے کہ انسان کو اس کا حکم دیا جانا درست ہو یا کسی حالت میں اس سے منع کیا جانا صحیح ہو' لہٰذا یہ کیسے فرمایا: ''وَلَا تَمُوْتُنَّ اِلَّا وَاَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ''؟۔

جواب۔ اس آیت کا معنی یہ ہے کہ تم دینِ اسلام پر ثابت وقائم رہو یہاں تک کہ جب تمہاری موت کا وقت آئے تو تم دینِ اسلام کی حالت میں دنیا سے جاؤ' لہٰذا یہ آیت اصل میں اسلام پر دوام وثبات کا امر یا ترکِ اسلام سے نہی کے معنی میں ہے۔

سوال: ''فَاِنْ اٰمَنُوْا بِمِثْلِ مَآ اٰمَنْتُمْ بِهٖ فَقَدِ اهْتَدَوْا''۔ اگر اس سے مراد اللہ تعالیٰ ہیں تو اس کا تو کوئی مثل نہیں اور اگر اس سے مراد دینِ اسلام ہے تو اس کا بھی کوئی مثل نہیں' اس لئے کہ دینِ حق ایک ہی ہے؟۔

جواب: یہاں کلمۂ مثل زائد ہے' معنی یہ ہے کہ ''فَاِنْ اٰمَنُوْا بِمِثْلِ مَآ اٰمَنْتُمْ بِهٖ'' یعنی بمن امنتم به 'مراد اللہ تعالیٰ ہیں' یا ''بما امنتم به سے مراد دینِ اسلام ہے۔ کلمۂ مثل کلام میں کبھی زائد ہوتا ہے۔ جیسے فرمانِ خداوندی ہے: ''لَیْسَ کَمِثْلِهٖ شَیْءٌ'' نیز فرمانِ الٰہی ہے: ''کَمَنْ مَّثَلُهٗ فِی الظُّلُمٰتِ''۔ اور بعض کہتے ہیں کہ ''بمثل'' میں باء زائدہ ہے۔ جیسے اللہ تعالیٰ کے اس فرمان میں زائد ہے: ''بجذع النخلة'' خلاصہ یہ ہوا کہ آیت کا معنی ہے کہ اگر وہ لوگ تمہارے اللہ پر ایمان لانے یا دینِ اسلام پر ایمان لانے کی طرح ایمان لے آئیں تو یقیناً وہ راہِ ہدایت پاسکتے ہیں۔

سوال: یہ کیسے فرمایا: ''وَمَا جَعَلْنَا الْقِبْلَةَ الَّتِیْ کُنْتَ عَلَیْهَآ اِلَّا لِنَعْلَمَ مَنْ یَّتَّبِعُ الرَّسُوْلَ مِمَّنْ یَّنْقَلِبُ عَلٰی عَقِبَیْهِ'' حالانکہ اللہ تعالیٰ اس کا علمِ ازلی رکھتے ہیں؟

جواب اوّل: ''لِنَعْلَمَ'' کا معنی ہے' تا کہ وہ امر جس کا ہمارے علم میں ہونا اور پایا جانا پہلے سے ثابت ہے وہ موجود ہو۔
جوابِ ثانی: ''علم'' سے مراد ہے بندوں کے لئے ممتاز کرنا' جیسے اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان ہے: ''لِیَمِیْزَ اللّٰہُ الْخَبِیْثَ مِنَ الطَّیِّبِ''
سوال: یہ کیسے فرمایا: ''فَلَنُوَلِّیَنَّکَ قِبْلَۃً تَرْضٰھَا'' اس سے تو بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ نبی کریم ﷺ کو بیت المقدس کی جانب رخ کرنا پسند نہیں تھا' حالانکہ اس کی طرف رخ کرنا اللہ ہی کے حکم کی وجہ سے تھا۔
جواب: اس ''رضا'' سے مراد طبعی محبت ہے' اللہ تعالیٰ کے حکم کی بجا آوری یا رضا وتسلیم مراد نہیں ہے۔
سوال: یہ کیسے فرمایا: ''وَمَآ اَنْتَ بِتَابِعٍ قِبْلَتَھُمْ'' حالانکہ ان کے دو قبلے تھے یہود کا الگ قبلہ تھا اور نصاریٰ کا الگ قبلہ تھا؟۔
جواب: چونکہ وہ دونوں قبلے باطل اور قبلہ حق کے خلاف تھے تو گویا وہ باطل ہونے کے اعتبار سے قبلہ واحد ہیں اور ایک قبلہ کے حکم میں ہیں۔
سوال: یہود جیسے ظالموں کو مومنوں کے مقابلے میں حجت کیسے حاصل ہوگی' حتیٰ کہ فرمایا: لِئَلَّا یَکُوْنَ لِلنَّاسِ عَلَیْکُمْ حُجَّۃٌ اِلَّا الَّذِیْنَ ظَلَمُوْا مِنْھُمْ''؟
جواب اوّل: اس کا معنی ہے کہ کہیں وہ ظلم اور باطل طور پر نہ کہنے لگیں' جیسے کوئی شخص اپنے صاحب سے کہتا ہے: تیرا میرے ذمہ کوئی حق نہیں' ہاں اگر تم ظلم ہی کردیا غلط بات کہنا چاہو تو اور بات ہے۔
جواب ثانی: یہاں اصل میں ''اِلَّا'' واو عاطفہ کے معنی میں ہے یعنی وَالَّذِیْنَ ظَلَمُوْا مِنْھُمْ' جیسے اللہ تعالیٰ کا یہ فرمانِ مبارک ہے: ''اِنِّیْ لَا یَخَافُ لَدَیَّ الْمُرْسَلُوْنَ اِلَّا مَنْ ظَلَمَ''
جواب ثالث: ان دونوں جگہوں میں ''اِلَّا'' لکن کے معنی میں ہے' اور جب نبی کریم ﷺ بیت المقدس کی طرف رخ کر کے نماز پڑھتے تھے تو ان کی اس وقت حجت یہ تھی کہ وہ کہتے تھے کہ محمد (ﷺ) کو تو اپنے قبلہ کا پتہ نہیں ہم ان کی اتباع کیسے کریں؟ نیز وہ کہتے تھے کہ یہ تو ہمارے دین کی مخالفت کرتے ہیں اور ہمارے ہی قبلہ کی اتباع کرتے ہیں' پھر جب اللہ تعالیٰ نے تحویلِ قبلہ کا حکم دیتے ہوئے کعبۃ اللہ کی طرف رخ کرنے کا فرمایا تو ان کی یہ حجت ختم ہوگئی اور زبان بند ہوگئی' پھر وہ کہنے لگے کہ تم نے بیت المقدس کے قبلہ کو کیوں چھوڑ دیا؟ اگر وہ قبلہ غلط تھا تو آپ تو ایک زمانہ

تک اس کی طرف رخ کر کے نمازیں پڑھتے رہے ہو اور اگر وہ قبلہ صحیح تھا تو پھر اس کو چھوڑ کر بیت اللہ کا رخ کیوں کیا؟ یہی معنی مراد ہے اللہ تعالیٰ کے اس فرمان سے: ''اِلَّا الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا مِنْهُمْ''۔ بعض کہتے ہیں کہ اس سے مراد ان کا یہ قول ہے کہ محمد (ﷺ) نے ہمارا قبلہ صرف حب الوطنی اور قومی دین کی خاطر ترک کیا ہے۔ اور بعض کہتے اس سے مراد مشرکین کا یہ قول ہے: محمد (ﷺ) ہمارے قبلہ کی طرف لوٹ آئے ہیں اس لئے کہ وہ جانتے ہیں کہ ہمارا دین برحق ہے عنقریب ہمارے دین کی طرف بھی لوٹ آئیں گے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کے باطل امر کو حجت کہا اس لئے کہ وہ صورت میں حجت کے مشابہ ہے۔ جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ''حُجَّتُهُمْ دَاحِضَةٌ'' یعنی باطلۃ۔ اور فرمایا: ''فرحوا بما عندهم من العلم''۔

سوال: ''وَاشْكُرُوْا لِيْ وَلَا تَكْفُرُوْنِ'' (اور شکر کرو واسطے میرے اور مت کفر کرو) یہاں پر ''وَاشْكُرُوْا لِيْ'' کے بعد ''وَلَا تَكْفُرُوْنِ'' کہنے میں کیا فائدہ ہے؟ شکر تو کفر کی نقیض (ضد) ہے جب شکر پایا جائے گا تو کفر منتفی ہوگا؟

جوابِ اوّل: ''وَاشْكُرُوْا لِيْ'' کا معنی ہے میری نعمت کے ذریعہ میری فرمانبرداری پر مدد چاہو اور ''لَا تَكْفُرُوْنِ'' کا معنی ہے میری نعمت کے ذریعہ میری نافرمانی پر مدد نہ چاہو۔

جوابِ ثانی: پہلے جملہ میں شکر کا حکم ہے اور دوسرے میں اس شکر گزاری پر ثبات و دوام کا امر ہے۔

سوال: یہ کیسے فرمایا: ''وَالنَّاسِ اَجْمَعِيْنَ'' (اور آدمیوں کی سب کی) حالانکہ جو کافر اپنے دین پر مرتا ہے تو اس کے دین والے اس پر لعنت نہیں کرتے؟

جوابِ اوّل: ''النَّاس'' سے صرف مؤمنین مراد ہیں۔

جوابِ ثانی: یہ لفظ اپنے عموم پر ہے اور مراد یہ ہے کہ اس کے دین والے آخرت میں اس پر لعنت کریں گے۔ جیسے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ''ثُمَّ يَوْمَ الْقِيَامَةِ يَكْفُرُ بَعْضُكُمْ بِبَعْضٍ وَّيَلْعَنُ بَعْضُكُمْ بَعْضًا'' (پھر قیامت کے روز تم ایک دوسرے کا انکار کرو گے اور ایک دوسرے پر لعنت کرو گے)۔ نیز ارشادِ باری تعالیٰ ہے: ''كُلَّمَا دَخَلَتْ اُمَّةٌ لَّعَنَتْ اُخْتَهَا''

سوال: ''وَاِلٰهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ'' (اور معبود تمہارا معبود ایک ہے) میں ''اِلٰهٌ'' کہنے میں کیا فائدہ ہے؟ اگر ''وَاِلٰهُكُمْ وَاحِدٌ'' (اور تمہارا معبود ایک ہے) کہتے تو زیادہ مختصر ہوتا؟

جواب: اگر یوں کہتے ''وَاِلٰهُكُمْ وَّاحِدٌ'' تو اس کا ظاہری معنی صرف یہ ہوتا کہ وہ ذات، معبود ہونے میں ایک ہے یعنی اس کے سوا کوئی معبود نہیں، مگر اللہ تعالیٰ کے متوحد فی الذات ہونے کا علم

نہ ہوتا لیکن جب "الٰہ" کو مکرر ذکر کیا جائے تو اس سے متوحد فی الذات کا بھی علم ہوتا ہے اور اس آیتِ کریمہ کا مقصد بھی اللہ تعالیٰ کی احدیت فی الذات کو ثابت کرنا اور نصاریٰ کے قول کی نفی کرنا ہے۔ جو کہتے ہیں کہ اصول تین ہیں: ان میں سے ایک خدا ہے، جس طرح زید (مثلاً) ایک ہے لیکن اس کے اعضاء متعدد ہیں لہٰذا جب الٰہ واحدٌ کہا تو اس سے اللہ تعالیٰ کی احدیت فی الذات والصفت معلوم ہوئی، اس پر یہ اعتراض ہو سکتا ہے کہ "وَاحِدٌ" کا قول احدیت فی الذات کا بھی احتمال رکھتا ہے اور احدیت فی الصفات کا بھی محتمل ہے خواہ "اِلٰہ" کا ذکر مکرر ہو یا نہ ہو، بنا بریں یہ جواب نا تمام ہے۔

سوال: وَمَثَلُ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا کَمَثَلِ الَّذِیْ یَنْعِقُ بِمَالَا یَسْمَعُ اِلَّا دُعَآءً وَّنِدَآءً، اور مثال ان لوگوں کی جو کافر ہوئے مانند مثال اس شخص کے کہ چلاتا ہے ساتھ اس چیز کے کہ نہیں سنتا مگر بلانا اور پکارنا) اس آیت میں تشبیہ ہو کر درست ہے؟ بظاہر کفار کی چرواہے کے ساتھ تشبیہ معلوم ہوتی ہے؟

جوابِ اوّل: دراصل ضمیر مقدر ہے، اصل عبارت اس طرح ہے: "ومثلک یا محمد مع الکفار کمثل الراعی مع الانعام" یعنی اے محمد! آپ کی ان کافروں کے ساتھ مثال ایسی ہے جیسے راعی (چرواہے) اپنے جانوروں کے ساتھ ہو۔

جوابِ ثانی: تقدیرِ عبارت یہ ہے: "مثل الذین کفروا کمثل بھائم الراعی"۔ یعنی ان کافروں کی مثال چرواہے کے جانوروں کی طرح ہے۔

جوابِ ثالث: تقدیری عبارت یہ ہے: "ومثل واعظ الذین کفروا کمثل الناعق بالبھائم" یعنی کافروں کو وعظ کرنے والے کی مثال اس شخص کی سی ہے جو جانوروں کے پیچھے چلاتا ہو۔

جوابِ رابع: تقدیری عبارت یہ ہے: "ومثل الذین کفروا فی دعائھم الاصنام کمثل الراعی" یعنی بتوں کو پکارنے والے کافروں کی مثال چرواہے کی طرح ہے۔

سوال: اس میں اس جانور کی کیا تخصیص ہے کہ وہ بجز بلانے اور پکارنے کے کوئی بات نہیں سنتا، ہر عاقل بھی ایسا ہی ہوتا ہے کہ وہ بجز بلانے اور پکارنے کے کوئی بات نہیں سنتا "لَا یَسْمَعُ" سے کیا مراد ہے۔

جواب: "لَا یَسْمَعُ" (نہیں سنتا) سے مراد ہے "لَا یَفْھَمُ" (نہیں سمجھتا)

سوال: دو آیتوں میں بظاہر تعارض ہے، یہاں فرمایا: "وَلَا یُکَلِّمُھُمُ اللّٰہُ یَوْمَ الْقِیٰمَۃِ" (اور نہ بات کرے گا ان سے اللہ دن قیامت کے) اور دوسری جگہ یہ ارشاد ہے: "فَوَرَبِّکَ لَنَسْئَلَنَّھُمْ

اَجۡمَعِیۡنَ عَمَّا کَانُوۡا یَعۡمَلُوۡنَ ''(پس قسم ہے رب تیرے کی البتہ سوال کریںگے ہم ان سے سب سے اس چیز سے کہ تھے عمل کرتے)؟

جواب: جہاں کلام کی نفی ہے وہاں لطف واکرام کے ساتھ کلام نہ کرنا مراد ہے اور جہاں کلام کا اثبات ہے وہاں اہانت اور توبیخ کے ساتھ کلام کرنا مراد ہے۔ لہٰذا دونوں آیتوں میں کوئی تعارض نہیں۔

سوال: یہ کیسے فرمایا: ''کُتِبَ عَلَیۡکُمُ الۡقِصَاصُ فِی الۡقَتۡلٰی'' (فرض کیا جاتا ہے تم پر قصاص مقتولین کے بارے میں) حالانکہ قصاص (بہر حال) فرض نہیں ہے بلکہ مقتول کے اولیاء کو اس میں اختیار ہوتا ہے؟

جواب: اس سے مراد یہ ہے کہ قاتل پر خود سپردگی فرض کی گئی ہے' یہ مراد نہیں ہے کہ مقتول کے ورثاء پر فرض ہے کہ وہ اپنا حق پورا پورا وصول کریں۔

سوال: یہ کیسے فرمایا: ''اَلۡوَصِیَّۃُ لِلۡوَالِدَیۡنِ وَالۡاَقۡرَبِیۡنَ'' (وصیت کرنا واسطے ماں باپ کے اور قرابت والوں) یعنی ''اَلۡاَقۡرَبِیۡنَ'' کا "الۡوَالِدَیۡنِ'' پر عطف کیا گیا ہے' حالانکہ والدین تو قرابت داروں میں سب سے زیادہ قرابت والے ہیں یعنی اقرب الاقربین ہیں' عطف تو دونوں میں مغایرت کا مقتضی ہے؟

جواب: والدین' اقربین میں سے نہیں ہیں' کیونکہ قریب اس کو کہتے ہیں جو دوسرے کی طرف بواسطہ منسوب ہو جیسے بھائی' چچا وغیرہ' جب کہ والدین' ایسے نہیں ہیں' اور اگر بالفرض والدین' اقربین میں شمار ہوں تو اس صورت میں والدین کا خصوصی ذکر ان کے شرف وعظمت کی بناء پر ہوگا' جیسے اس ارشادِ حق میں ہے: ''وَمَلٰٓئِکَتِہٖ وَرُسُلِہٖ وَجِبۡرِیۡلَ وَمِیۡکٰلَ''۔

سوال: یہ کیسے فرمایا: ''کُتِبَ عَلَیۡکُمُ الصِّیَامُ کَمَا کُتِبَ عَلَی الَّذِیۡنَ مِنۡ قَبۡلِکُمۡ'' (فرض کیا گیا تم پر روزہ جس طرح تم سے پہلے (امتوں کے) لوگوں پر فرض کیا گیا تھا) حالانکہ امتِ محمدیہ کا روزہ موسیٰ وعیسیٰ علیہما السلام کی امتوں کے روزوں کی طرح نہیں ہے؟

جوابِ اوّل: یہاں تشبیہ اصلِ صوم میں ہے نہ کہ کیفیتِ صوم میں یا تشبیہ کیفیتِ افطار میں ہے۔ اس لئے کہ پہلے صرف غروبِ آفتاب سے لے کر رات سونے تک افطار مباح تھا پھر اس فرمانِ الٰہی سے یہ حکم منسوخ ہوا: ''وَکُلُوۡا وَاشۡرَبُوۡا حَتّٰی یَتَبَیَّنَ لَکُمۡ'' (اور کھاؤ اور پیو اس وقت تک کہ تم کو ظاہر ہو)۔

جوابِ ثانی: یہ تشبیہ صوم کے عدد میں بھی ہے جیسا کہ ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے' وہ

فرماتے ہیں: نصاریٰ پر بھی رمضان کے روزے فرض تھے اور وہ دس روزے رمضان سے پہلے یا بعد میں رکھتے تا کہ وہ روزے گرمیوں میں نہ واقع ہوں اور پھر اس تقدیم و تاخیر کی تلافی مزید بیس روزوں سے کرتے چنانچہ ان کے پچاس روزے گرمی و سردی کے درمیان میں ہو جاتے ہیں۔

سوال: ''هُدیً لِلنَّاسِ'' (لوگوں کے لئے ہدایت ہے) فرما دینے کے بعد مزید ''وَبَيِّنٰتٍ مِّنَ الْهُدٰى وَالْفُرْقَانِ'' (اور دلیلیں ہدایت کی سے اور معجزے) فرمانے میں کیا فائدہ ہے؟

جواب: پہلے یہ بات ذکر فرمائی کہ قرآن ذریعۂ ہدایت ہے' پھر یہ ذکر فرمایا کہ یہ منجملہ ان آسمانی کتابوں کے ہے جو بندوں کے لئے ذریعۂ ہدایت بھی ہیں اور حق و باطل میں فرق کرنے والی اور فیصلہ کرنے والی بھی ہیں دونوں میں کوئی تکرار نہیں۔

سوال: ''فَمَنْ شَهِدَ مِنْكُمُ الشَّهْرَ فَلْيَصُمْهُ وَمَنْ كَانَ مَرِيضًا أَوْ عَلٰى سَفَرٍ فَعِدَّةٌ مِّنْ أَيَّامٍ أُخَرَ'' (پس جو کوئی حاضر ہو تم میں سے اس مہینے میں پس چاہئے کہ روزہ رکھے اس کو اور جو کوئی بیمار ہو یا اوپر سفر کے پس گنتی ہے دِنوں اور سے) اس آیت میں مریض اور مسافر کو دوبارہ ذکر کرنے میں کیا فائدہ ہے؟۔

جواب: اصل میں سابقہ آیت میں تندرست آدمی' مریض اور مسافر کو روزہ رکھنے یا نہ رکھنے کا اختیار دیا گیا تھا اس آیت سے تندرست آدمی کا اختیار منسوخ ہوا جبکہ سابقہ آیت میں مریض اور مسافر کے اختیار کا بھی ذکر تھا جس سے یہ وہم ہوتا تھا کہ شاید ان کے اختیار کا حکم بھی منسوخ ہو گیا اور اب مریض اور مسافر کو بھی اختیار نہیں رہا اس لئے اس وہم کے ازالہ کے لئے ان (مریض اور مسافر) کا ذکر دوبارہ کیا گیا۔

سوال: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ''فَإِنِّي قَرِيبٌ أُجِيبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ إِذَا دَعَانِ'' (پس تحقیق میں نزدیک ہوں جواب دیتا ہوں پکارنے والے کو جب پکارتا ہے مجھ کو) اس ارشاد سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ دُعا کرنے والے کی دُعا کو قبول کرتے ہیں۔ حالانکہ ہم دیکھتے ہیں کہ بہت سے دُعا کرنے والوں کی دُعا قبول نہیں ہوتی ؟۔

جواب: نبی کریم ﷺ کا ارشادِ مبارک ہے: ''جو مسلمان بھی اللہ تعالیٰ سے ایسی دُعا کرے جس میں کوئی قطع رحمی نہ ہو اور گناہ کی بات نہ ہو تو اللہ تعالیٰ اس کو اس دعا کی وجہ سے تین امور میں سے ایک امر ضرور عطا کرتے ہیں' یا تو اس کی دُعا قبول کر لیتے ہیں' یا اس دُعا کو اس کے لئے آخرت میں ذخیرہ کر لیتے ہیں یا اس شخص سے اس کے مثل کوئی تکالیف و برائی دور کر دیتے ہیں''۔ نیز قبولیت دعا کے لئے اطاعت خداوندی' حلال کھانا اور دُعا کے وقت حضور قلبی شرط ہے' جب یہ

شرائط موجود ہوں گی تو وہ دعا ضرور قبول ہوگی' نیز دُعا کرنے والا شخص بسا اوقات دعا کی قبولیت میں اپنی مصلحت (بہتری) خیال کررہا ہوتا ہے' جبکہ اللہ تعالیٰ کے علم میں یہ ہوتا ہے کہ جو کچھ اس نے مانگا ہے وہ چیز تاخیر سے دینے میں اس کا بھلا اور فائدہ ہے نہ کہ فوراً دینے میں۔ یا اللہ تعالیٰ کے علم میں وہ چیز اس کو نہ دینے میں ہی قابلِ مصلحت ہوتی ہے' لہٰذا اللہ تعالیٰ کو اس کا مقصودِ اصلی یعنی مصلحت و بہتری مطلوب ہوتی ہے جو کہ وہ منظور فرماتا ہے لیکن بندہ سمجھتا ہے کہ میری دعا قبول نہیں ہوئی اور مجھے مانگی ہوئی چیز عطا نہیں ہوئی۔

سوال: ''تِلْکَ عَشَرَۃٌ کَامِلَۃٌ'' (یہ دس ہوئے پورے) اس فرمانِ باری تعالیٰ کا کیا فائدہ ہے؟ سب جانتے ہیں کہ تین اور سات دس ہوتے ہیں۔ نیز ''کَامِلَۃٌ'' کہنے میں کیا نکتہ ہے؟ کیونکہ یہ بات بھی سب کو معلوم ہے کہ دس پورے ہی ہوتے ہیں' تمام اسمائے عدد نہ مذکور سے کم پر صادق آتے ہیں اور نہ اس سے زیادہ پر صادق آتے ہیں؟۔

جواب: ''تِلْکَ عَشَرَۃٌ'' کہنے میں فائدہ یہ ہے کہ کہیں کسی کو یہ وہم نہ ہو کہ مذکور آیت میں واو بمعنی او ہے جیسا کہ اس ارشادِ الٰہی مین واوٗ بمعنی او ہے: ''فَانْکِحُوْا مَا طَابَ لَکُمْ مِنَ النِّسَاءِ مَثْنٰی وَثُلٰثَ وَرُبٰعَ'' (پس نکاح کرو جو خوش لگے تم کو سوائے ان کے عورتوں سے دو دو اور تین تین اور چار چار) یعنی پورے دس دن کے روزے رکھے' چنانچہ ''تِلْکَ عَشَرَۃٌ'' سے دو عددوں میں سے ایک عدد کے واجب ہونے کا یہ خیال منتفی ہوگیا کہ یا تو تین روزے ایام حج میں رکھے یا حج سے واپس آنے کے وقت سات روزے رکھے۔ اس کی ''عَشَرَۃٌ'' سے نفی ہوگئی اور معلوم ہوگیا کہ دونوں عدد واجب ہیں' ایام حج میں تین روزے اور حج سے لوٹتے وقت سات روزے۔ اور کلمہ ''کَامِلَۃٌ'' تاکید کے لئے ہے' جیسے اس فرمان میں ''حَوْلَیْنِ کَامِلَیْنِ'' (پورے دو سال) ''کَامِلَیْنِ'' تاکید کے لئے ہے۔ یا ''کَامِلَۃٌ'' کا معنی ہے کہ یہ روزے اس ہدی کا بدل ہونے کے علاوہ اجر و ثواب میں کامل ہیں۔ یا ''کَامِلَۃٌ'' کا مطلب یہ ہے کہ یہ روزے باوجود اس کے کہ بعض مسلسل ہیں اور بعض متفرق اس کا بدل واقع ہونے میں کامل ہیں۔ یا ''کَامِلَۃٌ'' کا معنی یہ ہے کہ بعض روزے مکہ میں اور بعض غیر مکہ میں پیش آنے کے باوجود کامل ہیں۔ خلاصہ یہ ہے کہ کمال وصف کے اعتبار سے ہے نہ کہ ذات کے لحاظ سے۔

سوال: ''فَاِذَا اَفَضْتُمْ مِنْ عَرَفٰتٍ فَاذْکُرُوا اللّٰهَ عِنْدَ الْمَشْعَرِ الْحَرَامِ وَاذْکُرُوْهُ کَمَا هَدٰىکُمْ'' (پس جب پھرو تم عرفات سے پس یاد کرو اللہ کو نزدیک مشعر حرام کے اور یاد کرو اس کو جیسا ہدایت کیا تم کو) اس آیت میں ذکر اللہ کا حکم متکرر ہے اس میں کیا فائدہ ہے؟۔

جوابِ اوّل: ذکراللہ کا حکم مکرر اس لئے ہے تاکہ اس بات پر تنبیہ ہو جائے کہ مقصود اللہ تعالیٰ کا ذکر تکرار کے ساتھ ہے نہ کہ ایک مرتبہ ذکر کرنا' یعنی منظورِ خدا یہ ہے کہ اس کا ذکر بار بار کیا جائے۔ اسی لئے دوسری بار اس کا حکم دینے میں ایک اور فائدہ کا اضافہ کیا یعنی "کَمَا هَدٰىكُمْ" مطلب یہ ہوا کہ تم اس کو اس کی وحدانیت کے ساتھ یاد کرو جیسے اس نے تم کو ہدایت دے کر یاد کیا۔

جوابِ ثانی: پہلے ذکر سے مراد ہے مزدلفہ میں دو نمازوں کو جمع کرنا اور دوسرے ذکر سے مراد فجر کے بعد دُعا ہے۔ لہٰذا یہاں تکرار نام کی کوئی چیز ہی نہیں۔

سوال: "فَاِذَآ اَفَضْتُمْ مِّنْ عَرَفٰتٍ.... ثُمَّ اَفِيْضُوْا مِنْ حَيْثُ اَفَاضَ النَّاسُ" (پس جب پھرو تم عرفات سے پھر پھرو جہاں سے پھرتے ہیں لوگ)' مفسرین کا اتفاق ہے کہ "ثُمَّ اَفِيْضُوْا مِنْ حَيْثُ اَفَاضَ النَّاسُ" سے عرفات کی واپسی مراد ہے' اس تفسیر کے مطابق "فَاِذَآ اَفَضْتُمْ مِّنْ عَرَفٰتٍ" کا کیا معنیٰ ہوگا؟ یعنی مزدلفہ واپس آنے کے بعد اور اس میں دو مرتبہ ذکر کرنے کے بعد اب پھر وہ کیسے عرفات سے واپس لوٹیں گے؟۔

جواب: یہاں اصل میں تقدیم و تاخیر ہے' اصل عبارت اس طرح ہے: "مِنْ رَّبِّكُمْ ثُمَّ اَفِيْضُوْا مِنْ حَيْثُ اَفَاضَ النَّاسُ 'فَاِذَآ اَفَضْتُمْ مِّنْ عَرَفٰتٍ" (اس میں کوئی گناہ نہیں کہ معاش کی تلاش کرو جو تمہارے پروردگار کی طرف سے ہے پھر تم سب کو ضرور ہے کہ اسی جگہ ہو کر واپس آجاؤ جہاں اور لوگ جا کر وہاں سے واپس آتے ہیں' پس جب تم لوگ عرفات سے واپس آنے لگو۔۔)

سوال: "فَمَنْ تَعَجَّلَ فِىْ يَوْمَيْنِ فَلَآ اِثْمَ عَلَيْهِ وَمَنْ تَاَخَّرَ فَلَآ اِثْمَ عَلَيْهِ" (پس جو کوئی جلدی کرے بیچ دو دن کے پس نہیں گناہ اوپر اس کے' اور جو کوئی تاخیر کرے اس پر بھی کچھ گناہ نہیں) اس فرمانِ الٰہی کے بیان میں کیا فائدہ ہے؟ اس لئے کہ یہ بات سبھی کو معلوم ہے کہ جب بعض رمی جمار کو ترک کر کے جلدی کرنے والے پر کوئی گناہ نہیں ہے تو اس شخص پر بھی کوئی گناہ نہیں ہوگا جو تاخیر کرتا ہے اور مکمل رمی کا امر بجالاتا ہے؟

جوابِ اوّل: اصل میں اہلِ جاہلیت میں دو فریق تھے' ایک فریق تعجیل کرنے والے کو گنہگار قرار دیتا تھا اور دوسرا فریق تاخیر کرنے والے کو گنہگار قرار دیتا تھا' اس لئے اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں دونوں سے گناہ کی نفی کا ذکر کیا کہ دونوں پر کوئی گناہ نہیں۔

جوابِ ثانی: اصل مین دو چیزیں ہیں' ایک ہے رخصت اور دوسری چیز ہے عزیمت' یہ جو فرمایا کہ تاخیر کرنے والے پر بھی کچھ گناہ نہیں اسکا مطلب یہ ہے کہ اس نے جو رخصت پر عمل نہیں کیا اور عزیمت کو اختیار کیا ہے اس میں اس پر کوئی گناہ نہیں' اگرچہ اللہ تعالیٰ کو رخصت اور عزیمت دونوں

عمل پسند ہیں، خواہ رخصت کو بجالایا جائے اور خواہ عزیمت کو اختیار کیا جائے۔
جوابِ ثالث: تعجیل اور تاخیر کرنے والوں کا گنہگار نہ ہونا دراصل تقویٰ پر موقوف ہے، محض رمی جمار کے بارے میں عزیمت یا رخصت پر موقوف نہیں ہے، پھر بعض کہتے ہیں کہ تقویٰ سے مراد حج کے دوران گناہوں سے بچنا ہے اور بعض کہتے ہیں کہ اس تقویٰ سے میدانِ عرفات اور دوسرے مواقفِ حج میں جو اس نے اللہ سے وعدے کئے ہیں اور توبہ واستغفار وغیرہ کیا ہے حج کے بعد اپنی بقیہ زندگی میں ان پر قائم رہنا اور معاصی سے اجتناب کرنا مراد ہے۔ یہاں ایک مشکل یہ ہے کہ جس تعجیل کی رخصت دی گئی ہے وہ صرف ایام تشریق کے دوسرے دن میں ہے۔ یعنی صرف ایک دن کی ہے نہ کہ دونوں کی، لہٰذا ''یَوْمَیْنِ'' کا لفظ ذکر فرما کر اس سے ایام تشریق کا صرف دوسرا دن کیسے مراد لیا؟

سوال: ''وَاِلَی اللّٰہِ تُرْجَعُ الْاُمُوْرُ'' (اور سارے مقدمات اللہ تعالیٰ ہی کی طرف رجوع کئے جائینگے)۔ اس آیت سے بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ امور پہلے غیر اللہ کی طرف راجع تھے۔ جیسے اہلِ عرب کا قول ہے: رجع الی فلان عبدہ و منصبہ یعنی فلاں کی طرف اس کا غلام اور اس کا منصب لوٹا دیا گیا۔؟

جواب: اس آیت میں خطاب ان لوگوں کو ہے جو غیر اللہ کی عبادت کرتے ہیں اللہ تعالیٰ کے افعال کو غیر کی طرف منسوب کرتے ہیں، ان کو اس آیت میں بتایا گیا ہے کہ جب قیامت کے روز حقیقتِ حال کا انکشاف ہوگا تو وہ اپنے کفر اور ظلم کے سبب غیر اللہ کی طرف منسوب افعال کو رد کردیں گے، نیز ''اور کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے، جیسے کہا جاتا ہے: ''یعنی فلاں کی طرف سے مجھے ناگوار امر پیش آیا۔ ایک شاعر کہتا ہے:

وَمَا المرءُ اِلَّا کالشھاب وضوئِہ ☆ یحور رمادا بعد اذھو ساطع

یعنی انسان ایک شعلہ کی روشنی کی طرح ہے کہ جب وہ شعلہ بلند ہوتا ہے تو راکھ بن جاتا ہے۔ اور نیز یہ کہ تمام امور بندوں کی تخلیق سے قبل اللہ تعالیٰ ہی کی طرف راجع تھے، پھر جب اللہ نے ان کو پیدا کیا تو بعض امور کا بطورِ نیابت وخلافت کے مالک بنا دیا پھر ان کی وفات کے بعد سارے امور آخر کار اسی ذات کی طرف راجع ہوں گے۔ اللہ تعالیٰ کے ان فرامین کا تعلق اسی بات سے ہے، فرمایا: لِمَنِ الْمُلْکُ الْیَوْمَ'' (آج کے دن کس کی بادشاہت ہے؟) اور فرمایا: ''اَلْمُلْکُ یَوْمَئِذِنِ الْحَقُّ لِلرَّحْمٰن'' (اس روز حقیقی حکومت رحمٰن (ہی) کی ہوگی)۔

نیز یہاں یوں فرمایا: ''وَاِلَی اللّٰہِ تُرْجَعُ الْاُمُوْرُ'' صرف ''وَاِلَیْہِ'' نہیں فرمایا، اگرچہ

سابق میں اس کا ذکر ہو چکا تھا تو اس کی وجہ تعمیم اور تعظیم کا قصد ہے' حالانکہ یہ ایجاز اور اختصار کے منافی ہے۔

**سوال:** ''وَيَسْئَلُوْنَكَ مَا ذَا يُنْفِقُوْنَ ط قُلْ مَآ اَنْفَقْتُمْ مِنْ خَيْرٍ فَلِلْوَالِدَيْنِ وَالْاَقْرَبِيْنَ'' (لوگ آپ سے پوچھتے ہیں کہ کیا چیز خرچ کیا کریں۔ آپ فرما دیجئے کہ جو کچھ مال تم کو صرف کرنا ہو سو ماں باپ کا حق ہے اور قرابت داروں کا)۔

یہاں جواب' سوال کے مطابق نہیں ہے۔ اس لئے کہ انہوں نے سوال یہ کیا تھا کہ وہ کیا چیز خرچ کریں؟ مگر انہیں جواب میں مال کا مصرف بتایا گیا؟

**جواب:** اللہ تعالیٰ اس ارشاد میں ''قُلْ مَآ اَنْفَقْتُمْ مِنْ خَيْرٍ'' (آپ فرما دیجئے کہ جو کچھ مال تم کو صرف کرنا ہو) ان کے سوال کا جواب موجود ہے اور وہ ہے: کل خیر یعنی جو مال بھی خرچ کرنا چاہو خرچ کر سکتے ہو پھر مزید مال کا مصرف بھی بیان فرما دیا۔ اس کی نظیر اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان ہے: ''وَمَا تِلْكَ بِيَمِيْنِكَ يَا مُوْسٰى قَالَ هِيَ عَصَايَ'' الآیۃ (اے موسیٰ تیرے دائیں ہاتھ میں کیا ہے'' انہوں نے فرمایا یہ میری لاٹھی ہے۔۔) اور حضور علیہ الصلاۃ والسلام کا یہ فرمان بھی اس کی نظیر ہے جب آپؐ سے ماءِ بحر سے وضو کے بارے میں سوال کیا گیا تو آپؐ نے فرمایا: ''ھوَ الطهور ماؤه والحل ميتته'' یعنی بحر کا پانی پاک ہے اور اس کا مردار حلال ہے۔

**سوال:** اس میں کیا نکتہ پنہاں ہے کہ تین مرتبہ ''يَسْئَلُوْنَكَ'' واوٴ کے بغیر آیا ہے (يَسْئَلُوْنَكَ مَاذَا يُنْفِقُوْنَ۔ يَسْئَلُوْنَكَ عَنِ الشَّهْرِ الْحَرَامِ۔ يَسْئَلُوْنَكَ عَنِ الْخَمْرِ وَالْمَيْسِر) اور تین ہی مرتبہ ''يَسْئَلُوْنَكَ'' واوٴ کے ساتھ آیا ہے (وَيَسْئَلُوْنَكَ مَا ذَا يُنْفِقُوْنَ ۔ وَيَسْئَلُوْنَكَ عَنِ الْيَتٰمٰى۔ وَيَسْئَلُوْنَكَ عَنِ الْمَحِيْضِ)؟

**جواب:** اس کی وجہ یہ ہے کہ ان لوگوں کے پہلے امور سے متعلق سوالات متفرق طور پر ہوئے تھے اور دوسرے امور سے متعلق سوالات ایک ہی وقت میں کئے گئے تھے اس لئے حرفِ جمع کے ساتھ ان کو لایا گیا تاکہ اس پر دلالت کرے۔

**سوال:** یہ کیسے فرمایا: ''وَاِنْ عَزَمُوا الطَّلَاقَ فَاِنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ'' (اور اگر قصد کریں طلاق کا پس تحقیق اللہ سننے والا جاننے والا ہے) حالانکہ ان کے طلاق دینے کا قصد اور ارادہ علم سے تعلق رکھتا ہے نہ کہ سماعت سے' تو کیسے فرمایا کہ وہ ذات ان کے عزمِ طلاق کو سننے والی ہے؟۔

**جواب:** عموماً عزمِ طلاق اور عدمِ رجوع باہمی بحث و تکرار خالی نہیں ہوا کرتا اور اگر خالی بھی ہو تو عزمِ طلاق کے متعلق وہ اپنے دل میں اسے ضرور بیان کیا کرتا ہے اور یہ کلام ہے جسے اللہ تعالیٰ ہی

سن سکتے ہیں' جیسے وہ شیطان کے وسوسہ تک کو سن لیتا ہے۔
سوال: یہ کیسے فرمایا: "وَبُعُوْلَتُهُنَّ اَحَقُّ بِرَدِّهِنَّ فِیْ ذٰلِکَ" (اور ان عورتوں کے شوہران کے پھر لوٹا لینے کا حق رکھتے ہیں اس عدت کے اندر) حالانکہ عورتوں کے لئے رجعت میں کوئی حق نہیں ہے۔ اور افعل التفضیل کا صیغہ (احق) اشتراک کا مقتضی ہے کہ دونوں حق رکھتے ہیں؟۔
جواب: اس سے مراد یہ ہے کہ شوہر جب رجوع کرنا چاہتا ہو اور عورت نہ مانتی ہو تو اس صورت میں شوہر کے قول کی اس عورت کے قول کو ترجیح دینا ضروری ہے' کیونکہ رجعت میں اس عورت کا حق ہے۔
سوال: یہ کیسے فرمایا: "وَبُعُوْلَتُهُنَّ اَحَقُّ بِرَدِّهِنَّ فِیْ ذٰلِکَ اِنْ اَرَادُوْا اِصْلَاحًا" (اور ان عورتوں کے شوہران کے پھر لوٹا لینے کا حق رکھتے ہیں اس عدت کے اندر بشرطیکہ اصلاح کا قصد رکھتے ہوں) یہاں اصلاح کے قصد کی شرط کیسے لگائی' حالانکہ شوہر بہر حال رجعت کا حقدار ہے خواہ وہ اصلاح کا ارادہ رکھتا ہو یا عدت کو طول دے کر اس کے ساتھ اضرار (تکلیف دینے) کا قصد رکھتا ہو' اس آیت کا مطلب کیا ہے؟۔
جواب: مراد یہ ہے کہ اگر وہ شوہر اصلاح چاہتا ہو تو رجوع کرنا زیادہ درست اور قرینِ انصاف ہوگا اور اگر وہ اسے تکلیف پہنچانے کا ارادہ رکھتا ہے تو پھر زیادہ صحیح اور درست یہ ہوگا کہ وہ رجوع نہ کرے۔
سوال: دو آیتیں ہیں ان میں تطبیق کیسے ہوگی' ایک آیت یہ ہے: "فَقَالَ لَهُمُ اللّٰهُ مُوْتُوْا ثُمَّ اَحْیَاهُمْ" (سو اللہ تعالیٰ نے ان کے لئے (حکم) فرمادیا کہ مرجاؤ (سب مر گئے) پھر ان کو جلا دیا) اور دوسری آیت یہ ہے: "لَا یَذُوْقُوْنَ فِیْهَا الْمَوْتَ اِلَّا الْمَوْتَةَ الْاُوْلٰی" (وہاں بجز اس موت کے جو دنیا میں آچکی تھی اور موت کا ذائقہ بھی نہیں چکھیں گے)؟
جواب: پہلی آیت سے ان کی اجل کو باقی رکھتے ہوئے عقوبت کی موت دینا مراد ہے اور دوسری آیت سے ان کی اجل کو ختم کرتے ہوئے موت دینا مراد ہے۔ اس کی نظیر موسیٰ علیہ السلام کے قصہ کے سلسلہ میں اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان ہے: "ثُمَّ بَعَثْنٰكُمْ مِّنْۢ بَعْدِ مَوْتِكُمْ" (پھر ہم نے تم کو زندہ کر اٹھایا تمہارے مرجانے کے بعد) اب اس آیت میں عقوبت کی موت دینا مراد ہے یا پھر ان کا دوبارہ زندہ ہونا ان کے پیغمبر کے معجزہ کے طور پر تھا' جیسا کہ حضرت عزیرؑ کے دوبارہ زندہ کرنے کا واقعہ قرآنِ کریم میں بیان ہوا ہے' انبیاء کرامؑ کے معجزات اصل میں نوادر اور مستثنیات میں سے ہوتے ہیں' لہٰذا دوسری آیت کریمہ سے مراد وہ موت ہے جو کسی نبی کے معجزہ کے سبب

نہ ہو۔ یا قومِ موسیٰ کا زندہ کرنا ان کے نبی کا معجزہ بھی تھا' یہ عام جواب ہے۔ علاوہ ازیں خود یہ سوال بھی قابلِ اشکال ہے۔ اس لئے کہ "لَا یَذُوْقُوْنَ" میں جو ضمیر ہے وہ متقین کی طرف راجع ہے اور "فِیْهَا" کی ضمیر جنت کی طرف لوٹتی ہے جیسا کہ سورۃ الدخان میں اس کی مزید وضاحت آ رہی ہے' ان شاء اللہ تعالیٰ۔ بناء بریں تو اصل سوال ہی مندفع ہو جاتا ہے۔

**سوال:** یہ کیسے ارشاد فرمایا: "وَاللّٰهُ یُؤْتِیْ مُلْكَهٗ مَنْ یَّشَآءُ" (اور اللہ تعالیٰ اپنا ملک جس کو چاہیں دیں) حالانکہ اللہ تعالیٰ کسی کو بھی اپنا ملک نہیں دیتے؟

**جواب:** یہاں ملک سے مراد وہ ریاست اور سلطنت ہے جس کے وہ لوگ طالوت کو دینے کے منکر تھے' اس سے یہ مراد بالکل نہیں کہ اللہ تعالیٰ جسے چاہتے ہیں اپنا ملک دے دیتے ہیں آیت کا سیاق اس سے مانع ہے۔

**سوال:** پانی کے متعلق کیسے فرمایا: "وَمَنْ لَّمْ یَطْعَمْهُ" (اور جو کوئی نہ چکھے گا اس کو) "وَمَنْ لَّمْ یَشْرَبْهُ" (اور جو اس پانی کو نہ پیئے گا) کا لفظ نہیں فرمایا' حالانکہ پانی پی جانے والی چیز ہے نہ کہ کھائے جانے والی چیز؟

**جواب:** اصل میں لفظ "طعم" عام ہے' کھانے کے معنی میں بھی آتا ہے اور چکھنے کے معنی میں بھی آتا ہے' یہاں مراد چکھنا ہے۔

**سوال:** اللہ تعالیٰ کے اس ارشادِ مبارک میں "تِلْكَ الرُّسُلُ" الآیۃ' میں موسیٰ اور عیسیٰ علیہما السلام کو خصوصی طور پر ذکر فرمانے کی کیا وجہ ہے' آخر اور بھی بہت سارے انبیاء موجود تھے؟

**جواب:** اس کی وجہ یہ ہے کہ ان دو پیغمبروں کو دو عظیم اور مشہور کتابوں کے ساتھ ساتھ بہت سے روشن اور ممتاز معجزات عطا کئے گئے ہیں۔

**سوال:** یہ کیسے فرمایا: "مِنْ قَبْلِ اَنْ یَّاْتِیَ یَوْمٌ لَّا بَیْعٌ فِیْهِ وَلَا خُلَّةٌ وَّلَا شَفَاعَةٌ" (قبل اس کہ وہ دن (قیامت) آ جائے جس میں نہ تو خرید و فروخت ہوگی اور نہ دوستی ہوگی اور نہ کوئی سفارش ہوگی) حالانکہ قیامت کے روز انبیاء وغیرہ کی سفارش ثابت ہے' دلیل اس کی یہ فرمانِ باری تعالیٰ ہے: "مَنْ ذَا الَّذِیْ یَشْفَعُ عِنْدَهٗ اِلَّا بِاِذْنِهٖ" (کون ہے وہ جو سفارش کرے نزدیک اس کے مگر ساتھ حکم اس کے کے) اور یہ فرمان بھی اس کی دلیل ہے: "وَلَا یَشْفَعُوْنَ اِلَّا لِمَنِ ارْتَضٰی" (اور وہ سفارش نہیں کر سکتے مگر اس کے لئے جو وہ پسند کرے)۔

نیز یہ فرمانِ الٰہی بھی ثبوتِ سفارش پر دلیل ہے: "وَلَا تَنْفَعُ الشَّفَاعَةُ عِنْدَهٗ اِلَّا لِمَنْ اَذِنَ لَهٗ" "اور نہیں نفع دیتی سفارش اس کے نزدیک مگر جس کے لئے وہ اجازت دے"

بہر حال ان آیات سے سفارش کا ہونا ثابت ہوتا ہے' جبکہ "وَلَا خُلَّةٌ وَلَا شَفَاعَةٌ" سے اس کی نفی ثابت ہوتی ہے؟۔

جواب: یہ آیات قیامت کے روز شفاعت کے ثبوت پر دال نہیں ہیں' بلکہ ان آیات سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی اجازت اور مرضی کے بغیر کوئی شفاعت اور سفارش فائدہ نہیں دے گی اور نہ ہی کسی کے لئے پائی جائے گی۔ اور یہ چیز وجودِ شفاعت کی نفی کے منافی نہیں ہے' منافی تو اس کے وجود کی خبر دینا ہے نہ کہ امکانِ وجود کی خبر دینا اس کے منافی ہے۔

جوابِ ثانی: اگر یہ بات مان لی جائے کہ مذکورہ آیات قیامت کے دن سفارش کے ثبوت پر دلالت کرتی ہیں تو پھر اس کا جواب یہ ہوگا کہ اس سے مراد ان کواکب (ستاروں) اور اصنام (بتوں) کی شفاعت کی نفی ہے جن کا وہ اعتقاد رکھتے تھے' اسی لئے اس کے بعد یہ فرمایا: "وَالْكٰفِرُوْنَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ" (اور کافر ہی لوگ ظلم کرتے ہیں)۔

جوابِ ثالث: بعض کہتے ہیں کہ "وَلَا شَفَاعَةٌ" سے مراد یہ ہے کہ آخرت میں شفاعت صرف فضل وثواب کی زیادتی کے لئے ہوگی' ترکِ واجب کے گناہ کے سلسلہ میں کوئی شفاعت نہیں ہوگی۔ اور یہاں مخاطب مومنین ہیں جن کو واجب نفقہ یعنی زکوٰۃ کے متعلق خطاب کیا گیا ہے۔

سوال: "وَالْكٰفِرُوْنَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ" (کافر لوگ ہی ظلم کرتے ہیں) بطورِ حصر کیوں فرمایا' جب کہ غیرِ کافر بھی ظلم کرتے ہیں؟

جواب: کافروں کا ظلم چونکہ زیادہ شدید ہے اس لئے گویا وہی ظالم ہیں اور کوئی نہیں۔ اس کی نظیر یہ فرمان ہے: "اِنَّمَا يَخْشَى اللّٰهَ مِنْ عِبَادِهِ الْعُلَمٰٓؤُا" (خدا سے وہی بندے ڈرتے ہیں جو (اس کی عظمت کا) علم رکھتے ہیں)۔

سوال: "اَللّٰهُ وَلِيُّ الَّذِيْنَ آمَنُوْا يُخْرِجُهُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ" (اللہ تعالیٰ دوست دار ہے ان لوگوں کا جو ایمان لائے' نکالتا ہے ان کو اندھیروں سے طرف روشنی کے)' اس آیتِ کریمہ میں "يُخْرِجُهُمْ" (نکالتا ہے) لفظِ مضارع کے ساتھ کیوں فرمایا ہے' "اَخْرَجَهُمْ" (ان کو نکالا) ماضی کا لفظ کیوں نہیں استعمال کیا' حالانکہ ایمان کے پائے جانے کی وجہ سے اندھیروں سے روشنی کی طرف اخراج (نکالنا) پایا گیا ہے' اس لئے بظاہر ماضی کا لفظ لانا مناسب تھا؟

جواب: اصل میں مضارع کا لفظ دوام اور استمرار پر دلالت کرتا ہے: معنی یہ ہوگا کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے مومنین کے حق میں یہ اخراج (اندھیروں سے روشنی کی طرف) زمانۂ مستقبل میں دو،

واستمرار کے ساتھ ہوگا کہ ان کو مزید ہدایت دیتے رہیں گے اور ان کے شبہات دور کرتے رہیں گے اور جو ابھی تک مسلمان نہیں ہوئے اور اللہ کے علم میں ہے کہ وہ آئندہ ایمان کی دولت سے سرفراز ہوں گے ان کے حق میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ اخراج ہدایت کی ابتداء اور اس کی زیادتی کے ذریعہ دوام واستمرار کے طور پر ہوگا' جب کہ ماضی کا لفظ استمرار کے معنی پر دلالت نہیں کرتا۔

**سوال:** مومنین کفر کے اندھیروں میں اور کافرین' ایمان کے نور میں کب تھے کہ پھر ان کو اس سے نکالا گیا؟۔

**جواب:** اخراج (نکالنا) کا لفظ داخل نہ ہونے کے معنی میں مستعمل ہوتا ہے' جیسے اس شخص کے لئے خَرَجَ اور اَخرَجَ (نکلا اور خود کو اس سے نکالا) کا لفظ استعمال کیا جاتا ہے جو کسی کام میں پڑنے سے آپنے آپ کو بچاتا ہے۔ یہاں بھی اللہ تعالیٰ کا مومنین کو کفر و ضلالت کے اندھیروں میں داخل ہونے سے بچانا ان کا اس سے اخراج (نکالنا) ہے اور کافروں کا ان کے لئے باطل کو مزین (آراستہ) کرنا' جس کے ذریعہ وہ ان کو راہِ حق سے باز رکھتے ہیں' ان کو نورِ ہدایت سے نکالنا ہے۔

نیز اہلِ کتاب کے روسا کا ظہورِ نبوت سے پہلے حضور ﷺ پر ایمان ان کے لئے نور تھا اور ظہورِ نبوت کے بعد ان کا کفر اس نور سے کفر کے ظلمات کی طرف خروج تھا' اس لئے کہ ظہورِ معجزات کے وقت حضور ﷺ کا متبع' جہالت کی ظلمتوں سے نکل کر علم کے نور کی طرف آیا اور آپ کا مخالف نورِ علم سے نکل کر جہالت کی ظلمتوں کی طرف آنے والا ہے۔

**سوال:** حضرت ابراہیمؑ کی دلیل کے مقابلہ میں نمرود نے ایک مجوسی کو قتل کروا کے اور دوسرے کو رہا کر کے دکھایا کہ میں بھی زندہ کرسکتا ہوں اور مار سکتا ہوں ابھی یہ بات ختم نہ ہوئی تھی اور اسکی حجت توڑی نہیں گئی تھی کہ حضرت ابراہیمؑ نے فوراً دوسری حجت اور دلیل بیان کردی کہ میرا رب سورج کو مشرق سے لاتا ہے تو اس کو مغرب سے لا کر دکھا دے' آخر ابراہیمؑ کی زندہ کرنے اور مارنے سے کیا مراد تھی۔ اور آپ نے پہلی بات کو چھوڑ کر فوراً دوسری دلیل کیوں بیان کرنا شروع کردی۔

**جوابِ اوّل:** حضرت ابراہیمؑ نے دیکھا کہ میرا مدِّ مقابل احیاء اور اماتت کا وہ معنی سمجھنے سے قاصر ہے' جس کی نسبت انہوں نے اللہ تعالیٰ کی طرف کی تھی' اس لئے تو نمرود نے عجیب طرح اس کی مخالفت کی' اور دو معنوں کا مختلف ہونا اس سے مخفی رہا۔

جوابِ ثانی: پہلی حجت سے عدول کی وجہ یہ تھی کہ ابراہیمؑ کو چونکہ یہ معلوم ہوگیا تھا کہ نمرود نے میری حجت سمجھ لی ہے لیکن وہ اپنے پیروکاروں اور حاشیہ نشینوں کے سامنے اس حجت کو ملتبس کرنا چاہتا ہے اور حقائق کی پردہ پوشی کا ارادہ رکھتا ہے اس لئے انہوں نے ایک ایسی ظاہر اور واضح چیز کی طرف عدول کیا جسے ہر شخص سمجھ سکتا تھا اور جس کے سمجھنے میں کسی کو التباس یا اشتباہ نہیں ہو سکتا تھا۔

سوال: اللہ تعالیٰ نے نمرود کے دل پر کیسے مہر لگادی کہ وہ پھر سورج کو مغرب سے طلوع کرنے کے سلسلہ میں حضرت ابراہیمؑ کا معارضہ نہ کرسکا؟

جوابِ اوّل: اگر وہ اس کا معارضہ کرتا بھی تو اللہ تعالیٰ سورج کو مغرب سے طلوع نہ فرماتے' اس لئے کہ سورج کا مغرب سے طلوع ہونا علاماتِ قیامت میں سے ہے جو علامت قیامت کے بالکل قریب ظاہر ہوگی۔

جوابِ ثانی: نمرود اور اس کے متبعین بھی اس بات کو جانتے تھے کہ سورج کا مشرق سے طلوع ہونا خود اس کی پیدائش پر مقدم ہے اگر وہ بالفرض اس کا دعویٰ کرتا تو وہ سب اس کی تکذیب کر دیتے۔

سوال: حضرت عزیرؑ نے نبی ہونے کے باوجود احیاء بعد الموت کو بعید خیال کرتے ہوئے کیسے فرمایا: "اَنّٰی یُحْیٖ هٰذِهِ اللّٰهُ بَعْدَ مَوْتِهَا" (اللہ تعالیٰ اس بستی کے مُردوں کو اس کے مرنے کے بعد کیسے زندہ کریں گے)۔ ایک پیغمبر پر تو ویران بستی کو اور اس کے رہنے والوں کو دوبارہ زندہ کرنے کی قدرتِ خداوندی مخفی نہیں ہوا کرتی؟

جوابِ اوّل: حضرت عزیرؑ نے یہ بات اللہ تعالیٰ کی عظیم قدرت کا انکار یا اس کے استبعاد کے طور پر نہیں فرمائی بلکہ اللہ تعالیٰ کی عظیم قدرت سے متعجب ہو کر یا کیفیت احیاء کی رؤیت کے طالب اور خواہشمند ہو کر فرمائی۔ اس لئے کہ "اَنّٰی" کیف' معنی میں بھی آتا ہے' امام مجاہدؒ سے منقول ہے کہ اس بستی کے پاس سے گزرنے والا کوئی کافر شخص تھا جسے بعث بعد الموت میں شک تھا' اگرچہ قولِ اول ہی زیادہ مشہور ہے۔

سوال: اللہ تعالیٰ نے ابراہیمؑ سے یہ کیسے فرمایا: "اَوَ لَمْ تُؤْمِنْ" (کیا تم ایمان نہیں لائے؟) حالانکہ اللہ تعالیٰ کو یہ بات معلوم تھی کہ ابراہیمؑ ایمان اور یقین کے لحاظ سے تمام لوگوں سے زیادہ مضبوط ہیں؟۔

جواب: مقصد یہ تھا کہ ابراہیمؑ وہ جواب دیں جس سے سامعین کو مُردوں کے زندہ کرنے کی درخواست سے ایک عظیم فائدہ حاصل ہو۔

سوال: یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ ایک نبی کا دل اللہ تعالیٰ کی قدرت علی الاحیاء پر مطمئن نہ ہوحتیٰ کہ ابراہیمؑ نے جواب میں کہا: ''وَلٰكِنْ لِّيَطْمَئِنَّ قَلْبِىْ'' (تا کہ میرا دل مطمئن ہو جائے) ابراہیمؑ کا دل تو اللہ تعالیٰ کی قدرت علی الاحیاء پر مطمئن تھا؟

جوابِ اول: مطلب یہ تھا کہ جیسے برہان اور دلیل سے انہیں اطمینان حاصل ہے اسی طرح آنکھوں سے مشاہدہ کر کے بھی دلی اطمینان حاصل ہو جائے۔

جوابِ ثانی: مطلب یہ ہے کہ تا کہ مجھے اس بات کا اطمینان ہو جائے کہ آپ نے مجھے اپنا خلیل بنالیا ہے۔

جوابِ ثالث: یعنی مجھے اپنے مستجاب الدعوات ہونے کا اطمینان حاصل ہو جائے۔ پہلی وجہ پر یہ اعتراض ہوسکتا ہے کہ آنکھوں سے مشاہدہ کر کے یقین میں کیسے اضافہ ہو جاتا جبکہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے مروی ہے کہ وہ فرماتے ہیں: اگر اللہ تعالیٰ حجاب کو ہٹادیں تو میرے یقین میں کوئی اضافہ نہیں ہوگا''۔ ابراہیمؑ کا مقام تو ان سے عظیم ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ حضرت علیؓ کی اس سے مراد مشاہدہ سے قبل اپنے یقین کی قوت ہے' حتیٰ کہ جو زیادتی (اضافہ) معاینہ سے انہیں حاصل ہوتی وہ بالکل معمولی اور غیر معتد بہ ہوتی۔

سوال: ''فَخُذْ اَرْبَعَةً مِّنَ الطَّيْرِ فَصُرْهُنَّ اِلَيْكَ'' (تو تم چار پرندے لو پھر ان کو (پال کر) اپنے لئے ہلالو) یہاں لفظ ''فَخُذْ'' (چار پرندے لے لو) کافی تھا' مزید ''فَصُرْهُنَّ'' کہنے میں کیا نکتہ ہے؟

جواب: اس لفظِ ''فَصُرْهُنَّ'' کے ذکر کرنے میں فائدہ یہ ہے کہ وہ ان پرندوں کو اور ان کی شکلوں اور صفتوں کو اچھی طرح دیکھ لیں تا کہ احیاء کے بعد کہیں ان کو یہ وہم نہ ہو کہ یہ کوئی اور پرندے ہیں۔

سوال: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ''ثُمَّ لَا يُتْبِعُوْنَ مَآ اَنْفَقُوْا مَنًّا'' (پھر خرچ کرنے کے بعد احسان نہیں جتلاتے) اس آیت مبارکہ میں اللہ تعالیٰ نے احسان نہ جتانے پر متقین کی مدح فرمائی ہے' اور احسان سے منع بھی فرمایا ہے حالانکہ خود ذاتِ باری نے خود کو ''اَلْمَنَّان'' کے وصف کے ساتھ موصوف کیا ہے' ارشاد فرمایا: ''لَقَدْ مَنَّ اللّٰهُ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ'' (اللہ نے مومنوں پر احسان کیا ہے)؟

جواب: ''مَنَّ'' ''اَعْطٰى'' (دینا اور عطا کرنا) کے معنی میں ہے' اللہ تعالیٰ کی صفات میں جو ''مَنَّان'' کا ذکر آتا ہے اس کا بھی معنی ہے یعنی عطا کرنے والا' اور ''فَامْنُنْ اَوْ اَمْسِكْ'' اور ''لَقَدْ مَنَّ اللّٰهُ

عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ'' میں ''مَنّ'' انعام کے معنی میں ہے یعنی اللہ نے مومنوں پر انعام کیا ہے'' اور ''فَاِمَّا مَنًّا بَعْدُ'' کا مطلب ہے بغیر کسی عوض کے انعام کے طور پر رہا کرنا۔ اور ایک ''مَنّ'' کا معنی ہوتا ہے' کوئی نعمت کسی کو دے کر اس کو شمار کرنا' اس کا ذکر کرنا اور اس کو عظیم خیال کرنا' یہ مذموم ہے۔

سوال: اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد: ''بَلِ اللّٰهُ يَمُنُّ عَلَيْكُمْ اَنْ هَدٰاكُمْ لِلْاِيْمَانِ'' (بلکہ اللہ تم پر احسان رکھتا ہے کہ اس نے تم کو ایمان کی ہدایت دی) بظاہر اس ''مَنّ'' کا تعلق دوسری قسم سے ہے جو مذموم ہے؟۔

جواب: اس سے مراد نعمت ایمان کو شمار کرنا اور اس کو ذکر کرنا ہے' یہ مذموم یا قبیح نہیں ہے' بخلاف نعمت مال کے' اس کو شمار کرنا قبیح ہے۔ نیز اللہ تعالیٰ کی بعض صفات ایسی ہیں کہ جو خدا تعالیٰ کے حق میں تو قابل مدح ہیں مگر بندے کے حق میں باعث مذمت ہیں جیسے جبّار' متکبر اور منتقم وغیرہ۔

سوال: اللہ تعالیٰ نے پہلے تو فرمایا: '' اَيَوَدُّ اَحَدُكُمْ اَنْ تَكُوْنَ لَهٗ جَنَّةٌ مِّنْ نَّخِيْلٍ وَّاَعْنَابٍ'' (بھلا تم میں سے کسی کو یہ بات پسند ہے کہ اس کا ایک باغ ہو کھجوروں کا اور انگوروں کا) پھر فرمایا: ''لَهٗ فِيْهَا مِنْ كُلِّ الثَّمَرٰتِ'' (اس شخص کے لئے اس باغ میں ہر قسم کے میوے ہوں)۔

یعنی پہلے فرمایا کھجوروں اور انگوروں کا ایک باغ ہو پھر فرمایا اس میں ہر قسم کے میوے و پھل ہوں' دونوں کیسے جمع ہو سکتے ہیں؟۔

جواب: چونکہ کھجور کا درخت اور انگور کا درخت تمام درختوں میں زیادہ فضیلت رکھتے ہیں اور ان کے منافع بھی دوسرے درختوں کی بہ نسبت زیادہ ہیں اس لئے ان دونوں کو خاص طور پر ذکر کیا اور فرمایا کہ کھجوروں اور انگوروں کا ایک باغ ہو' اگرچہ اس باغ میں ان کھجوروں اور انگوروں کے علاوہ بھی دوسری قسم کے پھل اور میوے موجود ہیں مگر کھجوروں اور انگوروں کے درخت کو تغلیباً اور تفضیلاً ذکر فرما دیا۔

سوال: اللہ تعالیٰ کے اس فرمانِ ذی شان سے ''لَا يَسْئَلُوْنَ النَّاسَ اِلْحَافًا'' (وہ لوگوں سے لپٹ کر مانگتے نہیں پھرتے) بظاہر یہ مفہوم نکلتا ہے کہ وہ لپٹ کر لوگوں سے تو نہیں مانگتے تھے البتہ رفق اور نرمی سے مانگتے ہوں گے تو پھر ان کے حق میں یہ کیسے فرمایا: '' يَحْسَبُهُمُ الْجَاهِلُ اَغْنِيَآءَ مِنَ التَّعَفُّفِ'' (ناواقف ان کو دولتمند خیال کرتا ہے ان کے سوال سے بچنے کے سبب سے)؟

جواب: یہاں سوال (مانگنا) اور الحاف (لپٹ کر مانگنا) دونوں کی نفی مقصود ہے' جیسا کہ اللہ تعالیٰ

کا یہ ارشادِ مبارک ہے: ''لَا ذَلُوْلٌ تُثِيْرُ الْاَرْضَ'' (وہ نہ ہل میں چلا ہوا ہو جس سے زمین جوتی جائے)

سوال: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ''اَلَّذِيْنَ يَاْكُلُوْنَ الرِّبٰو'' (جو لوگ سود کھاتے ہیں) کیا وجہ ہے کہ یہاں سود پر وعید اور عذاب کو صرف سود کھانے کے ساتھ خاص کیا گیا ہے حالانکہ سودی لباس پہننے والا، سود کو ذخیرہ کرنے والا اور سودی مال کا ہبہ کرنے والا سب اس گناہ میں برابر ہیں؟

جواب: چونکہ مالی انتفاع سے مقصود زیادہ تر اس کا کھانا ہی ہوتا ہے جس سے کوئی استغنا نہیں ہوسکتا اس لئے انتفاع کی اقسام کو کھانے سے تعبیر فرمایا، جیسے کہا جاتا ہے: 'اکل فلان ماله کله'' جب وہ اپنے مال کو کھانے کے مصالح میں صرف کرے۔

سوال: اس کی کیا وجہ ہے کہ سود کھانے والے کے لئے وعید کو خاص کیا گیا ہے حالانکہ سود کھانے والا اور کھلانے والا دونوں گنہگار ہیں؟

جواب: اس لئے کہ سود کھانے والا کا ربا سے انتفاع سود کھلانے والے کے انتفاع سے زیادہ ہے۔

سوال: اللہ تعالیٰ کے اس ارشادِ عالی کا کیا مطلب ہے: ''اِنَّمَا الْبَيْعُ مِثْلُ الرِّبٰو'' (بیع بھی تو مثل سود کے ہے) یہاں کلام تو ربا کے بارے میں ہے، اور ان مشرکین کا مقصود تو ربا کو بیع کے ساتھ تشبیہ دینا ہے، اس لحاظ سے ہونا یوں چاہئے ''انما الربا مثل البیع'' یعنی جیسے بیع حلال ہے اسی طرح ربا بھی حلال ہے؟

جواب: یہ تشبیہ اور تمثیل بطورِ مبالغہ کے ہے۔ کیونکہ مشرکین کے اعتقاد میں ربا حلال تھا اور وہ ربا کو حلت میں اصل اور بیع کو فرع قرار دیتے تھے۔ جیسے کہا جاتا ہے: القمر کوجہ زید یعنی چاند زید کے چہرہ کی مانند ہے'' والبحر ککفہ''۔ اور دریا اس کی ہتھیلی کی طرح ہے یہ اس وقت کہتے ہیں جب کسی چیز کو مبالغہ کے طور پر بیان کرنا مقصود ہوتا ہے۔

سوال: ارشادِ باری ہے ''وَمَنْ عَادَ فَاُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ'' (اور جو شخص پھر عود کرے تو یہ لوگ دوزخ میں جائیں گے اور اس میں ہمیشہ رہیں گے) اس آیت سے تو معلوم ہوتا ہے کہ سود کھانے والے لوگ دوزخ میں ہمیشہ رہیں گے، پھر آپ یہ کیسے کہتے ہیں کہ کبیرہ گناہ کا مرتکب مخلّوا فی النار (ہمیشہ دوزخ میں) نہ ہوگا؟

جوابِ اوّل: ''خلود'' کا لفظ طولِ بقاء کے معنیٰ میں استعمال ہوتا ہے، اگرچہ وہ طولِ بقاء تابید کی صفت کے ساتھ نہ ہو۔ جیسے جب امیر کسی کو طویل مدت تک محبوس رکھے تو کہتے ہیں: ''خلد الأمیر فلانا فی الحبس۔

جوابِ ثانی: ''فَاُولٰئِکَ'' سے یہ اشارہ ملتا ہے کہ آیتِ تحریم کے نازل ہونے کے بعد بھی جو شخص کہے: ''اِنَّمَا الْبَیْعُ مِثْلُ الرِّبٰو'' یعنی بیع سود کے مثل ہے اور ربا کو حلال سمجھے تو وہ کافر ہو جائے گا اور ظاہر ہے کہ کافر مخلّد فی النار ہوگا۔

سوال: تنگ دست کو مہلت دینا فرض ہے جس کا ثبوت نص سے ہے اور اس پر صدقہ وخیرات کرنا تطوع (نفل) ہے لہٰذا یہ کیسے فرمایا ''وَاَنْ تَصَدَّقُوْا خَیْرٌ لَّکُمْ'' (اور یہ کہ خیرات کرو تو بہتر ہے تمہارے لئے)؟

جواب: ہر وہ تطوع جس میں وصفِ زیادت کے ساتھ اصل فرض بھی حاصل ہو وہ فرض سے افضل ہے جیسے حرام سے اجتناب فرض ہے اور حلال سے بے رغبتی تطوع ہے اسی طرح یہاں پر بھی ہے۔

سوال: ''اِذَا تَدَایَنْتُم بدَیْنٍ'' (جب تم معاملہ کرو ادھار کا) یہاں ''بِدَیْنٍ'' کے لفظ کا کیا فائدہ ہے حالانکہ ''تَدَایَنْتُم'' کے لفظ کے بعد اس کی ضرورت نہیں رہتی؟

جوابِ اوّل: اس کا فائدہ یہ ہے کہ ''فَاکْتُبُوْہُ'' کی ضمیر (ہُ) اس ''بِدَیْنٍ'' کی طرف راجع ہو جائے۔ اس لئے کہ اگر ''بِدَیْنٍ'' کا لفظ ذکر نہ فرماتے تو یوں کہنا پڑتا: ''فاکتبوا الدین'' جب کہ پہلی صورت نظم کے لحاظ سے احسن ہے۔

جوابِ ثانی: اصل میں ''تَدَایَن'' کا لفظ مشترک ہے ادھار بیع اور جزا سب اس کے معانی آتے ہیں۔ ''دَیْن'' دال کے فتح کے ساتھ بمعنی قرض اور دال کے کسرہ کے ساتھ بمعنی جزا ہے اس لئے ''بِدَیْنٍ'' کا لفظ لائے تاکہ امتیاز ہو جائے۔ جیسے ارشادِ باری تعالیٰ ہے: ''مَالِکِ یَوْمِ الدِّیْنِ'' یعنی جزا کے دن کا مالک۔ چنانچہ ''بِدَیْنٍ'' سے مرادی معنی متعین ہو گیا۔

سوال: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ''وَاِنْ کُنْتُمْ عَلٰی سَفَرٍ'' (اگر تم کہیں سفر میں ہو) رہن کیلئے سفر کی شرط کیسے لگائی جبکہ رہن کا جواز سفر کے ساتھ خاص نہیں ہے؟

جواب: سفر کا ذکر تخصیصِ حکم کے لئے نہیں ہے بلکہ سفر کا ذکر اس لئے کیا گیا کہ سفر میں چونکہ قابلِ اعتماد قسم کے کاتب اور شاہد کا دستیاب ہونا یقینی نہیں ہوتا اس لئے علیٰ سبیل الارشاد مسافروں کے مال کی حفاظت کے لئے رہن رکھنے کا امر فرمایا گیا۔

سوال: ''فَاِنَّہٗ اٰثِمٌ قَلْبُہٗ'' (پس اس کا قلب گنہگار ہوگا) میں قلب کو ذکر کرنے میں کیا نکتہ ہے حالانکہ صرف قلب ہی نہیں بلکہ پورا جملہ گناہ کے ساتھ موصوف ہے؟

جواب: کتمانِ شہادت کہتے ہیں گواہی کو ضمیر میں رکھنا (چھپانا) اور اسے زبان پر نہ لانا اب

چونکہ یہ ایسا گناہ ہے جو قلب کے ساتھ مقترن ہے اور قلب سے متعلق ہے اس لئے گناہ کی نسبت قلب کی طرف کر دی گئی۔ کیونکہ جس عضو کا عمل میں اصل تعلق ہو اس کی طرف کسی فعل کی اسناد زیادہ بلیغ ہوتی ہے۔ جیسے کہا جاتا ہے: ''ھذا ما ابصرته عینی، وسمعته اذنی و وعاہ قلبی''

سوال: ''وَاِنْ تُبْدُوْا مَا فِیْٓ اَنْفُسِکُمْ اَوْ تُخْفُوْہُ یُحَاسِبْکُمْ بِہِ اللّٰہُ'' (اور جو باتیں تمہارے نفسوں میں ہیں ان کو اگر تم ظاہر کرو گے یا پوشیدہ رکھو گے حق تعالیٰ تم سے حساب لیں گے)۔ اس آیت سے تو معلوم ہوتا ہے کہ انسان کے دل میں جو خیالات آتے ہیں اس پر بھی اس کا مؤاخذہ اور محاسبہ ہوگا۔ حالانکہ جب تک انسان اپنے عمل کے ذریعہ اس کا ارتکاب نہ کر لے گنہگار نہیں ہوتا یا تو اس وجہ سے کہ وساوس سے بچنا اس کی وسعت و طاقت سے باہر ہے یا اس حدیث مشہور کی وجہ سے جو اس بارے میں وارد ہے۔؟

جوابِ اوّل: بعض علماء کہتے ہیں کہ آیتِ مذکورہ سے عموم ہی مراد ہے، مگر پھر یہ حکم اس فرمانِ باری سے منسوخ ہو گیا: ''لَا یُکَلِّفُ اللّٰہُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَھَا'' (اللہ تعالیٰ کسی شخص کو مکلف نہیں بناتا مگر اسی کا جو اس کی طاقت اور اختیار میں ہو)۔

جوابِ ثانی: بعض کہتے ہیں کہ یہ حکم اپنی جگہ باقی ہے۔ منسوخ نہیں ہوا اس لئے کہ یہ چیز ہے نہ کہ امر و نہی۔ البتہ عموم مراد نہیں ہے بلکہ اس سے مراد وہ چیز ہے جس سے بچنا انسان کے لئے ممکن ہو اور وہ ہے اعتقادِ جازم اور عزمِ قاطع، محض حدیث النفس اور وسوسہ مراد نہیں ہے (کیونکہ اس سے بچنا ناممکن ہے)، پھر یہ بات بھی قابلِ ملاحظہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے محاسبہ کا ذکر فرمایا ہے، معاقبہ کا ذکر نہیں فرمایا، تو مطلب یہ ہوا کہ اللہ تعالیٰ قیامت کے روز اپنا علمی احاطہ بتانے کے لئے بندوں کو ان کی وہ تمام باتیں جو انہوں نے ظاہر کی تھیں یا پوشیدہ رکھی تھیں بتلا دیں گے، پھر جس کی چاہیں گے فضل فرماتے ہوئے مغفرت فرمائیں گے۔ اور جس کو چاہیں گے عدل کرتے ہوئے عذاب دیں گے۔ جیسا کہ اگلی آیاتِ مبارکہ میں اس کی خبر دی گئی ہے۔

سوال: فرمانِ باری تعالیٰ: ''اٰمَنَ الرَّسُوْلُ'' (ایمان رکھتے ہیں رسول) رسولِ پاک ﷺ کی مدح ایمان کے ساتھ بیان فرمائی گئی، حالانکہ آپ تو رسالت کے مقام و مرتبہ پر فائز ہیں، اس رسالت کا درجہ ایمان کے مرتبہ سے اعلیٰ ہے، اس ارشادِ عالی ''اٰمَنَ الرَّسُوْلُ'' میں کیا فائدہ اور نکتہ ہے؟

جواب: مقصد مومنین کو یہ بتانا ہے کہ ایمان کا شرف و رتبہ بہت زیادہ ہے یعنی ایمان کا مقام بہت اعلیٰ ہے، اسی لئے تو اللہ تعالیٰ نے اپنے خواص اور انبیاء و رسل کی مدح ایمان کے وصف کے ساتھ فرمائی ہے۔ جیسے سورۃ الصافات میں ... کے تذکرہ فرمانے کے بعد آخر میں فرمایا گیا: ''اِنَّہٗ مِنْ

عِبَادِنَا الْمُؤْمِنِیْنَ ''(بے شک وہ ہمارے ایماندار بندوں میں سے تھے)۔
سوال: ابن عباسؓ سے مروی ہے کہ انہوں نے اس کو یوں پڑھا: ''وَمَلٰئِکَتِہٖ وَکُتُبِہٖ'' (اور اس کے فرشتوں کے ساتھ اور اس کی کتاب کے ساتھ) یعنی ''کتاب'' مفرد پڑھا۔ جمع کے ساتھ ''کُتُب'' نہیں پڑھا' اور پھر جب اس کی وجہ ان سے پوچھی گئی تو انہوں نے فرمایا: کتاب' کتب سے اکثر ہے' اس کی کیا وجہ ہے۔؟
جواب: ان کی مراد کتاب سے جنسِ کتاب تھی' اور کتب جمع ہے' اور جنس' جمع سے اکثر ہوتی ہے' کیونکہ وہ حقیقت میں کل کے معنی میں ہوتی ہے۔ اس پر یہ اعتراض ہوسکتا ہے کہ جمع مضاف اور مفرد مضاف میں کلام عرفاً اور شرعاً استغراق کے لئے ہوتا ہے' جیسے کسی کا اپنے غلام کے لئے کہنا: ''اکرم أصدقائی' واھن أعدائی'' یا یہ کہنا: ''زوجاتی طوالق یا عبیدی أحرار۔''۔ بخلاف اس قول کے: ''صدیقی وعدوی وعبدی وامرأتی'' اس سے معلوم ہوا کہ جمع مضاف' مفرد مضاف سے اکثر ہوتا ہے۔
سوال: ''لَا نُفَرِّقُ بَیْنَ اَحَدٍ مِنْ رُّسُلِہٖ'' (ہم اس کے سب پیغمبروں میں سے کسی میں تفریق نہیں کرتے)۔ یہاں پر ''بَیْنَ'' کا لفظ ''اَحَدُ'' کی جانب مضاف کرکے استعمال کیا گیا' حالانکہ ''بَیْنَ'' کا لفظ دو یا دو سے زیادہ چیزوں کی طرف ہی مضاف ہوتا ہے' پھر یہاں کیسے فرمایا گیا: ''لَا نُفَرِّقُ بَیْنَ أَحَدٍ مِنْ رُّسُلِہٖ''۔
جواب اوّل: یہاں احد جمع کے معنی میں یعنی اَحاد جیسے فَمَا مِنْکُمْ مِّنْ أَحَدٍ عَنْہُ حَاجِزِیْنَ'' میں ''اَحَد'' بمعنی جمع ہے' جس کی دلیل لفظ ''حَاجِزِیْنَ'' ہے' گویا یوں فرمایا: ''لَا نُفَرِّقُ بَیْنَ أَحَادٍ مِنْ رُسُلِہٖ''۔ جیسے کہتے ہیں: ''المال بین اَحاد النّاس''۔
جوابِ ثانی: لفظ ''اَحَد' مفرد مذکر' مفرد مؤنث' تثنیہ مذکر و تثنیہ مؤنث اور جمع مذکر اور جمع مؤنث سب کی صلاحیت رکھتا ہے' خواہ کلام منفی ہو یا مثبت۔
جیسے: ''ما رأیت أحدا الا بنی فلان یا الابنات فلان'' یہ دونوں برابر ہیں۔
نیز جیسے: ''ان جاء ک احد بکتابی فاعطہ ودیعتی'' اب اس میں سارے برابر ہیں۔
خلاصہ یہ ہوا کہ آیتِ ہذا کا معنی یہ ہے کہ ہم پیغمبروں میں تفریق نہیں کرتے خواہ وہ دو ہوں یا جماعت ہو اور ''لَسْتُنَّ کَأَحَدٍ'' کے فرمان میں بھی 'اَحَد'' کا اسی سے تعلق ہے۔
سوال: ''لَھَا مَا کَسَبَتْ وَعَلَیْھَا مَا اکْتَسَبَتْ'' (اس کو ثواب بھی اسی کا ملے گا جو ارادہ سے کرے اور اس پر عذاب بھی اسی کا ہوگا جو ارادہ سے کرے) اس فرمان میں اس بات پر کیا دلیل ہے

کہ اوّل: ''لَهَا مَا كَسَبَتْ'' کا تعلق خیر سے ہے اور ثانی ''عَلَيْهَا مَا اكْتَسَبَتْ'' کا شر سے ہے؟

جوابِ اوّل: بعض کہتے ہیں کہ ''مَنْ كَسَبَتْ'' وَاكْتَسَبَتْ'' کے معنی میں ہے اول خیر کے لئے اور ثانی شر کے لئے ہے۔ مگر غور کیا جائے تو یہ اس کے لئے دلیل نہیں ہے۔ اس لئے کہ ان آیاتِ مبارکہ میں بھی ''کسب'' کا لفظ اس کے خلاف استعمال ہوا ہے: ''وَمَنْ يَّكْسِبْ خَطِيْئَةً اَوْ اِثْمًا'' نیز ارشاد ہے: ''كُلُّ نَفْسٍ بِمَا كَسَبَتْ رَهِيْنَةٌ'' نیز فرمایا: ''اَوْ يُوْبِقْهُنَّ بِمَا كَسَبُوْا'' نیز فرمایا: ''وَمَنْ يَّقْتَرِفْ حَسَنَةً'' یہاں اکتساب اور اقتراف کا ایک ہی معنی ہے (اس لئے یہ جواب ناقص ہے)۔

جوابِ ثانی: یہاں پر خیر اور شر پر دلیل لام اور علی کا کلمہ ہے' مگر دیکھا جائے تو یہ بھی دلیل نہیں ہے' کیوں کہ ان آیاتِ قرآنیہ میں لام اور علی کا لفظ اس کے خلاف استعمال ہوا ہے: ''اُولٰئِكَ لَهُمُ اللَّعْنَةُ وَلَهُمْ سُوْءُ الدَّارِ'' نیز ''اِنْ اَحْسَنْتُمْ اَحْسَنْتُمْ لِاَنْفُسِكُمْ وَاِنْ اَسَأْتُمْ فَلَهَا'' نیز فرمایا: ''اُولٰئِكَ عَلَيْهِمْ صَلَوَاتٌ مِّنْ رَّبِّهِمْ وَرَحْمَةٌ''۔

جوابِ ثالث: لام اور علیٰ کا کلمہ اطلاق کی صورت میں معنی خیر وشر کا مقتضی ہوتا ہے اور لام کا کلمہ خیر کے لئے اور علیٰ کا کلمہ شر کے لئے اس وقت استعمال ہوتا ہے جب وہ دونوں متقارب ہوں جیسے اس آیتِ مذکورہ میں متقارب ہیں ''لَهَا مَا كَسَبَتْ وَعَلَيْهَا مَا اكْتَسَبَتْ'' اس کی دلیل یہ فرمانِ باری ہے ''وَلَا تَكْسِبُ كُلُّ نَفْسٍ اِلَّا عَلَيْهَا''۔ یہاں اس کو مطلق رکھا اور اس سے مراد شر ہے اور مابعد جملہ اس کی دلیل ہے۔ جیسے کہتے ہیں: ''الدهر يومان' يوم لک ويوم عليک '' یعنی زمانہ دو دن کا ہے' ایک دن تیرے حق میں اور ایک دن تیرے خلاف میں' نیز جیسے اہلِ عرب کہتے ہیں: ''فلان يشهد لک وفلان يشهد عليک'' یعنی فلان شخص تیرے حق میں اور فلان تیرے خلاف گواہی دیتا ہے۔ اسی طرح ایک آدمی اپنے صاحب سے کہتا ہے: ''هذا الكلام حجة عليک لا لک۔'' یعنی یہ کلام تیرے خلاف حجت ہے نہ کہ تیرے حق میں۔ ایک شاعر کہتا ہے۔

عَلٰى اَنَّنِيْ رَاضٍ بِاَنْ اَحْمِلَ الْهَوٰى ☆ وَاَخْلُصَ مِنْهُ لَا عَلَيَّ وَلَا لِيَا

یعنی میں اس شرط پر عشق برداشت کرنے یا اس سے چھٹکارا پانے پر راضی ہوں کہ نہ وہ میرے لئے سودمند ہو اور نہ میرے نقصان دہ۔ اور اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان: ''مَنْ عَمِلَ صَالِحًا فَلِنَفْسِهٖ وَمَنْ اَسَاءَ فَعَلَيْهَا'' اگرچہ مقید ہے لیکن یہاں لام اور علی کی وجہ سے اس پر دلالت موجود ہے اس لئے کہ یہاں قیدِ ظرفیت کو شامل ہے۔

# سورۃ آل عمران

سوال: قرآنِ مجید کے بارے میں فرمایا: ''نَزَّلَ عَلَیۡکَ الۡکِتٰبَ بِالۡحَقِّ'' (اتاری اوپر تیرے کتاب حق کے ساتھ) اور تورات وانجیل کے بارے میں یوں فرمایا: ''وَاَنۡزَلَ التَّوۡرٰاۃَ وَالۡاِنۡجِیۡلَ'' (اور تورات وانجیل اتاری) یعنی قرآن کے متعلق لفظ ''نَزَّلَ'' اور تورات وانجیل کے لئے ''اَنۡزَلَ'' کا لفظ ذکر کیا' اس کی کیا وجہ ہے؟۔

جوابِ اوّل: امام زمخشریؒ وغیرہ نے اس کا جواب یہ دیا ہے کہ قرآن تھوڑا تھوڑا کر کے اتارا گیا اور تورات وانجیل ایک ہی دفعہ نازل ہوئیں' اس لئے قرآن کے لئے ''نَزَّلَ'' کا لفظ اور دوسری کتابوں کے لئے ''اَنۡزَلَ'' کا لفظ استعمال کیا گیا ہے۔ مگر اس کے بعد جو فرمانِ باری آتا ہے: ''وَاَنۡزَلَ الۡفُرۡقَانَ'' اس سے اس جواب پر اعتراض ہوتا ہے تو اس کے جواب میں امام زمخشریؒ فرماتے ہیں کہ اس سے جنسِ کتب سماویہ مراد ہے' مذکورہ کتب ثلاثہ خصوصی طور پر مراد نہیں ہیں' یا اس کتاب سے زبور مراد ہے یا اس سے مراد قرآن ہے' اور پھر اس کا مکرر ذکر تعظیم کے لئے ہے' مگر اس کے بعد والی آیت سے اس پر اعتراض ہوسکتا ہے یعنی ''هُوَ الَّذِیۡۤ اَنۡزَلَ عَلَیۡکَ الۡکِتٰبَ'' نیز ان آیاتِ کریمہ سے بھی اعتراض ہوسکتا ہے' فرمایا: ''وَالَّذِیۡنَ یُؤۡمِنُوۡنَ بِمَاۤ اُنۡزِلَ اِلَیۡکَ وَمَاۤ اُنۡزِلَ مِنۡ قَبۡلِکَ'' نیز ارشادِ باری ہے: ''وَقَالَ الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا لَوۡلَا نُزِّلَ عَلَیۡهِ الۡقُرۡاٰنُ جُمۡلَةً وَّاحِدَةً''

جوابِ ثانی: ''نَزَّلَ'' میں تضعیف اور ''اَنۡزَلَ'' میں ہمزہ دونوں تعدیہ کے لئے ہیں' اس لئے کہ نزل فعل لازم بنفسہ ہے' اور جب یہ دونوں تعدیہ کے لئے ہوں تو کسی اور معنی کے لئے نہیں ہوں گے جیسے تکثیر وغیرہ' کیونکہ اس کی کوئی نظیر نہیں ہے' دونوں کو لائے ہیں' معنی ایک ہی ہے یعنی تعدیہ۔ جیسا کہ اہلِ عرب کی عادت ہے کہ وہ کلام کو مختلف طریقوں سے لایا کرتے ہیں۔ اس جواب کی تائید اللہ تعالیٰ کے اس فرمانِ عالی سے ہوتی ہے' ارشاد ہے: ''لَوۡلَا نُزِّلَ عَلَیۡهِ اٰیَةٌ مِّنۡ رَّبِّهٖ'' اور ایک اور جگہ ارشاد ہے: ''لَوۡلَاۤ اُنۡزِلَ عَلَیۡهِ اٰیَةٌ مِّنۡ رَّبِّهٖ''

سوال: یہاں ''مِنۡ'' تبعیضیہ کے ساتھ فرمایا: ''مِنۡهُ اٰیٰتٌ مُّحۡکَمٰتٌ'' (اس کی بعض آیتیں محکم ہیں) اور دوسری جگہ فرمایا: ''کِتٰبٌ اُحۡکِمَتۡ اٰیٰتُهٗ'' (یہ ایک ایسی کتاب ہے جس کی آیتیں محکم ہے) اس سے تو معلوم ہوتا ہے کہ قرآن کی تمام آیات محکم ہیں۔؟

جوابِ اوّل: یہاں ''مِنۡهُ اٰیٰتٌ مُّحۡکَمٰتٌ'' میں ''مُحۡکَمٰتٌ'' سے مراد ''نَاسِخَاتٌ'' (منسوخ

کرنے والی) ہے اور ''مُتَشَابِهٰتٌ'' سے مراد ''مَنْسُوخَاتٌ'' (منسوخ شدہ آیتیں) ہے۔
''مُحْکَمٰتٌ'' سے مراد عقلیات ہے اور ''مُتَشَبِهَاتٌ'' سے مراد شرعیات ہے۔
جوابِ ثالث: ''مُحْکَمٰتٌ'' سے مراد ہے جن آیتوں کا معنی واضح ہو اور ''مُتَشَابِهٰتٌ'' سے مراد وہ آیتیں ہیں جن کا معنی غیر واضح اور دقیق ہو اور ''کِتٰبٌ اُحْکِمَتْ اٰیٰتُه'' سے مراد یہ ہے کہ سارا قرآن پاک صحیح اور ثابت (مضبوط) ہے اور ہر طرح کے خلل اور زلل سے مصون و محفوظ ہے۔ لہٰذا ان میں کوئی منافات نہیں ہے۔
سوال: یہاں ارشاد فرمایا: ''وَاُخَرُ مُتَشَابِهٰتٌ'' (اور بعض آیتیں مشتبہ المراد ہیں) اور دوسری جگہ میں فرمایا: ''کِتَابًا مُتَشَابِهًا'' (متشابہ کتاب) پہلی آیت میں کتاب کے بعض حصہ کو متشابہ قرار دیا اور دوسری آیت میں سارے قرآن کو متشابہ فرمایا جارہا ہے' وجہ تطبیق کیا ہوگی؟۔
جواب: دونوں آیتوں میں کوئی منافات نہیں ہے' اس لئے کہ ''وَاُخَرُ مُتَشَابِهٰتٌ'' سے مراد وہی ہے جس کا ابھی اوپر ذکر گزرا' اور ''کِتَابًا مُتَشَابِهًا'' سے مراد یہ کہ کتاب حکیم کا بعض حصہ صحت اور عدمِ تناقض میں اس کے بعض حصہ کے مشابہ ہے اور ایک حصہ اس کے دوسرے حصہ کی تائید کرتا ہے۔
سوال: پھر ''مُتَشَابِهٰتٌ'' (غیر واضح المراد آیتیں) کے نازل کرنے کا کیا فائدہ ہے۔ حالانکہ نزولِ قرآن سے مقصود بیان و ہدایت ہے' معانی کا غیر واضح ہونا اس مقصود کے منافی ہے یا اس کو بعید کر دیتا ہے؟
جواب: اصل میں کلامِ عرب دو طرح کا ہوتا ہے کلام کی ایک قسم ایسی ہے جس کا معنی جلدی سمجھ میں آجاتا ہے اور وہ ظاہری معنی کے علاوہ کسی اور کا محتمل بھی نہیں ہوتا اور دوسری قسم وہ ہے جو کنایہ' مجاز' تلویح اور اشارہ پر مشتمل ہوتی ہے' اور اس کے معانی متعارض اور متزاحم ہوتے ہیں۔ کلامِ عرب میں یہ قسمِ ثانی زیادہ مستحسن اور مستبدع (عمدہ) شمار ہوتی ہے' قرآنِ حکیم بھی معنی اعجاز کے ثبوت کے لئے ان دونوں قسموں میں نازل ہوا' گویا یوں فرمایا گیا کہ آؤ اس قرآن کا معارضہ کرو' جس نوع سے بھی معارضہ کرنا چاہو معارضہ کرو کیونکہ یہ دونوں انواع کو جامع ہے۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن کو محکم اور متشابہ دونوں طرح نازل کیا تاکہ دیکھا جائے اور آزمایا جائے کہ کون سارے قرآن پر ایمان لاتا ہے اور مشتبہ المراد آیتوں کو سپرد بعلمِ خداوندی کرتا ہے کہ پھر وہ ذات اس کو اس پر اجر و ثواب عطا کرے اور کون اس میں ریب و شک کر کے منافقت کا کردار ادا کرتا ہے کہ پھر اس کو سزا دی جائے۔ جیسے اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کی نہر طالوت وغیرہ کے ذریعہ آزمائش کی تھی۔

جوابِ ثانی: متشابہات کے نزول سے مقصد یہ ہے کہ کہ علماء بحث واستدلال اور نظر واجتہاد کر کے اس متشابہ کو محکم کی طرف لوٹائیں تا کہ اس عبادت پر انہیں جزا دی جائے اور اجر وثواب سے نوازا جائے۔ اگر سارا قرآن ظاہر المراد اور واضح المعانی ہوتا تو پھر اس میں عالم اور جاہل سارے برابر ہو جاتے۔ اور بحث واستنباط نہ ہونے کی وجہ سے افکار معدوم ہو جائیں' کیونکہ نظر و فکر سے ہی مشکل امور حل ہوتے ہیں۔ اسی لئے کسی حکیم و دانا شخص کا قول ہے: مالداری کا عیب یہ ہے کہ وہ کند ذہنی کو پیدا کرتی ہے اور فکر کو معدوم کرتی ہے اور ناداری کی خوبی یہ ہے کہ وہ ذہن وفکر کو استعمال میں لانے اور کسب و معاش میں تدبیروں کے اختیار کرنے پر آمادہ کرتی ہے۔

سوال: اللہ تعالیٰ کے اس ارشادِ مبارک کا کیا مطلب ہے: ''وَاُخْرٰی کَافِرَۃٌ یَّرَوْنَھُمْ مِّثْلَیْھِمْ رَاْیَ الْعَیْنِ '' (اور یہ کافر اپنے کو دیکھ رہے تھے کہ ان مسلمانوں سے کئی حصہ (زیادہ) ہیں کھلی آنکھوں دیکھنا) اس آیت سے تو معلوم ہوتا ہے کہ کافر گروہ مسلمانوں کو اپنے سے دگنا دیکھتے تھے یا اختلافِ قولین کی بناء پر مسلمان ان کافروں کو اپنے سے دگنا دیکھتا تھے' بہر کیف! یہ آیتِ مبارکہ سورۃ الانفال کی اس آیت کے منافی ہے: ''وَاِذْ یُرِیْکُمُوْھُمْ اِذِ الْتَقَیْتُمْ فِیْٓ اَعْیُنِکُمْ قَلِیْلًا وَّیُقَلِّلُکُمْ فِیْٓ اَعْیُنِھِمْ '' (اور جس وقت اللہ تعالیٰ تم کو جبکہ تم مقابل ہوئے وہ لوگ تمہاری نظر میں کم کر کے دکھا رہے تھے اور ان کی نگاہ میں تم کو کم کر کے دکھلا رہے تھے) اس لئے کہ یہ آیت اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ دونوں گروہ ایک دوسرے کو کم خیال کرنے میں مساوی تھے' یعنی ہر گروہ دوسرے کو کم ہی دیکھتا تھا؟

جوابِ اوّل: اصل میں تقلیل اور تکثیر (کم اور زیادہ دیکھنا) کا تعلق دو مختلف حالتوں سے ہے' اس کی تفصیل یہ ہے کہ پہلے تو اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کی نظر میں مشرکین کی تعداد کو کم کر کے دکھایا اور اسی طرح مشرکین کی نگاہ میں مسلمانوں کی تعداد کو قلیل کر کے دکھایا حتیٰ کہ جب دونوں گروہ لڑائی پر جری ہوئے اور دونوں کا آمنا سامنا ہوا تو پھر اللہ تعالیٰ نے مشرکین کی نظروں میں مسلمانوں کی تعداد زیادہ کر کے دکھلائی حتیٰ کہ وہ بزدل اور پست ہمت ہونے لگے اور مغلوب ہوئے اور مسلمانوں کی آنکھوں میں مشرکین کی تعداد کو بھی زیادہ یا اپنے برابر کر کے دکھایا۔ مشرکین فی الحقیقت مسلمانوں سے زیادہ تھے' اس سے مقصد یہ تھا کہ مسلمانوں کو اللہ تعالیٰ کے وعدہ کی سچائی معلوم ہو جائے' اس لئے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ''فَاِنْ یَّکُنْ مِّنْکُمْ مِّائَۃٌ صَابِرَۃٌ یَّغْلِبُوْا مِائَتَیْنِ '' الآیۃ (سو اگر تم میں کے سو آدمی ثابت قدم رہنے والے ہونگے تو دو سو پر غالب آجائیں گے)' چنانچہ مسلمان اس غزوہ بدر میں مشرکین پر غالب آئے حالانکہ مشرکین کی تعداد مسلمانوں سے کئی

گنا تھی۔

**جوابِ ثانی:** بعض کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو مشرکین کی تعداد مسلمانوں کی تعداد کے برابر کر کے دکھائی' حالانکہ مشرکین ان سے تین گنا زیادہ تھے' لیکن اللہ نے مسلمانوں کی نگاہوں میں ان کو قلیل تعداد میں دکھایا اور مشرکین کو مسلمانوں کی تعداد اتنی دکھائی جتنی تعداد پر غالب آنے کا وعدہ پہلے فرمایا تھا کہ اگر تم میں سے سو آدمی بھی ثابت قدم رہنے والے ہوں گے تو ان کے دو سو آدمیوں پر غالب آئیں گے۔

**سوال:** ''شَہِدَ اللّٰہُ اَنَّہٗ لَآ اِلٰہَ اِلَّا ھُوَ لا وَالْمَلٰٓئِکَۃُ وَاُولُوا الْعِلْمِ قَآئِمًا بِالْقِسْطِ ط لَآ اِلٰہَ اِلَّا ھُوَ'' (گواہی دی اللہ نے اس کی کہ بجز اس ذات کے کوئی معبود ہونے کے لائق نہیں) اور فرشتوں نے بھی اور اہلِ علم نے بھی اور معبود بھی وہ اس شان کے ہیں کہ اعتدال کے ساتھ انتظام رکھنے والے ہیں ان کے سوا کوئی معبود ہونے کے لائق نہیں اس آیت میں ''لَآ اِلٰہَ اِلَّا ھُوَ'' کو مکرر کیوں ذکر کیا گیا' اس میں کیا فائدہ ہے؟

**جوابِ اوّل:** پہلا ''لَا اِلٰہَ اِلَّاھُوَ'' اللہ عزّ وجل کا قول ہے اور دوسرا ''لَآ اِلٰہَ اِلَّا ھُوَ'' فرشتوں اور اہلِ علم کے قول کو بیان کیا گیا ہے۔

**جوابِ ثانی:** حضرت جعفر الصادقؒ فرماتے ہیں کہ پہلے کلمہ وصف ہے اور دوسرا تعلیم کے لئے ہے یعنی تم بھی اسی طرح کہو اور گواہی دو جیسے انہوں نے گواہی دی ہے۔

**سوال:** اللہ تعالیٰ کے اس فرمانِ مبارک میں: ' اَلَمْ تَرَاِلَی الَّذِیْنَ اُوْتُوْا نَصِیْبًا مِنَ الْکِتٰبِ یُدْعَوْنَ اِلٰی کِتٰبِ اللّٰہِ لِیَحْکُمَ بَیْنَھُمْ ثُمَّ یَتَوَلّٰی فَرِیْقٌ مِّنْھُمْ وَھُمْ مُّعْرِضُوْنَ '' (اے محمدؐ) کیا آپ نے ایسے لوگ نہیں دیکھے جن کو کتاب (توراۃ) کا ایک (کافی) حصہ دیا گیا اور اُسی کتاب اللہ کی طرف اس غرض سے اُن کو بلایا بھی جاتا ہے اور ان کے درمیان فیصلہ کر دے پھر (بھی) ان میں سے بعض لوگ انحراف کرتے ہیں بے رخی کرتے ہیں)' وَھُمْ مُّعْرِضُوْنَ '' (اور وہ بے رخی کرتے ہیں) کے ذکر کرنے کا کیا فائدہ ہے؟ حالانکہ تولّی اور اعراض کا ایک ہی معنی ہے جیسا کہ سورۃ البقرۃ میں گزر چکا ہے' آخر ان دونوں لفظوں کو لانے کی کیا وجہ ہے؟

**جوابِ اوّل:** ''یَتَوَلّٰی'' کا معنی ہے دعوت دینے والے سے انحراف کرتے ہیں اور ''مُعْرِضُوْنَ'' کا معنی ہے کہ وہ داعی جس چیز کی طرف ان کو دعوت دیتا ہے وہ اس سے بے رخی کرتے ہیں۔ یعنی کتاب اللہ سے۔

**جوابِ ثانی:** ''یَتَوَلّٰی'' کا مطلب ہے کہ ان کے ابدان ان سے انحراف کرتے ہیں اور

مُعْرِضُوْن'' کا معنی ہے کہ ان کے قلوب حق بات سے اعراض کرتے ہیں۔

جوابِ ثالث: ''ہُوَلٰی'' سے مراد ان کے علماء کا انحراف (عن الحق) ہے اور ''مُعْرِضُوْن'' سے ان کے متبعین کا اعراض مراد ہے۔

سوال: اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد عالی میں 'بِیَدِکَ الْخَیْرُ'' (آپ ہی کے اختیار میں ہے سب بھلائی) خیر کی تخصیص کی کیا وجہ ہے۔ حالانکہ خیر وشر اور نفع ونقصان سب اللہ تعالیٰ کے اختیار اور قبضہ میں ہیں؟

جوابِ اوّل: یہ کلام اصل میں مشرکین کی تردید میں لایا گیا ہے کیونکہ مشرکین اللہ تعالیٰ کے اس وعدہ کے منکر تھے جو اس نے بزبانِ جبریلؑ اپنے نبی علیہ السلام سے روم وفارس کی فتح کے بارے میں کیا تھا' اللہ تعالیٰ نے اس فتح کا وعدہ آپؐ کے صحابہؓ سے بھی کیا تھا۔ چونکہ اصل کلام خیر سے متعلق تھا اس لئے حال کے اعتبار سے خیر کی تخصیص کی گئی۔

جوابِ ثانی: یہاں مراد تو خیر اور شر دونوں ہیں مگر ایک چیز کے ذکر پر اکتفاء کیا گیا کیونکہ وہ دوسرے امر پر دال ہے۔ جیسے اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان ہے:''سَرَابِیْلَ تَقِیْکُمُ الْحَرَّ''خیر کے ذکر کی وجہ یہی ہے کہ انسان اسی میں رغبت رکھتا ہے اور اللہ تعالیٰ سے بندوں کا مطلوب بھی یہی ہے۔

سوال: ارشادِ باری ہے:'' تُوْلِجُ الَّیْلَ فِی النَّھَارِ وَتُوْلِجُ النَّھَارَ فِی الَّیْلِ ''(آپ رات کو دن میں داخل کردیتے ہیں اور دن کو رات میں داخل کردیتے ہیں) یہاں کیسے فرمایا کہ رات کو دن میں اور دن کو رات میں داخل کردیتا ہے۔ کسی شے کا کسی شے میں 'ایلاج'' (داخل کرنا) اجتماع حقیقت کا مقتضی ہے جیسے دھاگہ کا سوئی میں ڈالنا اور انگوٹھی کا انگلی میں داخل کرنا' یعنی اس سے تو دن اور رات کی حقیقت کا متحد ہونا لازم آتا ہے' حالانکہ دن اور رات کی حقیقت مختلف ہے؟

جوابِ اوّل: ''ایلاج'' کا ایک معنی تو وہی ہے جو مذکور ہوا' لیکن کبھی 'ایلاج'' کا معنی ہوتا ہے کہ ایک چیز کی صفت کا اس طرح تبدیل ہونا کہ دوسری چیز کی صفت کا اس پر غلبہ ہو اور اصل ذات باقی رہے' جیسے کثیر دودھ میں تھوڑی سی روئی کا ڈالنا' یا تھوڑے سے دودھ میں کثیر روئی ڈالنا۔ کیونکہ دونوں کی حقیقت ذات کے اعتبار سے ایک ہے لیکن ایک کی صفت دوسرے پر غالب ہے۔

لیل ونہار بھی اسی طرح ہیں' جب رات معتدل زمانہ کی نسبت سے چودہ گھنٹہ کی ہو تو دن کی بہ نسبت اس میں دو گھنٹے یقیناً غالب ہونگے' اسی طرح برعکس صورت میں ہے۔

جوابِ ثانی: مطلب یہ ہے کہ رات کے زمانہ کو دن کے زمانہ میں داخل کردیتا ہے اور دن کے زمانہ کو رات کے زمانہ میں داخل کردیتا ہے۔

جوابِ ثالث: رات کو دن میں اور دن کو رات میں داخل کرنا اس اعتبار سے ہے کہ ایک قوم کی رات (وہی) دوسروں کے لئے دن ہے اور ایک قوم کا دن دوسروں کے لئے رات ہے۔

سوال: " وَلَيْسَ الذَّكَرُ كَالْأُنْثٰى " کا کیا معنی ہے؟ یہ بات تو واضح ہے کہ مذکر مؤنث کی طرح نہیں ہے؟

جواب: اس جملہ کا مقصد امرأۃِ عمران کا اپنی بات پر اعتذار ہے' اس لئے کہ انہوں نے یہ خیال کیا تھا کہ ان کے شکم میں لڑکا ہے اسی لئے انہوں نے یہ نذر مانی تھی کہ وہ اس کو بیت المقدس کا خادم بنائے گی' ان کی شریعت میں صرف مذکر کے لئے اس طرح کی نذر ماننا درست تھا۔ لیکن جب ان کے ہاں لڑکی پیدا ہوئی تو انہوں نے یہ سمجھا کہ ان کی نذر قبول نہین ہوئی اس لئے اعتذار کرتے ہوئے کہا: " وَلَيْسَ الذَّكَرُ كَالْأُنْثٰى " (اور لڑکا لڑکی کے برابر نہیں)۔ ان کا مطلب یہ تھا کہ لڑکی تو لڑکے کی طرح مسجد کی خدمت وغیرہ کرنے کی صلاحیت و قابلیت نہیں رکھتی' اس سے ان کی مراد یہ نہیں تھی کہ لڑکی صورت یا طاقت وغیرہ میں لڑکے کی طرح نہیں ہے (کیونکہ یہ بات تو سب جانتے ہیں)۔

چنانچہ جب امرأۃِ عمران نے مریم کو نذر کی قبولیت میں خاص کرنے پر تعجب کا اظہار کیا تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا: " فَتَقَبَّلَهَا رَبُّهَا بِقَبُوْلٍ حَسَنٍ " (پس ان کو ان کے رب نے بوجہ احسن قبول فرمالیا)۔

سوال: کلام عرب میں جب ایک چیز کو دوسرے کے مثل قرار دیتے ہیں تو حرفِ نفی کو امرِ قاصر پر اور حرفِ تشبیہ کو امرِ کامل پر داخل کرتے ہیں۔ یہ ان کا تمثیل میں طریقہء استعمال ہے' لہٰذا اس بناء پر یوں کہنا چاہئے؟ " وَلَيْسَ الْأُنْثٰى كَالذَّكَرِ "؟

جواب اوّل: جیسے اثبات کی صورت میں تشبیہ کے اندر اصل کو فرع اور فرع کو اصل قرار دینے میں مبالغہ فی المشابہت ثابت ہوتا ہے جیسے القمر کوجہ زیدٍ البحر ککفہٖ اسی طرح نفی کی صورت میں اصل کو فرع اور فرع کو اصل قرار دینے میں مبالغہ فی المشابہت کی نفی ثابت ہوتی ہے نہ کہ مشابہت کی نفی میں مبالغہ ثابت ہوتا ہے' اور یہی یہاں مقصود ہے۔ اس لئے کہ یہاں مذکر اور مؤنث کے مابین مشابہت' عمومی اور اغلبی اوصاف میں واقع ہے۔

حضرت امِ مریمؑ کی مراد ان دونوں کے درمیان نذر کے صحیح ہونے اور بیت المقدس کے خادم بننے میں مشابہت کی نفی تھی' اسی لئے انہوں نے دوسرے کا عکس کیا' یعنی مذکر مؤنث کی طرح نہیں ہے۔

جوابِ ثانی: یہ اللہ تعالیٰ کا قول ہے' معنی یہ ہوگا کہ وہ لڑکا جس کی حضرت امِ مریم نے خواہش کی تھی کہ وہ بیت المقدس کا خادم بنے اس لڑکی کے برابر نہیں ہے جوان کو اس لئے عطا فرمائی کہ اللہ کے علم میں تھا کہ یہ (لڑکی) اور اس کا بیٹا سارے جہان والوں کے لئے ایک نشانی بنیں گے' اور یہ قول: اس مجمل آیت کی تفسیر ہے: " وَاللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا وَضَعَتْ " (حالانکہ اللہ تعالیٰ زیادہ جانتے ہیں اس کو جو انہوں نے جنی) یعنی وہ اس کے شرف کی مقدار کو نہیں جانتی "والذکر کا الانثی" میں لام عہدی ہے۔

یہ ساری بات امام زمخشریؒ نے بیان کی ہے' مکمل بحث "کشاف" میں ہے۔

فقیہ ابو اللیث فرماتے ہیں: بعض کہتے ہیں کہ " وَلَيْسَ الذَّكَرُ كَالْاُنْثٰى اللہ تعالیٰ کا حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کو فرمانا ہے کہ اے محمدؐ! لڑکا لڑکی کے مانند نہیں ہے۔ اور بعض کہتے ہیں کہ یہ امِ مریمؑ کا کلام ہے؟

سوال: فرمانِ باری تعالیٰ ہے: "فَنَادَتْهُ الْمَلٰٓئِكَةُ وَهُوَ قَآئِمٌ يُّصَلِّىْ فِى الْمِحْرَابِ " (پس پکار کے کہا ان سے فرشتوں نے اور وہ کھڑے نماز پڑھ رہے تھے محراب میں)۔ فرشتوں نے زکریا علیہ السلام کو نماز کی حالت میں ان کو کیسے پکارا اور پھر انہوں نے نماز کی حالت ہی میں ان فرشتوں کو کیسے جواب دیا' یہ تو درست نہیں ہے؟۔

جواب: " يُصَلِّىْ " سے مراد ہے " يَدْعُوْا " (دعا کر رہے تھے) جیسے ایک مقام پر صلوۃ سے دعا مراد لی گئی ہے' فرمایا: " وَلَا تَجْهَرْ بِصَلٰوتِكَ وَلَا تُخَافِتْ بِهَا " (اور اپنی نماز میں نہ تو بہت پکار کر پڑھیے اور نہ بالکل چپکے چپکے ہی پڑھیے) یہاں صلوٰۃ سے مراد دعا ہے۔

سوال: " اِنَّ اللّٰهَ يُبَشِّرُكَ بِيَحْيٰى مُصَدِّقًا بِكَلِمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ " (تحقیق اللہ تعالیٰ آپ کو بشارت دیتے ہیں یحییٰ کی کہ وہ کلمۃ اللہ کی تصدیق کرنے والے ہونگے) اس آیت میں یحییٰ علیہ السلام کی تخصیص کی کیا وجہ ہے' ہر مومن اللہ تعالیٰ کے تمام کلمات کی تصدیق کرنے والا ہوتا ہے؟

جواب: مطلب یہ ہے کہ وہ (یحییٰ) عیسیٰؑ کی تصدیق کرنے والے ہونگے جن کا وجود اللہ تعالیٰ کے کلمہ "کُنْ" سے وابستہ ہوگا یعنی جن کا وجود باپ کے واسطہ کے بغیر کلمہ کُنْ کے ذریعہ ہوگا' ظاہر ہے کہ حضرت یحییٰ علیہ السلام کی وجود یا رتبہ میں عیسیٰ علیہ السلام کی تصدیق کرنا بڑھ کر ہے۔

سوال: حضرت زکریا علیہ السلام نے پروردگارِ عالم سے " هَبْ لِىْ مِنْ لَّدُنْكَ ذُرِّيَّةً طَيِّبَةً " (عنایت کیجئے مجھ کو خاص اپنے پاس سے کوئی اچھی اولاد) اولاد کی درخواست کی اور اللہ تعالیٰ نے ان کو بزبانِ ملائکہ یحییٰ علیہ السلام کی بشارت بھی دے دی اس کے باوجود انہوں نے اولاد عطا

کرنے پر قدرتِ خداوندی کا انکار کرتے ہوئے یہ کیسے کہا ''رَبِّ اَنّٰی یَكُوْنُ لِیْ غُلٰمٌ وَّقَدْ بَلَغَنِیَ الْكِبَرُ وَامْرَاَتِیْ عَاقِرٌ'' (میرے پروردگار! میرے لڑکا کس طرح ہوگا حالانکہ مجھ کو بڑھاپا آپہنچا اور میری بی بی بھی بانجھ ہے)؟

**جوابِ اوّل:** زکریا علیہ السلام نے یہ بات اللہ تعالیٰ کی عظیم قدرت سے تعجب اور استفہام کے طور پر فرمائی' انکار اور استبعاد کے طور پر نہیں فرمائی۔

**جوابِ ثانی:** زکریا علیہ السلام کو اشتباہ ہوا تھا کہ میرے بوڑھے ہونے اور بیوی کے بھی بانجھ ہونے کے باوجود اولاد کیسے عطا ہوگی۔ انکار کے طور پر بالکل نہیں فرمایا۔

**جوابِ ثالث:** ان کی مُراد یہ تھی کہ یہ حالتیں (میرے بڑھاپے کو پہنچنے اور بیوی کے بانجھ ہونے) ان دونوں سے کیسے زائل ہوں گی؟ لیکن اس جواب پر اعتراض ہوسکتا ہے کہ آیت کا دوسرا حصہ اس جواب کے مطابق اور مناسب نہیں ہے۔

**سوال:** اللہ تعالیٰ کے اس ارشادِ مبارک میں ''اِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰكِ وَطَهَّرَكِ وَاصْطَفٰكِ عَلٰی نِسَآءِ الْعٰلَمِیْنَ'' (بلاشک اللہ تعالیٰ نے تم کو منتخب فرمایا ہے اور پاک بنایا ہے اور تمام جہاں بھر کی بیبیوں کے مقابلہ میں منتخب فرمایا ہے) ''اصطفاء'' (منتخب فرمانا) کا ذکر مکرر کیوں ہے؟۔

**جوابِ اوّل:** پہلے ''اصطفاء'' سے مراد بیت المقدس کی خدمت کی عبادت اور مؤنث ہونے کے باوجود نذر کی قبولیت کے لئے ان کو مخصوص و منتخب فرمانا ہے اور دوسرے ''اصطفاء'' سے مراد عیسیٰ علیہ السلام کی ولادت کے لئے انہیں منتخب فرمانا ہے۔

**جوابِ ثانی:** ''اصطفاء'' کا دوبارہ ذکر اس فائدے کی خاطر ہے کہ مریم علیہا السلام کو جہاں بھر کی عورتوں کے مقابلہ میں منتخب فرمایا گیا ہے نہ کہ مردوں کے مقابلہ میں' جیسا کہ ''عَلٰی نِسَآءِ الْعٰلَمِیْنَ'' کا قول اس کی طرف مشیر ہے۔

**سوال:** ''وَمَا كُنْتَ لَدَیْهِمْ اِذْ یُلْقُوْنَ اَقْلَامَهُمْ'' (اور آپ ان لوگوں کے پاس اس وقت نہ تھے جب وہ اپنے اپنے قلموں کو (پانی میں) ڈالتے تھے) اس فرمان کے ذریعہ نبی کریم ﷺ کے اس زمانہ میں موجود نہ ہونے کا ذکر کیوں فرمایا؟ یہ بات تو سب جانتے تھے کہ حضور مریم علیہا السلام کے زمانہ میں نہیں تھے' حالانکہ چاہئے تو یہ تھا کہ اس بات کی نفی کی جاتی کہ یہ انباءِ غیب' حضور ﷺ کسی اور سے سن کر نہیں بتادیتے بلکہ وحی الٰہی سے بتاتے ہیں' مشرکین کو اسی بات کا تو وہم تھا کہ یہ کسی یاد رکھنے والے سے سن کر ہمیں بتادیتے ہیں' خدا کی طرف سے وحی نہیں ہے؟

**جواب:** مشرکین' حضورِ اکرم ﷺ کے اُمّی ہونے کو قطعی طور پر جانتے تھے اور وہ وحی کے منکر تھے

اور اب حضور اور مشاہدہ کے سوا اور کوئی صورت باقی نہیں رہی تھی' اور یہ صورت انتہائی محال اور ناممکن ہے' اس لئے آپ کے حضور اور مشاہد کی نفی ان منکرینِ وحی کا مذاق اڑانے کے طور پر کی گئی جبکہ وہ حضور کے امّی ہونے کو بھی جانتے تھے۔ اس کی نظیر اللہ تعالیٰ کا یہ فرمانِ عالی ہے: ''وَمَا كُنْتَ بِجَانِبِ الْغَرْبِيِّ'' (اور آپ (طور کی) مغربی جانب میں موجود نہ تھے) نیز'' وَمَا كُنْتَ بِجَانِبِ الطُّوْرِ'' (اور آپ طور کی جانب میں موجود نہ تھے)۔

سوال: '' اِسْمُهُ الْمَسِيْحُ عِيْسَى ابْنُ مَرْيَمَ'' (اس کا نام مسیح عیسیٰ بن مریم ہوگا) کے ذکر کرنے کا کیا فائدہ ہے' مریم علیہا السلام کے علم میں تھا کہ جس ولد کی انہیں خوشخبری دی گئی ہے وہ ان کا بیٹا ہی ہوگا؟۔

جواب: اصل میں اولاد اپنے باپ کی طرف منسوب ہوتی ہے نہ کہ ماں کی طرف' اس لئے'' عِيْسَى ابْنُ مَرْيَمَ'' بتانے پر مریم علیہا السلام کو معلوم ہوگیا کہ یہ ولد بغیر باپ کے پیدا ہوگا اور اپنی ماں کی طرف ہی منسوب ہوگا۔

سوال: '' وَيُكَلِّمُ النَّاسَ فِي الْمَهْدِ وَكَهْلًا '' (اور آدمیوں سے کلام کرینگے گہوارہ میں اور بڑی عمر میں) عیسیٰ علیہ السلام کا ادھیڑ عمر میں لوگوں سے باتیں کرنا ان کی وجہ خصوصیت اور صورتِ معجزہ کیسے ہے؟

جوابِ اوّل: اس کا مطلب یہ ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام ان دو حالتوں میں نبیوں والا کلام کریں گے اور ان کی حالتِ طفولیت اور حالتِ کہولیت میں کوئی تفاوت نہیں ہوگا جس میں عقل پختہ ہوجاتی ہے اور نبیوں کو نبوت عطا ہوتی ہے۔ گویا کہ یوں فرمایا گیا کہ عیسیٰ علیہ السلام لوگوں سے بچپن میں ایسے ہی کلام کرینگے جیسے وہ لوگوں سے ادھیڑ عمر میں کلام کریں گے' امام زجاج کہتے ہیں: اس سے علیہ السلام یہ معلوم ہوتا ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام زمانۂ کہولت تک زندہ رہیں گے۔ لہٰذا یہ مریم علیہا السلام کے لئے عیسیٰ علیہ السلام کی طولِ عمر کی مزید بشارت ہے۔

جوابِ ثانی: ان حالتوں کو ذکر کرنے سے مقصود ان کے الٰہ (خدا) ہونے کی نفی کرنا ہے' وہ اس طرح سے کہ اگر وہ خدا ہوتے تو ان پر حالات کا تغیر کبھی نہ آتا اور زمانہ کبھی ان پر اثر انداز نہ ہوسکتا۔ چنانچہ ان پر حالات (کبھی حالتِ طفولیت اور کبھی حالتِ کہولیت) کا تغیر ان کے خدا نہ ہونے کو ثابت کرتا ہے۔

سوال: ''اِنِّي مُتَوَفِّيْكَ وَرَافِعُكَ اِلَيَّ '' (پس تم کو وفات دینے والا ہوں اور (فی الحال) میں تم کو اپنی طرف اٹھائے لیتا ہوں) یہ کیسے ارشاد فرمایا؟ حالانکہ اللہ تعالیٰ نے ان کو اپنی طرف اٹھایا

ہے اُن کو وفات تو نہیں دی؟۔

جواب اوّل: جب یہودیوں نے ان کو قتل کی دھمکی دی تو اللہ تعالیٰ نے عیسیٰ علیہ السلام کو اس بات کی بشارت دی کہ ان کی روح (طبعی) وفات کے ذریعہ قبض ہوگی نہ کہ قتل کے ذریعہ عربی میں واؤ ترتیب کا فائدہ نہیں دیتی۔ لہٰذا اس آیت سے رفعِ آسمانی سے پہلے ہی وفات کا ہونا لازم نہیں آتا۔

جوابِ ثانی: عبارت میں تقدیم و تاخیر ہے یعنی یوں تھا: '' اِنِّی رَافِعُکَ وَمُتَوَفِّیکَ '' (میں تمہیں اٹھاؤں گا اور تمہیں وفات دوں گا)۔

جوابِ ثالث: '' مُتَوَفِّیکَ '' کا معنی ہے میں تمہیں تمہارے اعضاء اور جسم کے ساتھ زمین سے پورا پورا وصول کروں گا کہ یہ یہودی لوگ تجھے کبھی نقصان نہیں پہنچا سکیں گے۔ اس لئے کہ '' توفی '' کا لفظ اہلِ عرب کے اس قول سے ماخوذ ہے '' توفیت حقی علی فلان '' یعنی میں نے فلاں سے اپنا حق پورا پورا وصول کرلیا۔

جوابِ رابع: '' مُتَوَفِّیکَ '' کا معنی ہے میں تمہیں تیرے نفس میں نوم کے ساتھ وفات دوں گا جیسے اس فرمانِ الٰہی میں '' توفی '' کا ذکر ہے: '' اَللّٰهُ یَتَوَفَّی الْاَنْفُسَ حِیْنَ مَوْتِهَا وَالَّتِیْ لَمْ تَمُتْ فِیْ مَنَامِهَا '' (اللہ ہی قبض کرتا ہے جانوں کو ان کی موت کے وقت اور ان جانوں کو بھی جن کی موت نہیں آئی ان کے سونے کے وقت) اور '' رَافِعُکَ '' کا معنی ہے اور میں تمہیں اپنی طرف اٹھالوں گا جبکہ تو سو رہا ہوگا۔ تاکہ تمہیں کوئی خوف اور ڈر لاحق نہ ہو اور اس وقت بیدار ہوگا جب تو آسمان میں ہوگا۔

سوال: یہ کیسے فرمایا ہے: '' اِنَّ مَثَلَ عِیْسٰی عِنْدَ اللّٰهِ کَمَثَلِ اٰدَمَ '' (بے شک عیسیٰ علیہ السلام کی مثال اللہ تعالیٰ کے نزدیک آدمؑ کی مثال کی طرح ہے) عیسیٰ و آدم علیہما السلام میں مماثلت کیسے ہے؟ آدمؑ کی تخلیق مٹی سے اور عیسیٰ کی تخلیق پھونک سے ہوئی اور آدمؑ ماں باپ کے بغیر اور عیسیٰ صرف ماں سے پیدا کئے گئے؟

جواب: اس سے مقصود صرف باپ کے واسطہ کے بغیر پیدا ہونے میں تشبیہ دینا ہے۔ اور تشبیہ من جمیع الوجوہ مماثلت کا تقاضا نہیں کرتی بلکہ من بعض الوجوہ مماثلت کافی ہوتی ہے۔

سوال: '' وَمِنْ اَهْلِ الْکِتٰبِ مَنْ اِنْ تَاْمَنْهُ بِقِنْطَارٍ یُّؤَدِّهٖٓ اِلَیْکَ ۚ وَمِنْهُمْ مَّنْ اِنْ تَاْمَنْهُ بِدِیْنَارٍ لَّا یُؤَدِّهٖٓ اِلَیْکَ '' (اور اہلِ کتاب میں سے بعض شخص ایسا ہے کہ (اے مخاطب) اگر تم اس کے پاس انبار کا انبار مال بھی امانت رکھو گے تو وہ (مانگنے کے ساتھ ہی) اس کو تمہارے پاس لا رکھے!

اوران ہی میں سے بعض وہ شخص ہے کہ اگر تم اس کے پاس ایک دینار بھی امانت رکھ دو تو وہ بھی تم کو ادا نہ کرے) اہلِ کتاب کی تخصیص کی وجہ کیا ہے کہ ان میں سے بعضے امین اور بعضے خائن ہیں، مسلمانوں اور دیگر اہلِ مذاہب میں بھی بعض امانتدار اور بعض خیانت گر ہوتے ہیں؟

جوابِ اوّل: اہلِ کتاب کو واقعۂ حال کی بناء پر خاص طور سے ذکر فرمایا۔ اس لئے کہ آیتِ ہذا کے نزول کا سبب یہ ہے کہ عبداللہ بن سلامؓ کے پاس بارہ سو اوقیہ سونا امانت رکھا گیا تو انہوں نے مانگنے کے ساتھ ہی اس امانت کو ادا کر دیا اور فنحاص بن عازوراء کے پاس صرف ایک دینار امانۃً رکھا گیا تو اس نے اس میں خیانت کر دی۔

جوابِ ثانی: اہلِ کتاب کا مسلمانوں سے خیانت کرنا استحلال (حلال سمجھنے) کے طور پر ہوتا تھا جس کی دلیل آیت کا دوسرا حصہ ہے: " قَالُوْا لَيْسَ عَلَيْنَا فِي الْأُمِّيِّنَ سَبِيْلٌ "(وہ کہتے ہیں کہ ہم پر غیر اہلِ کتاب کے (مال کے) بارے میں کسی طرح کا الزام نہیں) جبکہ مسلمان کا دوسرے مسلمان سے خیانت کرنا اس کو حلال سمجھنے کے خیال سے نہیں ہوتا۔

سوال: یہ کیسے فرمایا ہے: "وَلَهٗ اَسْلَمَ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ طَوْعًا وَّكَرْهًا "(حالانکہ حق تعالیٰ کے سامنے سب سرافگندہ ہیں جتنے آسمانوں اور زمین میں ہیں خوشی سے اور بے اختیاری سے) سب تو اللہ تعالیٰ کے فرمان بردار نہیں ہیں؟! اکثر انسان وجنات تو منکر ہیں؟

جواب: اس سے مراد اللہ تعالیٰ کی قضا و قدر کے سامنے سرِ تسلیم خم کرنا ہے جیسے موت وحیات، صحت ومرض اور سعادت وشقاوت وغیرہ۔

سوال: یہ کیسے فرمایا: " اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بَعْدَ اِيْمَانِهِمْ ثُمَّ ازْدَادُوْا كُفْرًا لَّنْ تُقْبَلَ تَوْبَتُهُمْ " (بے شک جو لوگ کافر ہوئے اپنے ایمان لانے کے بعد پھر بڑھتے رہے کفر میں ان کی توبہ ہرگز مقبول نہ ہوگی) حالانکہ یہ بات سب جانتے ہیں کہ مرتد کا ارتداد خواہ کفر میں کتنا ہی بڑھ جائے اور وہ پھر توبہ کرلے تو اس کی توبہ مقبول ہوگی؟

جوابِ اوّل: ابن عباسؓ فرماتے ہیں: یہ آیتِ کریمہ ایسے لوگوں کے بارے میں نازل ہوئی ہے جو مرتد ہو گئے تھے اور اپنا حال مخفی رکھنے کے لئے اور اپنے دلوں میں کفر کو چھپاتے ہوئے زبان سے توبہ کا اظہار کیا تھا۔

جوابِ ثانی: بعض کہتے ہیں کہ یہ آیت ایسی قوم کے بارے میں نازل ہوئی جنہوں نے شرک کے سوا باقی تمام گناہوں سے توبہ کی تھی۔

جوابِ ثالث: اس کا معنی یہ ہے کہ موت آجانے کے وقت ان کی توبہ قبول نہ ہوگی۔

سوال: اس آیت کا کیا مطلب ہے: "اِنَّ اَوَّلَ بَیْتٍ وُّضِعَ لِلنَّاسِ لَلَّذِیْ بِبَکَّۃَ" (یقیناً وہ مکان جو سب سے پہلے لوگوں کے واسطے مقرر کیا گیا وہ مکان ہے جو کہ مکہ میں ہے) حالانکہ آدم علیہ السلام کے زمانہ سے لے کر ابراہیم علیہ السلام کے دور تک بہت سے گھر خانۂ کعبہ سے پہلے بنائے گئے ہیں؟

جوابِ اوّل: اس آیت کا معنی یہ ہے کہ سب سے پہلا مکان جو لوگوں کے لئے قبلہ کے طور پر اور مقامِ عبادت کے لحاظ سے بنایا گیا وہ خانۂ کعبہ ہے۔

جوابِ ثانی: مراد یہ ہے کہ سب سے پہلا مکان جو لوگوں کیلئے مبارک بنایا گیا وہ بیت اللہ ہے۔

جوابِ ثالث: ابن عباسؓ فرماتے ہیں: سب سے پہلے آدم علیہ السلام نے خانہ کعبہ تعمیر کیا اس لئے کہ جب آدم علیہ السلام کا آسمان سے ہبوط (نزول) ہوا تو اس وقت اللہ تعالیٰ نے ان کی طرف وحی بھیجی کہ تم میرے لئے زمین میں ایک گھر بناؤ اور اس کے اردگرد ویسا عمل کرو جیسا تم نے فرشتوں کو میرے عرش کے اردگرد کرتے دیکھا ہے، چنانچہ انہوں نے گھر بنایا اور اس کے اردگرد طواف کرنے لگے۔

سوال: اللہ تعالیٰ نے یوں کیوں فرمایا: " کُنْتُمْ خَیْرَ اُمَّۃٍ " (تم بہترین امت تھے) ایسا کیوں نہیں فرمایا " اَنْتُمْ خَیْرُ اُمَّۃٍ " یعنی تم بہترین امت ہو؟

جوابِ اوّل: "کُنْتُمْ خَیْرَ اُمَّۃٍ" کا مطلب ہے کہ تم اللہ تعالیٰ کے علمِ سابق میں بہترین امت تھے یا تم اس دن بہترین امت تھے جب اولادِ آدم سے عہد لیا گیا تھا۔ اور اس سے مقصد یہ بتانا ہے کہ یہ خیریت ان کی صفتِ اصلی ہے نہ کہ صفتِ عارضی۔

جوابِ ثانی: یہاں "کَانَ" تامہ ہے اور " خَیْرَ اُمَّۃٍ " بنا بر حال کے منصوب ہے، معنی یہ ہے کہ تم بہترین امت ہو "کَانَ" کے متعلق مکمل بحث "اِنَّہٗ کَانَ فَاحِشَۃً وَّ مَقْتًا" میں ذکر کی جائے گی (انشاء اللہ تعالیٰ)۔

سوال: اس ارشادِ الٰہی کا کیا معنی ہے: "وَلَوْاٰمَنَ اَھْلُ الْکِتٰبِ لَکَانَ خَیْرًا لَّھُمْ" (اگر اہلِ کتاب ایمان لے آتے تو ان کے لئے زیادہ اچھا ہوتا) کسی چیز کے متعلق یہ کہنا کہ یہ اس سے زیادہ بہتر ہے اسی وقت درست ہوتا ہے جبکہ ان دونوں چیزوں میں خیر (بہتری) ہو۔ حالانکہ ایمان میں تو خیر ہے مگر غیرِ ایمان میں تو کوئی خیر نہیں، ورنہ یہ لازم آئے گا کہ غیرِ ایمان میں بھی خیر ہے لیکن ایمان میں زیادہ خیر ہے؟

جواب: اس آیتِ مبارکہ کا معنی یہ ہے کہ اہلِ کتاب کا موسیٰ علیہ السلام و عیسیٰ علیہما السلام پر ایمان

لانے کے ساتھ ساتھ حضرت محمد ﷺ پر بھی ایمان لانا صرف موسیٰ وعیسیٰ علیہما السلام پر ایمان لانے سے زیادہ اچھا اور بہتر ہے۔

سوال: اس آیتِ مبارکہ کا مطلب کیا ہے: "مَثَلُ مَا یُنفِقُوْنَ فِیْ هٰذِهِ الْحَیٰوةِ الدُّنْیَا کَمَثَلِ رِیْحٍ فِیْهَا صِرٌّ" (وہ جو کچھ خرچ کرتے ہیں اس دنیوی زندگانی میں اس کی حالت اس حالت کے مثل ہے کہ ایک ہوا ہو جس میں تیز سردی ہو) اس آیت مبارکہ سے بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ کافروں کے وہ اموال جن کو وہ جاہ وشہرت اور مفاخرت کے حصول کے لئے خرچ کرتے ہیں یا کفر کے باوجود نیک کاموں میں صرف کرتے ہیں یا رسولِ کریم ﷺ کی عداوت میں ان کو خرچ کرتے ہیں ان (اموال) کو ایسی کھیتی کے ساتھ تشبیہ دی گئی ہے جس کو تیز ہوا لگ جائے اور وہ اس کھیتی کو برباد کر کے رکھدے، جس کے سبب وہ کھیتی ناقابلِ انتفاع ہو جائے یہاں درحقیقت تشبیہ کا تعلق کھیتی کے ساتھ ہے نہ کہ ہوا کے ساتھ، لیکن آیت میں "ریح" کے ساتھ تشبیہ دی گئی ہے؟

جوابِ اوّل: اصل میں یہاں لفظ مقدر ہے، اصل میں ہے: "اِهْلَاکُ مَا یُنفِقُوْنَ کَمَثَلِ اِهْلَاکِ رِیْحٍ فِیْهَا صِرٌّ" یعنی جو کچھ وہ خرچ کرتے ہیں وہ ایسے ہی برباد جاتا ہے جیسے تیز ہوا کھیتی کو برباد کر دیتی ہے، یا ان کفار کے خرچ کرنے کی مثال اس ہوا سے تباہ شدہ جگہ (یعنی کھیتی) کی طرح ہے۔ اس کی نظیر اللہ تعالیٰ کا یہ فرمانِ عالی ہے: "مَثَلُ الَّذِیْنَ یُنفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ کَمَثَلِ حَبَّةٍ" (جو لوگ اللہ کی راہ میں اپنے مالوں کو خرچ کرتے ہیں ان کے خرچ کئے ہوئے مالوں کی حالت ایسی ہے جیسے ایک دانہ کی حالت) نیز یہ فرمانِ باری بھی اس کی نظیر ہے: "وَمَثَلُ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا کَمَثَلِ الَّذِیْ یَنْعِقُ" (اور ان کافروں کی کیفیت (نافہمی میں) اس (جانور کی) کیفیت کے مثل ہے کہ ایک شخص ہے وہ جانور کے پیچھے چلا رہا ہے)۔

جوابِ ثانی: امام ثعلبؒ فرماتے ہیں کہ یہاں عبارت میں تقدیم وتاخیر ہے، تقدیری عبارت اس طرح ہے: "کَمَثَلِ حَرْثِ قَوْمٍ ظَلَمُوْا اَنْفُسَهُمْ اَصَابَتْهُ رِیْحٌ فِیْهَا صِرٌّ فَاَهْلَکَتْهُ" یعنی کفار کی مثال اس قوم کی کھیتی کے مثل ہے جنہوں نے اپنی جانوں پر ظلم کیا ہو پھر تند وتیز ہوا اس کھیتی کو لگ جائے اور اس کو برباد کر کے رکھدے۔

سوال: "اِنْ تَمْسَسْکُمْ حَسَنَةٌ تَسُؤْهُمْ وَاِنْ تُصِبْکُمْ سَیِّئَةٌ یَّفْرَحُوْا بِهَا" (اگر لگے تم کو بھلائی ناخوش کرتی ہے ان کو اور اگر پہنچے تم کو برائی خوش ہوتے ہیں ساتھ اس کے) اس آیت میں کیا وجہ ہے کہ حسنۃ کو مَسّ کے ساتھ اور سیئۃ کو اِصابہ کے ساتھ بیان کیا گیا ہے؟

جواب: مَسّ کا لفظ عبارت میں توسّع کے لئے اِصابہ کے معنیٰ میں مستعار ہے۔ وگرنہ دونوں کا

معنی ایک ہی ہے۔ جیسے اللہ تعالیٰ کے یہ ارشادات ہیں: "مَا اَصَابَکَ مِنْ حَسَنَةٍ فَمِنَ اللّٰهِ وَمَا اَصَابَکَ مِنْ سَیِّئَةٍ فَمِنْ نَفْسِکَ" نیز "اِنَّ الْاِنْسَانَ خُلِقَ هَلُوْعًا اِذَا مَسَّهُ الشَّرُّ جَزُوْعًا وَاِذَا مَسَّهُ الْخَیْرُ مَنُوْعًا"

سوال: اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد کا کیا مطلب ہے؟ "وَسَارِعُوْٓا اِلٰی مَغْفِرَةٍ" (اور جلدی کرو طرف بخشش کے) جبکہ حضور نبی کریم علیہ افضل التحیۃ تو فرماتے ہیں: "العجلة من الشيطان والتأني من الرحمٰن" یعنی جلد بازی شیطان کی طرف سے ہوتی ہے اور آہستہ روی اختیار کرنا رحمٰن کی طرف سے ہے؟

جواب: نبی کریم ﷺ نے پانچ موقعوں کو مستثنیٰ قرار دیا ہے' آپ نے فرمایا: "مگر گناہ سے توبہ کرنے' قرض ادا کرنے' بالغہ کنواری کی شادی کرنے' میت کو دفن کرنے اور مہمان کا اکرام کرنے میں جلدی کرو"۔ آیتِ بالا میں جس مسارعت (جلدی) کا حکم دیا گیا ہے اس سے توبہ کرنے میں جلدی کرنا مراد ہے' اسی طرح اسبابِ مغفرت بھی توبہ کے مفہوم میں داخل ہیں۔

سوال: "وَالَّذِیْنَ اِذَا فَعَلُوْا فَاحِشَةً اَوْ ظَلَمُوْٓا اَنْفُسَهُمْ" (اور ایسے لوگ کہ جب کوئی ایسا کام کر گز تے ہیں جس میں زیادتی ہو یا اپنی ذات پر نقصان اُٹھاتے ہیں) اس آیت مبارکہ میں ظَلَمُوْا کا کلمہ اَوْ کے ذریعہ ماقبل پر عطف کیا گیا ہے' حالانکہ فاحشہ (بُرائی) کا فعل ظلمِ نفس میں داخل ہے بلکہ فاحشہ ظلمِ نفس کی ابلغ نوع ہے؟ اس لئے بظاہر تو "ظَلَمُوْٓا اَنْفُسَهُمْ" کہنا کافی تھا؟۔

جواب: یہاں "فاحشة" سے مراد ظلمِ نفس کی ایک نوع ہے یعنی زنا یا ہر کبیرہ گناہ مراد ہے' پس اس لفظ "فاحشہ" کو زیادتِ قباحت کے لئے ذکر کیا گیا اور ظلمِ نفس سے مراد اس کے ماسوا گناہ ہیں۔

سوال: یہاں تو فرمایا: "وَمَنْ یَّغْفِرُ الذُّنُوْبَ اِلَّا اللّٰهُ" (اور اللہ تعالیٰ کے سوا اور ہے کون جو گناہوں کو بخشتا ہے) لیکن ایک دوسرے مقام پر ارشاد فرمایا: "وَاِذَا مَا غَضِبُوْا هُمْ یَغْفِرُوْنَ" (اور جس وقت کہ غصے ہوتے ہیں وہی بخش دیتے ہیں) نیز فرمایا: "قُلْ لِّلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا یَغْفِرُوْا" (آپ فرما دیجئے ایمان والوں کو کہ وہ بخش دیا کریں) ان آیات میں بظاہر تعارض معلوم ہوتا ہے' پہلی آیت سے تو معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے سوا اور کوئی نہیں بخشتا اور دوسری آیات سے معلوم ہوتا ہے' کہ اللہ کے سوا بھی اور لوگ بخشتے ہیں' اس آیت کا مطلب کیا ہے؟۔

جواب: "وَمَنْ یَّغْفِرُ الذُّنُوْبَ اِلَّا اللّٰهُ" کا معنی ہے کہ اللہ کے سوا اور کون ہے جو من کل الوجوہ گناہوں پر پردہ ڈال دے' ظاہر ہے ایسا غفران (معاف فرمانا اور بخشنا) اللہ کے سوا اور کسی میں

پایا جاسکتا۔
سوال: ''اَفَائِنْ مَّاتَ اَوْ قُتِلَ'' (سو اگر آپ کا انتقال ہو جائے یا آپ شہید ہی ہو جائیں) اس آیتِ کریمہ میں ''اَوْ قُتِلَ'' لانے کا کیا فائدہ ہے؟ صرف ''اَفَائِنْ مَّاتَ'' کہہ دینا کافی تھا اس لئے کہ قتل بھی ایک موت ہے جو اس میں داخل ہے؟۔
جواب: قتل اگرچہ موت ہے لیکن جب عرفِ عام میں میّت کا لفظ بولا جائے تو اس سے مقتول مفہوم نہیں ہوتا چنانچہ اسی لئے ایک کا دوسرے پر عطف کیا گیا۔
سوال: اس مقام پر تو فرمایا ہے: ''وَمَنْ يَّغْلُلْ يَاْتِ بِمَا غَلَّ يَوْمَ الْقِيَامَةِ'' (جو شخص خیانت کرے گا وہ شخص اپنی خیانت کی ہوئی چیز کو قیامت کے دن حاضر کرے گا) لیکن ایک دوسری جگہ پر ارشاد فرمایا: ''وَلَقَدْ جِئْتُمُوْنَا فُرَادٰى كَمَا خَلَقْنٰكُمْ اَوَّلَ مَرَّةٍ '' (الانعام:۹۴) (اور تم ہمارے پاس تنہا تنہا آ گئے جس طرح ہم نے اول بار تم کو پیدا کیا تھا)۔
دونوں آیتوں میں بظاہر تعارض ہے' کیونکہ پہلی آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ خیانت کی ہوئی چیز کو قیامت کے دن حاضر کرے گا اور دوسری آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ ساری مخلوق تنہا تنہا حاضر ہوگی؟
جواب: پہلی آیت کا معنی یہ ہے کہ وہ اس حال میں آئے گا کہ اس کا گناہ اس کے دفترِ اعمال میں مرقوم ہوگا۔ یا مطلب یہ ہے کہ اپنے گناہ کا بار اٹھائے ہوئے آئے گا۔ اور دوسری آیت میں'' فُرَادٰى'' کا معنی یہ ہے کہ وہ لوگ اپنے اہل و اموال سے علیحدہ اور تنہا ہو کر آئیں گے۔ یا مطلب یہ ہے کہ وہ اللہ کے سوا باطل معبودوں سے الگ ہو کر آئیں گے' یا اپنے شرکاء سے جدا ہو کر حاضر ہوں گے۔ آیت کا مکمل حصہ ان توجیہات کے صحیح ہونے پر شاہد ہے۔
سوال: صحیحین میں نبی کریم ﷺ کی یہ حدیث منقول ہے' آپؐ نے فرمایا: ''خیانت کرنے والا شخص قیامت کے دن بعینہٖ اسی چیز کو اپنے کندھے پر اٹھائے ہوئے آئے گا جس میں اس نے خیانت کی ہوگی خواہ وہ چیز بولنے والی ہو (جانور وغیرہ) یا خاموش رہنے والی (مال و دولت)''۔ یہ حدیثِ رسولؐ کا مفہوم ہے۔ اس سے مذکورہ جواب مندفع ہو جاتا ہے؟
جواب: بناء بریں دوسری آیت سے مراد یہ ہوگا کہ وہ لوگ اپنے اہل و مال کی حمایت و مدد سے الگ اور جدا ہوں گے' مکمل آیت اس جواب کے صحیح ہونے پر شاہد ہے۔
سوال: اس ارشادِ باری کا کیا مطلب ہے: ''وَهُمْ دَرَجٰتٌ عِنْدَ اللّٰهِ'' (یہ لوگ درجات (پر) ہیں اللہ کے نزدیک) لوگوں کو نفسِ درجات کہنا کیسے صحیح ہے؟

جوابِ اوّل: لفظ مقدر ہے۔ اصل میں ہے: ''هُمْ ذُوْدَرَجٰتٍ'' یعنی وہ درجات والے ہیں۔ یا ''هُمْ اَهْلُ دَرَجَاتٍ'' یہاں اصل مراد کو عدمِ التباس کی وجہ سے حذف کر دیا گیا۔

جوابِ ثانی: ''دَرَجٰتٌ'' سے مراد طبقات ہے' اس صورت میں کوئی لفظ مقدر ماننے کی ضرورت نہیں' معنی یہ ہوگا کہ وہ لوگ اللہ ہاں درجات میں مختلف ہونے کی وجہ سے طبقات میں متفاوت ہوں گے۔

سوال: دونوں فریقوں (ایک وہ جو رضائے حق کا تابع ہو اور دوسرا وہ غضبِ الٰہی کا مستحق ہو) کے لئے درجات کا لفظ کیسے فرمایا گیا ہے۔ حالانکہ ان میں سے ایک فریق درجات کا اور دوسرا درکات کا مستحق ہے؟

جوابِ اوّل: ''دَرَجٰتٌ'' کا لفظ دونوں فریقوں کے لئے مستعمل ہے' اس کی دلیل سورۃ الاحقاف میں فرمانِ خداوندی ہے' دونوں فریقوں کا پہلے ذکر فرمایا' اس کے بعد فرمایا: ''وَلِكُلٍّ دَرَجٰتٌ مِمَّا عَمِلُوْا'' (اور ہر ایک کے لئے ان کے اعمال کی وجہ سے الگ الگ درجے ملیں گے) اس کی تحقیق یہ ہے کہ بعض جہنمی خفیف عذاب میں مبتلا ہوں گے اس اعتبار سے وہ مقام کے اعتبار سے اعلیٰ ہوں گے اور بعض جہنمی جہنم میں شدید عذاب سے دوچار ہوں گے اس لحاظ سے وہ مقام کے اعتبار سے ان سے اسفل ہوں گے۔

جوابِ ثانی: اگر ''دَرَجٰت'' کا اہلِ درجات کے ساتھ اختصاص تسلیم کر لیا جائے تو ''هُمْ دَرَجٰتٌ'' کا قول صرف انہی کی طرف راجع ہوگا' اصل عبارت یوں ہوگی: ''اَفَمَنِ اتَّبَعَ رِضْوَانَ اللّٰهِ وَهُمْ دَرَجَاتٌ عِنْدَ اللّٰهِ كَمَنْ بَآءَ بِسَخَطٍ مِّنَ اللّٰهِ وَهُمْ دَرَكَاتٌ'' یعنی سو ایسا شخص جو کہ رضائے حق کا تابع ہو اور اللہ تعالیٰ کے نزدیک درجات پر فائز ہو کیا وہ اس شخص کے مثل ہو جائے گا جو کہ غضبِ الٰہی کا مستحق ہو اور درکات کا اہل ہو''۔ بہر حال یہاں بعض حصہ کو اس لئے حذف کر دیا کہ مذکور حصہ اس پر دلالت کرتا ہے۔

سوال: ''اَلَّذِيْنَ قَالُوْا اِنَّ اللّٰهَ فَقِيْرٌ وَّنَحْنُ اَغْنِيَآءُ'' (جو کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ مفلس ہے اور ہم دولتمند ہیں) جن لوگوں نے یہ بات کہی تھی وہ نبی کریم علیہ السلام کے زمانہ میں موجود تھے اور انہوں نے یہ بات اس وقت کہی تھی جب انہوں نے اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان سنا: ''مَنْ ذَا الَّذِيْ يُقْرِضُ اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا'' (کوئی شخص ہے جو اللہ تعالیٰ کو اچھی طرح قرض کے طور پر دے)۔ لہٰذا ان کے حق میں یہ کیسے فرمایا: ''سَنَكْتُبُ مَا قَالُوْا وَقَتْلَهُمُ الْاَنْبِيَآءَ بِغَيْرِ حَقٍّ'' (ہم ان کے کہے ہوئے کو لکھ رہے ہیں اور ان کا انبیاء کو ناحق قتل کرنا بھی)' انہوں نے تو کبھی بھی انبیاء کو قتل

نہیں کیا؟
جواب: چونکہ وہ اپنے اسلاف کے اس عمل (انبیاء کوقتل کرنا) پر راضی اور خوش تھے تو گویا انہوں نے خود یہ کام کیا ہے' اس لئے انبیاء کے قتل کی نسبت انکی طرف کردی گئی۔ قرآنِ حکیم میں یہ صورت جا بجا مذکور ہے۔
سوال: ارشادِ خداوندی ہے: ''وَاَنَّ اللّٰهَ لَيۡسَ بِظَلَّامٍ لِّلۡعَبِيۡدِ'' (یہ امر ثابت ہے کہ اللہ تعالیٰ بندوں پر ظلم کرنے والے نہیں) یہاں ''ظلّام'' مبالغہ کا صیغہ ہے جس کا معنی ہے بہت زیادہ ظلم کرنے والا۔ ظلّام کی نفی سے ظالم کی نفی لازم نہیں آتی' ہاں البتہ ظالِم کی نفی سے ظلّام کی نفی لازم آتی ہے' اس لئے لَيۡسَ بظالِمٍ فرماتے تو زیادہ بہتر ہوتا کیونکہ اس طرح اللہ تعالیٰ کی ذاتِ مقدسہ سے ابلغ طریقہ سے ظلم کی نفی ہو جاتی؟
جوابِ اوّل: یہاں مبالغہ کا صیغہ کثرتِ عبید (بندوں کی کثرت) کی وجہ سے لایا گیا ہے نہ کہ کثرتِ ظلم کی وجہ سے۔ جیسے ارشاد ہے: ''وَلَا يَظۡلِمُ رَبُّكَ اَحَدًا'' (آپ کا رب کسی پر ظلم نہیں کرتا) اسی طرح فرمایا: ''عَالِمُ الۡغَيۡبِ'' اور ایک جگہ ''عَلَّامُ الۡغُيُوۡبِ'' مبالغہ کے صیغہ کے ساتھ۔ جب معمول مفرد ہو تو مبالغہ کا صیغہ نہیں لایا جاتا۔ جیسے زید ظالم لعبدہ وعمرو ظلّام لعبیدہ' زید اور عمرو دونوں ظلم میں برابر ہیں۔ نیز جیسے ''مُحَلِّقِيۡنَ رُءُوۡسَكُمۡ وَمُقَصِّرِيۡنَ'' اس میں تشدید کے ساتھ محلّق اور مقصّر کو لایا گیا فاعلین کی کثرت کی بناء پر نہ کہ فعل کے مکرر ہونے کی وجہ سے۔
جوابِ ثانی: یہاں صیغہ مبالغہ نسب کے لئے ہے یعنی اس ذاتِ مقدسہ کی طرف ظلم کو منسوب نہیں کیا جاتا۔ تو بناء بریں آیت کے معنی ہوں گے کہ وہ ظالم نہیں ہے۔
جوابِ ثالث: یہاں ''ظلّام'' کا اطلاق قباحتِ فعل کی زیادتی کے اعتبار سے کیا گیا ہے نہ کہ کثرتِ فعل کے اعتبار سے' اس لئے کہ وہ ذات جو عظیم القدر بھی ہو اور کثیر العدل بھی اس کی طرف سے کسی جرم کے بغیر کسی کے لئے عذاب کا صادر ہونا اس شخص کے ظلم سے زیادہ قبیح اور شنیع ہے جو نہ عظیم المرتبت ہو اور نہ کثیر العدل ہو۔ حاصلِ جواب یہ ہے کہ مبالغہ کا صیغہ کبھی تو ذاتِ فعل کی زیادتی کے اعتبار سے مستعمل ہوتا ہے اور کبھی صفتِ فعل کی زیادتی کے لحاظ سے استعمال ہوتا ہے' پس ظلم اگر بالفرض اللہ تعالیٰ کی ذاتِ مقدسہ کی طرف سے پایا جائے تو وہ زیادتِی قباحت کے اعتبار سے ان ہزار ہا ظلموں سے کہیں بڑھ کر ہوگا جو بندوں کی طرف سے پائے جائیں۔ اس کی نظیر اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان ہے: ''وَحَمَلَهَا الۡاِنۡسَانُ اِنَّهٗ كَانَ ظَلُوۡمًا جَهُوۡلًا'' (اور انسان نے

اس کو اپنے ذمہ لے لیا وہ ظالم ہے جاہل ہے) اس میں "ظَلُوم" اور "جَهُول" مبالغہ کے صیغے ہیں۔ اس کا بیان ان شاء اللہ تعالیٰ اپنے مقام پر آئے گا۔

سوال: اللہ تعالیٰ کے اس فرمانِ عالی میں: "فَاِنْ كَذَّبُوْكَ فَقَدْ كُذِّبَ رُسُلٌ مِنْ قَبْلِكَ" (اگر یہ لوگ آپ کی تکذیب کریں تو بہت سے پیغمبروں کی جو آپ سے پہلے گزرے ہیں تکذیب کی جا چکی ہے) اس آیت میں جزا مقدم ہے حالانکہ حق تو یہ ہے کہ جزا شرط کے بعد ہو؟۔

جواب: جوابِ شرط محذوف ہے اس لئے کہ "فَقَدْ كُذِّبَ رُسُلٌ مِنْ قَبْلِكَ" اس کی جزا بننے کی صلاحیت نہیں رکھتا کیونکہ وہ شرط پر مقدم ہے معنی یہ ہے کہ اگر یہ لوگ آپ کی تکذیب کریں تو آپ سابقہ پیغمبروں کی تکذیب سے خود کو تسلی دیا کریں۔ یہاں سبب کو (جو کہ ان کی تکذیب ہے) مسبب کی جگہ پر (جو کہ تسلی دینا ہے) رکھا گیا ہے۔

سوال: "وَاِذْ اَخَذَ اللّٰهُ مِيْثَاقَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ لَتُبَيِّنُنَّهٗ لِلنَّاسِ وَلَا تَكْتُمُوْنَهٗ" (اور جب کہ اللہ تعالیٰ نے اہلِ کتاب سے یہ عہد لیا کہ اس کتاب کو عام لوگوں کے روبرو ظاہر کر دینا اور اس کو پوشیدہ مت کرنا) یہاں مزید "وَلَا تَكْتُمُوْنَهٗ" کہنے میں کیا فائدہ ہے؟ آیت کا اوّل حصہ اس کو مستغنی کر دیتا ہے؟ یعنی جب یہ کہہ دیا کہ "اس کتاب کو ظاہر کرنا" تو اس کی بظاہر ضرورت نہیں رہتی کہ "پوشیدہ مت کرنا"؟

جوابِ اوّل: "لَتُبَيِّنُنَّهٗ" کا مطلب ہے کہ اس کتاب کو فی الحال ظاہر کرنا اور اس پر مداومت رکھنا اور "لَا تَكْتُمُوْنَهٗ" کا معنی یہ ہے کہ آیندہ اس کو مت چھپانا۔

جوابِ ثانی: پہلی ضمیر کتاب کی طرف اور دوسری ضمیر نبی ﷺ کے ذکر اور صفت کی طرف راجع ہے اس لئے کہ کچھ پہلے حضور اکرم ﷺ کا ذکر گزرا ہے۔

سوال: پھر بھی "وَلَا تَكْتُمُوْنَهٗ" کہنا تکرار ہے اس لئے کہ جب وہ کتاب کو بیان کریں گے اور اس کو ظاہر کریں گے تو اس سے لازماً نبی کریم ﷺ کی صفت اور آنحضرت کا ذکر بھی واضح اور بیان ہوگا اس لئے کہ حضور ﷺ کا صفت بھی من جملہ کتاب میں سے ہے یعنی تورات وانجیل میں حضور کی شان بھی مذکور ہے۔ لہٰذا اس کے بعد "وَلَا تَكْتُمُوْنَهٗ" کہنا تکرار ہوگا؟

جواب: بناء بریں "وَلَا تَكْتُمُوْنَهٗ" کا قول تاکید کے لئے ہوگا۔

سوال: "رَبَّنَآ اِنَّكَ مَنْ تُدْخِلِ النَّارَ فَقَدْ اَخْزَيْتَهٗ" (اے ہمارے پروردگار بے شبہ آپ جس کو دوزخ میں داخل کریں اس کو واقعی رسوا ہی کر دیا) اور دوسری جگہ فرمایا: "يَوْمَ لَا يُخْزِي اللّٰهُ النَّبِيَّ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ" (اس دن کہ نہ رسوا کرے گا اللہ نبی کو اور ان لوگوں کو کہ ایمان لائے

ساتھ ان کے) ان آیات مبارکہ سے بظاہر معتزلہ اور خارجیہ کے قول کی تائید ہوتی ہے کہ مومنین جہنم میں داخل ہی نہیں ہوں گے ان آیات کا صحیح مفہوم کیا ہے؟۔

جوابِ اوّل: "اَخزَیْتَهٗ" کا معنی ہے ذلیل وخوار کرنا' یہ "خِزیٌ" سے ماخوذ ہے اور "یَوْمَ لَا یُخْزِیْ" میں "یُخزِیْ" خِزَایَةٌ سے ماخوذ ہے اس کا معنی ہے نکال وفضیحت۔ چنانچہ جو شخص بھی دوزخ میں داخل ہوگا وہ ذلیل وخوار ضرور ہوگا لیکن یہ ضروری نہیں کہ دوزخ میں جانے والا ہر شخص فضیحت کا بھی شکار ہو۔

جوابِ ثانی: آیتِ اولیٰ سے اقامت اور خلود کا ادخال مراد ہے' اس سے تحلّتِ قسم (قسم پوری کرنے) کے لئے ادخالِ جہنم مراد نہیں ہے جس کا ذکر اس آیت میں ہے: "وَاِنْ مِّنْكُمْ اِلَّا وَارِدُھَا" (مریم:۷۱) یعنی اور تم میں سے کوئی بھی نہیں جس کا اس پر سے گزر نہ ہو"۔

جوابِ ثالث: اس سے مراد تطہیر والا ادخال ہے جو بعض مومنین کے لئے ان کے گناہوں کے بقدر ہوگا۔ بعض کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کا یہ قولِ مبارک: "یَوْمَ لَا یُخْزِی اللّٰهُ النَّبِیَّ وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ" مستقل کلام ہے' یعنی یہاں سے ایک نیا کلام شروع ہورہا ہے' اس کا ماقبل پر عطف نہیں ہے۔

سوال: اس آیت کا کیا مطلب ہے: "سَمِعْنَا مُنَادِیًا" (یعنی ہم نے ایک پکارنے والے کو سنا)۔ حالانکہ امرِ مسموع منادی کی ندا ہوتی ہے نہ کہ نفسِ منادی؟۔

جواب: اصل عبارت تھی: "نِدَاءَ مُنَادٍ" کیونکہ پورا قولِ باری اس طرح ہے' "سَمِعْنَا مُنَادِیًا یُّنَادِیْ" (ہم نے ایک پکارنے والے کو سنا کہ وہ پکارتا ہے)۔ جیسے کہتے ہیں: سمعت زیدًا یقول کذا (میں نے زید کو سنا کہ وہ اس طرح کہتا ہے) اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ "سَمِعْتُ قَوْلَ زَید" (میں نے زید کی بات سنی)۔ بہرحال آیتِ مذکورہ میں "مُنَادِیًا" سَمِعَ کا مفعول ہے اور "یُنَادِیْ" حال ہے جو مفعول کے مضاف کے محذوف ہونے پر دال ہے۔

سوال: "رَبَّنَا فَاغْفِرْلَنَا ذُنُوْبَنَا وَكَفِّرْ عَنَّا سَیِّاٰتِنَا" (اے پروردگار ہمارے پھر ہمارے گناہوں کو بھی معاف فرمادیجئے اور ہماری بدیوں کو بھی ہم سے زائل کردیجئے) یہاں بظاہر تکرار معلوم ہوتا ہے۔ کیونکہ تکفیرِ سیئات (بدیوں کو زائل کرنا) غفرانِ ذنوب (گناہوں کو معاف کرنا) میں داخل ہے؟ دونوں لفظ لانے میں کیا فائدہ ہے؟۔

جواب: دونوں کا معنی مختلف ہے' اس لئے کہ "غفران" محض فضل کرنے کو کہتے ہیں' اور "تکفیر" کہتے ہیں سیئات کو حسنات سے مٹانا اور زائل کرنا۔

سوال: "وَتَوَفَّنَا مَعَ الْاَبْرَارِ "(اور ہم کو نیک لوگوں کے ساتھ موت دیجئے) اس کا معنی کیا ہے؟ کیونکہ نیک لوگوں کے ساتھ وفات پانا تو ان کے لئے نافع نہیں ہے بلکہ خود ان کا نیک ہونا ان کے لئے نفع بخش ہے' خواہ پھر ان کے ساتھ وفات پائیں یا ان سے پہلے وفات پائیں یا ان کے بعد؟

جواب: اس کا معنی یہ ہے کہ ہمیں اس حال میں موت دینا کہ ہم نیک لوگوں کی صحبت سے وابستہ ہوں اور پھر بالآخر ان میں ہمارا شمار ہو۔ جیسے کہا جاتا ہے امیر نے مجھے بھی عطا کیا انعام والوں کے ساتھ۔ مطلب یہ ہوتا ہے کہ اس نے مجھے بھی ان کی جماعت میں سے قرار دیا اور شامل کیا۔ اگرچہ ان سے پہلے دیا ہو یا بعد میں۔

سوال: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: " وَاٰتِنَا مَا وَعَدْتَّنَا عَلٰی رُسُلِکَ " (اور ہم کو وہ چیز بھی دیجئے جس کا ہم سے اپنے پیغمبروں کی معرفت آپ نے وعدہ فرمایا ہے)' یہاں انہوں نے پیغمبروں کی معرفت اللہ تعالیٰ سے وعدہ پورا کرنے کی دعا کی ہے حالانکہ ان کے علم میں بھی ہے بلکہ خود ان کا یہ قول ہے: "اِنَّکَ لَا تُخْلِفُ الْمِیْعَادَ " (یقیناً وہ وعدہ خلافی نہیں کرتے)؟

جواب: اللہ تعالیٰ کی طرف سے پیغمبروں کی زبانی مومنین سے وعدہ عام ہے۔ جس میں احتمال ہے کہ اس سے خصوص مراد ہو جیسا کہ قرآنِ کریم کی عام آیات میں ایسا اکثر ہوتا ہے' چنانچہ انہوں نے اللہ تعالیٰ سے دعا کی کہ ان کو بھی ان لوگوں میں شامل اور شمار کیا جائے جو اس وعدہ کے حکم میں داخل ہیں۔ دوسرا یہ کہ انہوں نے اللہ تعالیٰ سے اس وعدہ کے جلد پورا کرنے کی درخواست کی جو وعدہ اس نے ان کے دشمنوں کے خلاف اپنی نصرت وامداد کے متعلق کیا ہے' کیونکہ اللہ تعالیٰ نے مومنین سے یہ وعدہ کیا تھا کہ وہ ان کی انکے دشمنوں کے خلاف نصرت کرے گا لیکن اس وعدہ کو کسی وقت کے ساتھ مقید اور مخصوص نہیں کیا تھا۔

سوال: اللہ تعالیٰ کے اس فرمانِ عالی کا کیا مطلب ہے: " لَا یَغُرَّنَّکَ تَقَلُّبُ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا فِی الْبِلَادِ "(تجھ کو ان کافروں کا شہروں میں چلنا پھرنا فریب میں نہ ڈالے)' یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ رسول پاک ﷺ ان نعمتوں کی وجہ سے فریب یا دھوکہ میں آجائیں جو ان کافروں کو دی گئیں ہیں حتیٰ کہ حضور ﷺ کو ان کے دھوکہ میں آنے سے منع کیا جائے؟

جواب: اس کا معنی یہ ہے کہ اے مومنو! ان کافروں کی چہل پہل کہیں تمہیں دھوکہ میں نہ ڈال دے۔ طریقہ یہ ہے کہ قوم کے رئیس اور مقتداء کو کسی بات کا مخاطب بنایا جاتا ہے مگر اس سے مراد اس کے متبعین اور اس کی جماعت کے افراد ہوتے ہیں۔ دوسرا یہ کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کافروں کی خوشحالی سے فریب خوردہ نہیں تھے' یہاں فریب میں نہ آنے کا حکم محض تاکید کے لئے

اوراس پر مداومت اور ثابت قدم رہنے کے لئے ہے۔ جیسا کہ ایک دوسری جگہ پر حضور کو فرمایا گیا: '' فَلَا تَكُونَنَّ ظَهِيْرًا لِّلْكَافِرِيْنَ '' (آپ کافروں کے پشت پناہ نہ ہوں) یا فرمایا: '' وَلَا تَكُوْنَنَّ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ '' (آپ مشرکوں میں سے نہ ہوں) یا ایک جگہ آپ سے فرمایا گیا: '' فَلَا تُطِعِ الْمُكَذِّبِيْنَ '' (آپ ان تکذیب کرنے والوں کا کہنا کبھی نہ ماننا)۔

سوال: '' تَقَلُّبُ '' (چلنا پھرنا) سے کس طرح منع کیا گیا ہے حالانکہ یہ ممنوع چیز نہیں ہے؟

جواب: اس کا معنی ہے ان کے شہروں میں چلنے پھرنے کی وجہ سے آپ فریب میں نہ آئیں کہ کہیں ان کا چلنا پھرنا آپ کو دھوکہ میں نہ ڈال دے۔ یعنی یہ کلام تنزيل السبب منزلة المسبب کے قبیل سے ہے۔ کیونکہ کافروں کے تَقَلُّب (چلنا پھرنا) نے اگر (بالفرض) ان کو فریب ودھوکہ میں ڈالا تو وہ اس کی وجہ سے دھوکہ میں آجائیں گے اس لئے اصل سبب سے ہی منع کر دیا گیا اور وہ ہے ان کے تَقَلُّب کا ان کو دھوکہ میں ڈالنا۔ تاکہ مسبب سے باز رہیں اور وہ ہے ان کا کافروں کے تَقَلُّب سے دھوکہ اور فریب میں آنا۔

سوال: اچھا! اس کی کیا وجہ ہے کہ یوں فرمایا گیا ہے: '' لَا يَغُرَّنَّكَ تَقَلُّبُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فِي الْبِلَادِ '' (کافروں کا شہروں میں چلنا پھرنا تمہیں فریب میں نہ ڈالے) اس طرح کیوں نہیں فرمادیا: '' لَا يَغُرَّنَّكَ نِعَمُهُمْ وَاَمْوَالُهُمْ '' (کافروں کی نعمتیں اور ان کے مال تمہیں فریب میں نہ ڈالیں) کیونکہ فریب خوردگی کا احتمال کافروں کے اموال اور ان کی نعمتوں میں ہے ان کے شہروں میں چلنے پھرنے میں تو فریب خوردگی کا احتمال نہیں ہے؟

جواب: کافروں کے چلنے پھرنے سے مراد نعمتوں اور تجارتوں میں ان کا تصرّف اور اموال کے ذریعہ تلذّذ اور تلطف (مزے لینا) ہے ایک نادار اور تہی دست آدمی جب کسی مالدار شخص کو مختلف نعمتوں سے لطف اندوز ہوتے دیکھتا ہے تو اس کی دل شکنی ہوتی ہے اور اسے تکلیف ہوتی ہے۔ اس لئے یہاں '' تَقَلُّب '' (چلنا پھرنا) کا لفظ ذکر کیا گیا ہے۔ بعض اہلِ علم کہتے ہیں کہ اس کا معنی یہ ہے کہ ان کافروں کا گناہوں اور نافرمانیوں میں ملوّث ہونا تمہیں فریب میں نہ ڈال دے کہ یہ لوگ اپنے گناہوں کی وجہ سے پکڑے نہیں جارہے ہیں۔

سوال: '' اُولٰٓئِكَ لَهُمْ اَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ سَرِيْعُ الْحِسَابِ '' (ایسے لوگوں کو ان کا نیک عوض ملے گا ان کے پروردگار کے پاس بلاشبہ اللہ تعالیٰ جلدی ہی حساب کردینگے) اس آیت کا معنی کیا ہوگا؟ کیونکہ یہاں: '' لَهُمْ اَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ '' کا قول اجر وثواب کی بشارت کے موقع پر لایا گیا ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی سرعت حساب کا قول '' اِنَّ اللّٰهَ سَرِيْعُ الْحِسَابِ ''

بھی ذکر کیا گیا ہے حالانکہ یہ قول اس وقت ذکر کرتے ہیں جب کسی کو ڈرانا' دھمکانا یا کسی عذاب کی وعید سنانی ہو؟

جواب: اس کا معنی یہ ہے کہ یہ لوگ اللہ کی آیات کو حساب کے خوف سے نہیں بیچتے کیونکہ وہ ذات سریع الحساب ہے' اس کا تعلق ماقبل سے ہے۔

# سورۃ النساء

سوال: ارشادِ باری تعالیٰ ہے: ''وَخَلَقَ مِنۡهَا زَوۡجَهَا '' (اور اس جاندار سے اس کا جوڑا پیدا کیا) جب حواء کی تخلیق حضرت آدمؑ سے ہوئی ہے اور ہم بھی حضرت آدمؑ ہی سے تخلیق شدہ ہیں یعنی ان کی اولاد ہیں تو حواء کی نسبت آدمؑ کی طرف اولاد کی ہوگی اور حواء اس لحاظ سے ہماری بہن ہوگی نہ کی ماں؟

جوابِ اوّل: بعض مفسرین کہتے ہیں: یہاں ''مِنۡ'' بیانِ جنس کے لئے ہے' تبعیض کے لئے نہیں ہے' معنی یہ ہوگا کہ اللہ تعالیٰ نے اس جاندار کی جنس سے اس کا جوڑا پیدا فرمایا۔ جیسے یہ آیتِ مبارکہ ہے: ''لَقَدۡ جَآءَكُمۡ رَسُوۡلٌ مِّنۡ اَنۡفُسِكُمۡ '' میں ''مِنۡ'' بیانِ جنس کے لئے ہے۔

جوابِ ثانی: جمہور مفسرین کہتے ہیں: یہاں ''مِنۡ'' تبعیض ہی کے لئے ہے لیکن حواء کی آدم علیہ السلام سے تخلیق بطریقِ تولید نہیں تھی جیسے اولاد کی تخلیق ماں باپ سے ہوتی ہے' لہٰذا اس سے بنتیت (آدمؑ کی بیٹی ہونا) اور اخیت (ہمارے لئے ان کا بہن ہونا) لازم نہیں آتی۔

سوال: ارشادِ الٰہی ہے: ''وَاٰتُوا الۡيَتٰمٰٓى اَمۡوَالَهُمۡ '' (اور دو یتیموں کو مال ان کے) اس آیتِ مبارکہ میں یتیموں کو ان کے مال ادا کرنے کا حکم ہے۔ حالانکہ یتیم کو اس کا مال اس وقت تک دینا بالاتفاق جائز نہیں جب تک کہ وہ بالغ نہ ہو جائے؟

جواب: یہاں یہی مراد ہے کہ جب وہ بالغ ہو جائیں تو ان کا مال ان کو دے دو' اور یہاں ان کو مَا کَانَ کے اعتبار سے زمانہ بلوغ کے قریب ہونے کی بناء پر یتیم کے نام سے موسوم کیا گیا۔ جیسے اونٹنی کو وضعِ حمل کے بعد بھی عُشَرَاء (دس ماہ کی حاملہ اونٹنی) کہہ دیتے ہیں۔ اسی طرح کبھی بالغ کو بھی مَا کَانَ کے اعتبار سے یتیم کہہ دیتے ہیں' جیسے مَا يَكُوۡنُ کے اعتبار سے حی (زندہ) کو میت (مردہ) اور انگور کو شراب کہہ دیتے ہیں۔ فرامینِ باری تعالیٰ ہیں: ''اِنَّكَ مَيِّتٌ وَّاِنَّهُمۡ مَّيِّتُوۡنَ'' اور فرمایا: ''اِنِّىۡۤ اَعۡصِرُ خَمۡرًا '' اسی طرح لوگوں کا نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم کے لئے نبوت ملنے کے بعد یتیم ابی طالب کہنا' اسی قبیل سے ہے۔

سوال: ''وَلَا تَأْكُلُوا اَمْوَالَهُمْ اِلٰى اَمْوَالِكُمْ '' (اور نہ کھاؤ ان کے مال اپنے مالوں کے ساتھ ) یہاں فرمایا گیا ہے کہ یتیموں کا مال اپنے مالوں کے ساتھ مت کھاؤ' حالانکہ صرف یتیم کا مال کھانا بھی حرام ہے' کیا وجہ ہے کہ یہاں یتیم کے مال کے کھانے کی ممانعت کو اوصیاء (وصی کے جمع) کے مال کے ساتھ مخصوص کیا گیا ہے؟۔

جواب: تخصیص کی وجہ یہ ہے کہ ضرورت نہ ہونے کے باوجود یتیم کا مال کھانا زیادہ قبیح اور شنیع ہے' چونکہ وہ لوگ عدم ضرورت کے باوجود یتیموں کا مال کھایا کرتے تھے اس لئے ممانعت اس کے مطابق آئی۔

سوال: جب یہ فرمادیا: ''مِمَّا تَرَكَ الْوَالِدَانِ وَالْاَقْرَبُوْنَ ''(اس چیز میں سے جس کو ماں باپ اور بہت نزدیک کے قرابت دار چھوڑ جائیں) تو اس میں قلیل اور کثیر بھی آ گیا لہٰذا اس کے بعد پھر یہ کہنا ''مِمَّا قَلَّ مِنْهُ اَوْ كَثُرَ '' (خواہ وہ چیز قلیل ہو یا کثیر) بظاہر بے فائدہ ہے؟

جواب: ''مِمَّا قَلَّ مِنْهُ اَوْ كَثُرَ '' کہنا تاکید کے طور پر اور یہ بتانے کے لئے ہے کہ سارا کا سارا ترکہ واجب القسمت ہے خواہ وہ کم ہو یا زیادہ' کہیں ایسا نہ ہو کہ ترکہ کے کسی قلیل حصہ کو معمولی امر سمجھ کر چھوڑ دیا جائے اور اسے تقسیم نہ کیا جائے' اور کوئی وارث اس کا تنہا مالک بن جائے۔

سوال: یہ کیسے فرمایا: ' وَلِاَبَوَيْهِ لِكُلِّ وَاحِدٍ مِّنْهُمَا السُّدُسُ مِمَّا تَرَكَ اِنْ كَانَ لَهٗ وَلَدٌ '' (اور ماں باپ کے لئے میت کے ترکہ میں سے چھٹا حصہ ہے' اگر میت کے کچھ اولاد ہو) حالانکہ اگر اولاد میں میت کی بیٹی ہو تو باپ کے لئے ثلث ہوتا ہے' سدس نہیں ہوتا؟

جواب: آیتِ مبارکہ میں فرض کا بیان کیا گیا ہے۔ تعصیب (عصبہ) کا بیان نہیں ہے۔ ظاہر ہے کہ فرض ہونے کے طور پر باپ کو بیٹی کے ساتھ سدس ہی ملتا ہے۔

سوال: اللہ تعالیٰ کا ارشاد مبارک ہے: ' وَمَنْ يَّعْصِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَيَتَعَدَّ حُدُوْدَهٗ يُدْخِلْهُ نَارًا خَالِدًا فِيْهَا '' (اور جو شخص اللہ اور رسول کا کہنا نہ مانے گا اور بالکل ہی اس کے ضابطوں سے نکل جائے گا اس کو آگ میں داخل کریں گے اس طور سے کہ وہ اس میں ہمیشہ ہمیشہ رہے گا)۔ یہاں عاصی کے لئے خلود فی النار (جہنم میں ہمیشہ رہنا) کا قطعی حکم کیسے لگایا گیا؟۔

جواب: اس سے مراد وہ شخص ہے جو اللہ کی نافرمانی اس کے احکام کو ردّ کر کے اور انکار کی صورت میں کرتا ہے' ظاہر ہے کہ احکامِ خداوندی کا انکار کفر ہے اور کفر کی سزا خلود فی النار ہی تو ہے۔

سوال: اس آیت کا کیا معنی ہے: ''حَتّٰى يَتَوَفّٰهُنَّ الْمَوْتُ '' (یہاں تک کہ موت ان کا خاتمہ کردے) یہاں ''توفی'' اور ''موت'' دونوں کا معنی ایک ہی ہے' گویا کہ یوں فرمایا' حتّٰی

يُمِيْتَهُنَّ الْمَوْتُ '' معنی یہ ہوگا کہ یہاں تک کہ موت ان کو موت دے دے؟
جوابِ اوّل: اس کا معنی یہ ہے کہ یہاں تک کہ موت کے فرشتے ان کو پکڑ کر ان کی روح قبض کرلیں۔

جوابِ ثانی: معنی یہ ہے کہ یہاں تک کہ موت کے فرشتے ان کو فوت کردیں۔
سوال: ارشادِ الٰہی ہے: ''اِنَّمَا التَّوْبَةُ عَلَى اللهِ '' (توبہ اللہ کے ذمہ ہے) توبہ تو بندہ کے ذمہ ہے۔ اس لئے '' اِنَّمَا التَّوْبَةُ عَلَى الْعَبْدِ '' کہنا چاہیے؟
جوابِ اوّل: یہاں مضاف محذوف ہے' اصل میں ہے: ''اِنَّمَا قُبُوْلُ التَّوْبَةِ عَلَى اللهِ '' یعنی توبہ قبول کرنا اللہ کے ذمہ ہے۔
جوابِ ثانی: توبة الله کا معنی ہوتا ہے اللہ تعالیٰ کا مغفرت اور رحمت کے ساتھ اپنے بندوں پر رجوع کرنا' اس لئے کہ توبہ کا لغوی معنی رجوع ہے۔
سوال: یہاں ''بِجَهَالَةٍ '' (نادانی میں) فرمانے کا کیا مطلب ہے؟ اگر کوئی شخص جانتے ہوئے گناہ کا ارتکاب کرے' پھر توبہ کرے تو کیا اس کی توبہ ہوگی؟۔
جواب: ''بِجَهَالَةٍ '' کا مطلب یہ ہے کہ وہ اس گناہ کی مقدارِ قباحت اور اس کے برے انجام سے ناواقف ہو کر ایسا کرے' کیونکہ ہر گنہگار گناہ کرتے وقت اس سے جاہل اور نادان ہوتا ہے' ''جہالت'' سے مراد اس کے فعلِ معصیت اور گناہ ہونے کی نادانی نہیں ہے کہ وہ اس فعل کے معصیت ہونے کو نہیں جانتا۔ لہٰذا اس کا معنی یہ ہوا کہ نفسانی خواہشات کے غلبہ' تلبیسِ ابلیس اور تزیینِ شیطان کے سبب اس شخص سے اس کا کمالِ علم سلب کرلیا گیا ہو۔
سوال: اس سے کیا مراد ہے: ' ثُمَّ يَتُوْبُوْنَ مِنْ قَرِيْبٍ '' (پھر قریب ہی وقت میں توبہ کرلیتے ہیں) حالانکہ اگر کوئی گنہگار آدمی فوراً توبہ نہ کرے بلکہ ایک عرصہ دراز کے بعد بھی توبہ کرلے تو بھی اس کی توبہ قبول ہوتی ہے؟
جواب: یہاں ''قَرِيْبٍ'' کا لفظ بعید کے مقابل نہیں لایا گیا ہے' کیونکہ دونوں کا حکم ایک ہے بلکہ اس کا معنی یہ ہے کہ پھر وہ سلطانِ موت کو دیکھنے سے پہلے پہلے توبہ کرلیتے ہیں۔ کذا قاله ابن عباس رضی اللہ عنہ۔ اس پر قرینہ (آگے جاکر) یہ قولِ باری ہے: ''حَتّٰى اِذَا حَضَرَ اَحَدَهُمُ الْمَوْتُ قَالَ اِنِّىْ تُبْتُ الْئٰنَ '' (یہاں تک کہ جب ان میں سے کسی کے سامنے موت ہی آکھڑی ہوئی تو کہنے لگا کہ میں اب توبہ کرتا ہوں)۔
سوال: اس کا کیا مطلب ہے: ''وَاٰتَيْتُمْ اِحْدٰهُنَّ قِنْطَارًا '' (اور تم اس ایک کو انبار کا انبار مال

دے چکے ہو) حالانکہ اس سے لینے کی حُرمت مطلقاً ثابت ہے خواہ اس کو مہر نہ دیا ہو بلکہ وہ اس کے ذمہ ہو؟

جواب: یہاں "اِیْتَاءٌ" سے مراد ضمان اور التزام ہے جیسے اللہ تعالیٰ کے اس فرمان میں ضمان والتزام مراد ہے: "اِذَا سَلَّمْتُمْ مَا اٰتَیْتُمْ" (جب کہ ان کے حوالہ کردو جو کچھ ان کو دینا کیا ہے)۔

سوال: اس آیت میں "بہتان" سے مراد کیا ہے: "اَتَاْخُذُوْنَهٗ بُهْتَانًا" (کیا تم اس کو لیتے ہو بہتان رکھ کر) حالانکہ مہر کا لینا ظلم ہے بہتان نہیں ہے کیونکہ بہتان تو جھوٹ کو کہتے ہیں؟

جواب: حضرت ابن عباسؓ اور ابن قتیبہؒ فرماتے ہیں: "بہتان" سے مراد ظلم ہے اور امام زجاجؒ فرماتے ہیں اس سے مراد باطل ہے۔ لغت کی کتابوں میں یہ امر مشہور ہے کہ بہتان یہ ہے کہ انسان کسی دوسرے کے متعلق وہ بات کہے جو اس نے نہ کی ہو لہٰذا اس آیت کی مراد یہ ہے کہ شوہر بسا اوقات اپنی بیوی پر اس لئے تہمت لگاتا ہے تاکہ اس کے ذریعہ اس کا مہر اس سے لے سکے اور اس سے جدائی اختیار کر سکے اور بعض کہتے ہیں کہ اس بہتان سے مراد شوہر کا اس بات سے انکار کرنا ہے کہ اس کے ذمہ اس عورت کا کوئی مہر ہے۔

سوال: اس جگہ "وَلَا تَنْكِحُوْا" (تم نکاح مت کرو) فعلِ مستقبل سے نہی ہے اور "اِلَّا مَا قَدْ سَلَفَ" (مگر جو بات گزر گئی گزر گئی) ماضی ہے تو ماضی کا مستقبل سے استثناء کیسے درست ہے؟

جوابِ اوّل: یہاں "اِلَّا" "بَعْدُ" کے معنی میں ہے جیسے اس قولِ باری میں "اِلَّا" "بَعْدُ" کے معنی میں مستعمل ہے: "لَا یَذُوْقُوْنَ فِیْهَا الْمَوْتَ اِلَّا الْمَوْتَةَ الْاُوْلٰى"۔

جوابِ ثانی: یہاں عبارت میں تقدیم و تاخیر ہے اصل عبارت اس طرح ہے: "اِنَّهٗ كَانَ فَاحِشَةً اِلَّا مَا قَدْ سَلَفَ" (تحقیق یہ ہے بے حیائی مگر جو بات گذر گئی گزر گئی)۔

سوال: اس جگہ: "اِنَّهٗ كَانَ فَاحِشَةً" بلفظِ ماضی کیوں فرمایا حالانکہ باپ کی منکوحہ سے نکاح فی الحال بھی اور فی المآل بھی تا قیامت فاحشہ ہے؟

جواب: "كَانَ" کبھی ماضی منقطع (یعنی انقطاعِ زمانہ ماضی) کے لئے استعمال ہوتا ہے۔ جیسے "كَانَ زَیْدٌ غَنِیًّا" "زید مالدار تھا" اور کبھی "كَانَ" تسلسل زمانہ کے لئے آتا ہے جو زمانہ حال سے متصل ہو۔ جیسے ابو جندب الہذلی کا شعر ہے

وَكُنْتُ اذا جاری دعا لمضوفةٍ
اُشَمِّرُ حتّٰی یَنصِفَ الساق مِئْزَرِی

نیز جیسے قرآنِ پاک میں ہے: "وَكَانَ اللّٰهُ بِكُلِّ شَیْءٍ عَلِیْمًا" یعنی اللہ تعالیٰ کو ہمیشہ سے

چیز کا علم ہے۔ نیز: "وَكَانَ اللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرًا" یعنی اللہ تعالیٰ ہمیشہ سے ہر چیز پر قادر ہے بہر کیف ہماری بحث اس قسم سے ہے۔ "کان" کے متعلق مزید کلام ان شاء اللہ تعالیٰ اس فرمانِ الٰہی: "اِنَّ الصَّلٰوةَ كَانَتْ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ كِتٰبًا مَّوْقُوْتًا" کے تحت آرہا ہے۔

سوال: اللہ تعالیٰ کے اس فرمانِ عالی میں: "وَرَبَآئِبُكُمُ الّٰتِيْ فِيْ حُجُوْرِكُمْ" (اور تمہاری بیبیوں کی بیٹیاں جو کہ تمہاری پرورش میں رہتی ہیں) ربیبہ کی حرمت کو زیر پرورش ہونے کے ساتھ مقید کیا گیا ہے حالانکہ یہ حرمت مطلقاً ثابت ہے اگرچہ وہ اس کی زیر پرورش نہ ہو؟

جواب: "فِيْ حُجُوْرِكُمْ" (زیر پرورش) کی قید اغلب اور عادۃً لگائی گئی ہے یہ قید احترازی یا شرط کے طور پر نہیں ہے۔ (یعنی یہ قید اتفاقی ہے احترازی نہیں ہے) یہی وجہ ہے کہ حلت کے موقع پر صرف نفیِ دخول (صحبت نہ کرنا) پر اکتفاء کیا گیا ہے (وہاں پرورش کے تحت ہونے نہ ہونے کی کوئی قید نہیں) فرمایا: "فَاِنْ لَّمْ تَكُوْنُوْا دَخَلْتُمْ بِهِنَّ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ" (اگر تم نے ان بیبیوں سے صحبت نہ کی ہو تو تم کو کوئی گناہ نہیں) فتامل۔

سوال: یہاں "فَاِنْ لَّمْ تَكُوْنُوْا دَخَلْتُمْ بِهِنَّ" کہنے کا کیا فائدہ ہے؟ بظاہر یہ کہنے کی ضرورت نہیں کیونکہ "مِنْ نِّسَآئِكُمُ الّٰتِيْ دَخَلْتُمْ بِهِنَّ" اور "اُحِلَّ لَكُمْ مَّا وَرَآءَ ذٰلِكُمْ" دونوں کے مجموعے سے یہ بات معلوم ہو ہی جاتی ہے کہ ربیبہ کی حرمت عدمِ دخول کے ساتھ مقید ہے؟

جواب: "فَاِنْ لَّمْ تَكُوْنُوْا دَخَلْتُمْ بِهِنَّ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ" کا فائدہ یہ ہے کہ کسی کو یہ وہم نہ ہو کہ جس طرح "فِيْ حُجُوْرِكُمْ" کی قید محض عادت اور اغلب کے اعتبار سے ہے اسی طرح "فَاِنْ لَّمْ تَكُوْنُوْا دَخَلْتُمْ بِهِنَّ" کی قید بھی عادۃً اور اغلب کے اعتبار سے ہے (یعنی اتفاقی ہے احترازی نہیں ہے یہ وہم نہ ہو) چنانچہ اس وہم کے ازالہ کے لئے فرمایا: "فَاِنْ لَّمْ تَكُوْنُوْا دَخَلْتُمْ بِهِنَّ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ" (اگر تم نے ان سے صحبت نہ کی ہو تو تم کو کوئی گناہ نہیں)۔

سوال: باندیوں کے نکاح کے سلسلہ میں فرمایا: "فَانْكِحُوْهُنَّ بِاِذْنِ اَهْلِهِنَّ وَاٰتُوْهُنَّ اُجُوْرَهُنَّ" (سو ان سے نکاح کر لیا کرو ان کے مالکوں کی اجازت سے اور ان کو ان کے مہر دے دیا کرو) حالانکہ باندی کے مہر کا مالک اس کا آقا ہوتا ہے اس بناء پر ان باندیوں کا مہر ان کے آقا کو دینا ضروری ہے نہ کہ ان باندیوں کو دینا چاہئے لہٰذا یہ کیسے فرمایا کہ ان باندیوں کو ان کے مہر دے دیا کرو؟

جوابِ اوّل: چونکہ خود باندی بھی اور اس کی تمام چیزیں اس کے آقا کی مِلک ہوتی ہیں اس لئے باندی کو مہر دینا ایسا ہی ہے جیسے اس کے آقا کو دے دینا۔

**جوابِ ثانی:** یہاں مضاف محذوف ہے اور وہ ہے ''مَوَالِیهِنَّ'' چنانچہ آیت کا معنی یہ ہوگا کہ ان باندیوں کا مہر ان کے آقاؤں کو دے دیا کرو۔

**سوال:** اس آیت کا کیا مطلب ہے: ''ذٰلِکَ لِمَنْ خَشِیَ الْعَنَتَ مِنْکُمْ'' (یہ اس شخص کے لئے ہے جو تم میں زنا کا اندیشہ رکھتا ہو) حالانکہ باندی سے نکاح کا جواز بعض علماء کے نزدیک خوفِ عَنت (زنا کا اندیشہ) کے بغیر بھی ثابت ہے؟

**جواب:** یہاں عبارت مقدر ہے اصل میں تھا: ''ذٰلِکَ اَصْوَبُ وَاَصْلَحُ لِمَنْ خَشِیَ الْعَنَتَ مِنْکُمْ'' یعنی جو تم میں زنا کا اندیشہ رکھتا ہو اس کے لئے باندی سے نکاح کر لینا زیادہ درست اور مناسب ہے لہٰذا خوفِ عَنت (زنا کا اندیشہ) کی یہ شرط اصلح اور ارشد کے لئے ہوگی۔ (جوازِ نکاح کے لئے نہ ہوگی) جیسے اس فرمانِ خداوندی میں ''خیرًا'' کی شرط اسی کے لئے ہے فرمایا: ''فَکَاتِبُوْهُمْ اِنْ عَلِمْتُمْ فِیْهِمْ خَیْرًا'' (النور:۳۳) (اگر ان میں (بہتری کے آثار) پاؤ تو ان کو مکاتب بنا دیا کرو)۔

**سوال:** یہ کیسے فرمایا: ''یُرِیْدُ اللّٰهُ لِیُبَیِّنَ لَکُمْ'' (اللہ تعالیٰ ارادہ کرتا ہے کہ تم سے بیان کر دے) حالانکہ ''ارادہ'' تو اَنْ کے ساتھ متصل ہوتا ہے یوں کہتے ہیں: یرید ان یفعل جیسے اس فرمانِ مبارک میں ''یُرِیْدُ اللّٰهُ اَنْ یُّخَفِّفَ عَنْکُمْ'' (ارادہ کرتا ہے اللہ تعالیٰ یہ کہ تخفیف کرے تم سے)۔ ارادہ کا لفظ اَنْ کے ساتھ مقترن ہے۔؟

**جواب:** کتابِ عزیز میں ''لام'' بمعنی اَنْ بہت جگہ آیا ہے جیسے ارشاد ہے: ''وَاُمِرْتُ لِاَعْدِلَ بَیْنَکُمْ'' نیز جیسے فرمایا: ''وَاُمِرْنَا لِنُسْلِمَ لِرَبِّ الْعٰلَمِیْنَ'' اور ایک اور جگہ فرمایا: ''یُرِیْدُوْنَ لِیُطْفِئُوْا'' وغیرہ۔

**سوال:** اس آیتِ مبارکہ میں تجارت کو خصوصی طور پر کیوں ذکر کیا گیا ہے: ''اِلَّا اَنْ تَکُوْنَ تِجَارَةً عَنْ تَرَاضٍ مِّنْکُمْ'' (لیکن کوئی تجارت ہو جو باہمی رضامندی سے ہو) حالانکہ تجارت کی طرح ہبہ وصیت صدقہ اور ضیافت وغیرہ بھی حلت کا تقاضا کرتے ہیں)۔

**جوابِ اوّل:** تجارت کا ذکر خاص طور پر اس لئے کیا گیا ہے کہ لوگوں کا اپنے اموال کے متعلق اکثر تصرف تجارت ہی میں ہوتا ہے۔

**جوابِ ثانی:** اسبابِ رزق کا زیادہ تر تعلق تجارت سے ہے۔ اس لئے تجارت کا خاص طور پر ذکر کیا گیا۔

**سوال:** اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ''لَوْ تُسَوّٰی بِهِمُ الْاَرْضُ'' (کاش کہ برابر کی جائے ساتھ ان

کے زمین)۔ مفسرین کہتے ہیں کہ اس کا معنی یہ ہے کہ وہ قیامت کے روز تمنا کریں گے کہ کاش وہ مٹی بن جائیں۔ جیسے سورۃ النباء کے آخر میں بھی اس کا ذکر آیا ہے۔ الفاظ کا ظاہر اس بات کا تقاضا کرتا ہے کہ وہ کفار آرزو کریں گے کہ ہم (اللہ تعالیٰ) زمین کو ان کے مثل انسان بنادیں۔ جیسے کہتے ہیں سوّیت زیدًا بعمرو' اس کا معنی ہوتا ہے کہ میں نے زید کو عمرو کے برابر کردیا' زید مسوّیٰ اور عمرو مسوّی بہ ہے؟

جواب: ''سَوَّیۡتُ ھٰذَا بِھٰذَا'' کے دو معنی ہیں (۱) دوسرے کے حکم کو پہلے پر جاری کرنا جیسے سَوَّیۡتُ زَیۡدًا بِعَمۡرٍو یعنی میں نے زید کو عمرو کے برابر کردیا' یہ سَاوَیۡتُ کی طرح ہے۔

(۲) مسوّیٰ مفعول ہو اور مسوّی بہ اس کا آلہ ہو۔ جیسے ''سَوَّیۡتُ الۡقَلَمَ بِسِکِّیۡنٍ'' یعنی میں نے قلم کو چھری کے ساتھ برابر کیا۔ قلم مسوّیٰ اور مفعول ہے اور سکّین (چھری) مسوّی بہ اور آلہ ہے۔ یا جیسے ''سَوَّیۡتُ الثَّوۡبَ بِالۡمِقۡرَاضِ'' یعنی میں نے کپڑے کو برابر قینچی سے' یعنی ٹھیک کیا' الثوب (کپڑا) مسوّی اور مفعول ہے اور مقراض (قینچی) مسوّی بہ اور آلہ ہے۔ اسی طرح اس آیت کریمہ میں بھی ''تُسَوّٰی'' کے معنی میں دو احتمال ہیں (۱) یہ بمعنی ''سَاوَیۡتُ'' ہو' آیت کا مطلب یہ بنے گا کہ وہ کفار قیامت کے دن آرزو کریں گے کہ کاش وہ مٹی بنا کر زمین کے برابر کردیئے جائیں۔ جیسے قولِ باری تعالیٰ ہے ''لَتَنُوۡٓءُ'' اور وَامۡسَحُوۡا بِرُءُوۡسِکُمۡ' ان لوگوں کے قول کے مطابق جو یہاں باء کو زائدہ قرار نہیں دیتے' نیز جیسے عام محاورہ میں کہتے ہیں: ''ادخلت الخاتم فی اصبعی'' یعنی میں نے انگوٹھی داخل کی اپنی انگلی میں)۔

(۲) یہ ''تُسَوّٰی بِھِمُ الۡاَرۡضُ'' بمعنی آلہ ہو' اس صورت میں آیتِ مبارکہ کا معنی ہوگا کہ وہ آرزو کریں گے کہ کاش زمین ان کو خوب کوٹ کر برابر کردے اور وہ مٹی بن جائیں اور پھر زیرِ زمین منتشر ہو جائیں اور زمین بالکل سیدھی اور ہموار ہو جائے کہ کہیں بھی اونچ نیچ نہ ہو۔ جیسے ایک جگہ فرمایا: ''لَا تَرٰی فِیۡہَا عِوَجًا وَّلَاۤ اَمۡتًا'' (طٰہٰ: ۱۰۷) ''(اے مخاطب) نہیں دیکھے گا تو بیچ اس کے کجی اور نہ اونچان یعنی ٹیلہ)۔ جب بعث بعد الموت ہوگا اور قبریں اور گڑھے مردوں سے خالی ہو جائیں گی تو زمین کی سطح متفاوت ہوگی تو اللہ تعالیٰ اس کو ہموار اور مساوی السطح کردیں گے' بہر حال! ہو سکتا ہے کہ کافروں کی یہ تمنا اور آرزو زمین کو مساوی سطح بنانے سے قبل ہو۔

سوال: اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد کا کیا مطلب ہے؟ ''لَکَانَ خَیۡرًا لَّھُمۡ وَاَقۡوَمَ'' (تو یہ بات ان کے لئے بہتر ہوتی اور موقع کی بات تھی) ''خَیۡرٌ'' اسم تفضیل کا صیغہ ہے' جب کہا جاتا ہے کہ ''ھٰذَا خَیۡرٌ مِّنۡ ذٰلِکَ'' یعنی یہ اس سے بہتر ہے تو اس کا مطلب اور تقاضا یہ ہوتا ہے کہ بہتری ان

دونوں باتوں میں سے ہر بات کے اندر ہے لیکن اس بات کو دوسری بات سے فضیلت ہے یعنی اس کا بظاہر مطلب یہ ہے کہ جو کلمات یہودی لوگ کہتے ہیں وہ بھی ٹھیک ہیں مگر سَمِعْنا واَطَعْنا کے کلمات اس سے زیادہ بہتر ہیں؟۔

جواب: یہاں ''خیر'' سے مراد وہ خیر ہے جو شر کے مقابل استعمال ہوتا ہے۔ اس سے مراد وہ خیر نہیں ہے جو صیغہ افعل التفضیل کا ہے۔ جیسے کہتے ہیں فی فلانٍ خَیرٌ'' فلان میں خیر ہے'' یعنی شر نہیں ہے۔

سوال: اس آیت میں ''مفعُولٌ'' سے کیا مراد ہے؟'' وكانَ اَمْرُ اللّٰه مفعُوْلًا ''(اور ہے کام اللہ کا کیا گیا)''' مفعول'' تو مخلوق ہے حالانکہ اللہ کا امر مخلوق نہیں ہے؟

جواب: یہاں ''امر'' سے مراد وہ امر نہیں ہے جو نہی کی ضد ہے۔ بلکہ اس سے مراد کوئی حادثہ یا کام یا بات ہے وغیرہ' کیونکہ اس کو''امر'' کہتے ہیں' جیسے اس فرمانِ الٰہی میں ''امر'' کا معنی کوئی کام یا بات وغیرہ ہے: '' لَعَلَّ اللّٰهَ يُحدِثُ بعد ذٰلِکَ اَمرًا ''(الطّلاق:۱)'' شاید کہ اللہ پیدا کر دے پیچھے اس کے کچھ بات'' نیز فرمایا: '' اَتاهَا اَمرُنَا لَيلًا اَو نَهارًا ''(یونس:۲۴)'' دن میں یا رات میں اس پر ہماری طرف سے کوئی حادثہ آپڑا''۔

سوال: اس آیت سے کیا مراد ہے: '' اِنَّ اللّٰهَ لا يَغفِرُ اَنْ يُّشرَکَ بِه ''(بے شک اللہ تعالٰی اس بات کو نہ بخشیں گے کہ ان کے ساتھ کسی کو شریک قرار دیا جائے'' حالانکہ بھول کر شرک کرنے والا' کرھا اور جبراً شرک کرنے والا اور شرک سے توبہ تائب ہونے والا قابلِ بخشش ہے؟

جوابِ اوّل: اس سے مراد ان لوگوں کے شرک کے ماسوا دوسروں کا شرک ہے' یہ مذکورہ لوگ خارجی دلائل کی بناء پر آیت کے عموم سے مخصوص اور مستثنٰی ہیں۔

جوابِ ثانی: مشیت کی قید کا تعلق منفی اور مثبت دونوں فعلوں سے ہے۔ گویا یوں فرمایا: بے شک اللہ تعالٰی جس کے لئے چاہے گا شرک معاف نہیں کرے گا اور جس کیلئے چاہے گا اس کے ماسوا معاف کر دے گا۔

سوال: اس آیت مذکورہ سے تو معلوم ہوتا ہے کہ شرک کے علاوہ جو گناہ ہیں ان کی بخشش قطعی نہیں ہے بلکہ ان کی بخشش متوقع ہے اور اللہ تعالٰی کے اس ارشادِ عالی: ''اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَظَلَمُوْا لَمْ يَكُنِ اللّٰهُ لِيَغفِرَ لَهُمْ وَلَا لِيَهْدِيَهُمْ طَرِيقًا اِلَّا طَرِيْقَ جَهَنَّمَ خَالِدِيْنَ فِيهَا اَبَدًا ''(النساء: ۱۶۹) سے پتہ چلتا ہے کفر اور ظلم جو غیر شرک ہیں ان کی قطعی مغفرت نہیں ہوگی' ان آیات میں تطبیق کی کیا صورت ہوگی؟۔

جوابِ اوّل: یہاں ''ظلم'' سے مراد شرک ہے' حضرت مقاتلؒ فرماتے ہیں: شرک کا نام ظلم بھی رکھا جاتا ہے' اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے'' اِنَّ الشِّرۡکَ لَظُلۡمٌ عَظِیۡمٌ ''(شرک بڑا ظلم ہے)۔ لہٰذا ایسا ہی ہے جیسے فرمایا ہو:'' اِنَّ الَّذِیۡنَ اَشۡرَکُوۡا ''

جوابِ ثانی: اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان:''وَیَغۡفِرُ مَا دُوۡنَ ذٰلِکَ لِمَنۡ یَّشَآءُ ''شرک کے ماسوا گناہ کی مغفرت پر قطعی نہیں ہے بلکہ اس کی مغفرت مشیتِ الٰہیہ کے ساتھ معلّق ہے' پھر دوسری آیت کے ذریعہ توضیح فرمائی کہ کافر ان لوگوں میں داخل نہیں ہے جن کی مغفرت' مشیتِ خداوندی سے معلّق ہے۔ لہٰذا یہ امر متعین ہوگیا کہ کافر ان لوگوں میں داخل ہے جن کی مغفرت نہیں ہوگی' اس لئے کہ ان دونوں کے درمیان کوئی واسطہ نہیں ہے۔

جوابِ ثالث: یہ آیت عام ہے لیکن دوسری آیت سے مخصوص ہے۔ جیسے اللہ تعالیٰ کا یہ قول '' اِنَّ اللّٰہَ یَغۡفِرُ الذُّنُوۡبَ جَمِیۡعًا ''پہلی آیت سے مخصوص ہے' اجماعِ امت اس کا مؤید ہے' کیوں کہ اس بات پر اجماعِ امت ہے کہ کافر اور مشرک دونوں ناقابلِ مغفرت ہیں اور جہنم میں ہمیشہ رہیں گے۔ اس کی دلیل اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان ہے'' اِنَّ الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا مِنۡ اَہۡلِ الۡکِتٰبِ وَالۡمُشۡرِکِیۡنَ فِیۡ نَارِ جَہَنَّمَ خٰلِدِیۡنَ فِیۡہَا ''یعنی بیشک وہ لوگ جو کافر ہوئے اہلِ کتاب میں سے اور مشرکین میں سے وہ ہمیشہ ہمیشہ جہنم کی آگ میں ہوں گے''۔

سوال: اللہ تعالیٰ تو مذمت کرتے ہوئے فرماتے ہیں:'' اَلَمۡ تَرَ اِلَی الَّذِیۡنَ یُزَکُّوۡنَ اَنۡفُسَہُمۡ بَلِ اللّٰہُ یُزَکِّیۡ مَنۡ یَّشَآءُ ''(کیا تو نے ان لوگوں کو نہیں دیکھا جو اپنے کو مقدس بتلاتے ہیں' بلکہ اللہ تعالیٰ جس کو چاہیں مقدس بنادیں) نیز فرمایا:'' فَلَا تُزَکُّوۡا اَنۡفُسَکُمۡ ہُوَ اَعۡلَمُ بِمَنِ اتَّقٰی ' (النجم:٣٢)(تو تم اپنے کو مقدس مت سمجھا کرو (بس) تقویٰ والوں کو وہی خوب جانتا ہے) ان آیات سے تو معلوم ہوا کہ اپنے کو مقدس اور متقی نہیں کہنا چاہئے' لیکن ایک حدیث مبارک میں حضورِ اقدس ﷺ نے خود کو مزکّی اور مقدس فرمایا ہے' حضورؐ نے فرمایا:''میں خدا کی قسم آسمان میں بھی امین ہوں اور زمین میں بھی امین ہوں'' اسی طرح یوسف علیہ السلام نے بھی فرمایا:'' اِجۡعَلۡنِیۡ عَلٰی خَزَآئِنِ الۡاَرۡضِ اِنِّیۡ حَفِیۡظٌ عَلِیۡمٌ ''(یوسف:٥٥)(ملکی خزانوں پر مجھ کو پر مامور کردو' تحقیق میں نگہبانی کرنے والا خوب جاننے والا ہوں''؟

جواب: حضورِ اکرم ﷺ نے مذکورہ فرمان اس وقت فرمایا تھا جب منافقین نے حضورؐ پر الزام لگایا تھا کہ آپؐ نے عدل اور امانت کے ساتھ مال تقسیم نہیں کیا' آپ کو چاہئے کہ اس تقسیم میں عدل و انصاف سے کام لیں تو آپؐ نے ان کی تردید اور تکذیب کے لئے مذکورہ فرمان ارشاد فرمایا۔ اور

یوسف علیہ السلام نے جو کچھ فرمایا تھا اس کی وجہ صرف احکامِ الٰہی کا نفاذ اور حق و عدل کا قیام تھا جو کہ انبیاء کے فرائضِ منصبی میں سے ہوا کرتا ہے۔ نیز یوسف علیہ السلام جانتے تھے کہ اس وقت ان کے علاوہ اور کوئی شخص بھی ایسا نہیں ہے جو اس اہم کام کو سرانجام دے سکے' لہٰذا یوسف علیہ السلام ہی چونکہ اس کے لئے متعین تھے اس لئے انہوں نے اس منصب کا مطالبہ کیا اور خود اپنی تعریف بیان کی' اس کے باوجود نبی کریم علیہ السلام سے مروی ہے کہ آپؐ نے فرمایا: ''اللہ تعالیٰ میرے بھائی یوسف علیہ السلام پر رحم فرمائے اگر وہ یہ نہ کہتے کہ مجھے ملکی خزانوں پر مامور کردو' تو اللہ اس کو اسی وقت حاکم بنادیتے لیکن ان کے کہنے کی وجہ سے ایک سال کی تاخیر ہوئی''۔

**سوال:** اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد کا کیا مطلب ہے؟ ''اَلَمْ تَرَ اِلَی الَّذِیْنَ اُوْتُوْا نَصِیْبًا مِنَ الْکِتٰبِ یُؤْمِنُوْنَ بِالْجِبْتِ وَالطَّاغُوْتِ........ اُولٰئِکَ الَّذِیْنَ لَعَنَهُمُ اللّٰهُ'' (کیا تو نے ان لوگوں کو نہیں دیکھا جن کو کتاب کا ایک حصہ ملا ہے (پھر باوجود اس کے) وہ بُت اور شیطان کو مانتے ہیں..... یہ وہ لوگ ہیں جن کو خدا تعالیٰ نے ملعون بنادیا ہے) یہاں کلام حصر کے لئے ہے اس سے معلوم ہوا کہ اللہ کی لعنت ان میں منحصر ہے' حالانکہ اللہ کی لعنت ان میں منحصر نہیں ہے بلکہ تمام کفار کو شامل ہے؟۔

**جواب:** ''اُولٰئِکَ'' کے لفظ سے ان لوگوں کی طرف اشارہ ہے جو اس بات کے قائل ہیں کہ کفّار مسلمانوں کی بہ نسبت زیادہ راہِ راست پر ہیں' ظاہر ہے یہ بات تمام کفّار کی طرف سے پائی جاتی ہے' لہٰذا لعنت ان تمام کو شامل ہوگی۔

**سوال:** '' کُلَّمَا نَضِجَتْ جُلُوْدُهُمْ بَدَّلْنٰهُمْ جُلُوْدًا غَیْرَهَا لِیَذُوْقُوا الْعَذَابَ '' (جب ایک دفعہ ان کی کھال جل چکے گی تو ہم اس پہلی کھال کی جگہ فوراً دوسری کھال پیدا کردیں گے تاکہ عذاب ہی بھگتتے رہیں) اس سے بظاہر یہ معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ گناہ والی کھالوں کی جگہ اور اس کے بدلہ ان کھالوں کو عذاب دیں گے جن کھالوں نے گناہ نہیں کئے' حالانکہ بے قصور کو عذاب دینا ظلم ہے؟۔

**جوابِ اوّل:** جب ان کی نئی کھالوں کو عذاب دیا جائے گا تو اس عذاب کا درد ان کے دلوں کو ہوگا اور ظاہر ہے کہ وہ دل تو نئے نہ ہوں گے بلکہ اصل میں وہ دل ہی شرک وغیرہ کی وجہ سے عاصی ہوں گے۔

**جوابِ ثانی:** تبدیلی سے مراد یہ ہے کہ ان کی کھالیں تو وہی رہیں گی البتہ کھالوں کو جلانا اور گالنا بار بار ہوگا' یعنی یہاں ایک کھال کی جگہ دوسری کھال کی تبدیلی کا ذکر صفات کے اعتبار سے ہے' نہ

کہ ذات کے اعتبار سے۔ صفات کی تبدیلی مراد ہے' ذات کی تبدیلی مراد نہیں ہے' جیسے اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ''یَوْمَ تُبَدَّلُ الْاَرْضُ غَیْرَ الْاَرْضِ وَالسَّمٰوٰتُ'' (ابراہیم:۴۸) (جس روز دوسری زمین بدل دی جائے گی اس زمین کے علاوہ اور آسمان بھی)۔ نیز جیسے ایک شاعر کا شعر ہے:

وما النّاس بالنّاس الذین عَہدتہم ☆ وماالدارُ بالدار التی کنتُ اعہد

(یہ لوگ وہ لوگ نہیں ہیں جن سے میں نے عہد کیا تھا اور نہ یہ گھر وہ گھر ہے جہاں میں رہتا تھا)۔

سوال: یہ کیسے فرمایا: '' وَنُدْخِلُهُمْ ظِلًّا ظَلِيلًا '' (اور ہم ان کو نہایت گنجان سایہ میں داخل کرینگے)۔

جنت میں تو دھوپ نہیں ہوگی کہ اس کی گرمی سے بچنے کے لئے سایہ کی ضرورت پیش آئے؟

جواب: یہاں مجازاً خوشگوار اور پرآسائش مقام مراد ہے جیسا کہ عرفِ عام میں ایسا کہتے ہیں۔ کیونکہ حجاز کے علاقے شدید گرم ہوتے تھے اس لئے سایہ کی جگہ ان کے لئے بڑی عمدہ تھی لہٰذا ان سے ان کے فہم اور سمجھ کے مطابق خطاب کیا گیا' جیسے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: '' وَلَهُمْ رِزْقُهُمْ فِيهَا بُكْرَةً وَعَشِيًّا '' (مریم:۶۲) (اور ان کو ان کا کھانا صبح وشام ملا کرے گا) حالانکہ جنت میں نہ طلوعِ آفتاب ہوگا اور نہ غروبِ آفتاب کہ اس میں صبح وشام کا وقت آئے' لیکن چونکہ جنت میں کھانے پینے کی تمام نعمتیں دن کے دونوں حصوں میں ان کے لئے موجود ہوں گی اس لئے یہ تعبیر اختیار کی کہ ان کے لئے صبح وشام رزق موجود ہوگا۔

سوال: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: '' فَأُولَٰئِكَ مَعَ الَّذِينَ أَنْعَمَ اللَّهُ عَلَيْهِمْ مِنَ النَّبِيِّينَ وَالصِّدِّيقِينَ وَالشُّهَدَاءِ وَالصَّالِحِينَ '' (تو ایسے اشخاص بھی ان حضرات کے ساتھ ہوں گے جن پر اللہ تعالیٰ نے انعام فرمایا ہے یعنی انبیاء اور صدیقین اور شہداء اور صلحاء)۔ اس آیتِ مبارکہ میں ان لوگوں کی مدح بیان ہوئی ہے جو اللہ ورسولؐ کے مطیع وفرماں بردار ہیں۔ اہلِ عرب کی عادت تو یہ ہے کہ جب کسی کی مدح بیان کرتے ہیں تو پہلے ادنیٰ کا ذکر کرتے ہیں پھر اعلیٰ کو بیان کرتے ہیں جسے ترقی من الادنیٰ الی الاعلیٰ کہتے ہیں' لیکن یہاں تو اس کا عکس ہے' یعنی اعلیٰ سے ادنی کی طرف نزول ہے؟۔

جواب: یہاں کلام سے مراد مذکورہ امر نہیں ہے بلکہ یہاں کلام سے اصل مقصود یہ بتانا ہے کہ جو لوگ اللہ ورسولؐ کے فرمان بردار ہیں وہ قیامت کے روز معززین اور خواص کے ساتھ ہوں گے۔ پھر گویا کسی سائل نے ان اشراف اور خواص کے متعلق سوال کیا کہ وہ کون ہیں؟ تو مزید افادہ کی خاطر معنیٰ مقصود مکمل ہونے کے بعد تفصیل بیان کی گئی کہ '' فَأُولَٰئِكَ مَعَ الَّذِينَ أَنْعَمَ اللَّهُ

عَلَیۡهِمۡ'' الایۃ اور اس تفصیل کے بیان کرنے میں اخص فالاخص اور اشرف فالاشرف کا لحاظ فرمایا گیا' اشراف اور خواص کو ذکر کرنے کی غالب وجہ یہی معلوم ہوتی ہے۔ جیسے اللہ تعالیٰ کا ارشادِ عالی ہے: ''یٰۤاَیُّهَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡۤا اَطِیۡعُوا اللّٰهَ وَاَطِیۡعُوا الرَّسُوۡلَ وَاُولِی الۡاَمۡرِ مِنۡكُمۡ'' نیز ارشادِ باری تعالیٰ ہے: ''شَهِدَ اللّٰهُ اَنَّهٗ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ وَالۡمَلٰٓئِكَةُ وَاُولُوا الۡعِلۡمِ'' خلاصہ یہ ہوا کہ آیت ہذا سے مقصود اجمالی طور پر خبر دینا ہے نہ کہ تفصیلی طور پر' جس کی دلیل یہ ہے کہ جب بندوں کو تعلیم دی کہ وہ اللہ سے اس چیز کو مانگیں تو ان لوگوں کی اس قول سے اجمالاً رہنمائی فرمائی: ''اِهۡدِنَا الصِّرَاطَ الۡمُسۡتَقِیۡمَ صِرَاطَ الَّذِیۡنَ اَنۡعَمۡتَ عَلَیۡهِمۡ''۔

**سوال:** یہاں ارشاد فرمایا: ''اِنَّ كَیۡدَ الشَّیۡطٰنِ كَانَ ضَعِیۡفًا'' (تحقیق شیطان کی تدبیر کمزور ہوتی ہے) اور عورتوں کی تدبیر کے بارے میں فرمایا: ''اِنَّ كَیۡدَكُنَّ عَظِیۡمٌ'' (تحقیق تمہاری تدبیر عظیم ہوتی ہے) ان دو آیتوں کو ملانے سے معلوم ہوتا ہے کہ عورتوں کا مکر شیطان کے مکر سے زیادہ بڑا ہوتا ہے حالانکہ یہ بات سب کو معلوم ہے کہ شیطانی تدبیر' نسوانی مکر سے عظیم تر ہوتی ہے؟

**جواب:** پہلی آیت سے مراد یہ ہے کہ اللہ کے مخلص اور نیک بندوں کے خلاف شیطان کی تدبیر حفاظتِ خداوندی کی وجہ سے کمزور اور لچر ہوتی ہے' جیسے ارشاد ہے: ''اِنَّ عِبَادِیۡ لَیۡسَ لَكَ عَلَیۡهِمۡ سُلۡطٰنٌ'' یعنی میرے بندوں پر تیرا کوئی زور نہیں چلے گا اور طرح ابلیسِ لعین کا قول نقل کرتے ہوئے فرمایا: ''اِلَّا عِبَادَكَ مِنۡهُمُ الۡمُخۡلَصِیۡنَ'' (ص:۸۳) (بجز آپ کے ان بندوں کے جو ان میں منتخب کیے گئے ہیں)۔ اور دوسری آیت سے مراد یہ ہے کہ عورتوں کے مکر اور ان کی چالاکیاں مردوں کے بہ نسبت عظیم ہیں۔ دوسرا جواب یہ بھی ہوسکتا ہے کہ: ''اِنَّ كَیۡدَكُنَّ عَظِیۡمٌ'' عزیزِ مصر کا قول ہے' اس کے قائل اللہ تعالیٰ نہیں ہیں۔ لہٰذا ان آیات میں کوئی تناقض یا تعارض نہیں ہے۔

**سوال:** ''وَاِنۡ تُصِبۡهُمۡ حَسَنَةٌ یَّقُوۡلُوۡا هٰذِهٖ مِنۡ عِنۡدِ اللّٰهِ ۚ وَاِنۡ تُصِبۡهُمۡ سَیِّئَةٌ یَّقُوۡلُوۡا هٰذِهٖ مِنۡ عِنۡدِكَ'' (اور اگر ان کو کوئی اچھی حالت پیش آتی ہے تو کہتے ہیں کہ یہ منجانب اللہ (اتفاقاً) ہوگئی اور اگر ان کو کوئی بری حالت پیش آتی ہے تو کہتے ہیں کہ یہ آپ کے سبب سے ہے) اس آیت سے منافقین اور مشرکین کی عیب چینی اور ان کی مذمت کی گئی ہے پھر اس قول سے اس کا رد کیا گیا: ''قُلۡ كُلٌّ مِّنۡ عِنۡدِ اللّٰهِ'' (آپ فرما دیجئے کہ سب کچھ اللہ ہی کی طرف سے ہے) پھر اس کے بعد فرمایا: ''مَاۤ اَصَابَكَ مِنۡ حَسَنَةٍ فَمِنَ اللّٰهِ وَمَاۤ اَصَابَكَ مِنۡ سَیِّئَةٍ فَمِنۡ نَّفۡسِكَ ؕ'' (تجھ کو جو کوئی خوشحالی پیش آتی ہے وہ محض اللہ کی جانب سے ہے اور جو کوئی بدحالی پیش آئے وہ تیرے

ہی سبب سے ہے) اب اس آیت میں منافقین کے بعینہ سی قول کی خبر دی گئی ہے جس کا پہلے رد کیا گیا تھا؟

جوابِ اوّل: بعض علماء کہتے ہیں کہ دوسرا جملہ بھی منافقین کے قول کی حکایت ہے اصل عبارت اس طرح ہے: " فَمَالِ هٰؤُلَآءِ الْقَوْمِ لَا يَكَادُوْنَ يَفْقَهُوْنَ حَدِيْثًا " یعنی ان لوگوں کو کیا ہوا کہ بات سمجھنے کے پاس کو بھی نہیں نکلتے کہ یہ یوں کہتے ہیں: " مَآ اَصَابَكَ مِنْ حَسَنَةٍ " الایۃ۔

جوابِ ثانی: اس کا معنی یہ ہے کہ اے انسان! تجھے جو کوئی خوشحالی اور آسودگی حاصل ہوتی ہے وہ محض اللہ تعالیٰ کے فضل کی وجہ سے ہوتی ہے اور جو کوئی بدحالی اور قحط زدگی پیش آتی ہے وہ تیرے ہی گناہوں اور شامتِ اعمال کے سبب آتی ہے نہ کہ محمد ﷺ کے سبب جیسا کہ مشرکین خیال کرتے ہیں۔ اس کی تائید اللہ تعالیٰ کے اس فرمانِ عالی سے ہوتی ہے: " وَمَآ اَصَابَكُمْ مِنْ مُّصِيْبَةٍ فَبِمَا كَسَبَتْ اَيْدِيْكُمْ وَيَعْفُوْا عَنْ كَثِيْرٍ " (الشوریٰ: ۳۰) (اور تم کو جو مصیبت پہنچتی ہے تو وہ تمہارے ہی ہاتھوں کے کئے ہوئے کاموں سے (پہنچتی ہے) اور بہت سی تو درگزر ہی کر دیتا ہے)۔

سوال: یہ کیسے کہا گیا ہے کہ شر اور معصیت اللہ کے ارادہ سے ہوتے ہیں حالانکہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: " وَمَآ اَصَابَكَ مِنْ سَيِّئَةٍ فَمِنْ نَّفْسِكَ " (اور تجھے جو کوئی بدحالی پیش آئے تو وہ تیرے ہی سبب سے ہے)؟

جواب: ان آیات میں "حسنة" سے مراد طاعت اور "سيئة" سے مراد معصیت نہیں ہے۔ بلکہ ان سے مراد خوش حالی و بدحالی اور نصرت و ہزیمت ہے جیسا کہ علماء کے اس میں اختلافی اقوال ہیں غور کرنے سے یہی بات معلوم ہوتی ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے " مَآ اَصَابَكَ " (جو کچھ تجھے پیش آئے) فرمایا ہے: "مَا عَمِلْتَ مِنْ سَيِّئَةٍ" (جو برائی تو نے کی) نہیں فرمایا ہے۔

سوال: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: "اَفَلَا يَتَدَبَّرُوْنَ الْقُرْاٰنَ وَلَوْ كَانَ مِنْ عِنْدِ غَيْرِ اللّٰهِ لَوَجَدُوْا فِيْهِ اخْتِلَافًا كَثِيْرًا" (تو کیا پھر قرآن میں غور نہیں کرتے اور اگر یہ اللہ کے سوا کسی اور کی طرف سے ہوتا تو اس میں بکثرت تفاوت پاتے) یہاں دو طرح کے سوالات ہیں پہلا سوال یہ ہے کہ اس آیت کا مفہوم اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ قرآن میں اختلاف کم ہے ورنہ وصفِ کثرت کے ساتھ اس اختلاف کو مقید کرنے کا کوئی فائدہ نہیں حالانکہ قرآن میں نہ زیادہ اختلاف ہے اور نہ کم یعنی بالکل اختلاف ہی نہیں ہے؟ دوسرا سوال یہ ہے کہ قرآن کے منجانب اللہ ہونے میں اختلافِ کثیر کا نہ ہونا اس بات پر دال ہے کہ غیر اللہ کی جانب سے آنے والی ہر کتاب میں اختلافِ کثیر پایا

جاتا ہے' حالانکہ یہ خلاف واقع ہے' اس لئے کہ یہاں اختلاف سے مراد یا تو اس کے الفاظ میں کذب اور تناقض ہے یا اس کے معانی میں تباین اور تعارض ہے یا پھر بلاغت اور حکمت وغیرہ میں بعض کا بعض کے درمیان تفاوت ہے؟

**جواب از سوالِ اوّل:** وصفِ کثرت کے ساتھ اختلاف کو مقید کرنا مبالغہ فی الاثبات کے لیے ہے گویا یوں فرمایا: ''اگر یہ قرآن اللہ کے سوا کسی اور کی طرف سے ہوتا تو لوگ اس میں اختلاف قلیل تو کیا' بکثرت تفاوت پاتے' لیکن یہ قرآن چونکہ اللہ کی جانب سے ہے اس لئے اس میں نہ کثیر اختلاف ہے اور نہ قلیل' لہٰذا یہ قرآن غیر اللہ کی طرف سے کیسے ہوسکتا ہے؟ چنانچہ یہاں اختلاف کو وصفِ کثرت کے ساتھ مقید کرنے سے مقصود یہی ہے' اس سے یہ مقصود نہیں ہے کہ قرآن کریم قلیل اختلاف پر مشتمل ہے' کثیر پر نہیں ہے۔

**جواب از سوالِ ثانی:** علم وفن کی کوئی بھی کتاب جو غیر اللہ کی طرف سے ہو اس میں مذکورہ تفاسیر میں سے کسی نہ کسی تفسیر کے مطابق فی الجملہ اختلاف ضرور موجود ہوتا ہے' جس کی معرفت استقراء اور تتبع سے ممکن ہے۔ اور قرآن مختلف علوم وفنون کا جامع ہے' لہٰذا اگر قرآن غیر اللہ کی طرف سے ہوتا تو اس میں ہر فن کی نسبت سے کچھ نہ کچھ اختلاف اور تفاوت ضرور ہوتا' جس کی وجہ سے مجموعہ اختلاف' اختلافِ کثیر بن جاتا۔

**سوال:** اللہ تعالیٰ کے اس ارشادِ مبارک میں: '' وَلَوْلَا فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَرَحْمَتُهٗ لَا تَّبَعْتُمُ الشَّيْطٰنَ اِلَّا قَلِيْلًا '' (اور اگر تم لوگوں پر خدا کا فضل اور رحمت نہ ہوتی تو تم سب کے سب شیطان کے پیرو ہو جاتے بجز تھوڑے سے آدمیوں کے) فضل و رحمت نہ ہونے کی صورت میں قلیل لوگوں کا استثناء کیا گیا ہے' حالانکہ اللہ تعالیٰ کا فضل اور اس کی رحمت نہ ہوتی تو بلا استثناء سب لوگ شیطان کے پیروکار ہو جاتے' یہاں کیا وجہ ہے کہ قلیل لوگوں کا استثناء کیا گیا ہے؟۔

**جوابِ اوّل:** یہ استثناء ماقبل کی طرف راجع ہے' اصل عبارت اس طرح ہے: ''اَذَاعُوْا بِهٖ اِلَّا قَلِيْلًا ''۔

**جوابِ ثانی:** بعض کہتے ہیں کہ اس کا معنی یہ ہے '' لَعَلِمَهُ الَّذِيْنَ يَسْتَنْبِطُوْنَهٗ مِنْهُمْ اِلَّا قَلِيْلًا ''

**جوابِ ثالث:** بعض کہتے ہیں کہ اس کا معنی یہ ہے: '' ولولا فضل الله عليكم بارسال الرسل لاتبعتم الشيطٰن في الكفر والضلال الا قليلا منكم كانوا يهتدون بعقولهم الى معرفة الله تعالى و توحيده '' یعنی اگر رسولوں کو مبعوث کر کے اللہ کا فضل نہ ہوتا تو تم سب کفر وضلالت میں شیطان کے پیروکار بن جاتے سوائے چند لوگوں کے کہ وہ اپنی عقلوں کے

ذریعہ خدا کی توحید اور معرفت کو حاصل کر لیتے۔ جیسے بعثتِ نبویؐ سے قبل قس بن ساعدہ اور ورقہ بن نوفل وغیرہ حضرات سے نے اپنی عقل کے ذریعہ توحید باری تعالیٰ اور معرفتِ خداوندی کو سمجھا۔

سوال: اس آیتِ کریمہ سے تو معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کا فضل اور اس کی رحمت کا وجود اکثر لوگوں کے لئے شیطان کی اتباع سے مانع ہے' حالانکہ حقیقتِ حال اس کے خلاف ہے کیونکہ اکثر لوگ کافر ہیں' اس کی تائید فرمان نبویؐ سے بھی ہوتی ہے' آپؐ نے فرمایا: ''اسلام' کفر کے مقابلہ میں ایسا ہے جیسے سیاہ رنگ کے بیل میں ایک سفید بال ہو''؟

جواب: یہاں خطاب صرف مومنین کو ہے' تمام لوگوں کو نہیں ہے۔

سوال: اگر آیتِ مذکورہ میں خطاب صرف مومنین کو ہے تو پھر استثناء کا کیا معنی ہے؟ اگر اس سے مراد شیطان کی ان معاصی میں اتباع ہے جن کیطرف وہ دعوت دیتا ہے یا جن کا دلوں میں وسوسہ ڈالتا ہے تو بایں مراد اکثر مومنین اس میں اس کے پیروکار ہیں اگرچہ عمر بھر میں کسی کبیرہ گناہ میں ایک بار ہی کیوں نہ ہو' اور اگر اس سے مراد دعوت الی الکفر میں اتباعِ شیطان ہے تو کسی بھی مومن نے کفر کے اندر اس کی پیروی نہیں کی ہے؟

جواب: اس آیتِ مبارکہ کا معنی یہ ہے کہ اے مومنو! اگر رسولؐ کے ذریعہ ہدایت دے کر اللہ تعالیٰ کا تم پر فضل نہ ہوتا تو تم کفر اور بُت پرستی وغیرہ امور میں شیطان کی پیروی کرتے مگر بعض تم میں سے ایسے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں ارسالِ رسولؐ کے علاوہ بھی زیادتیِ ہدایت اور نورِ بصیرت سے نوازا ہے کہ وہ اس کی بدولت کبھی بھی اس کی رحمت و کرم سے شیطان کے پیچھے نہ لگتے' جیسے قس بن ساعدہ اور ورقہ بن نوفل وغیرہ۔

سوال: ''وَمَنْ اَصْدَقُ مِنَ اللّٰهِ حَدِيْثًا'' (اور خدا تعالیٰ سے زیادہ کس کی بات سچی ہوگی) جس طرح قول اور علم کے متعلق یہ کہنا صحیح نہیں ہے کہ ھذا القول اقول یاھذا العلم اعلم۔ اسی طرح ھذا الصدق اصدق بھی نہیں کہا جاتا' کیوں کہ صدق نام ہے خبر کا واقع کے مطابق ہونا' لہٰذا جب یہ بات ثابت ہو جائے کہ یہ خبر نفس الامر اور واقع کے مطابق ہے تو اس میں کمی و زیادتی کا احتمال نہیں ہوتا؟

جواب: یہاں پر ''اَصْدَق'' قائل کی صفت ہے' قول کی صفت نہیں ہے' ظاہر نفس الامر اور واقع کے لحاظ سے دو قائل صدق میں متفاوت ہو سکتے ہیں' اگرچہ وہ دونوں قصۂ واحدہ کی خبر دینے میں مساوی ہوں گے اور ہر ایک اس میں صادق ہوگا' لہٰذا یہ صدق میں ایک قائل کو دوسرے قائل پر ترجیح دینا ہے نہ کہ ایک صدق کو دوسرے صدق پر ترجیح دینا ہے۔ اور اس میں کوئی شک نہیں کہ اللہ

تعالیٰ سے زیادہ کوئی بھی بات میں زیادہ صادق نہیں ہے اس لئے کہ غیر اللہ کے لئے غیر صدق عقلاً ممکن ہے بلکہ واقع بھی ہے ولو نادراً۔ جبکہ اللہ تعالیٰ دونوں چیزوں سے منزہ اور پاک ہیں۔

سوال: اللہ تعالیٰ کا فرمانِ عالی ہے: "کُلَّمَا رُدُّوْٓا اِلَی الْفِتْنَۃِ اُرْکِسُوْا فِیْھَا" (جب کبھی ان کو شرارت کی طرف متوجہ کیا جاتا ہے تو وہ اس میں جا گرتے ہیں) "ارکس" کا معنی بھی "رد" کے آتے ہیں اس لحاظ سے معنی یوں ہو جائیں گے "کلما ردوا الی الفتنۃ ردو فیھا" اور یہ تکرار ہے؟

جواب: فاعل مختلف ہونے کی وجہ سے تکرار نہیں ہے، معنی یہ ہو جائیں گے "جب کبھی ان کو ان کی قوم شرک کی طرف بلاتی ہے تو اللہ ان کو اس کی طرف لوٹا دیتے ہیں اور ان کے نفاق کی نحوست کو انہی پر پلٹ دیتے ہیں"۔ لہٰذا پہلا "رد" دعا (بلانا) کے معنی میں ہے اور "ارکس" رد اور نکس کے معنی میں ہے۔

سوال: اس آیتِ مبارکہ کا کیا مطلب ہے: "وَمَا کَانَ لِمُؤْمِنٍ اَنْ یَّقْتُلَ مُؤْمِنًا اِلَّا خَطَأً" (اور کسی مومن کی شان نہیں کہ وہ کسی مومن کو قتل کرے لیکن غلطی سے)۔ جب کہ کسی مومن کو غلطی سے قتل کرنا بھی جائز نہیں ہے؟

جوابِ اوّل: یہاں "الا" "ولا" کے معنی میں ہے یعنی "اور نہ ہی غلطی سے"۔ جیسے ان آیات میں "الا" "ولا" کے معنی میں ہے۔ ارشاد ہے: "اِنِّیْ لَا یَخَافُ لَدَیَّ الْمُرْسَلُوْنَ اِلَّا مَنْ ظَلَمَ" نیز فرمانِ الٰہی ہے: "لِئَلَّا یَکُوْنَ لِلنَّاسِ عَلَیْکُمْ حُجَّۃٌ اِلَّا الَّذِیْنَ ظَلَمُوْا مِنْھُمْ"

جوابِ ثانی: اس کا معنی یہ ہے کہ مومن کی یہ شان نہیں کہ وہ کسی کو اس وقت قتل کرے جب کہ اسے اس کے ایماندار ہونے کا یقین ہو، ہاں البتہ جب اس کو غالب گمان ہو کہ یہ مومن نہیں ہے اور وہ مشرکین کی صف میں موجود ہو تو پھر اس کو قتل کرنا جائز ہے اگرچہ وہ نفس الامر میں مومن ہو۔

سوال: یہ بات کیسے کہی جاتی ہے کہ جو مسلمان کبیرہ گناہ کے مرتکب ہوں گے وہ جہنم میں ہمیشہ نہیں رہیں گے، حالانکہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: "وَمَنْ یَّقْتُلْ مُؤْمِنًا مُّتَعَمِّدًا فَجَزَآؤُہٗ جَھَنَّمُ خٰلِدًا فِیْھَا وَغَضِبَ اللّٰہُ عَلَیْہِ وَلَعَنَہٗ وَاَعَدَّ لَہٗ عَذَابًا عَظِیْمًا" (اور جو شخص کسی مسلمان کو قصداً قتل کر ڈالے تو اس کی سزا جہنم ہے کہ ہمیشہ ہمیشہ کو اس میں رہنا ہوگا اور اس پر اللہ تعالیٰ غضبناک ہوں گے اور اس کو اپنی رحمت سے دور کر دیں گے اور اس کے لئے بڑی سزا کا سامان کرینگے) اس آیت میں تو اس کی سزا خلود فی النار بتائی گئی ہے؟

جوابِ اوّل: اس کا معنی یہ ہے کہ اس کے ایمان دار ہونے کے سبب اس کو قصداً قتل کر دے، ظاہر ہے جو کسی مومن کو اس لئے قتل کر ڈالے کہ یہ صاحبِ ایمان ہے تو وہ کافر ہو جائے گا، اور کافر کی سزا

خلود فی النار ہی ہے۔

**جوابِ ثانی:** خلود سے مراد طولِ مکث (طویل عرصہ رہنا) ہے' اس لئے کہ خلود سے جب ابدیت مراد نہ ہو تو اس سے طولِ مکث مراد ہوتا ہے' جیسے کہتے ہیں: خلّد السلطان فلانا فی الحبس' مطلب یہ ہوتا ہے کہ بادشاہ نے اس کو طویل مدّت تک قید میں رکھا۔

**سوال:** پہلے فرمایا: ''فَضَّلَ اللّٰهُ الْمُجٰهِدِيْنَ بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ عَلَى الْقٰعِدِيْنَ دَرَجَةً'' (بزرگی دی اللہ تعالیٰ نے جہاد کرنے والوں کو ساتھ مالوں اپنے کے اور جانوں اپنی کے اوپر بیٹھ رہنے والوں کے درجہ میں) اس کے بعد فرمایا: ''وَفَضَّلَ اللّٰهُ الْمُجٰهِدِيْنَ عَلَى الْقٰعِدِيْنَ اَجْرًا عَظِيْمًا لا دَرَجٰتٍ مِّنْهُ'' (اور اللہ تعالیٰ نے مجاہدین کو بمقابلہ گھر میں بیٹھنے والوں کے بڑا اجرِ عظیم دیا ہے یعنی بہت سے درجے)۔ ان آیات میں تطبیق کی کیا صورت ہوگی' پہلی آیت سے ایک درجہ کے اعتبار سے مجاہدین کی فضیلت کو بیان فرمایا اور دوسری آیت میں بہت سے درجات کے اعتبار سے ان کی فضیلت کو ذکر کیا گیا؟

**جواب:** پہلی آیت میں مجاہدین کی ان لوگوں کے مقابلہ میں فضیلت بیان کی گئی ہے جو کسی عذر کی بناء پر گھر بیٹھے رہے کہ ان مجاہدین کو ایسے قاعدین کے مقابلہ میں ایک درجہ میں فضیلت ہے کیونکہ وہ لوگ بھی جہاد کا عزم وقصد رکھتے تھے مگر کسی عذر کی وجہ سے مجاہدین کے ساتھ شامل نہ ہو سکے اس لئے فرمایا: ''وَكُلًّا وَّعَدَ اللّٰهُ الْحُسْنٰى'' (اللہ تعالیٰ نے سب سے اچھے گھر کا وعدہ کر رکھا ہے) یعنی جنت کا وعدہ ہے مجاہدین سے بھی اور کسی عذر کی وجہ سے جہاد میں نہ جا سکنے والوں سے بھی۔ اور دوسری آیت میں مجاہدین کی ان لوگوں پر تفضیل بیان کی گئی ہے جو بلا عذر جہاد کرنے والوں کے ہمراہ نہ گئے۔ ایسے قاعدین کے لئے کوئی فضیلت نہیں ہے' بلکہ وہ کوتاہی کرنے والے اور گنہگار ہیں' لہٰذا ایسے قاعدین کے مقابلہ میں ان مجاہدین کی بہت سے درجات کے ساتھ فضیلت معلوم ہوئی' کیونکہ ان قاعدین کے لئے کوئی فضیلت ہی نہیں ہے۔

**سوال:** اس ارشادِ باری تعالیٰ میں: ''قَالُوْا فِيْمَ كُنْتُمْ قَالُوْا كُنَّا مُسْتَضْعَفِيْنَ فِى الْاَرْضِ'' (وہ ان سے کہتے ہیں کہ تم کس کام میں تھے' وہ کہتے ہیں کہ ہم سرزمین میں محض مغلوب تھے)۔ جواب' سوال کے مطابق نظر نہیں آتا' جو جواب ان فرشتوں کے قول کے مطابق ہو سکتا ہے وہ یہ ہے کہ ہم اس کام میں تھے یا ہم کسی کام میں نہیں تھے؟

**جواب:** ''فِيْمَ كُنْتُمْ'' کا معنی توبیخ ہے یعنی فرشتوں نے ان کو زجر اور توبیخ کی ہے کہ وہ دین سے کچھ بھی تعلق نہیں رکھتے کیونکہ انہوں نے ہجرت نہیں کی' لہٰذا ''فِيْمَ كُنْتُمْ'' کا قول مجازاً ''لَم

تَرَکْتُمْ'' کے معنی میں ہے یعنی تم نے ہجرت کیوں ترک کی ہے؟

چنانچہ انہوں نے اس کی علت بیان کرتے ہوئے اور فرشتوں کی توبیخ پر اعتذار کرتے ہوئے کہا: ''کُنَّا مُسْتَضْعَفِیْنَ فِی الْاَرْضِ'' (ہم سرزمین میں محض مغلوب تھے) فرشتوں نے ان کے اس اعتذار کو اس طرح رد کیا: ''اَلَمْ تَکُنْ اَرْضُ اللّٰہِ وَاسِعَۃً فَتُھَاجِرُوْا فِیْھَا'' (کیا خدا تعالیٰ کی زمین وسیع نہ تھی تم کو ترکِ وطن کرکے اس میں چلا جانا چاہئے تھا)۔

مطلب یہ ہے کہ اگر تم دور ہونے کی وجہ سے مدینہ کی طرف ہجرت نہیں کر سکتے تھے تو مکہ سے کسی قریبی علاقہ کی طرف چلے جاتے جہاں تم اپنے دینِ اسلام کے اظہار پر قدرت رکھ سکتے۔

سوال: اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد کا کیا مطلب ہے؟ ''فَقَدْ وَقَعَ اَجْرُہٗ عَلَی اللّٰہِ'' (پس تحقیق ثابت ہوگیا ثواب اس کا اللہ تعالیٰ کے ذمہ) یعنی واجب ہوگیا۔ غلام تو اپنے آقا پر کسی اجر کا مستحق نہیں ہوتا اس لئے کہ وہ اجیر نہیں ہے بلکہ وہ خالص غلام ہے لہٰذا یہ کیسے فرمایا کہ اس کا اجر اللہ کے ذمہ واجب ہوگیا؟۔

جواب: اس کا معنی یہ ہے کہ اجر اس جہت سے واجب اور ثابت ہوگیا کہ اس نے اپنے بندوں سے اسکا وعدہ فرمایا ہے کہ وہ کسی کا نیک عمل کبھی ضائع نہیں کرے گا اور اللہ تعالیٰ کا وعدہ کے خلاف کرنا محال ہے۔ لہٰذا اجر کا یہ وجوب اس جہت سے ہے اور یہ وعدہ بھی ابتداءً اس کا فضل ہے۔

سوال: اس ارشادِ خداوندی میں مسافر کے لئے قصر کے جواز کے لئے دشمن کے خوف کی شرط کیوں لگائی گئی ہے حالانکہ قصر امن کی صورت میں بھی جائز ہے فرمایا: ''وَاِذَا ضَرَبْتُمْ فِی الْاَرْضِ'' الآیۃ (اور جب تم زمین میں سفر کرو........)

جوابِ اوّل: دشمن کے خوف کا ذکر شرط کے طور پر نہیں ہے بلکہ غالب اور عادت (اکثر) کے اعتبار سے ہے۔ رسولِ کریم ﷺ اور آپ کے اصحابؓ کے اکثر اسفار دشمن کے خوف سے خالی نہیں ہوتے تھے اس کی نظیر اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان ہے: ''فَکَاتِبُوْھُمْ اِنْ عَلِمْتُمْ فِیْھِمْ خَیْرًا''

جوابِ ثانی: اصل میں کلام، اللہ تعالیٰ کے اس فرمانِ مبارک پر پورا ہوجاتا ہے: ''اِنْ تَقْصُرُوْا مِنَ الصَّلٰوۃِ'' اور آگے یہ فرمانِ خداوندی: ''اِنْ خِفْتُمْ'' الآیۃ مستقل کلام ہے یعنی جملہ مستانفہ ہے (نئی بات شروع ہورہی ہے) اور اس کا جواب محذوف ہے اور وہ ہے: ''فَاحْتَاطُوْا اَوْتَاھَبُوْا'' یعنی پھر تم احتیاط سے کام لو یا پھر تم تیاری کرو۔

جوابِ ثالث: یہاں قصر سے مراد وہ قصر ہے جس کے شرائط وارکان میں سے شدتِ خوف کی حالت ہے جیسے خوف اس قدر شدید ہو کہ رکوع اور سجدہ کے ساتھ نماز نہ پڑھی جاسکتی ہو یا قبلہ رخ

ہوکر نماز ادا نہ کی جاسکتی ہو یا سواری سے اتر کر نماز کا فریضہ ادا نہ ہوسکتا ہو۔ اس سے مراد رکعات کی تعداد میں قصر نہیں ہے اور مذکورہ قصر خوف دشمن کے ساتھ مشروط ہے۔

**سوال:** اللہ تعالیٰ کا ارشاد عالی ہے: "اِنَّ الصَّلٰوۃَ کَانَتۡ عَلَی الۡمُؤۡمِنِیۡنَ کِتٰبًا مَّوۡقُوۡتًا" (یقیناً نماز مسلمانوں پر فرض ہے اور وقت کے ساتھ محدود ہے) لفظ "کَانَتۡ" ماضی پر دال ہے حالانکہ نماز فی الحال اور تا قیامت مسلمانوں پر فرض کی گئی ہے؟

**جواب:** لفظ "کَانَ" قرآن عزیز میں پانچ معانی کے لئے استعمال ہوا ہے۔ (۱) "کَانَ" ازل اور ابد کے معنی میں جیسے: "وَکَانَ اللّٰهُ عَلِیۡمًا حَکِیۡمًا" (۲) "کَانَ" ماضی کے معنی میں انقطاع کے ساتھ۔ جیسے: "وَکَانَ فِی الۡمَدِیۡنَةِ تِسۡعَةُ رَهۡطٍ" اور "کَانَ" کے معانی میں اصل یہی ہے۔ جیسے "کَانَ زَیۡدٌ صَالِحًا" اَوْ فقیرًا اَوْ مریضًا (۳) "کَانَ" بمعنی حال جیسے "اِنَّ الصَّلٰوۃَ کَانَتۡ عَلَی الۡمُؤۡمِنِیۡنَ کِتٰبًا مَّوۡقُوۡتًا" (۴) "کَانَ" بمعنی استقبال جیسے: "وَکَانَ مِنَ الۡکَافِرِیۡنَ" یعنی صار (ہوگیا)۔

**سوال:** ارشادِ خداوندی ہے: "وَتَرۡجُوۡنَ مِنَ اللّٰهِ مَالَا یَرۡجُوۡنَ" (اور تم اللہ تعالیٰ سے ایسی ایسی چیزوں کی امید رکھتے ہو کہ وہ لوگ امید نہیں رکھتے)۔ جس طرح مسلمان اجر و ثواب کی امید رکھتے ہیں اسی طرح کفار بھی مسلمانوں کے ساتھ لڑائی کرنے میں ثواب کی امید رکھتے ہیں، کیونکہ کفار بھی مسلمانوں کی طرح اپنے دین کو حق خیال کرتے ہیں اور وہ یہ سمجھتے ہیں کہ ہم دینِ الٰہی کی نصرت کر رہے ہیں اور اس کا دفاع کر رہے ہیں اور اس کے دشمنان کے خلاف جنگ کر رہے ہیں، پس ثابت ہوا کہ یہ "رجا" (امید) دونوں میں مشترک ہے؟ جب مشترک ہے تو یہ کیوں فرمایا گیا کہ تم اللہ سے امید رکھتے ہو اور وہ امید نہیں رکھتے ہیں؟

**جوابِ اوّل:** بعض کہتے ہیں کہ یہاں "رجا" خوف کے معنی میں ہے جیسے اس ارشاد باری تعالیٰ میں ہے: "مَالَکُمۡ لَا تَرۡجُوۡنَ لِلّٰهِ وَقَارًا" نیز جیسے اس میں ہے: "قُلۡ لِّلَّذِیۡنَ یَغۡفِرُوۡا لِلَّذِیۡنَ لَا یَرۡجُوۡنَ اَیَّامَ اللّٰهِ" جیسے شاعر کا قول ہے:

اذا لسعه النحل لم یَرۡجُ لَسۡعَهَا
یعنی جب اسے شہد کی مکھی ڈنک مارتی ہے

تو وہ اس کے ڈسنے کا خوف نہیں کھاتا۔

**جوابِ ثانی:** اگر "رجا" اصل (امید) ہی کے معنی میں ہو تو پھر اس کا جواب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے قرآنِ کریم میں مسلمانوں کو بشارت دی ہے اور ان سے وعدہ کیا ہے کہ ان کا دین تمام ادیان

عالم پر غالب ہوگا' ظاہر ہے کہ اس طرح کی بشارت اور وعدہ قرآن کے علاوہ باقی تمام کتب میں موجود نہیں ہے' لہٰذا دونوں باتیں الگ الگ ہوگئیں' ظاہر ہے کہ اس لحاظ سے مسلمان ہی اس بشارت اور وعدہ کے ایفاء کی امید کر سکتے ہیں۔ کفار نہیں کر سکتے۔

جوابِ ثالث: مسلمانوں کے لئے ''رجا'' ہے اور کافروں کے لئے ''طمع'' ہے' ''رجا'' اس چیز کی ہوتی ہے جس کا سبب بھی صحیح ہو اور جس کے مقدمات بھی درست ہوں' اور ''طمع'' اس کے برخلاف ہے' اس اعتبار سے کافروں کے لئے ''طمع'' تو ہے' مگر ''رجا'' نہیں ہے' ''رجا'' صرف مسلمانوں کے لئے ہے۔

سوال: اللہ تعالیٰ کے اس ارشادِ مبارک سے کیا مراد ہے اور اس کے ذکر کرنے میں کیا نکتہ ہے: ''اَوْ یَظْلِمْ نَفْسَهٗ '' (یا اپنی جان کا ضرر کرے)' صرف اس قول پر اقتصار کیوں نہیں کیا: ''وَمَنْ یَّعْمَلْ سُوْٓءًا '' (اور جو شخص برائی کرے)۔ کیونکہ ظلمِ نفس بھی عملِ سوء میں داخل ہے' صرف عملِ سوء کا ذکر کر دیتے؟

جوابِ اوّل: یہاں ''اَوْ'' واؤ کے معنی میں ہے۔ مطلب یہ ہوا کہ ''اور وہ شخص اس برائی کی وجہ سے اپنی جان کا ضرر کرے جس نے معصیت پر اسے دھنسایا''۔

جوابِ ثانی: بعض کہتے ہیں کہ ''عملِ سوء'' سے مراد شرک کے ماسوا دیگر برائیوں میں ملوث ہونا ہے اور ''ظلمِ نفس'' سے مراد شرک ہے۔

جوابِ ثالث: ''عملِ سوء'' سے مراد ہے وہ گناہ جس کا ضرر دوسرے تک متعدی ہو' اور ''ظلمِ نفس'' سے مراد ہے وہ گناہ جس کا ضرر اس کے فاعل تک محدود ہو۔

سوال: اللہ تعالیٰ کا فرمانِ مبارک ہے: ''وَلَوْلَا فَضْلُ اللّٰهِ عَلَیْکَ وَرَحْمَتُهٗ لَهَمَّتْ طَّآئِفَةٌ مِّنْهُمْ اَنْ یُّضِلُّوْکَ '' (اور اگر آپ پر اللہ کا فضل اور رحمت نہ ہو تو ان لوگوں میں سے ایک گروہ نے تو آپ کو غلطی ہی میں ڈال دینے کا ارادہ کرا یا تھا) اس آیت کے ظاہر سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ کے فضل کی وجہ سے ان لوگوں کی طرف سے آپ کو غلطی میں ڈالنے کا ارادہ نہیں پایا گیا۔

حالانکہ تفاسیر میں یہ بات منقول ہے کہ انہوں نے آپ کو بہکانے کا ارادہ کیا تھا۔ بلکہ ''هَمّ'' (قصد و ارادہ) سے بڑھ کر ان کی طرف سے ''قول مضل'' (بہکانے والی باتیں) بھی پایا گیا' یہ بات اس قصہ کے ابتدائی حصہ سے معلوم ہوتی ہے جس کا ذکر اس آیت میں ہے: ''اِنَّآ اَنْزَلْنَآ اِلَیْکَ الْکِتٰبَ بِالْحَقِّ لِتَحْکُمَ بَیْنَ النَّاسِ بِمَآ اَرٰکَ اللّٰهُ وَلَا تَکُنْ لِّلْخَآئِنِیْنَ خَصِیْمًا وَاسْتَغْفِرِ اللّٰهَ ''؟

جواب: ''لَهَمَّتْ'' ''لَوْلَا'' کا جواب نہیں ہے' بلکہ ''لَوْلَا'' سے مقدم ہے۔ ''لَوْلَا'' کا جواب محذوف ہے' اصل عبارت اس طرح ہے: ''لَقَدْ هَمَّتْ طائفة منهم اَنْ يَضلوک ولولا فضل الله عليک ورحمته لا ضلوک'' (یعنی ان لوگوں میں سے ایک گروہ نے آپ کو غلطی میں ڈالنے کا ارادہ کر لیا تھا اور اگر آپ پر اللہ کا فضل اور رحمت نہ ہوتی تو یہ لوگ آپ کو بہکا دیتے)۔

سوال: اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد میں: ''لَا خَيْرَ فِيْ كَثِيْرٍ مِّنْ نَّجْوٰهُمْ اِلَّا مَنْ اَمَرَ بِصَدَقَةٍ'' (عام لوگوں کی اکثر سرگوشیوں میں خیر نہیں ہوتی ہاں مگر جو لوگ ایسے ہیں کہ خیرات کی ترغیب دیتے ہیں۔۔۔) فعل سے اسم کا استثناء کیسے درست ہے' کیوں کہ ''نَجْوٰى'' فعل ہے اور ''مَنْ'' اسم ہے؟

جواب: یہاں الفاظ مقدر ہیں' عبارت اس طرح ہے: ''اِلَّا نَجْوٰى مَنْ اَمَرَ بِصَدَقَةٍ'' لہٰذا یہاں فعل کا استثناء فعل سے ہی ہو رہا ہے۔ اس کی نظیر اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان ہے: ''وَلٰكِنَّ الْبِرَّ مَنْ'' اصل میں ہے: ''بِرَّ من اٰمَنَ بِاللّٰهِ''

سوال: پہلے امر بالخیر کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا: ''اِلَّا مَنْ اَمَرَ'' پھر فعل بالخیر کا ذکر فرمایا: ''وَمَنْ يَّفْعَلْ ذٰلِكَ'' الآیۃ اس کی کیا وجہ ہے؟

جواب: پہلے آمر بالخیر کا ذکر اس لئے کیا تاکہ فاعل بالخیر کی خیریت بطریقِ اولیٰ معلوم ہو جائے' پھر فاعل کا ذکر کیا اور اس کے لئے اجرِ عظیم کا وعدہ فرمایا تاکہ حکم بجالانے والے فاعل بالخیر کی آمر بالخیر پر فضیلت کا اظہار ہو' جب آمر بالخیر سے اجرِ عظیم کا وعدہ کیا گیا ہے تو فاعل بالخیر سے بطریق اولیٰ اجرِ عظیم کا وعدہ ہوگا۔

سوال: پہلے تو فرمایا: ''اِنْ يَّدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِهٖٓ اِلَّآ اِنٰثًا'' یعنی یہ لوگ خدا تعالیٰ کو چھوڑ کر صرف لات و منات وغیرہ کی عبادت کرتے ہیں جو مؤنث ہیں' لیکن پھر فرمایا: ''وَاِنْ يَّدْعُوْنَ اِلَّا شَيْطٰنًا مَّرِيْدًا'' (یعنی وہ لوگ صرف شیطان کی عبادت کرتے ہیں جو سرکش ہے؟''

جواب: اس کا معنی یہ ہے کہ ان لوگوں کی بت پرستی درحقیقت شیطان پرستی ہے۔ یا تو اس لئے کہ شیطان نے بت پرستی کے اچھے ہونے کا جوان کو دھوکہ دیا اور اس کو اچھی شکل میں ان کے سامنے پیش کر کے ان کو گمراہ کیا اور بہکایا' اس میں ان لوگوں نے شیطان کی فرماں برداری اختیار کی' یا پھر اس لئے کہ شیطان بتوں پر مقرر ہے' کفار کو بتوں کی پوجا کی طرف دعوت دیتا ہے اور عبادت خانوں کے خادم کا روپ اختیار کر کے ان سے گمراہانہ باتیں کرتا ہے۔

سوال: یہ بات کیونکر صحیح ہے کہ بندہ کے لئے جنتی ہونے کا حکم صرف ایمان کی وجہ سے لگایا جائے

گا' حالانکہ اللہ تعالیٰ نے اس آیتِ مبارکہ میں بظاہر عملِ صالح کی بھی شرط لگائی ہے: ''وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ سَنُدْخِلُهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ'' (اور جو لوگ ایمان لے آئے اور اچھے کام کیے ہم ان کو عنقریب ایسے باغوں میں داخل کریں گے کہ ان کے نیچے نہریں جاری ہوں گی) اسی طرح اس آیتِ کریمہ میں بھی عملِ صالح کی شرط کا ذکر ہے: ''وَمَنْ یَّعْمَلْ مِنَ الصّٰلِحٰتِ مِنْ ذَکَرٍ اَوْ اُنْثٰی وَهُوَ مُؤْمِنٌ'' الآیۃ ورنہ اس تقیید کا کوئی فائدہ نہیں رہ جاتا؟۔

جوابِ اوّل: عملِ صالح سے مراد اخلاص فی الایمان ہے۔

جوابِ ثانی: عملِ صالح سے مراد تازیست ایمان پر ثابت قدم رہنا ہے' ظاہر ہے یہ دونوں چیزیں ایمان کے دخولِ جنت کے لئے سبب ہونے میں شرط ہیں۔

سوال: اس آیت سے کیا مراد ہے؟: ''مَنْ یَّعْمَلْ سُوْٓءًا یُّجْزَ بِهٖ'' (جو شخص کوئی برا کام کرے گا وہ اس کے عوض میں سزا دیا جائے گا)۔ جبکہ توبہ کرنے والا جب توبہ کرے تو اس کی توبہ قبول ہوتی ہے' اس کو اس کی برائی کی سزا نہیں دی جاتی' اسی طرح جو شخص کوئی برائی کرے پھر اس کے بعد کوئی نیکی کرلے تو وہ نیکی اس برائی کو مٹا دیتی ہے اور ختم کر دیتی ہے اور یہ بات نصِ قرآنی سے ثابت ہے؟

جوابِ اوّل: اس سے مراد یہ ہے کہ اگر وہ برا کام کرتا ہے اور موت تک اس پر مصر رہتا ہے تو اس کو سزا دی جائے گی' لیکن اگر وہ اس سے توبہ کرلیتا ہے تو پھر وہ اس کے عوض میں سزا نہیں دیا جائے گا۔

جوابِ ثانی: مراد یہ ہے کہ مومن کو دنیا ہی میں اس کے گناہوں کا بدلہ مختلف قسم کے مصائب اور امراض وغیرہ کی صورت میں دیا جاتا ہے مگر کافر کو آخرت میں ہی اپنے کئے کا بدلہ ملے گا' جیسا کہ حدیث شریف میں آیا ہے۔

سوال: اس ارشادِ الٰہی میں: ''وَمَنْ یَّعْمَلْ مِنَ الصّٰلِحٰتِ'' (الآیۃ) (نیک کام کرنے والے مومنوں کی تخصیص کی گئی کہ ان پر ظلم نہیں ہوگا۔

حالانکہ ان کے علاوہ جو لوگ ہوں گے ان پر بھی ظلم نہ ہوگا؟

جوابِ اوّل: ''وَلَا یُظْلَمُوْنَ نَقِیْرًا'' کا قول دونوں فریقوں کی طرف راجع ہے برائی کرنے والا فریق اور نیکی کرنے والا فریق' کیونکہ فریقین کا ذکر اس سے پہلے ہو چکا ہے۔

جوابِ ثانی: ایجاز اور اختصار کی بناء پر ایک فریق کو ذکر کرنے پر اکتفاء کیا گیا' کیونکہ یہ دوسرے فریق کے یہاں مضمر ہونے پر دلالت کرتا ہے۔ مطلب یہ ہوگا کہ مومنوں پر ان کے

اعمال کم کر کے ظلم نہیں ہوگا اور کافروں پر ان کے گناہوں کی سزا کو بڑھا کر ظلم نہیں ہوگا۔

جوابِ ثالث: یہاں ''ظلم'' سے طاعات کے ثواب میں کمی نہ کرنا مراد ہے اور یہ مومنوں کے ساتھ خاص ہے اس لئے کہ کافروں کے اعمال پر اجر و ثواب ہی نہیں ہوتا کہ جو کم کیا جائے۔

سوال: اس آیت کا کیا معنی ہے: ''یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْۤا اٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ '' (اے ایمان والو ایمان لاؤ اللہ اور اس کے رسولؐ کے ساتھ) مومنوں سے ایمان کی طلب تو تحصیلِ حاصل ہے؟

جوابِ اوّل: اس کا معنی یہ ہے کہ اے وہ لوگوں جو حضرت عیسیٰؑ پر ایمان لائے ہو اللہ اور اس کے رسول محمد ﷺ پر بھی ایمان لاؤ۔

جوابِ ثانی: اس کا معنی یہ ہے کہ اے وہ لوگو جو میثاق کے دن ایمان لائے ہو اب بھی ایمان لاؤ۔

جوابِ ثالث: اس کا معنی یہ ہے کہ اے وہ لوگو جو علانیہ طور پر ایمان لائے ہو پوشیدہ طور پر بھی ایمان لاؤ۔

سوال: اللہ تعالیٰ کا ارشادِ عالی ہے: ''اَلَّذِیْنَ یَتَرَبَّصُوْنَ بِكُمْ ۚ فَاِنْ كَانَ لَكُمْ فَتْحٌ مِّنَ اللّٰهِ قَالُوْۤا اَلَمْ نَكُنْ مَّعَكُمْ ۖ وَاِنْ كَانَ لِلْكٰفِرِیْنَ نَصِیْبٌ ''الآیۃ (وہ ایسے ہیں کہ تم پر افتاد پڑنے کے منتظر رہتے ہیں پھر اگر تمہاری فتح منجانب اللہ ہوگئی تو باتیں بناتے ہیں کہ کیا ہم تمہارے ساتھ نہ تھے اور اگر کافروں کو کچھ حصہ مل گیا......) کیا وجہ ہے کہ مسلمانوں کی کامیابی کو ''فتح'' سے اور کافروں کی کامیابی کو ''نصیب'' سے تعبیر فرمایا ہے؟

جواب: اس کی وجہ مسلمانوں کی عظمتِ شان اور کافروں کی حقارتِ شان کو بیان کرتا ہے۔ اس لئے کہ مسلمانوں کی کامیابی ایک عظیم امر ہے، کیونکہ مسلمانوں کی کامیابی دینِ الٰہی کی نصرت اور اہلِ دین کی عزت سے عبارت ہے، آسمان کے دروازے کھولے جاتے ہیں، حتیٰ کہ اللہ کے اولیاء پر نزول ہوتا ہے۔ جبکہ کافروں کی کامیابی دنیا کے معمولی مال و متاع کے حصول کے سوا کچھ بھی نہیں ہے اور وہ مذکورہ امور میں سے کسی امر کو متضمن نہیں ہوتی۔ اس لئے مسلمانوں کی کامیابی کو ''فتح'' سے اور کافروں کی کامیابی کو ''نصیب'' سے تعبیر کیا گیا۔

سوال: اس آیتِ مبارکہ سے کیا مراد ہے؟ ''وَلَنْ یَّجْعَلَ اللّٰهُ لِلْكٰفِرِیْنَ عَلَى الْمُؤْمِنِیْنَ سَبِیْلًا '' (اور اللہ تعالیٰ کافروں کو مسلمانوں کے مقابلہ میں ہرگز غالب نہ فرمائیں گے) حالانکہ غزوۂ احد وغیرہ سے لے کر آج تک کفار بھی مسلمانوں کے مقابلہ میں غالب آئے ہیں؟

جواب: اس سے مراد دلیل و برہان میں غالب آنا ہے۔ ظاہر ہے مسلمان ہی ہمیشہ دلیل و برہان میں غالب رہے ہیں۔

سوال: اللہ تعالیٰ کا ارشاد مبارک ہے: ''اِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ فِي الدَّرْكِ الْاَسْفَلِ مِنَ النَّارِ'' (بلاشبہ منافقین دوزخ کے سب سے نیچے کے طبقے میں جائیں گے)۔ اس کی کیا وجہ ہے کہ منافق کو کافر سے زیادہ سخت عذاب ہوگا حالانکہ منافق کا حال کافر سے بہتر ہے کیونکہ منافق معصوم الدم ہوتا ہے اور کافر پر کفر کا حکم لگایا جاتا ہے، یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ منافقین کے حق میں فرماتے ہیں: ''مُذَبْذَبِيْنَ بَيْنَ ذٰلِكَ لَآ اِلٰى هٰٓؤُلَآءِ وَلَآ اِلٰى هٰٓؤُلَآءِ'' (یہ معلق ہو رہے ہیں دونوں کے درمیان میں نہ ادھر نہ اُدھر)۔ پس اللہ نے ان کو نہ مومن قرار دیا اور نہ ہی کافر؟

جواب: منافق کا حال اگرچہ ظاہری طور پر کافر سے بہتر ہے اور اچھا ہے مگر اس کا حال آخرت میں اللہ کے نزدیک کافر سے بھی بدتر ہے اس لئے کہ منافق کافر کے ساتھ کفر میں شریک ہونے کے علاوہ اسلام اور اہلِ اسلام کے ساتھ استہزاء اور اللہ اور مسلمانوں کے ساتھ فریب کاری میں بھی شریک ہے۔ اس لئے وہ زیادہ سخت عذاب میں گرفتار ہوگا۔

سوال: ''لَا يُحِبُّ اللّٰهُ الْجَهْرَ بِالسُّوْٓءِ مِنَ الْقَوْلِ اِلَّا مَنْ ظُلِمَ'' (اللہ تعالیٰ بُری بات کو پکار کر کہنے کو پسند نہیں کرتے مگر جو کوئی ظلم کیا جائے) اس آیت کا کیا معنی ہے؟ اللہ تعالیٰ تو بُری بات کو بالکل ہی پسند نہیں کرتے، وہ تو عفو و درگزر کو پسند فرماتے ہیں، مگر ''اِلَّا مَنْ ظُلِمَ'' سے تو معلوم ہوتا ہے کہ مظلوم کی بُری بات کو پسند کرتے ہیں؟۔

جواب: اس کا معنی ہے ''وَلَا جَهْرَ مَنْ ظُلِمَ'' (اور نہ ہی مظلوم کے بُری بات کو زبان پر لانے کو پسند کرتے ہیں) یعنی یہاں ''اِلَّا'' بمعنیٰ ''وَلَا'' ہے۔ اسکی نظیر گزر چکی ہے ''وَمَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ اَنْ يَّقْتُلَ مُؤْمِنًا اِلَّا خَطَـًٔا''۔

سوال: ''وَلَمْ يُفَرِّقُوْا بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْهُمْ'' میں لفظ ''بَيْنَ'' کو ''اَحَد'' پر کیسے داخل کیا گیا؟ کلمہ ''بَيْنَ'' تو دو یا دو سے زیادہ امور کا تقاضا کرتا ہے، فرّقت بين زيد و عمرو یا فرقت بين القوم تو کہا جانا صحیح ہے مگر فرقت بين زيد کہنا صحیح نہیں ہے؟

جواب: یہ سوال و جواب سورۃ البقرۃ کے آخر میں بھی ''عَوَانٌ بَيْنَ ذٰلِكَ'' کے تحت گزر چکا ہے۔

سوال: اس کی کیا وجہ ہے کہ جب ''فَبِمَا نَقْضِهِمْ مِّيْثَاقَهُمْ وَكُفْرِهِمْ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ'' الآية (ان کی عہد شکنی کی وجہ سے اور ان کے کفر کی وجہ سے احکامِ الٰہیہ کے ساتھ۔۔۔۔۔) میں ایک مرتبہ کفر کا ذکر ہوگیا تھا تو دوبارہ دوسری آیت میں ''وَبِكُفْرِهِمْ'' کفر کا اعادہ کیوں کیا گیا ہے؟

جواب: اس لئے کہ ان کی طرف سے کفر بھی متکرر ہوا تھا، کیونکہ انہوں نے پہلے موسیٰ وعیسیٰ علیہما السلام کے ساتھ کفر کیا پھر محمد ﷺ کے ساتھ بھی کفر کیا، چنانچہ بعض کفر کا بعض پر عطف کیا گیا۔

سوال: یہود تو عیسیٰ بن مریم علیہ السلام کے منکر تھے' وہ عیسیٰ کو ساحر بن ساحرہ اور فاعل ابن فاعلہ کہتے تھے' لہٰذا وہ عیسیٰ علیہ السلام کے پیغمبرِ خدا ہونے کا اقرار کیسے کر سکتے ہیں جس کو اس آیت میں ذکر کیا گیا ہے: ''وَقَوْلِهِمْ اِنَّا قَتَلْنَا الْمَسِيْحَ عِيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ رَسُوْلَ اللّٰهِ'' (اور ان کے اس کہنے کی وجہ سے کہ ہم نے مسیح عیسیٰ بن مریم کو جو کہ رسول ہیں اللہ تعالیٰ کے قتل کر دیا)؟

جواب: یہود نے ان کو اللہ کا رسول بطورِ استہزاء کے کہا' جیسے فرعون نے کہا: ''اِنَّ رَسُوْلَكُمُ الَّذِىْٓ اُرْسِلَ اِلَيْكُمْ لَمَجْنُوْنٌ'' (بلاشبہ تمہارا وہ رسول جو تمہاری طرف بھیجا گیا ہے البتہ دیوانہ ہے)۔

سوال: اللہ تعالیٰ کا فرمانِ عالی ہے: ''وَاِنَّ الَّذِيْنَ اخْتَلَفُوْا فِيْهِ لَفِىْ شَكٍّ مِّنْهُ ۭ مَا لَهُمْ بِهٖ مِنْ عِلْمٍ اِلَّا اتِّبَاعَ الظَّنِّ ۚ '' (اور جو لوگ ان کے بارہ میں اختلاف کرتے ہیں وہ شک میں ہیں اس سے' ان کے پاس اس پر کوئی علم نہیں' مگر پیروی کرنا گمان کا)' اس آیتِ مبارکہ میں اولاً ان کے بارے میں بتایا گیا کہ وہ شک میں ہیں پھر بتایا گیا کہ وہ ظن کا ہی اتباع کرتے ہیں۔ حالانکہ شک میں دونوں جانبین مساوی ہوتی ہیں اور ظن دو جانبوں میں سے ایک جانب کے راجح اور غالب ہونے کا نام ہے' یعنی ظن اور شک معنی کے اعتبار سے مختلف ہیں' لہٰذا وہ لوگ شک کرنے والے بھی ہوں اور ظن کرنے والے بھی ہوں یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ اور پھر ظن کا استثناء علم سے کیا گیا' حالانکہ ظن' علم کے افراد میں سے نہیں ہے بلکہ اس کا قسیم ہے؟

جوابِ اوّل: یہاں ظن' شک کے معنی میں مجازاً استعمال کیا گیا ہے' کیونکہ ان دونوں کی عدمِ جزم میں مشابہت ہے' اور اس آیت میں ظن کا علم سے استثناء منقطع ہے' چنانچہ یہاں ''اِلَّا'' ''لٰكِنْ'' کے معنی میں ہے' اس کی نظیر یہ فرمانِ خداوندی ہے: ''لَا يَسْمَعُوْنَ فِيْهَا لَغْوًا وَّلَا تَاْثِيْمًا اِلَّا قِيْلًا سَلٰمًا سَلٰمًا'' (وہاں نہ بک بک سنیں گے اور نہ کوئی بیہودہ بات پس (ہر طرف سے) سلام ہی سلام کی آواز آئے گی)۔

سوال: اللہ تعالیٰ کا ارشادِ مبارک ہے: ''لِئَلَّا يَكُوْنَ لِلنَّاسِ عَلَى اللّٰهِ حُجَّةٌ ۢ بَعْدَ الرُّسُلِ'' (تاکہ نہ ہو واسطے لوگوں کے اوپر اللہ تعالیٰ کے الزام بعد پیغمبروں کے)' اس آیت کا کیا مطلب ہے؟ ارسالِ رُسُل کی علت یہ بیان کرنا کہ ان لوگوں کے پاس اللہ تعالیٰ کے سامنے کوئی عذر باقی نہ رہے بظاہر صحیح نہیں ہے' کیونکہ ارسالِ رُسُل سے قبل بھی لوگوں کو ایسے عقلی دلائل عطا کئے گئے ہیں جو اس کی معرفت تک پہنچانے والے ہیں' لہٰذا ارسالِ رُسُل کے بعد اللہ تعالیٰ کے سامنے لوگوں کے پاس کوئی عذر باقی نہ رہنے کا کیا مطلب ہوگا؟۔

جواب: اصل میں اللہ تعالیٰ کے رُسُل اور اس کی کتب' غفلت سے بیدار کرنے والی اور عقلی دلائل

میں غور کرنے پر ابھارنے والی ہیں اور دنیا کی حقیقت کو اور تکلیف (مکلف ہونے) کے ان احوال کا انکشاف اور ان کی تفصیل بیان کرنے والی ہیں جن کی معرفت عقلِ انسانی سے پوری طرح حاصل نہیں ہوسکتی۔ لہٰذا اللہ تعالیٰ کا اپنے پیغمبروں کو بھیجنا لوگوں کی علت کے ازالہ کے لئے اور ان پر لزومِ حجت کی تکمیل کے لئے ہے۔ تاکہ کل کو وہ یہ نہ کہدیں: ''لَوْ لَا اَرْسَلْتَ اِلَيْنَا رَسُوْلًا'' یعنی آپ نے ہماری طرف پیغمبر کیوں نہیں بھیج دیا جو ہمیں خوابِ غفلت سے بیدار کرتا اور واجب الانتباہ امر پر متنبہ کرتا۔

سوال: ''اَنْزَلَهٗ بِعِلْمِهٖ '' (اتارا اس کو اپنے علمی کمال کے ساتھ) فرمایا ہے ''أنزله بقدرته'' یا ''انزله بعلمه وقدرته'' نہیں فرمایا' حالانکہ اللہ تعالیٰ کا فعل' علم وقدرت کے بغیر نہیں ہوتا؟

جوابِ اوّل: اس کا معنی ہے: ''انزله متلبسًا بعلمه'' یا اس کا معنی ہے: وفيه علمه۔

جوابِ ثانی: بعض کہتے ہیں کہ اس کا معنی یہ ہے کہ اللہ نے اس کتاب کو آپ پر یہ جانتے ہوئے اتارا کہ ساری مخلوق میں سے آپ ہی پر اس کا نزول اولیٰ ہے۔

سوال: ''رَسُوْلُ اللّٰهِ وَكَلِمَتُهٗ '' (اللہ کے رسول ہیں اور اس کے ایک کلمہ ہیں) جب کہ کلام اللہ صفتِ قدیمہ ہے اور قائم بذاتہ ہے۔ اور حضرت عیسیٰؑ مخلوق ہیں اور حادث ہیں؟ لہٰذا ان ''پر کلمۃ اللہ'' کا اطلاق کیسے صحیح ہوسکتا ہے؟۔

جوابِ اوّل: اس کا معنی یہ ہے کہ حضرت عیسیٰؑ کا شکمِ مادر میں آنا اللہ تعالیٰ کے کلمہ ''کن'' سے بغیر باپ کے واسطہ کے ہوا' جبکہ حضرت عیسیٰؑ کے علاوہ دوسرے انسانوں کا معاملہ حضرت آدمؑ کے سوا اس سے مختلف ہے۔

جوابِ ثانی: ''کلمہ'' سے مراد حجت ہے۔

سوال: اگر پہلے جواب کے مطابق حضرت عیسیٰؑ پر کلمہ کا اطلاق درست ہے تو حضرت آدمؑ پر بھی اس کا اطلاق درست ہونا چاہئے' بلکہ بطریقِ اولیٰ درست ہونا چاہئے کیونکہ حضرت آدمؑ میں یہ معنی بدرجہ اتم موجود ہے کیونکہ حضرت آدمؑ اس کلمہ ''کُنْ'' کے ذریعہ ماں اور باپ دونوں کے واسطوں کے بغیر پیدا ہوئے؟

جواب: ہم بایں معنی حضرت آدمؑ پر بھی کلمہ کے اطلاق کو صحیح تسلیم کرتے ہیں۔

سوال: اگر حضرت آدمؑ پر بھی کلمہ کا اطلاق صحیح ہے تو قرآنِ کریم میں ضرور اس کا ذکر ہوتا جیسے حضرت عیسیٰؑ کے حق میں آیا ہے؟

جواب: عیسیٰ علیہ السلام کے ساتھ اس کی تخصیص کی گئی ہے کیونکہ جو لوگ حضرت عیسیٰؑ اور ان کی

والدہ (مریمؑ) پر بہتان لگاتے تھے اور حضرت عیسیٰؑ کی باپ کی طرف نسبت کرتے تھے ان کی تردید کے لئے ان کے حق میں "کلمۃ اللہ" لایا گیا ہے۔

جبکہ یہ معنی اور صورت آدم علیہ الصلوٰۃ والسلام کے حق میں نہیں پائی جاتی' کیونکہ سب لوگوں کا اس پر اتفاق ہے کہ آدم علیہ السلام نہ کسی باپ کی طرف منسوب ہیں اور نہ ہی کسی ماں کی طرف منسوب ہیں۔

# سورۃ المائدۃ

**سوال:** "یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْۤا اَوْفُوْا بِالْعُقُوْدِ" (اے ایمان والو عہدوں کو پورا کرو) اور "اُحِلَّتْ لَكُمْ بَهِیْمَةُ الْاَنْعَامِ" (تمہارے لئے تمام چوپائے جو مشابہ انعام (یعنی اونٹ' بکری' گائے) کے ہوں حلال کئے گئے ہیں) کے مابین کیا مناسبت اور ربط ہے؟۔

**جواب:** "عُقُوْدٌ" سے مراد وہ عہود ہیں جو اللہ تعالیٰ نے حلال کی تحلیل اور حرام کی تحریم کے سلسلہ میں ان سے لیے۔

چنانچہ پہلے اجمالاً اس کا ذکر فرمایا پھر اس کے بعد "اُحِلَّتْ لَكُمْ بَهِیْمَةُ الْاَنْعَامِ" اور "حُرِّمَتْ عَلَیْكُمُ الْمَیْتَةُ" الآیۃ میں اسی کی تفصیل بیان کردی گئی۔

**سوال:** "مَاۤ اَكَلَ السَّبُعُ" (اور جو کھا گیا ہو درندہ) کا کیا مطلب ہے؟ کیونکہ جو درندہ کھا گیا ہو وہ تو معدوم ہوگا اس کا کھانا تو ناممکن ہے' لہٰذا اس کی تحریم چہ معنی دارد؟

**جواب:** اس کا معنی ہے درندے کے کھانے کے بعد جو حصہ باقی بچا ہے اس کا کھانا۔

**سوال:** اللہ تعالیٰ کے اس ارشادِ عالی: "اَلْیَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِیْنَكُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَیْكُمْ نِعْمَتِیْ وَرَضِیْتُ لَكُمُ الْاِسْلَامَ دِیْنًا" (آج کے دن تمہارے لئے تمہارے دین کو میں نے کامل کردیا اور میں نے تم پر اپنا انعام تام کردیا اور میں نے اسلام کو تمہارا دین بننے کے لئے پسند کرلیا) کا بظاہر مفہوم یہ ہے کہ اس سے قبل اللہ تعالیٰ نے اسلام کو بطورِ دین پسند نہیں کیا تھا' حالانکہ اسلام بعثتِ نبویؐ سے ہی حضور انور ﷺ اور آپؐ کے صحابہؓ کے لئے اللہ کے نزدیک پسندیدہ رہا ہے؟۔

**جواب:** "اَلْیَوْمَ" اصل میں پہلے دو جملوں کے لئے ظرف ہے' تیسرے جملہ کے لئے ظرف نہیں ہے' اس لئے کہ پہلا واؤ عطف کے لئے اور دوسرا ابتداء کے لئے ہے' لہٰذا تیسرا جملہ مطلق ہے' موقت نہیں ہے۔

**سوال:** اللہ تعالیٰ کے اس ارشادِ مبارک میں: "یَسْــٴَـلُوْنَكَ مَاذَاۤ اُحِلَّ لَهُمْ قُلْ اُحِلَّ لَكُمُ

الطَّيِّبٰتُ'' (لوگ آپ سے پوچھتے ہیں کہ کیا کیا جانوران کے لئے حلال کئے گئے ہیں آپ فرمادیں کہ حلال کی گئی ہیں تمہارے لئے پاکیزہ چیزیں) جواب سوال کے مناسب نہیں ہے طیبات نہ معلوم و متعین ہیں اور نہ ہی متفق علیہ کیونکہ طبیعتوں اور جگہوں کے اختلاف کے سبب وہ مختلف ہیں؟۔

جواب: یہاں پر ''طَیِّبٰتُ'' سے مراد ذبیحے ہیں اہلِ عرب ذبیحہ کو طیب بھی کہتے ہیں نیز میتہ کو خبیث کا نام بھی دیتے ہیں۔ لہٰذا اصل مراد متعین ہوگئی البتہ دیگر عمومات کی طرح یہ بھی عام مخصوص البعض ہے۔

سوال: ''وَمَا عَلَّمْتُمْ مِّنَ الْجَوَارِحِ'' (جن شکاری جانوروں کو تم تعلیم دو) کہہ دینے کے بعد ''مُکَلِّبِیْنَ'' (تم سدھاتے ہو) میں کیا فائدہ ہے کیونکہ ''مُکَلِّب'' کا معنی بھی ہے شکاری کتے کو تعلیم دینے والا؟

جواب: ''مُکَلِّبْ'' کا ایک معنی ہوتا ہے شکاری جانور کو شکار کے پیچھے لگانے والا اور اس پر آمادہ کرنے والا اس معنی کے اعتبار سے یہاں کوئی تکرار نہیں ہے اور پہلے معنی کے اعتبار سے کہا جائے گا کہ پہلے تعمیم تھی پھر تخصیص کردی اس لئے کہ ان لوگوں کا عام طور پر شکار کا ذریعہ یہ کتے ہی تھے۔ گویا اغلب اور اکثر کے اعتبار سے اس کا ذکر کیا گیا۔

سوال: ''وَمَا عَلَّمْتُمْ مِنَ الْجَوَارِحِ'' کا بظاہر تقاضا یہ ہے کہ خود یہ سدھائے ہوئے شکاری جانور حلال ہوں حالانکہ وہ خود تو حرام ہیں؟

جواب: یہاں عبارت مقدر ہے اصل میں ہے: ''مَصِیْدُ مَا عَلَّمْتُمْ مِنَ الْجَوَارِحِ'' یعنی ان شکاری جانوروں کا شکار کیا ہوا جانور حلال ہے اس کی تائید ''فَکُلُوْا مِمَّآ اَمْسَکْنَ عَلَیْکُمْ'' (تو ایسے شکاری جانور جس شکار کو تمہارے لیے پکڑیں اس کو کھاؤ) سے ہوتی ہے۔

سوال: ''وَمَنْ یَّکْفُرْ بِالْاِیْمَانِ'' (اور جو شخص ایمان کے ساتھ کفر کرے گا) سے کیا مراد ہے۔ حالانکہ مومن بہ جیسے اللہ تعالیٰ ہیں اسی طرح مکفور بہ اللہ تعالیٰ ہیں جیسے: ''قُوْلُوْا اٰمَنَّا بِاللّٰہِ'' اور ''کَیْفَ تَکْفُرُوْنَ بِاللّٰہِ'' سے معلوم ہوتا ہے لہٰذا جیسے یہ کہنا صحیح نہیں کہ وہ ایمان کے ساتھ ایمان لایا اسی طرح یہ کہنا بھی صحیح نہیں ہے کہ اس نے ایمان کے ساتھ کفر کیا؟

جوابِ اوّل: ''وَمَنْ یَّکْفُرْ بِالْاِیْمَانِ'' سے مراد ہے ''جو شخص ایمان سے پھر جائے'' جیسے کہتے ہیں کَفَرَ فُلَانٌ بِالْاِسْلَامِ یعنی فلاں شخص اسلام سے مرتد ہوگیا۔ کفر ارتداد کے معنی میں ہے کیونکہ ارتداد بھی کفر کی ایک نوع ہے اور یہاں ''بِالْاِیْمَانِ'' میں باء عَنْ کے معنی میں ہے جیسے''

سَأَلَ سَائِلٌ بِعَذَابٍ وَّاقِعٍ" اور "فَاسْئَلْ بِهٖ خَبِيْرًا" وغیرہ میں باءعَنْ کے معنی میں ہے۔
جوابِ ثانی: یہاں "ایمان" سے مراد مومن بہ ہے یعنی مصدر بمعنی مفعول ہے۔ جیسے "صَيْدُ الْبَحْرِ" میں صَيْدُ مصید کے معنی میں ہے۔
سوال: یہ کیسے فرمایا: "وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لا لَهُمْ مَّغْفِرَةٌ وَّ اَجْرٌ عَظِيْمٌ" (اللہ تعالیٰ نے ایسے لوگوں سے جو ایمان لے آئے اور انہوں نے اچھے کام کئے وعدہ کیا ہے کہ ان کے لئے مغفرت اور ثواب عظیم ہے) جبکہ "وَعَمِلُوا السَّيِّئَاتِ" (اور گناہ کئے) کہنا چاہئے تھا' کیونکہ مغفرت اس کے لئے ہوتی ہے جو برائیوں کا مرتکب ہو نہ کہ اس شخص کے لئے جو نیک کام کرنے والا ہو؟
جواب: کوئی بھی شخص چھوٹے بڑے گناہ سے خالی نہیں۔ اگر چہ وہ نیک کام کرنے والا ہو' آیت کا مطلب یہ ہے کہ جو شخص ایمان لے آئے اور اچھے کام کرے اس سے اللہ کا وعدہ ہے کہ وہ اس کے سیئات کو معاف کردے گا' جیسے ارشادِ خداوندی ہے: "اِنَّ الْحَسَنَاتِ يُذْهِبْنَ السَّيِّئَاتِ" یعنی نیکیاں برائیوں کو دور کردیتی ہیں۔
سوال: "وَلَقَدْ اَخَذَ اللّٰهُ مِيْثَاقَ بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ" الایۃ کے آخر میں فرمایا: "فَمَنْ كَفَرَ بَعْدَ ذٰلِكَ مِنْكُمْ فَقَدْ ضَلَّ سَوَآءَ السَّبِيْلِ." (اور جو شخص اس کے بعد کفر کرے گا وہ بے شک راہِ راست سے دور جا پڑا) حالانکہ جس نے اس سے قبل بھی کفر کیا تھا وہ بھی راہِ راست سے دور جا پڑا؟۔
جواب: یہ بالکل صحیح ہے کہ جس نے اس سے پہلے کفر کیا وہ بھی راہِ راست پر نہیں ہے' لیکن انعامات کے ذکر کرنے کے بعد کی ضلالت زیادہ قبیح ہے' اس لئے کہ کفر کی قباحت' انکار کردہ نعمتوں کے بڑے ہونے کے بقدر ہوتی ہے' اسی لئے اس کا ذکر خاص طور پر کیا گیا۔
سوال: اس کی کیا وجہ ہے کہ "وَمِنَ الَّذِيْنَ قَالُوْٓا اِنَّا نَصٰرٰى" (اور جو لوگ کہتے ہیں کہ ہم نصاریٰ ہیں) کا انداز اختیار فرمایا ہے' یوں نہیں فرمایا: "وَمِنَ النَّصٰرٰى" (اور نصاریٰ میں سے)؟
جواب: اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ اپنے اس دعویٰ میں کہ ہم نصاریٰ ہیں جھوٹے ہیں' انہوں نے اپنا نام نصاریٰ اللہ کی نصرت کے دعویٰ پر رکھا تھا' انہی لوگوں نے حضرت عیسیٰ سے کہا کہ ہم اللہ کے انصار ہیں' بعد ازاں وہ نسطوریہ' یعقوبیہ اور ملکانیہ کے ناموں سے انصارِ شیطان بنتے ہوئے الگ الگ ہو گئے' اس لئے ان کو زجر اور توبیخ کرنے کے لئے یہ اندازِ کلام اختیار فرمایا۔

سوال: "یٰٓاَھْلَ الْکِتٰبِ قَدْ جَآءَکُمْ رَسُوْلُنَا یُبَیِّنُ لَکُمْ کَثِیْرًا مِّمَّا کُنْتُمْ تُخْفُوْنَ مِنَ الْکِتٰبِ وَیَعْفُوْا عَنْ کَثِیْرٍ" (اے اہلِ کتاب تمہارے پاس ہمارے یہ رسول آئے ہیں کتاب میں سے جن امور کا تم اخفا کرتے ہو ان میں سے بہت سی باتوں کو تمہارے سامنے صاف صاف کھول دیتے ہیں اور بہت سے امور کو واگذاشت کر دیتے ہیں) سے کیا مراد ہے؟ نبی کریم ﷺ کے لئے یہ کیسے جائز ہے کہ وہ بعض ان امور کو ظاہر نہ کریں جن کو اہلِ کتاب چھپاتے تھے؟۔

جوابِ اوّل: حضور علیہ السلام نے ان کے بعض مخفی امور کو اس لئے ظاہر نہیں کیا کہ آپ حکمِ خداوندی کا اتباع فرماتے تھے' دینی امور میں اپنی طرف سے کچھ بھی نہیں کرتے تھے' آپ ایسے کاموں میں وحیِ الٰہی کا ہی اتباع فرمایا کرتے تھے' لہٰذا جن امور کے بیان و اظہار کا آپ کو حکم دیا گیا آپ نے ان کو واضح کیا اور جن امور کے بیان اور اظہار کا حکم نہیں ملا اس کے متعلق تا حکم اظہار خاموشی اختیار فرمائی۔

اس جواب کے مطابق یہاں "عفو" مجازاً ترک کے معنی میں ہوگا' ممکن ہے اللہ تعالیٰ نے ان امور سے حضورؐ کو مطلع فرما دیا ہو مگر اہلِ کتاب کے سامنے ان کے اظہار کا حکم نہ دیا ہو۔

جوابِ ثانی: جن امور کے بیان کرنے سے کسی شرعی حکم کا اظہار ہوتا اس کو آپؐ بیان فرما دیتے جیسے آنحضرت ﷺ کی صفات اور بشارت اور آیتِ رجم وغیرہ' اور جن امور کے بیان کرنے میں محض ان کی فضاحت اور آبروریزی ہوتی اور ان کا تعلق کسی شرعی حکم سے نہ ہوتا ان سے آپؐ در گزر فرماتے۔

جوابِ ثالث: جن امور کے اظہار میں آپؐ کے کسی معجزہ کا اثبات یا جن صفات کے بیان سے آپؐ کی نبوت کی تصدیق ہوتی اس کو حضور ﷺ بیان فرماتے یا جن امور میں اہلِ کتاب باہم اختلاف کرتے اور آپ کو ان میں حکم (ثالث) بناتے تو آپؐ ان کی وضاحت فرما دیتے تھے۔

سوال: اس آیت سے کیا مراد ہے: "قَدْ جَآءَکُمْ مِّنَ اللّٰہِ نُوْرٌ وَّکِتٰبٌ مُّبِیْنٌ۔ یَّھْدِیْ بِہِ اللّٰہُ مَنِ اتَّبَعَ رِضْوَانَہٗ" (تمہارے پاس اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک روشن چیز آئی ہے اور ایک کتاب واضح (یعنی قرآن مجید) کہ اس کے ذریعہ سے اللہ تعالیٰ ایسے شخصوں کو جو رضائے حق کے طالب ہوں راہیں بتلاتے ہیں) حالانکہ بندوں کو جبتک پہلے ہدایت نہ دی جائے وہ رضائے حق کی اتباع نہیں کر سکتے پس یہاں دور لازم آتا ہے؟

جواب: یہاں عبارت مقدر ہے: "یَھْدِیْ بِہِ اللّٰہُ مَنْ عَلِمَ اَنَّہٗ یُرِیْدُ اَنْ یَّتَّبِعَ رِضْوَانَہٗ" یعنی جس کے بارے میں اللہ کو یہ علم ہوتا ہے کہ یہ رضائے حق کی اتباع کا ارادہ رکھتا ہے اللہ تعالیٰ اس کو

ہدایت بخشتے ہیں، جیسے اس آیت میں عبارت مقدر ہے: ''وَالَّذِیْنَ جَاهَدُوْا فِیْنَا لَنَهْدِیَنَّهُمْ سُبُلَنَا''، یعنی جو لوگ ہماری راہ میں مجاہدہ کی راہوں کے طالب ہیں ہم ان کو اپنے مجاہدہ کی راہیں ضرور دکھائیں گے۔

**سوال:** یہ بات کہیں بھی دیکھنے یا سننے میں نہیں آئی کہ یہودیوں یا نصرانیوں نے کہا ہو کہ وہ اللہ کے بیٹے ہیں لہٰذا ''نَحْنُ اَبْنٰٓؤُا اللّٰهِ'' (ہم اللہ کے بیٹے ہیں) سے کیا مراد ہے؟

**جوابِ اوّل:** اللہ کے بیٹوں سے مراد اللہ کے خواص ہیں، جیسے کہا جاتا ہے، ابناء الدنیا، یا ابناء الآخرۃ۔

**جوابِ ثانی:** یہاں عبارت مقدر ہے، اصل میں ہے ''ابناء انبیاء اللّٰہ''، یعنی اللہ کے نبیوں کے بیٹے۔

**سوال:** ''قُلْ فَلِمَ یُعَذِّبُکُمْ بِذُنُوْبِکُمْ'' (آپ یہ پوچھیئے کہ اچھا تو پھر تم کو تمہارے گناہوں کے عوض عذاب کیوں دیں گے) کا کیا مطلب ہے؟ وہ لوگ تو اس بات کے منکر تھے کہ ان کو ان کے گناہوں کے عوض عذاب ہوگا۔ ان کا دعویٰ تو یہ تھا کہ جو گناہ وہ دن کو کرتے ہیں وہ رات کو معاف ہو جاتے ہیں اور جو رات کو کرتے ہیں وہ دن کو معاف ہو جاتے ہیں؟

**جوابِ اوّل:** وہ اس بات کے معترف تھے کہ ان کو چالیس دنوں کے عوض عذاب ہوگا جن چالیس دنوں میں انہوں نے حضرت موسیٰؑ کی عدم موجودگی میں گوسالہ کی پوجا کی تھی جب موسیٰ علیہ السلام پروردگار کی ملاقات کے لئے گئے ہوئے تھے۔ جیسے ان کا قول ایک دوسری جگہ پر نقل کیا گیا ہے: ''قَالُوْا لَنْ تَمَسَّنَا النَّارُ اِلَّآ اَیَّامًا مَّعْدُوْدَةً''

**جوابِ ثانی:** اس سے مراد وہ عذاب ہے جو اللہ نے بعضوں پر دنیا میں نازل کیا، جیسے اصحابِ سَبت کی شکلیں مسخ کر دی گئیں اور ان کو بندر بنا دیا گیا، قارون کو خسف (زمین میں دھنسانے) کا عذاب ہوا، اس توجیہ کے مطابق فعلِ مضارع (یُعَذِّبُکُمْ) بمعنی ماضی ہوگا، اور ان کی طرف عذاب کی نسبت اصل میں ان کے آباء کی طرف ہے۔ گویا کہ فرمایا کہ پھر اس نے تمہارے آباء و اجداد کو کیوں عذاب دیا تھا۔

**سوال:** اس آیت سے کیا مراد ہے؟: ''بَلْ اَنْتُمْ بَشَرٌ مِّمَّنْ خَلَقَ ط یَغْفِرُ لِمَنْ یَّشَآءُ وَیُعَذِّبُ مَنْ یَّشَآءُ'' (بلکہ تم بھی منجملہ اور مخلوقات کے ایک معمولی آدمی ہو اللہ تعالیٰ جس کو چاہیں گے بخشیں گے اور جس کو چاہیں گے سزا دینگے) اگر اس سے مراد یہ ہے کہ اے یہودیو اور عیسائیو! وہ تم میں سے جس کو چاہیں گے بخشیں گے اور جس کو چاہیں گے سزا دیں گے تو اس سے ان کی مغفرت کا جواز ثابت ہوتا ہے جو کہ اس آیت کی وجہ سے صحیح نہیں ہے: ''اِنَّ اللّٰهَ لَا یَغْفِرُ اَنْ یُّشْرَکَ بِهٖ'' اور اگر

اس سے مراد مومنین ہیں کہ مومنین میں سے جس کو چاہیں گے بخشیں گے اور جس کو چاہیں گے سزا دیں گے تو یہ ان کے قول کا جواب نہیں بن سکتا؟۔
جوابِ اوّل: اس سے مراد یہ ہے کہ جب وہ کفر (وغیرہ) سے توبہ کرلیں تو جس کو چاہیں گے بخشیں گے۔
جوابِ ثانی: مراد یہ ہے کہ مخلوقات میں سے جس کو چاہیں گے بخشیں گے یعنی مومنوں کو اور جس کو چاہیں گے عذاب دیں گے یعنی مشرکوں کو۔
سوال: اس آیت سے کیا مراد ہے؟ "یٰقَوْمِ اذْكُرُوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ اِذْ جَعَلَ فِيْكُمْ اَنْۢبِيَآءَ وَجَعَلَكُمْ مُّلُوْكًا" (اے میری قوم تم اللہ تعالیٰ کے انعام کو جو تم پر ہوا ہے یاد کرو جبکہ اللہ تعالیٰ نے تم میں بہت سے پیغمبر بنائے اور تم کو صاحب ملک بنایا) حالانکہ قوم موسیٰ صاحب ملک نہیں تھی؟
جوابِ اوّل: اس سے مراد بنی اسرائیل کے صاحبِ ملک لوگ ہیں وہ بارہ قبیلوں کے بارہ صاحبِ ملک تھے، ہر قبیلہ کا ایک صاحبِ ملک۔
جوابِ ثانی: اس سے مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو صحت وکفایت، خادم وزوجہ موافقہ اور گھروں سے نوازا، چنانچہ ان کو صاحبِ ملک فرمایا۔
جوابِ ثالث: اس سے مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو ایسے وسیع محلات عطا فرمائے جن میں نہریں بہتی تھیں۔
سوال: ان دو شخصوں کو کیسے معلوم ہو گیا کہ وہی غالب آئیں گے حتی کہ انہوں نے یہ کہا: "فَاِذَا دَخَلْتُمُوْهُ فَاِنَّكُمْ غٰلِبُوْنَ" (جس وقت تم دروازہ میں قدم رکھو گے اسی وقت غالب آجاؤ گے) آخر ان کو اپنے غالب آنے کا علم کس طریقہ سے ہوا؟
جوابِ اوّل: کیونکہ انہیں حضرت موسیٰ کی اس خبر پر کامل یقین تھا کہ: "اُدْخُلُوا الْاَرْضَ الْمُقَدَّسَةَ الَّتِیْ كَتَبَ اللّٰهُ لَكُمْ" (اس متبرک ملک میں داخل ہو کہ اس کو اللہ تعالیٰ نے تمہارے حصہ میں لکھ دیا ہے)
جوابِ ثانی: ان کو اپنے غالب ہونے کا علم غالب گمان کے طور پر ہوا تھا، انہیں وہ زمانہ یاد تھا جب اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی ان کے دشمنوں کے خلاف نصرت وامداد فرمائی تھی۔
سوال: "وَعَلَى اللّٰهِ فَتَوَكَّلُوْۤا اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ" (اور اللہ پر توکل رکھو اگر تم ایمان رکھتے ہو) یہاں تعلیق اس امر کا فائدہ دیتی ہے کہ جو شخص اللہ پر توکل نہیں رکھتا وہ مومن نہیں ہے، ورنہ یہ تعلیق بیکار ہے حالانکہ حقیقتِ امر یہ نہیں ہے؟

جواب: یہاں پر "اِنْ" "اِذَا" کے معنی میں ہے' لہٰذا یہ تعلیل کے معنی میں ہوگا' جیسے اس آیتِ کر
میں "وَذَرُوْا مَا بَقِیَ مِنَ الرِّبٰوا اِنْ کُنْتُمْ مُّؤْمِنِیْنَ"

سوال: دو آیتیں ہیں' ایک ہے: "اُدْخُلُوا الْاَرْضَ الْمُقَدَّسَةَ الَّتِیْ کَتَبَ اللّٰہُ لَکُمْ" (ا
متبرک ملک میں داخل ہو جس کو اللہ تعالیٰ نے تمہارے حصہ میں لکھ دیا ہے) اور دوسری آ
ہے: "فَاِنَّهَا مُحَرَّمَةٌ عَلَيْهِمْ" (پس تحقیق وہ زمین حرام کی گئی ہے ان پر) ان دو آیتوں میں تطب
کیسے ہوگی؟

جوابِ اوّل: اس کا معنی یہ ہے کہ یہ زمین تمہارے حصہ میں اللہ نے لکھ دی ہے بشرطیکہ تم اس
باشندوں سے جہاد کرو' لیکن جب انہوں نے جہاد کرنے سے انکار کر دیا تو کہہ دیا گیا کہ یہ زمین ا
پر حرام کر دی گئی ہے یعنی ان کے ہاتھ نہ لگے گی۔

جوابِ ثانی: کتابت اور تحریم دونوں عام ہیں لیکن ان سے خاص مراد لیا گیا ہے' چنانچہ کتابہ
(زمین کا تمہارے حصہ میں لکھ دینا) بعضوں کے لئے ہے اور اس سے مراد اطاعت گزار ہیں
اور تحریم بعضوں کے لئے ہے یعنی نافرمانوں پر حرام ہے۔

جوابِ ثالث: تحریم' چالیس برس کے ساتھ موقت ہے اور کتابت غیر موقت ہے۔ لہٰذا معنی
ہوں گے کہ چالیس برس گزرنے کے بعد ان کے حصہ میں آئے گی۔ مگر یہ جواب ان حضرات کے
قول کے مطابق تام ہوگا جو "اَرْبَعِیْنَ" کو "مُحَرَّمَةٌ" کی وجہ سے منصوب قرار دیتے ہیں اور ا
کو ظرف بناتے ہیں لیکن جو لوگ "اَرْبَعِیْنَ" کو "یَتِیْهُوْنَ" کا ظرف بناتے ہیں ان کے قول کے
مطابق تحریم ابدی طور پر ہوگی' اور یہ جواب تام نہیں ہوگا۔ اس لئے کہ ان کے نزدیک تقدیر
عبارت اس طرح ہوگی: "فَاِنَّهَا مُحَرَّمَةٌ عَلَيْهِمْ اَبَدًا یَتِیْهُوْنَ فِی الْاَرْضِ اَرْبَعِیْنَ سَنَةً" یع
وہ زمین ہمیشہ کے لئے ان پر حرام کر دی گئی ہے اور وہ چالیس برس تک اس زمین میں سرگردا
پھریں گے۔

یہ ایک ایسا مقام ہے جہاں مفسرین نے اختلاف کیا ہے۔ چنانچہ امام فراء ان لوگو
میں سے ہیں جو "اَرْبَعِیْنَ" کے نصب کو محرّمة اور یتیهون کی بناء پر جائز قرار دیتے ہیں ا
امام زجاج ان لوگوں میں سے ہیں جو محرّمة کی وجہ سے اس کے نصب کے جواز کو منع کر
ہیں۔ بعض نقل کرتے ہیں کہ تحریم ابدی طور پر تھی اور وہ چالیس برس کے بعد بھی داخل نہ
ہوئے' اور بعض سے یہ منقول ہے کہ جو لوگ ان میں سے باقی رہے اور جو مر گئے ان کی او
چالیس سال کے بعد اس سرزمین میں داخل ہوئی۔

پہلی توجیہ کی تائید اس سے ہوتی ہے کہ کلامِ عرب میں فعل کا ظرف پر تقدم غالب ستعال ہے۔ جیسے کہا جاتا ہے: سافر زید اربعین یوماً وغیرہ۔ جبکہ اس کا عکس بہت کم ستعال ہوتا ہے۔

وال: اس کی کیا وجہ ہے کہ: ''اِذْ قَرَّبَا قُرْبَانًا'' (جس وقت دونوں نے ایک نیاز پیش کی) فرمایا لیے۔ ''قُرْبَانَیْن'' (دو نیازیں) نہیں فرمایا' حالانکہ ان میں سے ہر ایک نے ایک ایک نیاز پیش ی تھی؟۔

واب اوّل: اس سے مراد جنس ہے جسے مفرد لفظ سے تعبیر کیا گیا' جیسے اس آیت میں: ''وَالْمَلَکُ عَلٰی اَرْجَائِهَا''

واب ثانی: عرب کے لوگ کبھی واحد بول کر تثنیہ مراد لیتے ہیں' جیسے اس آیت میں: ''عَنِ الْیَمِیْنِ وَعَنِ الشِّمَالِ قَعِیْدٌ'' نیز ایک شاعر کہتا ہے:

انی وقیار بها لغریب یعنی اصل میں تھا ''فانی بها لغریب وقیار کذلک'' اسی طرح اس یتِ مبارکہ میں: ''اِنَّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَالَّذِیْنَ هَادُوْا وَالنَّصٰرٰی وَالصَّابِئِیْنَ'' الآیۃ۔

واب ثالث: ''قُرْبَانًا'' واحد اس لئے لائے کہ فعیل وزن میں واحد' تثنیہ اور جمع سب برابر ہیں۔

سوال: ''اِنَّمَا یَتَقَبَّلُ اللّٰهُ مِنَ الْمُتَّقِیْنَ'' (خدا تعالیٰ متقیوں ہی کا عمل قبول کرتے ہیں) ''لَاَقْتُلَنَّکَ'' (میں تجھ کو ضرور قتل کروں گا) کا جواب کیسے بن سکتا ہے؟

جواب: چونکہ قابیل کا اپنے بھائی سے حسد اس کی نیاز کے قبول ہونے کی وجہ سے تھا اسی چیز نے نفس کو آمادہ کیا کہ وہ اس کو قتل کی دھمکی دے' اس لئے اس نے یہ بات تعریضاً اور حقیقتِ جواب سے کنایہ کے طور پر کہی۔

لہٰذا معنی یہ ہوا کہ جب تو نے اپنی نیاز تقویٰ سے خالی پیش کی تو مجھے کیوں کر قتل کرتے ، میں نے تو اپنی نیاز تقویٰ سے پیش کی۔

سوال: ہابیل نے قابیل سے یہ کیسے کہا: ''اِنِّیْ اُرِیْدُ اَنْ تَبُوْٓاَ بِاِثْمِیْ وَاِثْمِکَ'' (میں یوں چاہتا ہوں کہ تو میرے گناہ اور اپنے گناہ سب اپنے سر رکھ لے) حالانکہ ایک اجنبی کے لیے جب برائی کا ارادہ اور اسے گناہ میں مبتلا کرنا حرام ہے تو بھائی کے لیے کیسے روا ہوگا؟۔

جواب اوّل: یہاں حرفِ نفی مضمر ہے' اصل عبارت اس طرح ہے: ''انی ارید ان لا تبوأ باثمی و اثمک'' یعنی میں چاہتا ہوں کہ تم میرے گناہ اور اپنے گناہ کے ساتھ نہ پھرو' جیسے اس آیت میں رفِ نفی مقدر ہے: ''وَاَلْقٰی فِی الْاَرْضِ رَوَاسِیَ اَنْ تَمِیْدَ بِکُمْ'' یعنی ''ان لا تمید بکم'' نیز

جیسے اس آیت میں مقدر ہے" تَاللّٰہِ تَفتَؤُا تَذکُرُ یُوسُفَ "اور امری القیس کے اس قول میں بھی حرف نفی محذوف ہے:

فقلتُ یمینِ اللّٰہِ ابرح قاعداً یعنی لا ابرح قاعداً

**جوابِ ثانی:** یہاں مضاف محذوف ہے اصل میں یوں ہے: "انی ارید انتفاء ان تبوأ باثمی واثمک "یعنی میں چاہتا ہوں کہ تم میرے گناہ اور اپنے گناہ کو اپنے سر نہ رکھو۔ جیسے اس آیت میں مضاف محذوف ہے:" وَاُشرِبُوا فِی قُلُوبِھِمُ العِجلَ " یعنی حبّ العجل۔

**جوابِ ثالث:** اس کا معنی یہ ہے کہ میں یہ امر چاہتا ہوں بشرطیکہ تم مجھے قتل کرو مطلقاً نہیں۔

**جوابِ رابع:** قابیل ظالم تھا' اور ظالم کی جزا کا ارادہ جب اللہ کی طرف سے اچھا ہے تو بندہ کی جانب سے بھی اچھا ہے۔

**سوال:** اللہ تعالیٰ کا فرمان:" فَاَصبَحَ مِنَ النّٰدِمِینَ "(پس ہو گیا پشیمانوں میں سے) اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ قابیل تائب ہو گیا تھا' کیونکہ حضور ﷺ کا ارشاد ہے کہ" ندامت ہی حقیقت میں توبہ ہے" لہٰذا قابیل مستحقِ دوزخ نہیں ہوگا؟

**جوابِ اوّل:** قابیل کو شرمندگی اپنے بھائی کے قتل پر نہیں ہوئی تھی بلکہ سال بھر اپنی گردن پر اسے اٹھائے پھرنے پر ہوئی تھی یا اسے اس بات پر شرمندگی ہوئی کہ اسے اپنے بھائی کو دفن کرنے کی نہیں سوجھ رہی تھی بالآخر ایک کوے نے اس کو دفن کرنے کا طریقہ سکھایا۔ یا اسے اپنے بھائی کی گمشدگی پر پشیمانی ہوئی نہ کہ اپنے گناہ پر۔

**جوابِ ثانی:** اگر ہم اس بات کو تسلیم کر لیں کہ قابیل کو شرمندگی اپنے بھائی کے قتل کرنے پر ہوئی تھی تو ممکن ہے کہ ندامت ان کی شریعت میں توبہ شمار نہ ہوتی ہو' صرف ہماری شریعت میں اس کا توبہ ہونا معتبر ہو۔

**جوابِ ثلث:** توبہ' حقوق اللہ میں مؤثر ہوتی ہے' حقوق العباد میں مؤثر نہیں ہوتی۔ خون کرنا' حقوق العباد میں سے ہے' لہٰذا اس میں توبہ مؤثر نہیں ہوگی۔

**سوال:** ایک کا قتل کل کے قتل کی طرح اور ایک کا احیاء کل کے احیاء کی طرح کیسے ہو سکتا ہے' جب کہ دلیل بدو وجہ اس کا انکار کرتی ہے: پہلی وجہ یہ ہے کہ جرم جنایت جب بھی متعدد اور بہ کثرت ہوں گے تو وہ اور زیادہ قبیح ہوں گے لہٰذا اس پر گناہ اور سزا کی زیادتی بھی مناسب ہوگی یہی بات عقل وحکمت کے مطابق ہے۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ اس تشبیہ سے یا تو گناہ اور سزا میں ایک فرد اور کُل افراد کے قتل کا مساوی ہونا مراد ہے یا متقارب ہونا مراد ہے۔ اس سے یہ لازم آتا ہے کہ

جب وہ دوسرے شخص کو یا تیسرے شخص کو (هلم جراً) قتل کرے گا تو اس پر ایک اور گناہ نہیں ہوگا اور وہ ایک اور سزا کا سزاوار نہیں ہوگا' کیونکہ وہ کل افراد کے قتل کے گناہ کا ایک گناہ ہے' اور صرف اوّل یا اوّل اور ثانی کے قتل پر کُل کے قتل کی سزا کا مستحق ہوگا' اس لئے کہ جب ایک کا قتل کُل کے قتل کے مساوی یا مقارب ہے تو دو آدمیوں کا قتل' اس پر کُل انسانوں کے قتل کے گناہ اور کل انسانوں کے قتل کی سزا لازم کرے گا' لہٰذا اس کے بعد تیسرے اور چوتھے الیٰ آخرہ کے قتل سے کیا زیادتی ہوگی' اور یہ جائز نہیں کہ وہ ایک شخص یا دو شخصوں کے قتل سے بھی کُل انسانوں کے قتل کے گناہ کا مستحق ہو اور کل انسانوں کے قتل سے بھی کل انسانوں کے قتل کے گناہ کا مستوجب ہو؟۔

جوابِ اوّل: راجح قول یہ ہے کہ اس سے مراد یہ ہے کہ جس نے ایک جان بھی ناحق قتل کر دی تو اگر اس کا ولی نہ ہو تو تمام لوگ دنیا میں اس کے خصم ہیں اور آخرت میں مطلقاً ہیں۔ کیونکہ سب لوگ ایک باپ اور ایک ماں سے پیدا ہوئے۔

جوابِ ثانی: اس کا معنی یہ ہے کہ جس نے کسی ایسی جان کو جو نبی ہے یا امام عادل ہے قتل کر دیا تو یہ ایسا ہے جیسے اس نے تمام لوگوں کی منفعت کو ضائع کرنے کے اعتبار سے ساری انسانیت ہی کو قتل کر ڈالا۔

اس لئے کہ ایک نبی یا امامِ عادل کا نفع سب کو شامل ہوتا ہے۔

جوابِ ثالث: ''مَنْ قَتَلَ'' سے مراد قابیل ہے۔ قابیل پر گناہ ایسا ہوگا جیسا سب لوگوں کے قتل کا گناہ۔ کیونکہ قابیل پہلا شخص تھا جس نے قتل کا طریقہ رائج کیا' لہٰذا اس کے بعد جو قتل بھی ہوگا اس کا گناہ قابیل کو سبب بننے کی بناء پر ملتا رہے گا۔

جیسا کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا: ''مَنْ سنّ سنة حسنة ''الحدیث۔ یہ معنی (بظاہر) احسن ہے البتہ آیت کے یہ الفاظ اس کے مؤید نہیں ہیں: ''مِنْ اَجْلِ ذٰلِکَ کَتَبْنَا عَلٰی بَنِیْ اِسْرَآءِ یْلَ'' اس لئے کہ یہ معنی اس وقت صحیح ہوسکتا ہے جب اس سے مراد قابیل ہو اور س کی کتابت بنی اسرائیل کے ساتھ خاص نہ ہو۔

سوال: اس ارشادِ خداوندی کا کیا مطلب ہے: ''اِنَّمَا جَزٰٓؤُا الَّذِیْنَ یُحَارِبُوْنَ اللّٰہَ وَرَسُوْلَہٗ'' الآیۃ (جو لوگ اللہ تعالیٰ سے اور اس کے رسول سے لڑتے ہیں ان کی یہی سزا ہے۔۔۔) بندہ اور رب کے درمیان لڑائی ممتنع (ناممکن) ہے؟

جوابِ اوّل: یہاں عبارت مقدر ہے' اصل میں ہے ''یحاربونَ اولیاءَ اللّٰہِ'' یعنی اللہ کے اولیا سے لڑتے ہیں۔

**جوابِ ثانی:** یہاں محاربت سے مراد مخالفت ہے۔
**سوال:** اللہ تعالیٰ کا ارشادِ مبارک ہے: "اِنَّ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا لَوْ اَنَّ لَهُمْ مَّا فِی الْاَرْضِ جَمِیْعًا وَّمِثْلَهٗ مَعَهٗ لِیَفْتَدُوْا بِهٖ" (یقیناً جو لوگ کافر ہیں اگر ان کے پاس تمام دنیا بھر کی چیزیں ہوں اور ان چیزوں کے ساتھ اتنی چیزیں اور بھی ہوں تا کہ وہ اس کو دے کر چھوٹ جائیں۔۔۔) یہاں پر "بِہٖ" فرمایا ہے' حالانکہ جب دو چیزیں پہلے مذکور ہیں تو ضمیر بھی "بهما" ہونی چاہئے؟
**جواب:** اس قسم کا جواب پہلے بھی: "اِذْ قَرَّبَا قُرْبَانًا" کے تحت گزر چکا ہے۔
یہاں ایک اور جواب بھی ہے' وہ یہ ہے کہ اسمِ اشارہ کی جگہ پر اسمِ ضمیر کو رکھ دیا گیا ہے' گویا کہ فرمایا: "لیفتدوا بذلک" اور "ذلک" کے ذریعہ واحد' تثنیہ اور جمع سب کی طرف اشارہ کیا جاتا ہے۔
**سوال:** اس آیتِ مبارکہ سے کیا فائدہ حاصل ہوتا ہے؟ "فَاِنْ جَآءُوْكَ فَاحْكُمْ بَیْنَهُمْ اَوْ اَعْرِضْ عَنْهُمْ" (اگر یہ لوگ آپ کے پاس آئیں تو خواہ آپ ان میں فیصلہ کر دیجئے یا ان کو ٹال دیجئے) نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کا اہلِ کتاب کے ساتھ معاملہ ان دو صورتوں سے خالی نہیں تھا' یا تو آپ ان میں فیصلہ فرما دیتے یا ان سے اعراض فرماتے' پھر اس کے ذکر کرنے میں کیا فائدہ ہے؟
**جوابِ اوّل:** اس کا فائدہ یہ ہے کہ نبی علیہ السلام کو ان کے مابین فیصلہ کرنے یا نہ کرنے کا اختیار دیا گیا ہے تا کہ آپ کو معلوم ہو کہ اہلِ کتاب کے مابین فیصلہ کرنا آپ پر واجب نہیں ہے جیسے مسلمانوں کے درمیان فیصلہ کرنا آپ پر واجب ہے جب وہ اپنا کوئی معاملہ لے کر آئیں۔
**جوابِ ثانی:** بعض کہتے ہیں کہ یہ تخییر اس آیت کریمہ سے منسوخ ہے: "فَاحْكُمْ بَیْنَهُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ" اس سے مراد قرآنِ مجید ہے' اس کی دلیل یہ ہے: "وَلَا تَتَّبِعْ اَهْوَآءَهُمْ" یعنی آپ تورات کے ذریعہ فیصلہ کر کے ان کی خواہشوں کی پیروی نہ کریں۔
**سوال:** جب اللہ تعالیٰ نے قرآنِ کریم کو نازل فرمایا تو انجیل منسوخ ہو گئی لہٰذا یہ کیسے فرمایا: "وَلْیَحْكُمْ اَهْلُ الْاِنْجِیْلِ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فِیْهِ" (اور انجیل والوں کو چاہئے کہ اللہ تعالیٰ نے جو کچھ اس میں نازل فرمایا ہے اس کے موافق حکم کیا کریں)؟
**جواب:** یہ عام مخصوص ہے' یعنی اللہ تعالیٰ نے انجیل میں حضور کی نبوت کی صداقت پر جو علامات نازل فرمائیں اور بیان فرمائیں ہیں اس کے مطابق اہلِ انجیل حکم کیا کریں' اور یہ منسوخ نہیں ہے۔
**سوال:** اس آیتِ کریمہ سے کیا مراد ہے: "فَاِنْ تَوَلَّوْا فَاعْلَمْ اَنَّمَا یُرِیْدُ اللّٰهُ اَنْ یُّصِیْبَهُمْ بِبَعْضِ ذُنُوْبِهِمْ" (پھر اگر یہ لوگ اعراض کریں تو یہ یقین کر لیجئے کہ بس خدا ہی کو منظور ہے کہ ان

کے بعضے جرموں پران کو سزا دیں)' حالانکہ کفار تو اپنے تمام گناہوں اور جرموں پر سزا پائیں گے؟

جوابِ اوّل: اس سے مراد دُنیوی سزا ہے' یعنی بنی النضیر یا بنی قریظہ کی جلاوطنی' اور یہ ان کے بعضے جرموں کی سزا ہے' کیونکہ یہ دائمی سزا نہیں ہے' باقی رہی ان کی وہ سزا جو ان کو شرک کی بناء پر ملے گی وہ دائمی ہوگی' دنیا میں اس کا تصور بھی ممکن نہیں۔

جوابِ ثانی: بعض کہتے ہیں کہ اس "بعض" سے مراد ان کا قرآنی حکم کو تسلیم نہ کرنے اور اس سے اعراض کرنے کا گناہ ہے' اس کو مبہم اس لئے رکھا تا کہ اس کی شان ظاہر ہو۔

سوال: خدائی فیصلہ کا صحیح اور اچھا ہونا بالعموم ثابت شدہ امر ہے' خواہ یقین رکھنے والی قوم ہو یا نہ ہو۔

تو پھر یہ کیسے فرمایا: " وَمَنْ اَحْسَنُ مِنَ اللّٰهِ حُكْمًا لِقَوْمٍ يُّوْقِنُوْنَ " (اور فیصلہ کرنے میں اللہ سے کون اچھا ہوگا یقین رکھنے والوں کے نزدیک)؟

جواب: چونکہ یقین رکھنے والے لوگ دوسروں کی بہ نسبت اس سے زیادہ نفع اٹھاتے ہیں اس لئے حقیقت میں وہی منتفع ہونے والے ہیں' دوسرے نہیں ہیں' اس لئے ان کو خاص کرلیا گیا' اور اس کی نسبت انہی کی طرف کردی گئی' اس کی نظیر یہ ہے: "اِنَّمَا اَنْتَ مُنْذِرُ مَنْ يَّخْشٰهَا"۔

سوال: اس آیت کا کیا مطلب ہے: " وَمَنْ يَّتَوَلَّهُمْ مِّنْكُمْ فَاِنَّهٗ مِنْهُمْ " (اور جو شخص تم میں سے ان کے ساتھ دوستی کرے گا بیشک وہ انہی میں سے ہوگا) اس آیت کا بظاہر تقاضا یہ ہے کہ اہلِ کتاب سے دوستی کرنے والا کافر ہو جائے گا' حالانکہ ایسا نہیں ہے' کیونکہ فرمانِ الٰہی ہے: " لَا يَنْهٰكُمُ اللّٰهُ عَنِ الَّذِيْنَ لَمْ يُقَاتِلُوْكُمْ فِى الدِّيْنِ "الآیۃ؟

جواب: " وَمَنْ يَّتَوَلَّهُمْ مِّنْكُمْ " سے مراد منافقین ہیں' اس لئے کہ یہ آیت ان کے متعلق نازل ہوئی۔ کیونکہ منافقین ضمیر اور اعتقاد کے اعتبار سے کفار میں سے ہیں۔ اور اس کا معنی یہ ہے کہ ایسا شخص جزا کے لحاظ سے آخرت میں ان میں سے ہوگا اور اس کو سخت سزا ہوگی۔

سوال: اس آیتِ کریمہ کا کیا معنی ہے: " اِنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِى الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ " (یقیناً اللہ تعالیٰ سمجھ نہیں دیتے ان لوگوں کو جو ظلم کررہے ہیں)' حالانکہ کتنے ہی ایسے ظالم دیکھے گئے ہیں کہ انہوں نے توبہ کی تو اللہ نے ان کو ہدایت عطا کردی؟

جوابِ اوّل: اس کا معنی یہ ہے کہ جب تک وہ اپنے ظلم پر قائم رہیں گے اللہ تعالیٰ ان کو ہدایت نہیں دیں گے۔

جوابِ ثانی: اس کا معنی یہ ہے کہ اللہ کے علمِ سابق میں جس کا گمراہی پر مرنا لکھا ہے اس کو

ہدایت نہیں دیں گے۔

جوابِ ثالث: آیت کا معنی یہ ہے کہ ظالم لوگوں کو قیامت کے دن جنت کا راستہ نہیں دکھائیں گے مراد مشرکین ہیں۔

سوال: اس کی کیا وجہ ہے کہ: ''اَذِلَّةٍ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ'' (نرمی کرنے والے ہیں مسلمانوں پر) فرمایا ہے۔ یوں نہیں فرمایا گیا: ''اَذِلَّةٍ لِلْمُؤْمِنِيْنَ'' جب کہ اہلِ عرب ذَلّ لہ کہتے ہیں ذل علیہ نہیں کہتے؟

جواب: چونکہ ''ذل'' کا لفظ مہربانی اور نرمی کے معنی کو متضمن ہے اس لئے اس کو علیٰ سے متعدی کیا گویا کہ یوں فرمایا ''حانين على المؤمنين عاطفين عليهم'' یعنی وہ مسلمانوں پر مہربان اور ان کے لئے شفیق ہوں گے۔

سوال: اس آیتِ کریمہ سے کیا مراد ہے: ''وَمَنْ يَّتَوَلَّ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا فَاِنَّ حِزْبَ اللّٰهِ هُمُ الْغٰلِبُوْنَ'' (اور جو شخص اللہ سے دوستی رکھے گا اور اس کے رسول سے اور ایماندار لوگوں سے سو اللہ کا گروہ بلاشک غالب ہے) حضور نبی کریم ﷺ کے زمانہ مبارک سے آج تک کتنی بار اللہ کا گروہ غالب رہا؟ کیا مراد ہے اس غلبہ سے؟

جواب: اس سے مراد حجت و برہان کا غلبہ ہے نہ کہ دولت و حکومت کا غلبہ ظاہر ہے کہ حزب اللہ سے مراد مومنین ہیں جو حجت و برہان کے لحاظ سے ہمیشہ غالب رہیں گے۔

سوال: ''مَثوبة'' کا لفظ تو اچھائی کے ساتھ خاص ہے لہٰذا یہ کیسے فرمایا: ''قُلْ هَلْ اُنَبِّئُكُمْ بِشَرٍّ مِّنْ ذٰلِكَ مَثُوْبَةً عِنْدَ اللّٰهِ'' الآیۃ (آپ کہیے کہ کیا میں تم کو ایسا طریقہ بتلاؤں جو اس سے بھی خدا کے یہاں پاداش ملنے میں زیادہ بُرا ہوا)؟۔

جواب: ہمیں یہ بات تسلیم نہیں ہے کہ ثواب اور مثوبۃ کے الفاظ اچھائی کے ساتھ خاص ہیں بلکہ اس کا معنی مطلقاً جزا (بدلہ) ہے اس کی دلیل یہ ارشادِ خداوندی ہے: ''هَلْ ثُوِّبَ الْكُفَّارُ مَا كَانُوْا يَفْعَلُوْنَ'' یعنی کیا بدلہ دیئے گئے کافر اس چیز کا کہ تھے کرتے۔ نیز ارشاد ہے: ''فَاَثَابَكُمْ غَمًّا بِغَمٍّ'' مراد بدلہ دینا ہے ثواب کا لفظ بشارت کی طرح ہے جو لغت کے اعتبار سے اچھی خبر کے ساتھ خاص نہیں ہے بلکہ بری خبر کو بھی شامل ہے جیسے فرمانِ الٰہی ہے: ''فَبَشِّرْهُمْ بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ'' یعنی ان کو دردناک عذاب کی بشارت دے دو۔

سوال: ایسے بہت سے لوگوں کی طرف پیغمبر بھیجنے اور کتابیں نازل کرنے کا کیا فائدہ جن کے بارے میں اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: ''وَلَيَزِيْدَنَّ كَثِيْرًا مِّنْهُمْ مَّا اُنْزِلَ اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ طُغْيَانًا

وَّکُفْرًا'' (اور ضرور جو مضمون آپ کے پاس آپ کے رب کی طرف سے بھیجا جاتا ہے وہ ان میں بہتوں کی سرکشی اور کفر کی ترقی کا سبب بن جاتا ہے)؟

جواب: اس کا ایک فائدہ ان پر الزام حجت ہے۔ دوسرا فائدہ یہ ہے کہ جب پیغمبر تمام مخلوق کی طرف مبعوث ہوگا تو اس میں اس رسول کی اور کتاب کی تعظیم ہوگی۔

سوال: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: '' وَلَوْ اَنَّهُمْ اَقَامُوا التَّوْرٰةَ وَالْاِنْجِيْلَ ''الآیۃ (اور اگر یہ لوگ توریت کی اور انجیل کی پوری پابندی کرتے۔۔۔۔) اس آیت میں آسودہ حالی اور رزق کی کشادگی کو کتاب پر ایمان اور اس پر عمل کرنے کے ساتھ مُعلّق (مشروط) کیا گیا ہے' حالانکہ حقیقتِ حال ایسی نہیں ہے' کیونکہ ہم دیکھتے ہیں کہ بہت سے وہ لوگ جو چاروں کتابوں پر ایمان بھی رکھتے ہیں اور ان پر عمل پیرا بھی ہیں (جبکہ وہ منسوخ نہ ہوئے ہوں) ان کی زندگی مکدر اور رزق تنگ ہوتا ہے؟

جواب: یہ تعلیق اہلِ کتاب کے ساتھ خاص ہے' اس لئے کہ انہوں نے رزق کی تنگی کی اس طرح شکایت کی تھی: '' يَدُ اللّٰهِ مَغْلُوْلَةٌ '' تو اللہ تعالیٰ نے ان کو خبر دی کہ ان کی یہ تنگی ان کے کفر اور معاصی کی نحوست کے سبب بطورِ سزا کے ہے۔ اللہ تعالیٰ رزق کی تنگی کو بعض بندوں کے لئے نعمت اور بعضوں کے لئے نقمت (عذاب) کے طور پر کرتے ہیں۔ یہی حال رزق کی کشادگی کا ہے۔ یعنی کبھی رزق کی کشادگی اور تنگی دونوں کسی گناہ پر سزا کے طور پر ہوتی ہے اور کبھی ان دونوں سے کسی نیکی پر جزا دی جاتی ہے' اور یہ امر اشخاص کے احوال کے مختلف ہونے کی وجہ سے مختلف ہوتا ہے۔ لہٰذا رزق کی وسعت سے کسی کی عزت افزائی اور رزق کی تنگی سے کسی کی تذلیل لازم نہیں آتی۔ اور نہ ہی اس کا عکس لازم آتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس آیتِ مبارکہ میں اس کا رد فرمایا ہے: '' فَاَمَّا الْاِنْسَانُ اِذَا مَا ابْتَلٰاهُ رَبُّهٗ '' سے لے کر '' کَلَّا '' تک۔ یعنی حقیقتِ حال ایسی نہیں ہے جیسے انسان خیال کرتا ہے' انسان سمجھتا ہے کہ رزق کی وسعت اکرام کی اور اس کی تنگی اہانت کی دلیل ہے' بلکہ کسی کو نیک کاموں کی توفیق حاصل ہونا اور ہدایت کا ملنا درحقیقت کسی کے اکرام کی دلیل ہے اور نیک کاموں کی توفیق سے محروم ہونا اور راہِ ہدایت حاصل نہ ہونا اہانت کی دلیل ہے۔

سوال: اس آیتِ مبارکہ سے کیا مراد ہے: '' يٰۤاَيُّهَا الرَّسُوْلُ بَلِّغْ مَاۤ اُنْزِلَ اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ ط وَاِنْ لَّمْ تَفْعَلْ فَمَا بَلَّغْتَ رِسَالَتَهٗ '' (اے رسول جو کچھ آپ کے رب کی جانب سے آپ پر نازل کیا گیا ہے آپ سب پہنچا دیجئے۔ اور اگر آپ ایسا نہ کرینگے تو آپ نے اللہ تعالیٰ کا ایک پیغام بھی نہیں پہنچایا)۔

یہ بات تو سب جانتے ہی ہیں کہ اگر رسول' نازل شدہ احکام کو نہیں پہنچائیں گے تو وہ اللہ تعالیٰ کے پیغام کو پہنچانے والے نہیں ہوں گے۔ لہٰذا اس کے ذکر کرنے کا کیا فائدہ ہے؟۔

جوابِ اوّل: اس سے مراد یہود کے ان عیوب اور قبائح کو لوگوں تک پہنچانے اور اسکی تبلیغ پر برانگیختگی ہے جو آپ پر نازل کیے گئے' خلاصہ یہ ہے کہ آپ تمام نازل کردہ باتوں کو پہنچا دیجئے۔ اگر آپ (بالفرض) اس کا ایک حرف بھی چھپائیں گے تو وہ گناہ اور مخالفت میں ایسے ہے جیسے کوئی ایک بات بھی نہ پہنچائے۔ تو یہاں بعض کے کتمان کو کل کا کتمان قرار دیا گیا۔

جوابِ ثانی: اصل میں آنحضرت ﷺ کو تبلیغ کے سلسلہ میں تعجیل (جلدی کرنے) کا حکم دیا گیا ہے۔ حضور ﷺ اللہ تعالیٰ کے جمیع احکامات کی تبلیغ پر آمادہ اور اس کے میں پر عزم تھے لیکن بعض باتوں کو اپنی جان کے خوف کے سبب مؤخر فرمایا اگرچہ دوسرے وقت میں ان کی تبلیغ پر بھی آپ پُر عزم تھے۔ چنانچہ اس آیتِ کریمہ میں آپ کو تبلیغ کے سلسلہ میں تعجیل کا حکم دیا گیا۔ اس قول کی تائید اس فرمانِ خداوندی سے ہوتی ہے: "وَاللّٰهُ يَعْصِمُكَ مِنَ النَّاسِ" یعنی "اور اللہ تعالیٰ آپ کو لوگوں سے محفوظ رکھے گا"۔

سوال: اللہ تعالیٰ نے اس آیتِ مبارکہ میں "وَاللّٰهُ يَعْصِمُكَ مِنَ النَّاسِ" (اور اللہ تعالیٰ آپ کو لوگوں سے محفوظ رکھے گا) اپنے پیغمبر کی حفاظت کی ذمہ داری کیسے لی' احد کی لڑائی میں تو آپ کا چہرۂ مبارک زخمی ہوا اور آپ کے دانت مبارک بھی شہید ہوئے؟

جوابِ اوّل: اس آیتِ مبارکہ میں "عصمت" سے مراد قتل سے حفاظت ہے' نہ کہ تمام تکالیف سے حفاظت مراد ہے' کیونکہ تمام تکالیف اور آلام سے مکمل طور پر محفوظ ہونا انبیائے کرام علیہم السلام کے اخلاق کے مناسب نہیں ہے۔ اس لئے کہ انبیاء علیہم السلام تمام مکارمِ اخلاق کے جامع ہوتے ہیں اور سب سے اشرف اور اکرام خُلق' تکالیف کو برداشت کرنا ہے۔

جوابِ ثانی: یہ آیتِ مبارکہ غزوۂ احد کے بعد نازل ہوئی ہے' اس لئے کہ سورۃ المائدہ قرآنِ کریم کی ان سورتوں میں سے ہے جو آخر میں نازل ہوئیں۔

سوال: اس آیت کا کیا مطلب ہے؟ "وَمَا لِلظّٰلِمِيْنَ مِنْ اَنْصَارٍ" (اور ایسے ظالموں کا کوئی مددگار نہ ہوگا) جب کہ بعضے ظالمین یعنی گنہگار مسلمانوں کی قیامت کے روز حضور نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم شفاعت فرمائیں گے' معلوم ہوا کہ آپ ان کی مدد کریں گے؟

جواب: یہاں پر "ظالمین" سے مراد مشرکین ہے۔ جیسا کہ آیتِ ہٰذا کے اوّل اور درمیان والے حصہ سے معلوم ہوتا ہے۔

سوال: "قَدْ ضَلُّوْا مِنْ قَبْلُ" (تحقیق گمراہ ہوئے اس سے پہلے) کے بعد پھر "وَضَلُّوْا عَنْ سَوَآءِ السَّبِيْلِ" (اور بہک گئے سیدھی راہ سے) کہنے کا کیا فائدہ ہے؟

جواب: پہلے ضلال سے مراد ان کا انجیل سے بہکنا ہے اور دوسرے ضلال سے ان کا قرآن سے دور ہونا مراد ہے۔

سوال: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: "كَانُوْا لَا يَتَنَاهَوْنَ عَنْ مُّنْكَرٍ فَعَلُوْهُ" (جو بُرا کام انہوں نے کر رکھا تھا اس سے ایک دوسرے کو منع نہ کرتے تھے) اس آیت سے کیا مراد ہے کیونکہ خود بُرا کام کر گزرنے کے بعد اس برے کام سے منع کرنا بے معنی ہے؟

جوابِ اوّل: یہاں مضاف محذوف ہے اصل عبارت یہ ہے: "كانوا لا يتناهون عن معاودة منكر فعلوه" یعنی وہ لوگ اس برے کام کی عادت سے ایک دوسرے کو منع نہیں کرتے تھے جو انہوں نے کر رکھا تھا۔ یا مطلب یہ ہے کہ وہ ایک دوسرے کو اس بُرائی سے منع نہیں کرتے تھے جس کے کرنے کا وہ ارادہ کرتے۔

جوابِ ثانی: یہ بھی ممکن ہے کہ "لَا يَتَنَاهَوْنَ" سے مراد لا يمتنعون ہو۔ یعنی وہ لوگ اس برے کام سے خود باز نہیں آتے تھے۔ جو انہوں نے کر رکھا تھا بلکہ اس پر مُصر تھے۔ جیسے اہلِ عرب کہتے ہیں "تناهى عن الامر اور انتهى عنه" دونوں کا معنی ایک ہی ہوتا ہے۔ یعنی اس کام سے باز آیا۔

سوال: اس آیت سے کیا مراد ہے: "وَلٰكِنَّ كَثِيْرًا مِّنْهُمْ فٰسِقُوْنَ" (لیکن ان میں زیادہ لوگ فاسق ہیں) یہاں "مِنْهُمْ" سے مراد علی اختلاف القولین یہود ہیں یا نصاریٰ وہ تو سارے ہی فاسق ہیں؟

جواب: یہاں مطلق فسق مراد نہیں ہے بلکہ اس سے مراد وہ فسق ہے جو مشرکین کے ساتھ دوستی اور ان تک خبریں پہنچانے سے لازم آتا ہے ظاہر ہے کہ فسق کی یہ خاص صورت ان میں سے زیادہ لوگوں کے ساتھ مخصوص ہے۔ ایسے ہی لوگوں کا آیت کے شروع میں یعنی "تَرٰى كَثِيْرًا مِّنْهُمْ" الآیۃ میں ذکر کیا گیا ہے۔ ان سب کو شامل نہیں ہے۔

سوال: اس ارشادِ مبارک کا کیا مطلب ہے: "اِنَّمَا الْخَمْرُ وَالْمَيْسِرُ وَالْاَنْصَابُ وَالْاَزْلَامُ رِجْسٌ مِّنْ عَمَلِ الشَّيْطٰنِ" (شراب اور جوا اور بُت وغیرہ اور قرعہ کے تیر یہ سب گندی باتیں شیطانی کام ہیں) یہ تمام چیزیں تو اللہ تعالیٰ کی پیدا کردہ ہیں تو ان کے ایجاد میں شیطان کے عمل کو کیسے دخل ہوا؟۔

جواب: یہاں عبارت مقدر ہے: "اِنّما تعاطى الخمر والميسر الخ" یا اس طرح ہے "انما

مباشرة الخمر والميسر '' یعنی شراب' جوا' بُت وغیرہ اور قرعہ کے تیر کے کام کرنا اصل میں شیطانی کام ہیں۔

سوال: لیکن اس کے باوجود ان کو شیطانی عمل کیسے قرار دیا گیا؟ شراب اور جوئے وغیرہ کے کام تو فی الحقیقت انسانی عمل ہے؟

جواب: شیطان کی طرف ان کی نسبت مجازاً ہے۔ کیونکہ شیطان ہی فاسقوں کے لئے تزیین ووسوسہ کے واسطہ سے اس فعل کے وجود کا سبب ہے' جیسے ایک آدمی دوسرے کو کسی کے مارنے پر اکسائے اور وہ اس کو مارے تو اکسانے والے کے متعلق یہ کہنا جائز ہے کہ یہ تیرا عمل ہے۔

سوال: پہلی آیت میں شراب' جوئے' بت وغیرہ اور قرعہ کے تیروں کو جمع کیا (سب کا ذکر کیا) اور دوسری آیت میں صرف شراب اور جوے کو خاص طور پر ذکر کیا' اس کی کیا وجہ ہے؟

جوابِ اوّل: اس کی وجہ یہ ہے کہ لوگوں میں بغض وعداوت زیادہ تر شراب اور جوئے کی وجہ سے پیدا ہوتا ہے۔ اور یہی دو چیزیں ایسی ہیں کہ لوگ ان کی وجہ سے طاعات سے غافل ہوتے ہیں' جبکہ بُت وغیرہ اور قرعہ کے تیروں میں یہ خرابیاں نہیں پائی جاتیں' اگرچہ ان میں بھی دیگر مفاسد موجود ہیں۔

جوابِ ثانی: بعض کہتے ہیں کہ دوسری آیت میں صرف شراب اور جوئے کا مکرر ذکر اس لئے کیا گیا کہ خطاب مسلمانوں کو ہے' جس کی دلیل اللہ کا یہ فرمان ہے: '' يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا '' اور وہ صرف شراب اور جوئے کا عمل کرتے تھے۔ اور پہلی آیت میں ان چاروں کاموں کو اس لئے جمع کیا تا کہ مسلمانوں کو معلوم ہو جائے کہ یہ چاروں کام زمانۂ جاہلیت کے کاموں میں سے ہیں' نیز یہ کہ بت پرستی اور غیب دانی کا دعوی کر کے اللہ کے ساتھ غیر کو شریک کرنا اور شراب نوشی یا جوا بازی کو حلال خیال کرتے ہوئے کرنا ان میں کوئی فرق نہیں ہے۔

سوال: اس آیتِ مبارکہ کا کیا معنی ہے: '' يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَيَبْلُوَنَّكُمُ اللَّهُ بِشَيْءٍ مِنَ الصَّيْدِ تَنَالُهُ أَيْدِيكُمْ وَرِمَاحُكُمْ لِيَعْلَمَ اللَّهُ مَنْ يَخَافُهُ بِالْغَيْبِ '' (اے ایمان والو اللہ تعالیٰ قدرے شکار سے تمہارا امتحان کرے گا جن تک تمہارے ہاتھ اور تمہارے نیزے پہنچ سکیں گے تا کہ اللہ تعالیٰ معلوم کرے کہ کون شخص اس سے بن دیکھے ڈرتا ہے) یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کوئی کام اس لئے کریں تا کہ اس کے ذریعہ اللہ تعالیٰ کو معلومات حاصل ہوں؟

جوابِ اوّل: اس کا معنی یہ ہے کہ تا کہ اللہ تعالیٰ لوگوں کے سامنے ڈرنے والوں اور نہ ڈرنے والوں کو ممتاز اور جدا جدا کر دے۔

جوابِ ثانی: اس کا معنی یہ ہے کہ تا کہ اللہ کے بندے جان لیں کہ کون شخص اس سے بِن دیکھے ڈرتا ہے۔ یہ جواب بھی پہلے کے قریب ہے۔

جوابِ ثالث: اس کا معنی یہ ہے کہ تا کہ خوف کو وقوع کی حالت میں جان لے جیسے اس کو انتظار کی حالت میں جانا۔

سوال: فرمانِ خداوندی ہے: ''وَمَنْ قَتَلَهُ مِنْكُمْ مُتَعَمِّدًا فَجَزَآءٌ مِّثْلُ مَا قَتَلَ مِنَ النَّعَمِ'' (اور جو شخص تم میں سے اس کو جان بوجھ کر قتل کرے گا تو اس پر پاداش واجب ہوگی جو کہ مساوی ہوگی اس جانور کے جس کو اس نے قتل کیا ہے) اس آیتِ مبارکہ کا مطلب کیا ہے؟ وجوبِ جزا کے لئے وصفِ عمدیت تو شرط نہیں ہے' کیونکہ اگر وہ اس کو بھول کر یا غلطی سے بھی قتل کرے گا تب بھی جزا واجب ہوگی؟

جواب: حضرت ابن عباسؓ اور دیگر صحابہؓ و تابعینؒ کی ایک جماعت کے نزدیک وجوبِ جزا کے لئے وصفِ عمدیت شرط ہے لہٰذا اس صورت میں تو یہ سوال وارد نہیں ہوگا۔ البتہ جمہور کے قول کے مطابق وصفِ عمدیت کے ساتھ جزاء مقید ہے' اس کی وجہ یہ ہے کہ جو واقعہ اس آیتِ مبارکہ کے نزول کا سبب بنا اس میں قتل عمداً ہوا تھا' بعض صحابہؓ حالتِ احرام میں مقام حدیبیہ میں تھے کہ ان کے سامنے ایک گورخر آ گیا' ابوالیسرؓ نے اس کو نیزہ مارا اور اس کو کاٹا' پھر یہ آیت نازل ہوئی' لہٰذا عمدیت کا وصف واقعہ کے اعتبار سے ہوا نہ کہ شرط کے اعتبار سے' امام زہریؒ کہتے ہیں: کتاب اللہ میں حکم عمد پر نازل ہوا اور سنّت میں خطا کی صورت میں بھی وجوب وارد ہے۔

سوال: اس آیت کا کیا معنی ہے: '' هَدْيًا بٰلِغَ الْكَعْبَةِ '' (قربانی پہنچنے والی کعبہ کی) حالانکہ قربانی صرف حرم تک پہنچنا شرط ہے؟

جوابِ اوّل: ہدی کے جانور کا حرم تک پہنچنے سے مقصود کعبہ کی تعظیم ہے اس لئے کعبہ کا ذکر فرمایا ہے۔

جوابِ ثانی: اس کا معنی ہے ''بالغ حرم الکعبۃ'' یعنی کعبہ کے حرم تک پہنچنے والی۔

سوال: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ''جَعَلَ اللّٰهُ الْكَعْبَةَ الْبَيْتَ الْحَرَامَ قِيٰمًا لِّلنَّاسِ وَالشَّهْرَ الْحَرَامَ وَالْهَدْيَ وَالْقَلَآئِدَ ؕ ذٰلِكَ لِتَعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ وَاَنَّ اللّٰهَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ '' (خدا تعالیٰ نے کعبہ کو جو کہ ادب کا مکان ہے لوگوں کے قائم رہنے کا سبب قرار دے دیا اور عزت والے مہینہ کو بھی اور حرم میں قربانی ہونے والے جانور کو بھی اور ان جانوروں کو بھی جن کے گلے میں پٹے ہوں یہ اس لئے تا کہ تم اس بات کا یقین کر لو کہ بیشک اللہ

تعالیٰ تمام آسمانوں اور زمین کے اندر کی چیزوں کا علم رکھتے ہیں اور بیشک اللہ تعالیٰ سب چیزوں کو خوب جانتے ہیں) ان مذکورہ امور سے یہ کیسے معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ تمام آسمانوں اور زمین کے اندر کی چیزوں کا علم رکھتے ہیں اور یہ کہ اللہ تعالیٰ تمام چیزوں کو خوب جانتے ہیں؟

جوابِ اوّل: ''ذٰلک'' سے ان تمام غیوب کی طرف اشارہ ہے جن کا اس سورت میں پہلے ذکر کیا گیا ہے جیسے انبیائے کرام اور منافقوں اور یہودیوں کے احوال وغیرہ۔ اس سے ان امور کی طرف اشارہ نہیں ہے جن کا اس آیتِ مذکورہ میں ذکر کیا گیا ہے۔

جوابِ ثانی: عرب کے لوگ خونریزیاں کرتے اور لوگوں کے مال لوٹتے لیکن جب حرمت والا مہینہ آجاتا یا وہ خود حرمت والے شہر میں داخل ہوتے تو ان کاموں سے باز آجاتے۔ پس یہ بات علمِ الٰہی میں آئی کہ اگر ان کے لئے کوئی ایسا مکان یا زمان مقرر نہ کیا جائے جو ان کو قتل وغارت اور لوٹ مار سے روکنے کا سبب بنے تو لوگ ہلاک وتباہ ہو جائیں گے۔ لہٰذا مناسبت واضح ہوگئی۔

سوال: ارشادِ الٰہی ہے: '' مَا جَعَلَ اللّٰهُ مِنْ بَحِيْرَةٍ وَّلَا سَآئِبَةٍ وَّلَا وَصِيْلَةٍ وَّلَا حَامٍ ''(اللہ تعالیٰ نے نہ بحیرہ کو مشروع کیا ہے اور نہ سائبہ کو اور نہ وصیلہ کو اور نہ حامی کو) اس آیتِ مبارکہ سے کیا مراد ہے؟ کیونکہ ''جَعَل'' کا معنی تو پیدا کرنا ہوتا ہے جس کی دلیل اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے'' وَجَعَلَ مِنْهَا زَوْجَهَا '' نیز '' وَجَعَلَ الظُّلُمٰتِ وَالنُّوْرَ '' حالانکہ ان اشیاء کے خالق اللہ تعالیٰ ہیں مگر اس آیت میں اس کی نفی کی گئی ہے؟

جوابِ اوّل: یہاں ''جَعَل'' سے مراد ایجاب اور امر ہے' مطلب یہ ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے ان چیزوں کو واجب نہیں کیا اور نہ ہی ان کا حکم دیا ہے۔

جوابِ ثانی: یہاں ''جَعَل'' سے مراد تحریم ہے۔

سوال: اس آیتِ کریمہ کا کیا معنی ہوگا '' يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا عَلَيْكُمْ اَنْفُسَكُمْ ''(اے ایمان والو اپنی فکر کرو) اس سے تو معلوم ہوتا ہے کہ بس اپنی فکر کرنی چاہئے' حالانکہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر بھی واجب ہے' اس آیت سے تو اس کا عدمِ وجوب معلوم ہو رہا ہے؟

جوابِ اوّل: '' اَنْفُسَكُمْ '' کا معنی ہے: ''اَهْلَ دِيْنِكُمْ '' یعنی اپنے اہلِ دین کی فکر کرو' جیسے: ''وَلَا تَقْتُلُوْٓا اَنْفُسَكُمْ '' کا معنی ہے' اپنے اہلِ دین کو قتل نہ کرو۔

جوابِ ثانی: اس سے مراد آخر زمانہ ہے جب فتنہ وفساد بڑھ جائے گا اور امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فریضہ ادا کرنا دشوار ہو جائے گا' جیسا کہ آج کا زمانہ ہے۔

سوال: جب اللہ تعالیٰ ارشاد فرمائیں گے'' مَاذَآ اُجِبْتُمْ '' (تم کو کیا جواب ملا تھا) تو پیغمبر کیسے

عرض کرینگے کہ "لَا عِلْمَ لَنَا" (ہم کو کچھ خبر نہیں) حالانکہ وہ جانتے ہوں گے کہ ان کو انکی امتوں کی طرف سے کیا جواب ملا تھا؟

جوابِ اوّل: اس وقت دوزخ کی آگ بھڑک رہی ہوگی اور موقع دہشت زدگی وسرگردانی کا ہوگا اور انسانی عقلیں چکرا رہی ہوں گی اس لئے اس طرح کے موقعوں پر کوئی بات نفی یا اثبات میں کسی طرح نہیں سوجھتی ہے۔

جوابِ ثانی: پیغمبروں کا "لَا عِلْمَ لَنَا" کہنا اپنی امتوں سے شکایت کے طور پر تعریض اور ان سے انتقام کے بارے اللہ تعالیٰ سے اظہارِ التجاء کے طور پر ہوگا۔ گویا وہ کہیں گے: الٰہی! آپ جانتے ہی ہیں کہ ان کی طرف سے ہمیں کیا جواب ملا انہوں نے نہ ہماری تصدیق کی یا تکذیب۔

جوابِ ثالث: اس کا مطلب ہے کہ ہمیں ان کی طرف سے جو بھی جواب ملا ہم اس کی حقیقت سے بے خبر ہیں' اس لئے کہ ہم تو اس کے ظاہر کو جانتے ہیں اور آپ کی ذاتِ عالی اس کے ظاہر و باطن سے واقف ہے۔ بعد والی آیات اس کی مؤید ہے۔

سوال: حضرت عیسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام کا ادھیڑ عمر میں لوگوں سے باتیں کرنا آپ کا معجزہ کیسے شمار ہوسکتا ہے؟

جواب: اس اشکال کا جواب سورۃ آل عمران میں تفصیل سے گزر چکا ہے۔

سوال: حواریوں نے یہ بات کیسے کہدی "هَلْ يَسْتَطِيعُ رَبُّكَ اَنْ يُّنَزِّلَ عَلَيْنَا مَآئِدَةً مِّنَ السَّمَآءِ" (کیا آپ کے رب ایسا کر سکتے ہیں کہ ہم پر آسمان سے کچھ کھانا نازل فرمائیں) انہوں نے تو بعض ممکن چیزوں کے بارے اللہ تعالیٰ کی قدرت میں شک کیا' یہ تو کفر ہے؟

نیز انہوں نے اللہ کی ذات کو استطاعت کے ساتھ موصوف کیا' یہ تو تشبیہ ہے' اس لئے کہ استطاعت کا تعلق تو جوارح واعضاء کے ساتھ ہوتا ہے' جبکہ حواری' حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے مخلص پیروکار تھے' اور ان پر ایمان رکھنے والے تھے' کہ جیسا کہ اس آیتِ مبارکہ سے معلوم ہوتا ہے: "قَالُوْا اٰمَنَّا وَاشْهَدْ بِاَنَّنَا مُسْلِمُوْنَ"؟

جوابِ اوّل: ان کا یہ استفہام فعل سے تھا نہ کہ قدرت سے۔ جیسے ایک فقیر' مالدار صاحبِ قدرت شخص سے کہتا ہے: کیا آپ مجھے کچھ عطا کرنے پر قادر ہیں؟۔

اور اس کا نام استطاعۃ المطاوعۃ ہے' اس کو استطاعت القدرۃ نہیں کہتے۔

جوابِ ثانی: مطلب یہ ہے کہ کیا آپ کے لئے یہ بات آسان ہے کہ آپ اپنے رب سے مانگیں؟ جیسے کسی سے کہا جائے: کیا تم میرے ساتھ کھڑے ہونے کی استطاعت رکھتے ہو؟ جب

کہنے والا جانتا ہو کہ وہ اس کی استطاعت رکھتا ہے۔
سوال: اگر یہی معنی مراد ہے تو پھر عیسیٰ علیہ السلام نے ان الفاظ میں ان کو نکیر کیوں فرمائی: "اِتَّقُوا اللّٰہَ اِنۡ کُنۡتُمۡ مُّؤۡمِنِیۡنَ" (خدا سے ڈرو اگر تم ایمان دار ہو)؟
جواب: حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے ناگواری کا اظہار اس لئے فرمایا کہ انہوں نے ایسا محتمل المعنی لفظ استعمال کیا جو ایک مخلص مومن کے شایانِ شان نہیں ہوسکتا' اگرچہ انہوں نے یہ لفظ قصداً استعمال نہیں کیا تھا۔
سوال: حضرت عیسیٰؑ نے کیسے فرمایا: "وَلَاۤ اَعۡلَمُ مَا فِیۡ نَفۡسِکَ" (اور نہیں جانتا میں جو کچھ آپ کے جی میں ہے) ہر نفس والا ذی جسم ہوتا ہے' اس لئے کہ 'نفس" اس جوہر سے عبارت ہے جو قائم بذاتہ اور متعلق بالجسم ہو' اللہ تعالیٰ تو جسم سے منزّہ ہیں؟
جواب: "نفس" کے دو معانی ہیں: ایک تو یہی جو اوپر ذکر ہوئے' نفس کا دوسرا معنی ہے شے کی حقیقت اور اس کی ذات۔ جیسے کہتے ہیں: نفس الذھب والفضة محبوبة مراد ہوتی ہے سونے چاندی کی ذات۔ اس آیتِ کریمہ میں یہ دوسرا معنی مراد ہے۔
سوال: حضرت عیسیٰؑ نے یہ کیسے فرمایا: "مَا قُلۡتُ لَھُمۡ اِلَّا مَاۤ اَمَرۡتَنِیۡ بِہٖۤ اَنِ اعۡبُدُوا اللّٰہَ" (نہیں کہا میں نے واسطے ان کے مگر جو کچھ حکم کیا تھا تو نے مجھ کو ساتھ اس کے کہ تم اللہ کی عبادت کرو۔۔۔) حالانکہ لوگوں کو توحیدِ خداوندی کی تبلیغ کے علاوہ بھی آپ نے بہت سا مباح کلام فرمایا ہے؟
جواب: اس کا معنی یہ ہے کہ میں نے ان سے اِلٰہ سے متعلق وہی بات کہی جس کا آپ نے مجھے حکم دیا تھا۔
سوال: جب عیسیٰ علیہ السلام آسمانوں میں زندہ ہیں' ان کی وفات نہیں ہوئی تو پھر انہوں نے یہ کیسے فرمایا: "فَلَمَّا تَوَفَّیۡتَنِیۡ" (پھر جب آپ نے مجھ کو اٹھالیا)؟ اس سے کیا مراد ہے؟
جواب: "توفی" سے مراد ہے زمین پر ان کی مدّتِ اقامت مکمل کرنا۔ جس کا ذکر اس آیت میں گزر چکا ہے: "اِذۡ قَالَ اللّٰہُ یٰعِیۡسٰۤی اِنِّیۡ مُتَوَفِّیۡکَ وَرَافِعُکَ اِلَیَّ" الآیۃ۔ اور یہ سوال ان لوگوں کے قول پر ہوسکتا ہے جو کہتے ہیں کہ یہ سوال وجواب اس روز ہوئے جب آپ کو آسمان کی طرف اٹھالیا گیا۔ لیکن جمہور علماء کے نزدیک یہ سوال وغیرہ قیامت کے روز ہوں گے' اس صورت میں آپ کا جواب' سوال کے بالکل مطابق ہے۔ اس میں کوئی اشکال نہیں۔
سوال: اگر حضرت عیسیٰؑ یوں فرماتے: "اِنۡ تُعَذِّبۡھُمۡ فَاِنَّکَ اَنۡتَ الۡعَزِیۡزُ الۡحَکِیۡمُ وَاِنۡ تَغۡفِرۡ

لَهُمْ فَاِنَّهُمْ عِبَادُکَ " (اگر آپ ان کو عذاب دیں گے تو آپ زبردست ہیں حکمت والے ہیں اور اگر آپ ان کو بخش دیں تو یہ آپ کے بندے ہیں) تو آپس کی مناسبت زیادہ ظاہر ہوتی؟

جواب: اس آیت کا معنی یہ ہے کہ اگر آپ ان کو سزا دیں گے تو یہ آپ کے بندے ہیں یعنی مالکِ حقیقی و مطلق کا اپنے غلاموں میں تصرف مباح ہے، جو چاہے تصرف کرے، اور اگر آپ ان کو معاف فرمادیں تو آپ عزیز ہیں یعنی نافرمانوں سے انتقام نہ لینے اور ان کو سزا نہ دینے سے جس کی عزت میں کوئی کمی نہیں آتی اور حکیم بھی ہیں یعنی خواہ عذاب دیں یا معاف فرمائیں اپنے ہر کام میں حکمت والے ہیں۔

سوال: اس سے کیا مراد ہے: "یَوْمُ یَنْفَعُ الصّٰدِقِیْنَ صِدْقُهُمْ " (یہ دن ہے کہ فائدہ دے گا سچوں کو ان کا سچ) ظاہر ہے اس دن سے مراد قیامت کا دن ہے۔ جبکہ صدق (سچ) دنیا اور آخرت دونوں میں فائدہ دیتا ہے، آیت کے الفاظ حصر کو ظاہر کر رہے ہیں؟

جواب: آخرت میں صدق کا فائدہ چونکہ جنت کے حصول اور جہنم سے نجات کی صورت میں ظاہر ہوگا جو کہ دنیا میں نہیں ہے، اس لئے اُخروی نفع کی نسبت سے دنیوی نفع کالمعدوم ہے، چنانچہ اس کے مقابلہ میں اس کو مقید نہیں کیا۔

سوال: اگر اس آیتِ کریمہ: " هٰذَا یَوْمُ یَنْفَعُ الصّٰدِقِیْنَ صِدْقُهُمْ " سے مراد ان کا آخرت میں سچا ہونا ہے تو آخرت تو دارالعمل نہیں ہے اور اگر اس سے مراد ان کا دنیا میں سچا ہونا ہے تو اس مضمون کے مطابق نہیں ہے جس کا ذکر ہو رہا ہے یعنی قیامت کے دن حضرت عیسیٰؑ کے سچے ہونے کی گواہی؟

جواب: اس سے مراد وہ صدق ہے جو دنیا و آخرت دونوں میں قائم رہا، حضرت قتادہؒ سے مروی ہے کہ قیامت کے روز دو متکلم سچ بولیں گے مگر ایک کو تو ان کا سچ بولنا فائدہ دے گا مگر دوسرے کو فائدہ نہیں دے گا، ایک ابلیس ہوگا وہ کہے گا: "اِنَّ اللّٰهَ وَعَدَكُمْ وَعْدَ الْحَقِّ وَوَعَدْتُّكُمْ فَاَخْلَفْتُكُمْ " یعنی بے شک اللہ نے تم سے سچا وعدہ کیا تھا، اور میں نے بھی تم سے وعدہ کیا مگر میں نے خلاف وعدہ کیا۔ چنانچہ اس دن اس کا سچ بولنا اس کو کچھ نفع نہ دے گا۔ کیونکہ وہ اس سے قبل کاذب تھا، اور دوسرے حضرت عیسیٰؑ ہوں گے جو دنیا و آخرت دونوں میں صادق تھے چنانچہ ان کا سچ ان کے کام آئے گا۔

سوال: آسمان و زمین میں جو کچھ ہے وہ عقلاء اور غیر عقلاء ہیں، ایسا کیوں نہیں کیا کہ عقلاء کو تغلیباً ذکر کرتے ہوئے: " لِلّٰهِ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَنْ فِیْهِنَّ " فرمادیتے؟ یعنی "مَا" کی

بجائے ''مَن'' لے آتے؟

جواب: اس لئے کہ کلمہ ''مَا'' اصل وضع کے اعتبار سے تمام اجناس کو بالعموم شامل ہے۔ جب کہ ''مَنْ'' اصل وضع کے اعتبار سے تمام غیر عقلاء کو شامل نہیں ہے۔ لہٰذا کلمہ ''مَا'' کا اس جگہ پر استعمال زیادہ جامع ہے۔

# سورۃ الانعام

سوال: اس کی کیا وجہ ہے کہ '' وَجَعَلَ الظُّلُمٰتِ وَالنُّوْرَ '' (اور تاریکیوں کو اور نور کو بنایا) میں ''ظلمات'' کو جمع اور ''نور'' کو واحد لائے؟

جوابِ اوّل: اس کی وجہ یہ ہے کہ چونکہ اس سے قبل ظلمات کو جمع لائے ہیں اس لئے نور کو جمع لانے کی ضرورت نہیں' کیونکہ یہ اس پر دال ہے۔ جیسے '' اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ '' میں سماوات کو جمع لانے کے بعد ''ارض'' کو پھر جمع لانے کی حاجت نہیں رہی۔

جوابِ ثانی: دراصل ظلمۃ اسم ہے اور نور مصدر ہے' مفضل نے اس کو نقل کیا ہے' اور مصادر کی جمع نہیں لائی جاتی۔

سوال: جب یہ فرمادیا: '' یَعْلَمُ سِرَّ کُمْ '' (وہ تمہارے پوشیدہ احوال کو بھی جانتا ہے) تو پھر اس کے بعد '' وَجَهْرَکُمْ '' (اور تمہارے ظاہر احوال کو بھی) کہنے کا کیا فائدہ ہے؟

جواب: صرف اس کے مقابلہ کے لئے ذکر فرمایا۔ جیسے اس آیتِ متبرکہ میں: '' فَمَنْ تَعَجَّلَ فِیْ یَوْمَیْنِ فَلَآ اِثْمَ عَلَیْهِ وَمَنْ تَاَخَّرَ فَلَآ اِثْمَ عَلَیْهِ ''۔

سوال: ارشادِ باری تعالیٰ ہے: '' وَلَهٗ مَا سَکَنَ فِی الَّیْلِ وَالنَّهَارِ '' (اور واسطے اس کے ہے جو کچھ بستا ہے بیچ رات کے اور دن کے) جو حضرات سکون کی تفسیر حرکت کے مقابلہ میں کرتے ہیں ان کے قول کے مطابق اس آیتِ کریمہ میں حرکت کو چھوڑ کر صرف سکون کو خاص طور پر کیوں ذکر فرمایا؟۔

جوابِ اوّل: اس لئے کہ ان میں سکون اغلب حالت ہے جو کہ حیوانات اور جمادات میں سے ہر مخلوق پر طاری ہوتی ہے' کیونکہ ساکن مخلوقات' تعداد کے لحاظ سے متحرک مخلوقات سے زیادہ ہیں' یا اس لئے کہ ہر متحرک تو سکون کی طرف لوٹتا ہے مگر ہر ساکن حرکت کی طرف نہیں لوٹتا۔ یا اس لئے کہ سکون اصل ہے' اور حرکت ایک حادثاتی اور وقتی ہے۔

جوابِ ثانی: یہاں عبارت مقدر ہے' اصل میں تھا: '' مَا سَکَنَ وَتَحَرَّکَ '' مگر اختصار کی

خاطر صرف ایک کے ذکر کرنے پر اکتفاء کیا گیا' کیونکہ وہ اپنے مقابل پر دال ہے۔ جیسے اس آیتِ کریمہ میں: ''سَرَابِیْلَ تَقِیْکُمُ الْحَرَّ'' یعنی وَالْبَرْدَ۔

سوال: اس میں کیا نکتہ ہے کہ یوں فرمایا گیا: ''وَھُوَ یُطْعِمُ وَلَا یُطْعَمُ'' (اور وہی کھلاتا ہے اور وہ نہیں کھلایا جاتا) یوں نہیں فرمایا: ''وَھُوَ یُنْعِمُ وَلَا یُنْعَمُ عَلَیْہِ'' یعنی وہی انعام کرتا ہے' اس پر انعام نہیں کیا جاتا۔ بظاہر یہ صورت زیادہ عام ہے' کیونکہ یہ اطعام اور اس کے علاوہ چیزوں کو بھی شامل ہے؟۔

جوابِ اوّل: چونکہ رزق کی ضرورت زیادہ ہوتی ہے اس لئے اس کا خصوصی طور پر ذکر فرمایا گیا۔

جوابِ ثانی: مطعم کا آکل ومتغوط (کھانے والا اور پاخانہ کرنے والا) ہونا اس کے منعم علیہ ہونے سے زیادہ قبیح ہے اس لئے اس کا ذکر کیا۔

سوال: اللہ تعالیٰ کا یہ ارشادِ مبارک: ''قُلْ اَیُّ شَیْءٍ اَکْبَرُ شَھَادَۃً قُلِ اللّٰہُ'' (آپ کہیے کہ سب سے بڑھ کر چیز گواہی دینے کے لئے کون ہے۔ آپ کہئے کہ اللہ) اس بات کا تقاضا کرتا ہے کہ اللہ تعالیٰ بھی شے کے ساتھ موسوم ہو سکتے ہیں' اگر یہ بات صحیح ہے تو پھر شے کے ساتھ اس ذات کو پکارنا بھی اَلْحَیُّ الْقَیُّوْمُ وغیرہ کی طرح درست ہو؟

جواب: اللہ تعالیٰ کو پکارنے کی صحت انہی الفاظ کے ساتھ مخصوص ہے جو الفاظ اس کی مدح وتعریف اور صفاتِ کمالیہ پر دلالت کرتے ہوں جیسے اَلْحَیُّ الْقَیُّوْمُ وغیرہ۔ ایسا نہیں ہے کہ جس لفظ کا بھی اس ذاتِ عالی پر اطلاق صحیح ہو اس کے ذریعہ اس کو پکارنا بھی درست ہو۔ ہر شخص جانتا ہے کہ ہر موجو اور ثابت امر کا اطلاق اللہ سبحانہ وتعالیٰ پر درست ہے لیکن ہر ایک کے ذریعہ اس کو پکارنا درست نہیں ہے کذا ذکروا۔

سوال: شرعاً کسی مدّعی کا اللہ تعالیٰ کو اپنے دعویٰ کی صحت اور ثبوت کے لئے گواہ بنانا کافی نہیں ہے' حتیٰ کہ اگر کوئی مدّعی کہے کہ اللہ تعالیٰ میرے گواہ ہیں تو یہ ناکافی ہے' لہٰذا اس کی کیا وجہ ہے کہ خود نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام کو فرمایا گیا: ''قُلِ اللّٰہُ شَھِیْدٌ ' بَیْنِیْ وَبَیْنَکُمْ'' (آپ کہئے کہ میرے اور تمہارے درمیان اللہ تعالیٰ گواہ ہے)؟

جواب: اصل میں نبی کریم ﷺ کے علاوہ کسی اور کے لئے یہ صحیح نہیں ہے' کیوں کہ کوئی دوسرا شخص اس پر دلیل قائم نہیں کرسکتا کہ اللہ تعالیٰ اس کے حق میں گواہ ہیں' جبکہ نبی کریم علیہ السلام نے ان الفاظ میں دلیل قائم فرمائی: ''وَاُوْحِیَ اِلَیَّ ھٰذَا الْقُرْاٰنُ'' اس لئے کہ یہ معجزہ ہے:

سوال: ارشادِ خداوندی ہے: ''ثُمَّ لَمْ تَکُنْ فِتْنَتُھُمْ اِلَّآ اَنْ قَالُوْا وَاللّٰہِ رَبِّنَا مَا کُنَّا

مُشْرِكِيْنَ ''(پھر نہیں ہوگا بہانہ ان کا مگر یہ کہ کہیں گے قسم ہے اللہ پروردگار ہمارے کی نہ تھے ہم مشرک) یہ کیسے ممکن ہے کہ قیامت کے دن تمام امور کے حقائق کا معائنہ ہو جانے کے بعد بھی وہ تکذیب کر دیں' حالانکہ اس دن حال یہ ہوگا کہ ''بُعْثِرَ مَا فِي الْقُبُوْرِ ''(قبروں کے تمام مردے زندہ کئے جائینگے) اور ''حُصِّلَ مَا فِي الصُّدُوْرِ ''(آشکارا ہو جائے گا جو کچھ دلوں میں ہے)؟

جواب: قیامت کے دن کی ہولناکی اور دہشتناکی ایسی ہوگی کہ مصائب میں گرفتار شخص بدحواسی اور نفع ونقصان میں تمیز نہ کرنے کے سبب اس طرح کہے گا' جیسے دنیا میں عذاب میں مبتلا شخص کا حال ہوتا ہے کہ وہ خود اپنی اور دوسرے کی بھی تکذیب کر دیتا ہے اور ایسی بات کہہ دیتا ہے جس سے اس کو نفع کی بجائے نقصان ہوتا ہے۔ جیسا کہ اہلِ دوزخ یہ جاننے کے باوجود کہ وہ دوزخ میں ہمیشہ رہیں گے یہ کہیں گے: ''رَبَّنَا اَخْرِجْنَا مِنْهَا'' یعنی اے ہمارے رب ہمیں اس دوزخ کے عذاب سے باہر نکال دیجئے۔ نیز خلودِ جہنم کا یقین ہونے کے باوجود کہیں گے'' يَا مَالِكُ لِيَقْضِ عَلَيْنَا رَبُّكَ ''یعنی اے مالک تمہارا پروردگار (ہمیں موت دے کر) ہمارا کام ہی تمام کر دے' حالانکہ وہ جانتے ہوں گے کہ: '' لَا يُقْضٰى عَلَيْهِمْ فَيَمُوْتُوْا وَلَا يُخَفَّفُ عَنْهُمْ مِنْ عَذَابِهَا ''

سوال: یہاں دو آیتیں ہیں' ایک تو یہی ہے اور دوسری آیتِ کریمہ یہ ہے: '' وَلَا يَكْتُمُوْنَ اللّٰهَ حَدِيْثًا'' (اور وہ اللہ تعالیٰ سے کسی بات کا اخفاء نہ کر سکیں گے) ان آیتوں میں تطبیق کیسے ہوگی؟

جوابِ اوّل: قیامت کے دن مواقع مختلف ہوں گے' بعض مواقع پر وہ اخفاء کر سکیں گے اور بعض میں جھوٹی قسمیں کھائیں گے۔ جیسے ارشادِ ربانی ہے: ''فَوَرَبِّكَ لَنَسْئَلَنَّهُمْ اَجْمَعِيْنَ عَمَّا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ.'' نیز فرمایا: ''فَيَوْمَئِذٍ لَّا يُسْئَلُ عَنْ ذَنْبِهٖۤ اِنْسٌ وَّلَا جَآنٌّ ''

جوابِ ثانی: اصل میں ان کا جھوٹی قسمیں کھانا ان کے اعضاء وجوارح کی ان کے خلاف شہادت دینے سے قبل ہوگا' اور '' لَا يَكْتُمُوْنَ اللّٰهَ حَدِيْثًا'' کا معاملہ جوارح کی ان کے خلاف گواہی دینے کے بعد ہوگا۔

سوال: ارشادِ ربانی ہے: '' وَلَلدَّارُ الْاٰخِرَةُ خَيْرٌ لِّلَّذِيْنَ يَتَّقُوْنَ ''(اور البتہ آخرت کا گھر متقیوں کے لئے بہتر ہے) کیا وجہ ہے کہ متقین کو خاص طور پر ذکر کیا گیا' حالانکہ دارِ آخرت غیرِ متقین جیسے مجانین واطفال' ان کے لئے بھی بہتر ہے؟

جواب: متقین کو خاص طور پر اس لئے ذکر فرمایا گیا کہ وہ اس حیثیت سے اصل ہیں کہ ان کا درجہ اعلیٰ ہے اور غیر متقین ان کے تابع ہیں۔

سوال: اس میں کیا حکمت ہے کہ حضورِ اکرم ﷺ کے لئے اندازِ تخاطب اس طرح استعمال کیا "فَلَا تَكُونَنَّ مِنَ الْجٰهِلِيْنَ" (سو آپ نادانوں میں سے نہ ہو جایئے) اور حضرت نوح علیہ السلام سے یوں فرمایا: "اِنِّیْ اَعِظُكَ اَنْ تَكُوْنَ مِنَ الْجٰهِلِيْنَ" (بے شک میں آپ کو نصیحت کرتا ہوں کہ تم (آئندہ) نادان نہ بن جاؤ) یعنی حضرت نوحؑ سے تو نرم انداز میں خطاب فرمایا اور حضورِ اکرم ﷺ سے ذرا سخت انداز میں خطاب فرمایا' حالانکہ مرتبہ اور درجہ کے اعتبار سے حضورِ اکرم ﷺ ان سے اعلیٰ واشرف ہیں؟۔

جواب: اس کی وجہ یہ ہے کہ حضرت نوح علیہ السلام اپنے مطلوب سے ناواقف ہونے کی بناء پر معذور تھے' اللہ تعالیٰ نے ان سے وعدہ فرمایا تھا کہ ان کے اہل کو نجات حاصل ہوگی' نوح علیہ السلام نے گمان کیا کہ ان کا بیٹا ان کے اہل میں سے ہے۔ اس لئے انہوں نے اللہ کے وعدہ کو سامنے رکھتے ہوئے اپنے بیٹے کی نجات کے لئے دعا فرمائی تھی' جب کہ حضور نبی کریم ﷺ اس طرح کے معذور نہ تھے' حضورؐ یہ جاننے کے باوجود کہ ایمان وکفر کا تعلق مشیتِ خداوندی سے ہے اور یہ لوگ اللہ کی ہدایت سے ہی ہدایت حاصل کر سکتے ہیں آپؐ پر کفار کا کفر گراں بار ہوتا تھا۔

سوال: اس آیتِ مبارکہ سے کیا مراد ہے: "وَالْمَوْتٰى يَبْعَثُهُمُ اللّٰهُ ثُمَّ اِلَيْهِ يُرْجَعُوْنَ" (اور مُردوں کو اللہ تعالیٰ زندہ کر کے اٹھائیں گے پھر سب اللہ ہی کی طرف لائے جائینگے) یہ بات تو واضح ہے کہ جب مُردوں کو اللہ تعالیٰ ان کی قبروں سے اٹھائیں گے تو وہ لامحالہ زندہ ہونے کے بعد اللہ تعالیٰ ہی کی طرف لائے جائینگے' پھر اس کے ذکر کرنے کا کیا فائدہ ہے؟

جواب: اس سے مراد لوگوں کو اللہ کے سامنے حساب وجزا کے لئے لا کھڑا کرنا ہے اور یہ بات "بَعْث" کے علاوہ ہے جو حیات بعد الممات کا نام ہے لہٰذا اس میں کوئی تکرار نہیں ہے۔

سوال: ارشادِ الٰہی ہے: "وَقَالُوْا لَوْ لَا نُزِّلَ عَلَيْهِ اٰيَةٌ مِّنْ رَّبِّهٖ قُلْ اِنَّ اللّٰهَ قَادِرٌ عَلٰٓى اَنْ يُّنَزِّلَ اٰيَةً" (اور یہ لوگ کہتے ہیں کہ ان پر کوئی معجزہ کیوں نہیں نازل کیا گیا ان کے رب کی طرف سے۔ آپ فرما دیجئے کہ اللہ تعالیٰ کو بے شک پوری قدرت ہے اس پر کہ وہ معجزہ نازل فرمائیں) اگر یہ جواب نبی کریم ﷺ کی طرف سے صحیح ہو تو پھر ہر مدعیِ نبوت کا معجزہ کے مطالبہ کے وقت یہ کہد ینا بھی درست ہو کہ بے شک اللہ تعالیٰ اس پر قادر ہیں کہ وہ کوئی معجزہ نازل فرمائیں؟۔

جواب: جب کسی کی نبوت معجزۂ خداوندی سے ثابت ہو تو اس کے لئے ایسا کہنا صحیح ہے لیکن جب اس کی نبوت ہی ثابت نہ ہو تو پھر اس کے لئے ایسا کہنا صحیح نہیں ہے' حضورِ نبی کریم ﷺ کی نبوت قرآن پاک اور انشقاقِ قمر وغیرہ سے ثابت ہو چکی ہے اس لئے آپؐ کا اس طرح فرمانا تو درست

ہوگا لیکن کسی اور کے لئے درست نہ ہوگا جس کی نبوت ہی ثابت نہ ہو۔

**سوال:** اللہ تعالیٰ کے اس ارشادِ مبارک: ''وَمَا مِنْ دَآبَّةٍ فِي الْاَرْضِ وَلَا طٰٓئِرٍ يَّطِيْرُ بِجَنَاحَيْهِ'' (اور جتنے قسم کے جاندار زمین پر چلنے والے ہیں اور جتنے قسم کے پرند جانور ہیں کہ اپنے دونوں بازوں سے اُڑتے ہیں) کا کیا فائدہ ہے؟ یہ بات تو سب جانتے ہیں کہ ''دابۃ'' وہی جانور ہوتا ہے جو زمین پر چلتا ہے اس لئے کہ لغت میں ''دابۃ'' اس جانور کا نام ہے جو سطحِ زمین پر چلتا ہو اور ''طیر'' کے بازو اور پر ہوتے ہی ہیں' یہ سب کچھ بتانے کا کیا فائدہ ہے؟۔

**جواب:** اس میں چند فائدے ہیں' پہلا فائدہ یہ ہے کہ یہ تاکید کے لئے ہے جیسے کہتے ہیں'' هٰذِهٖ نَعْجَةٌ اُنْثٰى '' (یہ مادہ دنبی ہے) اور ''كَلَّمْتُهٗ بِلِسَانِيْ'' (میں نے اس سے زبان سے بات کی) اور کہتے ہیں: ''مَشَيْتُ اِلَيْهِ بِرِجْلِيْ '' (میں اس کی طرف اپنے ٹانگوں سے چل کر گیا) نیز جیسے ارشاد ہے: '' لَا تَتَّخِذُوْٓا اِلٰهَيْنِ اثْنَيْنِ '' نیز جیسے فرمایا: '' يَقُوْلُوْنَ بِاَلْسِنَتِهِمْ مَا لَيْسَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ ''

دوسرا فائدہ یہ ہے کہ مجاز ہونے کا وہم دور کرنا' کیوں کہ عرب کے ہاں کہا جاتا ہے: ''طار فلان فی امر کذا '' جب وہ اس کام کی طرف جلدی کرے۔ نیز وہ کہتے ہیں: ''طار الفرس '' جب گھوڑا تیز دوڑے۔

تیسرا فائدہ تعمیم اور احاطہ کی زیادتی ہے۔ گویا کہ فرمایا کہ تمام قسم کے دواب' جو زمین پر چلتے ہیں اور تمام قسم کے طیور' جو اڑتے ہیں۔

**سوال:** ''قُلْ اَرَءَيْتَكُمْ اِنْ اَتٰىكُمْ عَذَابُ اللّٰهِ اَوْ اَتَتْكُمُ السَّاعَةُ...... فَيَكْشِفُ مَا تَدْعُوْنَ اِلَيْهِ اِنْ شَآءَ '' (آپ کہیے کہ اپنا حال تو بتلاؤ کہ اگر تم پر خدا کا کوئی عذاب آپڑے یا تم پر قیامت ہی آپہنچے تو کیا خدا کے سوا کسی اور کو پکارو گے اگر تم سچے ہو بلکہ اسی کو پکارنے لگو پھر جس کے لئے تم پکارو اگر وہ چاہے تو اس کو ہٹا بھی دے) اس آیتِ کریمہ میں جو باتیں ذکر کی گئی ہیں ان میں سے ایک قیامت کا عذاب بھی ہے حالانکہ وہ تو مشرکین پر منکشف نہیں کیا گیا؟

**جواب:** مطلقاً کشف کی خبر نہیں دی بلکہ مشروط طور پر فرمایا ہے کہ اگر وہ چاہے تو مشرکین سے اس کو کھول دے۔

**سوال:** اس کی کیا وجہ ہے کہ اس آیتِ مبارکہ میں: '' قُلْ لَّآ اَقُوْلُ لَكُمْ عِنْدِيْ خَزَآئِنُ اللّٰهِ وَلَآ اَعْلَمُ الْغَيْبَ وَلَآ اَقُوْلُ لَكُمْ اِنِّيْ مَلَكٌ '' (آپ کہہ دیجئے کہ نہ تو میں تم سے یہ کہتا ہوں کہ میرے پاس خدا کے خزانے ہیں اور نہ میں تمام غیبوں کو جانتا ہوں اور نہ میں تم سے یہ کہتا ہوں کہ

میں فرشتہ ہوں) پہلے اور تیسرے جملہ میں تو قول کا ذکر کیا ہے لیکن دوسرے جملہ میں اس کا ذکر نہیں کیا؟

جواب: چونکہ اخبار بالغیب ایسی چیز ہے کہ بہت سے لوگ اس کا دعویٰ کیا کرتے ہیں جیسے نجومی' کاہن وغیرہ۔ پھر اکثر جُہال بھی ان نجومیوں کی باتوں کو درست خیال بھی کرتے ہیں اور ان کے بتانے کے مطابق عمل کرتے ہیں اس لئے حضور ﷺ نے اپنی ذاتِ مبارکہ سے اس کی حقیقت سے مبالغہ کے طور پر نفی فرمائی کہ میں غیبوں کو نہیں جانتا' جبکہ ملکیت اور الٰہیت دو ایسی چیزیں ہیں کہ ان کا حضور کی ذات سے اور دوسرے انسانوں سے انتفاء بالکل ظاہر ہے اس لئے ان دونوں کی نفی میں صرف نفیِ قول پر اکتفاء فرمایا' کیونکہ ان دونوں میں کوئی اور دعوی نہ نفس الامر میں متصور ہے' اور نہ لوگوں کے خیال وگمان میں متصور ہے۔ لہٰذا دونوں چیزوں میں امتیاز ہو گیا' اللہ تعالیٰ کے ارشاد عالی: "قُلْ لَّآ اَقُوْلُ لَكُمْ عِنْدِىْ خَزَآئِنُ اللّٰهِ" سے مراد یہ ہے کہ میں خدائی کا دعویٰ نہیں کرتا ہوں:" كذا قاله بعض المفسرين "

سوال: اس کی کیا وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے اس ارشادِ مبارک میں: " وَكَذٰلِكَ نُفَصِّلُ الْاٰيٰتِ وَلِتَسْتَبِيْنَ سَبِيْلُ الْمُجْرِمِيْنَ "(اور اسی طرح ہم آیات کی تفصیل کرتے رہتے ہیں اور تاکہ مجرمین کا طریقہ ظاہر ہو جائے) مجرمین کے طریقہ کا ذکر تو فرمایا لیکن مومنین کے طریقہ کا ذکر نہیں فرمایا' حالانکہ دونوں طریقوں کے ظاہر کرنے کی ضرورت ہے؟

جواب: اس کی وجہ یہ ہے کہ جب مجرمین کا طریقہ ظاہر ہو جائے گا تو لامحالہ مومنین کا طریقہ بھی آشکارا ہو جائے گا' کیونکہ یہی دو طریقے ہیں اس کے علاوہ کوئی اور طریقہ تو ہے ہی نہیں۔

سوال: اس کی کیا وجہ ہے کہ فرمایا: " وَيَعْلَمُ مَا جَرَحْتُمْ بِالنَّهَارِ "(اور جو کچھ تم دن میں کرتے ہو وہ اس کو جانتا ہے) حالانکہ لوگ جو کچھ دن میں اور رات کو کرتے ہیں وہ ان سب کو جانتا ہے؟ صرف دن کا ذکر کیوں فرمایا؟۔

جواب: اس لئے کہ اکثر و بیشتر کام دن ہی کو ہوتے ہیں' کیونکہ دن انسان کی حرکت کا زمانہ ہے جبکہ رات اس کے سکون کا زمانہ ہے' اس کی دلیل یہ ارشاد ہے: " وَمِنْ رَّحْمَتِهٖ جَعَلَ لَكُمُ الَّيْلَ وَالنَّهَارَ لِتَسْكُنُوْا فِيْهِ وَلِتَبْتَغُوْا مِنْ فَضْلِهٖ "اور یہ بات اس آیت کے بعد بیان فرمائی: " مَنْ اِلٰهٌ غَيْرُ اللّٰهِ يَاْتِيْكُمْ بِلَيْلٍ تَسْكُنُوْنَ فِيْهِ "۔

سوال: یہاں فرمایا ہے: " ثُمَّ رُدُّوْٓا اِلَى اللّٰهِ مَوْلٰىهُمُ الْحَقِّ "(پھر سب اپنے مالکِ حقیقی کے پاس لائے جائیں گے) اور دوسرے مقام پر فرمایا: " وَاَنَّ الْكٰفِرِيْنَ لَا مَوْلٰى لَهُمْ "(کافروں کا

کوئی مولیٰ و مالک نہیں ہوگا؟

جواب: پہلے مولیٰ سے مراد مالک یا خالق یا معبود ہے اور دوسرے مولیٰ سے مراد ناصر و مددگار ہے لہٰذا دونوں میں کوئی منافات نہیں ہے۔

سوال: ارشادِ باری تعالیٰ ہے: "قَوْلُهُ الْحَقُّ وَلَهُ الْمُلْكُ يَوْمَ يُنْفَخُ فِي الصُّوْرِ" (بات اسی کی سچ ہے اور واسطے اسی کے ہے بادشاہی جس دن پھونکا جائیگا صور میں) اس کی کیا وجہ ہے کہ "حق" اور "ملک" کو قیامت کے دن کے ساتھ خاص فرمایا گیا' حالانکہ اللہ تعالیٰ کی بات ہر وقت سچ ہے اور ہر زمان میں اس کی بادشاہی ہے؟۔

جواب: وجہ یہ ہے کہ وہ دن ایسا ہوگا کہ غیر اللہ کے لئے کسی صورت میں بادشاہی نہیں ہوگی' دنیا میں غیر اللہ کے لئے حکومت' خلافت یا ہبہ وانعام کے طور پر تو ہے' جس کی دلیل یہ آیتِ مبارکہ ہے جو حضرت داوٗدؑ کے بارے میں ہے: "وَاٰتَاهُ اللّٰهُ الْمُلْكَ وَالْحِكْمَةَ" نیز یہ ارشاد بھی دلیل ہے: "وَاللّٰهُ يُؤْتِيْ مُلْكَهٗ مَنْ يَّشَآءُ" اور اللہ تعالیٰ کی بات اس دن سچ ہونے کے معنی یہ ہیں کہ اس روز اللہ تعالیٰ کی بات بااثر ہوگی کہ کوئی بندہ اس کو رد نہیں کر سکے گا اور نہ ہی کوئی ضدّ ی اس میں کسی قسم کا شک کرے گا' کیونکہ سب لوگوں سے پردے ہٹا دیئے جائیں گے اور سب کے دعاوی اور خصومات کا قلع قمع ہو چکا ہوگا۔ جیسے فرمانِ خداوندی ہے: "لِمَنِ الْمُلْكُ الْيَوْمَ" یعنی اللہ تعالیٰ پوچھیں گے کہ آج کس کی بادشاہت ہے؟۔

سوال: اس کی کیا وجہ وحکمت ہے کہ اللہ تعالیٰ نے احسان جتانے کے ضمن میں فرمایا: "وَوَهَبْنَا لَهٗ اِسْحٰقَ وَيَعْقُوْبَ" (اور ہم نے ان کو اسحاقؑ دیا اور یعقوبؑ) حضرت اسماعیل علیہ السلام کا نام نہیں لیا حالانکہ وہ ان کے بڑے صاحبزادہ تھے؟۔

جواب: اس کی وجہ یہ ہے کہ اسحاق علیہ السلام ایک حرہ (آزاد عورت) کے بطن سے ان کو عطا ہوئے اور اسماعیل علیہ السلام ایک امہ (باندی) سے نوازے گئے' نیز اسحاق علیہ السلام ان کو ایک بوڑھی بانجھ عورت کے بطن سے عطا ہوئے' لہٰذا ان میں احسانِ خداوندی کا ظہور زیادہ ہے۔

سوال: اس کی کیا وجہ ہے کہ قرآنِ پاک کے بارے میں فرمایا: "وَالَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ يُؤْمِنُوْنَ بِهٖ" (اور جو لوگ آخرت کا یقین رکھتے ہیں ایسے لوگ اس پر ایمان لے آتے ہیں) حالانکہ ہم دیکھتے ہیں کہ یہود و نصاریٰ اور دوسرے بہت سے لوگ جو آخرت کا یقین تو رکھتے ہیں لیکن قرآنِ حکیم پر ایمان نہیں لاتے؟۔

جواب: اس کا معنی یہ ہے کہ جو لوگ آخرت پر کارآمد اور مقبول انداز میں ایمان لاتے ہیں وہی

لوگ اس پر ایمان لاتے ہیں۔ پھر اس کی دو صورتیں ہیں یا تو حضرت موسیٰ وحضرت عیسیٰ علیہما السلام کی بشارت کی وجہ سے اس کے نزول سے قبل اس کی تصدیق کرتے ہیں یا نزول کے بعد اس کی اتباع کرتے ہیں اور یہ بات حقیقت پر مبنی ہے۔ کیوں کہ جو شخص حضرت موسیٰ وحضرت عیسیٰ علیہما السلام کی بشارتِ محمدیؐ اور بشارتِ قرآن کی تصدیق نہیں کرتا یا بعثتِ نبویؐ کے بعد ان پر ایمان نہیں لاتا تو اس کا ایمان بالآخرت غیر معتبر ہے۔

سوال: جب یہ فرمادیا کہ: ''وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرٰی عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا'' (اور اس شخص سے زیادہ کون ظالم ہوگا جو اللہ پر جھوٹ تہمت لگائے) تو پھر اس کے بعد مستقل طور پر یہ فرمانے کی کیا ضرورت ہے کہ: ''اَوْ قَالَ اُوْحِیَ اِلَیَّ'' (یا یوں کہے کہ مجھ پر وحی آتی ہے) یہ بھی تو افترا علی اللہ ہی ہے؟

جواب الزامی: پہلا عام اور دوسرا خاص ہے اور مقصود دونوں کا انکار ہے اور عام کے وجود سے خاص کا وجود لازم نہیں آتا البتہ عام کی مذمت اور اس کے انکار سے خاص کی مذمت اور اس کا انکار لامحالہ لازم آتا ہے اور ہماری بحث اسی قسم سے ہے۔

جواب تحقیقی: چونکہ یہ خاص افتراء کی انواع میں سے زیادہ قبیح کی نوع کے ساتھ مخصوص ہے اس لئے اس کو خاص طور سے ذکر فرمایا تاکہ گناہ اور سزا کی زیادتی پر تنبیہ ہو۔

سوال: ''بَدِیْعُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ....... خَلَقَ كُلَّ شَیْءٍ ....... خَالِقُ كُلِّ شَیْءٍ'' اس کی کیا وجہ ہے کہ ''خَلَقَ كُلَّ شَیْءٍ'' کے بعد دوبارہ ''خَالِقُ كُلِّ شَیْءٍ'' فرمایا' دوبارہ ذکر کرنے میں کیا فائدہ ہے؟۔

جواب: اس کو پہلے نفیِ ولد پر استدلال کرنے کے لئے ذکر فرمایا' پھر اس کو دوبارہ اس قول: ''فَاعْبُدُوْهُ'' کی تمہید کے لئے ذکر فرمایا۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ''خَالِقُ كُلِّ شَیْءٍ'' ہونا اس کے مستحقِ عبادت وطاعت کو مقتضی ہے لہٰذا یہ ایک نیا فائدہ ہوا۔

سوال: ارشادِ خداوندی ہے: ''لَا تُدْرِكُهُ الْاَبْصَارُ وَهُوَ یُدْرِكُ الْاَبْصَارَ'' (اس کو تو کسی کی نگاہ محیط نہیں ہوسکتی اور وہ سب نگاہوں کو محیط ہو جاتا ہے) اس کی کیا وجہ ہے کہ ابصار کو ادراک کے ساتھ خاص کیا گیا' یہ نہیں فرمایا گیا کہ وہ ہر شے کا ادراک کر لیتا ہے حالانکہ یہ صورت ایسی ہے کہ اس سے تعریف میں زیادہ مبالغہ ہوتا ہے؟

جواب: اس کی دو وجہیں ہیں: ایک وجہ یہ ہے کہ یہاں لفظ مقابلہ کی رعایت رکھی گئی ہے' یہ بلاغت کی ایک نوع ہے' دوسری وجہ یہ ہے کہ یہ صفت' اس ذات کے اور ابصار کے درمیان خاص

ہے کہ وہ ابصار کا ادراک یعنی احاطہ کر سکتا ہے لیکن ابصار اس کو محیط نہیں ہو سکتیں۔ لیکن اس کے علاوہ جو چیزیں ابصار کا ادراک کر سکتی ہیں وہ ابصار بھی ان کا ادراک کر سکتی ہے اسی لئے ابصار کا خاص طور سے ذکر فرمایا۔

سوال: اس کی کیا وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس طرح فرمایا: "وَهُوَ الَّذِيْ اَنْزَلَ اِلَيْكُمُ الْكِتٰبَ مُفَصَّلًا" (اور وہ ایسا ہے کہ اس نے ایک کتاب کامل تمہارے پاس بھیجدی ہے اس کی حالت یہ ہے کہ اس کے مضامین خوب صاف صاف بیان کئے گئے ہیں) حالانکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: "انزلنا الیک الکتٰب" یعنی ہم آپ کے پاس کتاب بھیجی۔؟ یہاں یوں نہیں فرمایا: "وَهُوَ الَّذِيْ انزَلَ اِلَیَّ" (اور وہ ایسا ہے جس نے میرے پاس کتاب بھیجی ہے؟"۔

جواب: چونکہ نبی کریم ﷺ پر کتاب کے نازل کرنے کا مقصد یہ ہے کہ آپ اس کو مخلوق تک پہنچائیں اور اس کے ذریعہ ان کو ہدایت دیں اس لئے حقیقت میں یہ کتاب لوگوں کے پاس بھیجی گئی ہے لیکن حضور ﷺ کے واسطہ سے ہے اس لئے اس انزال کی نسبت حضور کی طرف بھی صحیح ہے اور لوگوں کی طرف بھی درست ہے۔

سوال: اس آیت سے کیا مراد ہے: "فَكُلُوْا مِمَّا ذُكِرَ اسْمُ اللّٰهِ عَلَيْهِ اِنْ كُنْتُمْ بِاٰيٰتِهٖ مُؤْمِنِيْنَ" (جس جانور پر اللہ کا نام لیا جائے اس میں سے کھاؤ اگر تم اس کے احکام پر ایمان رکھتے ہو) اس کی کیا وجہ ہے کہ مومن ہونے کو ایسے جانور کے کھانے کے ساتھ معلق کیا گیا جس پر اللہ کا نام لیا گیا ہو؟ حالانکہ اگر کوئی شخص جانور بالکل بھی نہ کھائے تب بھی وہ مومن رہے گا؟۔

جواب: اس سے مراد ایسے جانور کے حلال ہونے کا اعتقاد رکھنا ہے نہ کہ اس کا محض کھانا۔ کیونکہ عرب میں بعض ایسے بھی لوگ تھے جو میتہ کے حلال ہونے کے معتقد تھے لیکن ذبیحہ کی حرمت کے قائل تھے۔

سوال: اس کی کیا وجہ ہے کہ اس آیتِ کریمہ میں تزئین کے فاعل کو مبہم رکھا: "كَذٰلِكَ زُيِّنَ لِلْكٰفِرِيْنَ" (اسی طرح کافروں کو مستحسن معلوم ہوا کرتے ہیں) جب کہ ایک آیت میں فرمایا: "زَيَّنَّا لَهُمْ اَعْمَالَهُمْ" یعنی ہم نے ان کے اعمال ان کے سامنے مزین کئے' اور ایک دوسری آیت میں فرمایا: "وَزَيَّنَ لَهُمُ الشَّيْطٰنُ اَعْمَالَهُمْ" یعنی شیطان ان کے سامنے ان کے اعمال مزیّن کر کے پیش کرتا ہے' آخر کفار کے اعمال کا حقیقی مزیّن کون ہے؟۔

جواب: شیطان کی تزئین اغواء' ضلالت' وسوسہ اور ایرادِ شبہ کی صورت میں ہے اور اللہ تعالیٰ کی تزئین ان تمام امور کی تخلیق کی صورت میں ہے' لہٰذا دونوں نسبتیں درست ہوئیں۔

سوال: اس آیتِ کریمہ سے کیا مراد ہے: " یٰمَعۡشَرَ الۡجِنِّ وَالۡاِنۡسِ اَلَمۡ یَاۡتِکُمۡ رُسُلٌ مِّنۡکُمۡ" (اے جماعتِ جنات کی اور انسان کی کیا تمہارے پاس تم ہی میں کے پیغمبر نہیں آئے تھے) حالانکہ پیغمبر صرف انسانوں میں سے ہوئے ہیں؟

جوابِ اوّل: رُسُلُ الۡجِنِّ سے مراد وہ حضرات ہیں جو نبی کریم ﷺ سے قرآنِ کریم سن کر اپنی قوم کی طرف انذار و تبلیغ کے لئے گئے تھے۔ جیسے اس آیت میں فرمایا ہے: " وَاِذۡ صَرَفۡنَاۤ اِلَیۡکَ نَفَرًا مِّنَ الۡجِنِّ یَسۡتَمِعُوۡنَ الۡقُرۡاٰنَ " الآیۃ۔

جوابِ ثانی: یہ آیتِ مبارکہ اسی طرح ہے جیسے اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان ہے: "یَخۡرُجُ مِنۡهُمَا اللُّؤۡلُؤُ وَالۡمَرۡجَانُ " حالانکہ مراد صرف ایک دریا سے نکلنا ہے کیونکہ یہ کھارے سے ہی نکلتے ہیں۔

جوابِ ثالث: جنّات کی طرف بھی پیغمبر مبعوث ہوئے ہیں: " قالہ الضحاک ومقاتل "

سوال: اس کی کیا وجہ ہے کہ اس مذکورہ آیت: " یٰمَعۡشَرَ الۡجِنِّ وَالۡاِنۡسِ " الآیۃ میں ان کا اپنی جانوں پر گواہی دینے کا ذکر فرمایا۔ حالانکہ دونوں جملوں میں معنیٰ ایک ہی ہے؟

جواب: شہادت کے اعتبار سے ایک ہے مگر مشہود بہ کے اعتبار سے متعدد ہے۔ پہلے جملہ میں تو یہ ذکر ہے کہ وہ اس بات کے مقر ہوں گے کہ پیغمبروں نے تبلیغ و انذار کا فریضہ انجام دیا تھا اور دوسرے میں یہ ہے کہ وہ اپنے بارے میں کفر کا اقرار کریں گے۔ چنانچہ دونوں جملوں میں فرق ہوگیا۔

سوال: اس کی کیا وجہ ہے کہ اس آیت میں تو ذکر ہے کہ وہ اپنے کفر کا اقرار کریں گے لیکن: " وَاللّٰهِ رَبِّنَا مَا کُنَّا مُشۡرِکِیۡنَ " میں مذکور ہے کہ وہ اس سے انکار کریں گے؟

جوابِ اوّل: قیامت کے دن مواقع اور مواقف مختلف ہوں گے۔ بعض میں اقرار کریں گے اور بعض میں انکار۔

جوابِ ثانی: یہاں پر مراد یہ ہے کہ جب ان کے مُنہ پر مُہر لگ جائیگی تو ان کے اعضاء ان کے خلاف گواہی دیں گے جیسے ایک اور جگہ پر ارشاد ہے: " اَلۡیَوۡمَ نَخۡتِمُ عَلٰۤی اَفۡوَاهِهِمۡ وَتُکَلِّمُنَاۤ اَیۡدِیۡهِمۡ وَتَشۡهَدُ اَرۡجُلُهُمۡ " الآیۃ۔

سوال: " قَدۡ ضَلُّوۡا " (تحقیق یہ لوگ گمراہی میں پڑ گئے) فرمادینے کے بعد: " وَ مَا کَانُوۡا مُهۡتَدِیۡنَ " (اور نہ ہوئے راہ پانے والے) کہنے میں کیا فائدہ ہے؟

جواب: اس کا فائدہ اس بات کی خبر دینا ہے کہ وہ ایک بار گمراہ ہو جانے کے بعد اب دوبارہ راہ یاب نہیں ہوں گے۔ کیونکہ بعض لوگ ایسے بھی ہیں جو گمراہ ہوتے ہیں مگر پھر راہِ ہدایت پا

لیتے ہیں۔

**سوال:** ''سَفَهًا م بِغَيْرِ عِلْمٍ'' (بے وقوفی بغیر علم کے) کا کیا معنی ہے؟ ظاہر ہے کہ بے وقوفی جہالت سے ہی ہوتی ہے؟

**جوابِ اوّل:** ''بِغَيْرِ عِلْمٍ'' کا معنی ہے بِغَيْرِ حُجَّةٍ' یعنی بغیر حجت کے۔

**جوابِ ثانی:** یعنی مقدارِ قباحت اور مقدارِ عقوبت کے علم کے بغیر۔ ان دونوں جوابات کی صورت میں دوسری بات پہلے سے مستفاد نہ ہوگی۔

**سوال:** '' كُلُوْا مِنْ ثَمَرِهٖ '' (اس کے پھل میں سے کھاؤ) کے بعد: '' اِذَا اَثْمَرَ '' (جبکہ پھل لائے) کہنے میں کیا نکتہ ہے؟ حالانکہ یہ بات سب جانتے ہیں کہ پھل تبھی کھایا جاسکتا ہے جب وہ پھل لائے؟

**جواب:** اس کا فائدہ اور نکتہ یہ ہے کہ اس وہم کا ازالہ ہو کہ پھل کی اباحت اس کے پکنے پر موقوف ہے اس لئے فرمایا ''اِذَا اَثْمَرَ'' یعنی جب وہ پھل نکل آئے اسی وقت اس کا کھانا مباح ہے۔

**سوال:** اس آیتِ مبارکہ کا کیا مطلب ہے: '' قُلْ لَّآ اَجِدُ فِیْ مَآ اُوْحِیَ اِلَیَّ مُحَرَّمًا '' الآیۃ آپ کہہ دیجئے کہ جو کچھ احکام بذریعہ وحی میرے پاس آئے ہیں ان میں تو کوئی حرام غذا پاتا نہیں)۔ حالانکہ قرآنِ پاک ہی میں سود کھانے' یتیم کا مال اڑانے اور کسی کا مال باطل طریقہ سے کھانے وغیرہ' کی حرمت کا ذکر بھی موجود ہے؟

**جوابِ اوّل:** '' مُحَرَّمًا '' کا مطلب یہ ہے کہ جن چیزوں کو وہ لوگ زمانہ جاہلیت میں حرام سمجھتے تھے ان کو میں حرام نہیں پاتا.........

**جوابِ ثانی:** یعنی جن چیزوں کو وہ حلال سمجھتے ہیں میں وحی کے ذریعہ ان کو حرام نہیں پاتا مگر یہ کہ وہ مردار ہو الخ۔

**سوال:** اس کی کیا وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ''فَاِنْ كَذَّبُوْكَ فَقُلْ رَّبُّكُمْ ذُوْ رَحْمَةٍ وَّاسِعَةٍ'' (پھر یہ اگر آپ کو کاذب کہیں تو آپ کہہ دیجئے کہ تمہارا رب بڑی وسیع رحمت والا ہے)۔

حالانکہ موقع تو عذاب کا ہے' لہٰذا بہتر تو یہ ہے کہ یوں کہا جاتا کہ تمہارا رب بڑا سخت عذاب والا ہے یا اس جیسا کوئی لفظ ہوتا؟

**جوابِ اوّل:** ایسا اس لئے فرمایا تا کہ وہ جو خدا کی نافرمانی کی جرأت و جسارت کے معاملہ میں اللہ کی وسعتِ رحمت پر خود فریبی میں مبتلا ہیں اس کی نفی کی جائے۔ اور یہ طریقہ تہدید و انذار میں بلیغ تر ہے۔

جوابِ ثانی: اس کا معنی یہ ہے کہ تم اللہ کی وسعتِ رحمت سے دھوکہ نہ کھاؤ کیونکہ وہ وسعتِ رحمت کے باوجود تم سے اپنا عذاب نہیں ہٹائے گا۔

جوابِ ثالث: اس کا مطلب یہ ہے کہ تمہارا رب فرمانبرداروں کے حق میں وسیع الرحمت ہے اور وہ اپنا عذاب نافرمانوں سے نہیں ہٹائے گا۔

سوال: فرمانِ خداوندی ہے: "قُلْ تَعَالَوْا اَتْلُ مَا حَرَّمَ رَبُّكُمْ عَلَيْكُمْ" (آپ کہیئے کہ آؤ میں تم کو وہ چیزیں پڑھ کر سناؤں جن کو تمہارے رب نے تم پر حرام فرمایا ہے) پھر اس کی تفسیر دس احکامات کے ساتھ فرمائی' جن میں سے پانچ احکام تو واجب العمل ہیں۔ لیکن یہاں تلاوت کا لفظ استعمال ہوا ہے حالانکہ تلاوت لفظ کی صفت ہے نہ کہ معنی کی۔ تاکہ اس سے ان کے اضداد کا حرام ہونا لازم نہ آئے؟۔

جوابِ اوّل: "اَتْلُ مَا حَرَّمَ رَبُّكُمْ عَلَيْكُمْ" کا قول تلاوتِ غیر کی نفی نہیں کرتا' آپ نے یقیناً ما حرّم کی بھی تلاوت کی ہے اور اس کے علاوہ کی بھی تلاوت کی ہے۔

جوابِ ثانی: عبارت مقدر ہے: "اَتْلُ مَا حَرَّمَ رَبُّكُمْ عَلَيْكُمْ وَ اَوْجَبَ" یعنی میں نے تم کو وہ چیزیں پڑھ کر سناؤں جن کو تم پر تمہارے رب نے حرام فرمایا ہے اور واجب کیا ہے۔

سوال: اس کی کیا وجہ کہ صرف مالِ یتیم کے قریب جانے کی ممانعت فرمائی ہے جبکہ مالِ بالغ کا بھی یہی حکم ہے؟

جوابِ اوّل: صرف مالِ یتیم سے منع فرمانے کی وجہ یہ ہے کہ یتیم بیچارہ کمزور اور بے بس ہوتا ہے جس کی وجہ سے طامعین کی طمع اس کے مال میں زیادہ ہوتی ہے' نیز اس کے مال کی حفاظت اور مدد کرنے والے بھی کم ہی ہوتے ہیں۔ جبکہ بالغ کے مال کا یہ حال نہیں ہے۔

جوابِ ثانی: یہ تخصیص دونوں حکموں کی بناء پر ہے' یعنی غیر مستحسن طریقہ سے مالِ یتیم کے قریب جانے سے ممانعت اور مستحسن طریقہ سے اس کے قریب جانے کا وجوب یا اس کے مالک کی اجازت کے بغیر مستحسن طور پر اس کے مال کے قریب جانے کا جواز۔ ظاہر ہے کہ ان دونوں حکموں کا مجموعہ مالِ یتیم کے ساتھ ہی خاص ہے۔

جوابِ ثالث: غایت محذوف ہے' اصل عبارت اس طرح ہے: حتی یبلغ فسلموہ الیہ' یعنی یہاں تک کہ وہ بالغ ہو جائے پھر اس کا مال اس کے حوالہ کر دو۔

سوال: اس کی کیا وجہ ہے کہ عدل کو قول کے ساتھ خاص کرتے ہوئے فرمایا: "وَاِذَا قُلْتُمْ فَاعْدِلُوْا" (اور جب تم بات کہو تو انصاف کرو) ایسا کیوں نہیں فرمایا: "وَاِذَا فَعَلْتُمْ فَاعْدِلُوْا

''یعنی جب تم کوئی کام کرو تو انصاف کرو' حالانکہ افعال میں عدل کی حاجت زیادہ ہوتی ہے۔ اس لئے کہ فعلی جور وظلم سے پیدا ہونے والا ضرر اس ضرر سے زیادہ قوی ہوتا ہے جو قولی جور وظلم سے پیدا ہو؟

جواب: عدل کو قول کے ساتھ خاص کرنے کی وجہ یہ ہے کہ اس سے معلوم ہو جائے کہ فعل میں عدل بطریقِ اولیٰ واجب ہے۔ جیسے ارشاد باری تعالیٰ ہے'' وَلَا تَقُلْ لَّهُمَآ اُفٍّ'' یہاں یوں نہیں فرمایا:''وَلا تشتمهما ولا تضربهما '' کیوں کہ جب قول کا ذکر فرمادیا تو فعل میں تو بطریق اولیٰ ضروری ہوگا۔

سوال: ان دو آیتوں میں تطبیق کی کیا صورت ہوگی؟ پہلی آیت ہے:'' وَلَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰى ''(اور کوئی دوسرے کا بوجھ نہ اٹھائے گا) اور دوسری آیت یہ ہیں:'' وَلَيَحْمِلُنَّ اَثْقَالَهُمْ وَ اَثْقَالًا مَّعَ اَثْقَالِهِمْ ''(یہ لوگ اپنے گناہ اپنے اوپر لادے ہونگے اور اپنے گناہوں کے ساتھ کچھ گناہ اور) اور:''لِيَحْمِلُوْا اَوْزَارَهُمْ كَامِلَةً يَّوْمَ الْقِيَامَةِ وَمِنْ اَوْزَارِ الَّذِيْنَ يُضِلُّوْنَهُمْ بِغَيْرِ عِلْمٍ ''(نتیجہ اس کا یہ ہوگا کہ ان لوگوں کو قیامت کے دن اپنے گناہوں کا پورا بوجھ اور جن کو یہ لوگ بے علمی سے گمراہ کر رہے تھے ان کے گناہوں کا بھی کچھ بوجھ اپنے اوپر اٹھانا پڑے گا) نیز ایک مشہور حدیثِ مبارک بھی ہے کہ جو شخص کوئی برائی کرے تو اس برائی کا گناہ بھی اس پر ہوگا اور قیامت کے دن تک جو لوگ اس برائی پر عمل کریں گے ان کے گناہ بھی اس پر ہوں گے؟

جواب: پہلی آیت سے مراد ایسا گناہ ہے جس کی طرف وہ شخص بالواسطہ یا بالواسطہ کسی طرح بھی منسوب نہ ہو بلکہ مکمل طور پر اس کی نسبت کسی اور کی طرف ثابت ہو ایسے گناہ کا وہ بوجھ نہیں اٹھائے گا لیکن جو برائی اس طرح کی نہ ہو یعنی کسی طرح اس کی جانب منسوب ہو تو وہ اس وجہ سے اس کا بوجھ اٹھائے گا۔

جوابِ ثانی: اس آیت کا معنی یہ ہے کہ وہ اس بوجھ کو طوعاً (خوشی سے) نہیں اٹھائے گا جیسے مشرکین نے نبی کریم ﷺ سے کہا تھا کہ تم ہمارے دین میں واپس آجاؤ آپ کو آپکے دین کے معاملہ میں جو مشقت وغیرہ پہنچے گی ہم اس کے ذمہ دار ہیں' نیز کفار نے ایمان والوں سے کہا تھا'' اتَّبِعُوْا سَبِيْلَنَا وَلْنَحْمِلْ خَطٰيٰكُمْ ''یعنی تم ہماری راہ کو اپنا لو ہم تمہارے گناہوں کا بوجھ اٹھالیں گے۔ اور دوسری آیات کا معنی یہ ہے کہ ہم ان بوجھوں کو کرھاً (ناخوشی سے) اٹھائیں گے۔ لہٰذا ان میں کوئی منافات نہیں ہے۔

# سورۃ الاعراف

سوال: ارشادِ خداوندی ہے: "فَلَا یَكُنْ فِیْ صَدْرِكَ حَرَجٌ مِّنْهُ" (پس نہ ہو بیچ سینے تیرے کے تنگی اس سے) اس کی کیا وجہ ہے کہ اس ارشاد میں نہی حرج کی طرف متوجہ ہے؟
جواب: یہ ایسا ہی ہے جیسے کہتے ہیں: "لَا اَرَیَنَّكَ هُنَا" یعنی میں تمہیں یہاں نہ دیکھوں مراد یہ ہوتا ہے کہ تم یہاں نہ ٹھہرو کیونکہ اگر تم یہاں ٹھہرو گے تو میں تمہیں دیکھوں گا اسی طرح آیت کا معنیٰ ہے کہ آپ اس پر یقین کرلیں کوئی شک نہ کریں۔ اس لئے کہ حرج سے مراد شک ہے۔
سوال: اس آیت کا کیا معنیٰ ہے: "اَهْلَكْنٰهَا فَجَآءَهَا بَاْسُنَا" (ہلاک کیا ہم نے پس آیا ان کے پاس عذاب ہمارا) حالانکہ ہلاکت تو عذاب آنے کے بعد ہوتی ہے۔
جواب: اس کا معنیٰ یہ ہے کہ ہم نے ان کے ہلاک کرنے کا ارادہ کیا۔ جیسے یہ ارشادِ الٰہی ہے: "اِذَا قُمْتُمْ اِلَى الصَّلٰوةِ فَاغْسِلُوْا وُجُوْهَكُمْ" نیز جیسے "فَاِذَا قَرَاْتَ الْقُرْاٰنَ فَاسْتَعِذْ بِاللّٰهِ" مراد ہوتا ہے ان کاموں کا ارادہ کرنا۔
سوال: یہ کیسے فرمایا: "فَمَنْ ثَقُلَتْ مَوَازِیْنُهٗ....وَمَنْ خَفَّتْ مَوَازِیْنُهٗ" (پس جس شخص کا پلّہ بھاری ہوگا...... اور جس کا پلّہ ہلکا ہوگا) حالانکہ قیامت کا میزان (تول) ایک ہے متعدد تو نہیں ہیں پھر "موازین" فرما کر اس کو جمع کیوں لائے؟
جوابِ اوّل: اس کو جمع اس لئے لائے کہ میزان سے مراد اعمال کے موزونات ہیں۔
جوابِ ثانی: جمع اس لئے لائے کہ قیامت کا ایک میزان بھی کئی میزانوں کے قائم مقام ہوگا اور بہت سے میزانوں کا فائدہ دے گا کیونکہ اس ایک میزان میں چھوٹے چھوٹے اعمال بھی تولے جائیں گے اور پہاڑوں جیسے بڑے بڑے اعمال بھی تولے جائیں گے۔
سوال: اعمال کا وزن کیسے ہوگا اعمال تو اعراض ہیں نہ ان کا جسم ہے اور نہ ہی ثقل (بوجھ) وزن تو اجسام کا خاصہ ہے؟
جوابِ اوّل: اعمال کے صحیفے (رجسٹر) وزن کئے جائیں گے۔
جوابِ ثانی: یہ بات ثابت ہے کہ اللہ تعالیٰ ان اعمال کو جواہر اور اجسام کی صورت دے دیں گے۔ نیک لوگوں کے اعمال اچھی صورت میں اور برے لوگوں کے اعمال بُری صورت میں متصور ہوں گے۔ پھر اللہ تعالیٰ ان کا وزن کریں گے۔ "وَاللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ"۔
سوال: اس آیت سے کیا مراد ہے: "وَلَقَدْ خَلَقْنٰكُمْ ثُمَّ صَوَّرْنٰكُمْ ثُمَّ قُلْنَا لِلْمَلٰٓئِكَةِ اسْجُدُوْا

لِاٰدَمَ'' (اور ہم نے تم کو پیدا کیا پھر ہم نے ہی تمہاری صورت بنائی پھر ہم نے فرشتوں سے فرمایا کہ آدمؑ کو سجدہ کرو) کلمۂ ثُمَّ ترتیب کے لئے ہوتا ہے۔ جبکہ فرشتوں کو سجدۂ آدمؑ کا حکم ہماری تخلیق اور تصویر سے قبل ہوا تھا؟

**جوابِ اوّل:** آیت کا مطلب یہ ہے کہ ہم نے تمہارے باپ (آدمؑ) کو پیدا کیا پھر ان کی صورت بنائی' یہاں اصل میں مضاف (اب) محذوف ہے۔

**جوابِ ثانی:** مراد یہ ہے کہ ہم نے تمہارے باپ (آدمؑ) کو پیدا کیا پھر ان کی پشت میں تمہاری صورت بنائی۔ لیکن پہلا جواب زیادہ واضح ہے۔

**سوال:** اللہ تعالیٰ نے ابلیس سے کیسے فرمایا: '' فَاهْبِطْ مِنْهَا فَمَا يَكُوْنُ لَكَ اَنْ تَتَكَبَّرَ فِيْهَا '' (تو آسمان سے اتر تجھ کو کوئی حق حاصل نہیں کہ تو تکبر کرے آسمان میں رہ کر) حالانکہ نہ ابلیس کو کوئی حق حاصل ہے اور نہ ہی کسی اور کو کہ وہ زمین میں بھی تکبر کرے؟ پھر آسمان کو کیوں خاص کیا گیا؟

**جواب:** چونکہ آسمان' ان فرمانبردار فرشتوں کا مستقر ہے جو معصیت کا بالکل بھی ارتکاب نہیں کرتے' اس لئے ان کی طرف سے کسی معصیت کا پایا جانا زیادہ قبیح ہے' اس لئے ان کے مستقر اور مقام (آسمان) کو خاص طور پر ذکر فرمایا۔

**سوال:** ابلیس کی مہلت کی درخواست کیسے قبول کرلی گئی حالانکہ اس کا اس درخواست سے مقصد اللہ کے بندوں کو گمراہ کرنا اور ورغلانا ہی تھا؟

**جواب:** اس کی وجہ یہ ہے کہ اس میں دراصل بندوں کی آزمائش ہے نیز ابلیس کی مخالفت میں عظیم ثواب بھی ہے۔ اس کی نظیر دنیا کی وہ دلفریب چیزیں ہیں جن کو اللہ تعالیٰ نے خلق فرمایا ہے' نفس کی خواہشات بھی اس کی نظیر ہیں جن کے ذریعہ بندوں کا امتحان لیا جاتا ہے۔

**سوال:** ارشادِ باری تعالیٰ ہے: ''فَوَسْوَسَ لَهُمَا الشَّيْطٰنُ لِيُبْدِيَ لَهُمَا مَا وٗرِيَ عَنْهُمَا مِنْ سَوْاٰتِهِمَا'' (پھر شیطان نے ان دونوں کے دل میں وسوسہ ڈالا تاکہ ان کا پردہ کا بدن جو ایک دوسرے سے پوشیدہ تھا دونوں کے روبرو بے پردہ کردے) شیطان کا اصل مقصد تو ان کو جنّت سے نکالنا تھا نہ کہ ان کو بے پردہ کرنا' جس کی تائید اس آیت سے بھی ہوتی ہے: '' فَاَزَلَّهُمَا الشَّيْطٰنُ عَنْهَا فَاَخْرَجَهُمَا مِمَّا كَانَا فِيْهِ ''۔

**جواب:** '' لِيُبْدِيَ '' میں لامْ لامِ عاقبت وصیرورت ہے نہ کہ لامِ کَی۔ جیسے اس فرمانِ الٰہی میں: ''فَالْتَقَطَهٗ اٰلُ فِرْعَوْنَ لِيَكُوْنَ لَهُمْ عَدُوًّا وَّحَزَنًا''

نیز جیسے کسی شاعر کا قول ہے:

لِدُوا للموت وابنوا للخراب ☆ فکلکم یصیر الی التراب

سوال: اس آیت کا کیا معنی ہے: "ذٰلک من ایٰتِ اللہ" (یہ اللہ تعالیٰ کی نشانیوں میں سے ہے) لباس اور پوشاک میں اللہ تعالیٰ کی کونسی نشانی ہے؟

جوابِ اوّل: اس کا معنی یہ ہے کہ لباس اور پوشاک انسان کی ایک ایسی خاص علامت ہے جو اس بات پر دال ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس کو تمام حیوانات پر فضیلت عطا فرمائی ہے۔

جوابِ ثانی: اس کا معنی یہ ہے کہ لباس وغیرہ اللہ تعالیٰ کی نعمتوں میں سے ہے۔

سوال: اللہ تعالیٰ نے ابلیس کے حق میں یہ کیسے فرمایا: "ینزِعُ عنھما لباسھما" (وہ ان سے ان کا لباس اتار لیتا تھا) حالانکہ حقیقت میں ان کے لباس کو اتارنے والے اللہ تعالیٰ تھے؟۔

جواب: چونکہ ابلیس اپنے وسوسہ اور اغواء کی وجہ سے اس نزع لباس کا سبب بنا تھا اس لئے لباس اتارنے کی اس کی طرف نسبت کردی گئی جیسے کہتے ہیں: کھانے نے مجھے سیر کردیا' مشروب نے مجھے سیراب کردیا' حالانکہ سیراب کرنے والے اور سیر کرنے والے درحقیقت اللہ تعالیٰ ہیں اور طعام ومشروب اسکا سبب ہیں۔

سوال: اس آیتِ کریمہ سے کیا مراد ہے: "کما بدأکم تعودون" (تم کو اللہ تعالیٰ نے جس طرح شروع میں پیدا کیا تھا اسی طرح پھر تم دوبارہ پیدا ہوگے) حالانکہ اللہ نے ہم کو اولاً نطفہ سے پھر خونِ بستہ سے پھر لوتھڑے سے اور پھر گوشت ہڈیاں بنا کر پیدا کیا تھا اب ہم دوبارہ اس ترتیب پر نہ موت کے وقت اور نہ بعث بعد الموت کے وقت پیدا ہوں گے؟

جوابِ اوّل: اس کا معنی یہ ہے کہ جس طرح اللہ تعالیٰ نے تم کو شروع میں مٹی سے پیدا کیا تھا اسی طرح پھر تم دوبارہ مٹی سے پیدا ہوگے۔

جوابِ ثانی: اس کا معنی یہ ہے کہ جس طرح اللہ نے تم کو عدم کے بعد وجود دیا اسی طرح دوبارہ عدم کے بعد وجود دیں گے۔ چنانچہ تشبیہ نفسِ احیاء وخلق میں ہے نہ کہ کیفیت وترتیب میں۔

جوابِ ثالث: اس کا معنی یہ ہے کہ جس طرح اللہ تعالیٰ نے تم کو شروع میں سعید اور شقی دو صورتوں میں پیدا کیا تھا اسی طرح تم دوبارہ پیدا ہوگے کہ کوئی تم میں سے سعید ہوگا اور کوئی شقی۔ آیت ہذا بھی اس کی تائید کرتی ہے:

جوابِ رابع: اس کا معنی یہ ہے کہ جیسے اللہ تعالیٰ نے تم کو شروع میں اس حال میں پیدا کیا کہ تم کسی چیز کے مالک نہ تھے اسی طرح تم دوبارہ پیدا ہوگے۔ جیسے ارشادِ خداوندی ہے: "ولقد جئتمونا

فُرادٰی ''الآیۃ۔

سوال: اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد کا کیا مطلب ہے: '' قُلْ هِيَ لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا'' (یہ اشیاء دنیوی زندگی میں خاص اہلِ ایمان ہی کے لئے ہیں) حالانکہ مشاہدہ یہ ہے کہ یہ اشیاء (زینت وطیّبات) ان لوگوں کے لئے جو ایمان نہیں لائے زیادہ دائمی اور اکثر ہیں؟

جواب: عبارت مقدر ہے '' قُلْ هِيَ لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا غَيْرُ خَالِصَةٍ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا'' یعنی یہ اشیاء دنیوی زندگی میں اہلِ ایمان کے لئے خالص نہیں ہیں' اس لئے کہ مشرکین بھی اس میں شریک ہیں لیکن آخرت کی زندگی میں یہ اہلِ ایمان کے لئے خاص ہیں۔

سوال: اس آیت کا کیا مطلب ہے: '' وَنُوْدُوْٓا اَنْ تِلْكُمُ الْجَنَّةُ اُوْرِثْتُمُوْهَا بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ '' (اور ان سے پکار کر کہا جائیگا کہ یہ جنت ہے تم اسکے وارث کئے گئے ہو.......) میراث تو اس مال وغیرہ کا نام ہے جو کسی میّت کی طرف سے کسی کو منتقل ہو یہ معنی یہاں مفقود ہے؟۔

جوابِ اوّل: یہ کلام اصل میں اہلِ جنت اور اہلِ دوزخ کو وارث اور موروث عنہ کے ساتھ تشبیہ دینے کے طور پر ہے۔ اس لئے کہ اللہ تعالیٰ نے جنّت میں ایمان لانے کی شرط پر کفار کے لئے منزلیں پیدا کی ہیں پس جو ان میں سے ایمان نہیں لاتا اس کی منزل اہلِ جنت کو دے دیتے ہیں۔

جوابِ ثانی: نفسِ دخولِ جنّت بلاعوض محض اللہ کی رحمت اور اس کے فضل سے ہوگا پس یہ میراث کے مشابہ ہوگیا۔ اگرچہ جنت میں درجات اعمال کے اعتبار سے ہوں گے۔

سوال: اس آیت سے کیا مراد ہے: '' اَلَا لَهُ الْخَلْقُ وَالْاَمْرُ '' (خبردار ہو واسطے اس کے ہے پیدا کرنا اور حکم کرنا) '' خلق '' بمعنی ایجاد واحداث ہے' ظاہر ہے کہ یہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ خاص ہے لیکن '' امر '' تو غیر اللہ کے لئے بھی ثابت ہے جس کی دلیل یہ آیت ہے: '' يَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ '' نیز: '' وَاْمُرْ بِالْمَعْرُوْفِ '' نیز یہ آیت بھی دلیل ہے: '' وَاْمُرْ اَهْلَكَ بِالصَّلٰوةِ ''؟

جوابِ اوّل: یہاں '' امر '' سے مراد لفظ '' کن '' ہے جو اللہ تعالیٰ اشیاء کو خلق کرتے وقت فرماتے ہیں۔ ظاہر ہے '' امر '' کا یہ معنیٰ '' خلق '' کی طرح اللہ تعالیٰ کے ساتھ خاص ہے۔

جوابِ ثانی: خلق اور امر سے مراد وہ ہے جس کا ذکر سابقہ آیت میں گزرا ہے۔ یعنی آسمانوں اور زمین کو خلق کرنا اور سورج' چاند اور ستاروں کی تسخیر کا امر۔ کما ذکر' ظاہر ہے یہ خلق وامر اللہ تعالیٰ کی ذات کے ساتھ مخصوص ہے۔

سوال: نوح علیہ السلام نے تاء کے ساتھ '' ضَلَالَةٌ '' کیوں فرمایا؟ یوں نہیں فرمایا: '' لَيْسَ بِي

ضلال'' جیسے اپنی قوم کو''ضلال'' کے ساتھ موصوف کیا ہے' تا کہ خوف مناسبت بھی ہو جاتی کہ
اس چیز کو قوم نے ثابت کیا حضرت نوحؑ اس کی نفی کرنے والے ہوتے؟۔
جواب: ضلالة کا درجہ ضلال سے کم ہے' لہٰذا اپنی ذات سے ضلالة کی نفی کرنے میں زیادہ
مبالغہ ہے' گویا کہ فرمایا: مجھ میں تو ذرا بھی گمراہی نہیں۔ جیسے کوئی پوچھے: کیا آپ کے پاس پھل
ہے؟ آپ اس کے جواب میں کہیں کہ میرے پاس تو کوئی بھی پھل نہیں' تو یہ نفی میں زیادہ بلیغ
ہوگا۔
سوال: اس کی کیا وجہ ہے کہ قصہ ہودؑ میں تو ملاءُ (سردار) کو ''اَلَّذِیْنَ کَفَرُوْا'' (جو لوگ کافر
ہوئے) کے ساتھ بیان کیا ہے مگر قصہ نوحؑ میں مَلَاءُ کو ''اَلَّذِیْنَ کَفَرُوْا'' کے ساتھ موصوف نہیں
کیا وہاں صرف ''مَلَاءٌ مِّنْ قَوْمِہٖ'' فرمایا؟
جواب: جب قومِ ہودؑ کے اشراف نے ہود علیہ السلام سے یہ کہا تھا: ''اِنَّا لَنَرٰکَ فِیْ سَفَاھَۃٍ''
(ہم تم کو کم عقلی میں دیکھتے ہیں) اس وقت ان اشراف میں وہ لوگ بھی موجود تھے جو ہود علیہ السلام
پر ایمان لائے تھے' چنانچہ تمام اشراف ان کی قوم میں سے نہیں تھے بخلاف قومِ نوحؑ کے کہ جب
انہوں نے حضرت نوح علیہ السلام سے کہا تھا: ''اِنَّا لَنَرٰکَ فِیْ ضَلٰلٍ مُّبِیْنٍ'' (ہم تم کو صریح
غلطی میں مبتلا دیکھتے ہیں) اس وقت ان میں ایسا کوئی شخص نہیں تھا جو حضرت نوحؑ پر ایمان لایا ہو۔
چنانچہ یہاں تمام اشراف یہ بات کہنے والے تھے۔ بعض علماء نے یہی جواب دیا ہے۔ لیکن یہ
جواب سورۃ ہود میں قصہ نوحؑ کے بیان میں اس آیتِ کریمہ سے مخدوش ہو جاتا ہے: ''فَقَالَ
الْمَلَاُ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا'' سورۃ المومنون میں بھی اسی طرح ہے۔ مگر اس کا یہ جواب ہو سکتا ہے کہ یہ
قول دو مرتبہ واقع ہوا ہے' دوسری مرتبہ کا قول بعضوں کے ایمان لانے کے بعد سے متعلق ہے۔
سوال: جب قومِ صالحؑ زلزلہ کے عذاب میں گرفتار ہو کر موت کا شکار ہوگئی تو ان کے مرچکنے کے
بعد حضرت صالح علیہ السلام نے ان کو مخاطب کرتے ہوئے یہ کیسے فرمایا: ''یٰقَوْمِ لَقَدْ اَبْلَغْتُکُمْ
رِسَالَۃَ رَبِّیْ وَنَصَحْتُ لَکُمْ وَلٰکِنْ لَّاتُحِبُّوْنَ النّٰصِحِیْنَ'' (اے میری قوم میں نے تو تم کو
اپنے پروردگار کا حکم پہنچایا تھا اور میں نے تمہاری خیر خواہی کی لیکن تم لوگ خیر خواہوں کو پسند ہی نہیں
کرتے تھے)

بظاہر ایک زندہ شخص کا میت کو مخاطب کرنا تو ایک بے فائدہ چیز ہے؟

جواب: یہ صورت عرف میں مستعمل ہے' کیونکہ جو شخص کسی شخص کو نصیحت کرے اور وہ اس نصیحت
کو قبول نہ کرے حتیٰ کہ وہ پھر قتل ہو جائے یا تختۂ دار پر لٹکا دیا جائے پھر وہی خیر خواہ اس کے پاس

سے گزرے اور اسے یوں مخاطب کرتے ہوئے کہے۔

اے میرے بھائی! میں نے کتنی بار تمہیں سمجھایا بجھایا پر تم نے میری ایک نہ مانی تبھی تم اس انجام سے دوچار ہوئے۔ نیز اس قول وکلام کا فائدہ دیگر سامعین کو قبولیت نصیحت کی ترغیب دینا ہے تاکہ دوسرے سامعین کا اس شخص کی طرح انجام نہ ہو جس کو اس نے نصیحت کی تھی مگر اس نے قبول کرنے سے انکار کر دیا تھا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ ہلاکت سے دوچار ہوا۔

**سوال:** شعیب علیہ السلام نے اپنی قوم سے کیوں فرمایا: ''وَلَا تُفْسِدُوْا فِی الْاَرْضِ بَعْدَ اِصْلَاحِهَا'' (اور روئے زمین میں اس کی درستی کے بعد فساد مت پھیلاؤ) حالانکہ قوم شعیبؑ تو کبھی بھی مصلح نہیں رہی وہ تو ہمیشہ کافر اور مفسد رہی تھی؟

**جواب اوّل:** اس کا مطلب یہ ہے کہ تم زمین میں فساد مت پھیلاؤ بعد اس کے کہ اللہ تعالیٰ نے اس زمین کی امر بالعدل اور ارسالِ رُسُل کے ذریعہ اصلاح فرمائی۔

**جوابِ ثانی:** اس کا معنی یہ ہے کہ تم فساد مت پھیلاؤ بعد اس کے کہ صالحین نے اس میں اصلاح فرمائی جیسے انبیاء کرام اور ان کی شریعتوں کے متبعین۔ چنانچہ یہ اضافت ایسی ہے جیسے اس ارشاد خداوندی میں اضافت ہے: ''بَلْ مَكْرُ الَّيْلِ وَالنَّهَارِ'' یعنی بل مکرھم فِی اللَّیل والنَّھارِ۔

**سوال:** قومِ شعیبؑ نے اس آیت میں حضرت شعیبؑ کو دوبارہ کفر میں واپس آجانے کا کیسے کہا: ''لَنُخْرِجَنَّكَ يٰشُعَيْبُ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَكَ مِنْ قَرْيَتِنَا اَوْ لَتَعُوْدُنَّ فِيْ مِلَّتِنَا'' (اے شعیبؑ ہم آپ کو اور جو آپ کے ہمراہ ایمان والے ہیں ان کو اپنی بستی سے نکال دیں گے یا یہ ہو کہ تم ہمارے مذہب میں پھر آجاؤ) جب کہ شعیبؑ نے ان الفاظ میں ان کو جواب دیا تھا: ''اِنْ عُدْنَا فِيْ مِلَّتِكُمْ بَعْدَ اِذْ نَجّٰنَا اللّٰهُ مِنْهَا'' (اگر ہم تمہارے مذہب میں آجائیں بعد اس کے کہ اللہ تعالیٰ نے ہم کو اس سے نجات دی ہو)۔ شعیب علیہ السلام تو کبھی بھی ان کے مذہب پر نہیں تھے کیونکہ انبیائے کرام علیہم السلام کبائر خصوصاً کفر سے بری ہوتے ہیں؟

**جوابِ اوّل:** اہلِ عرب ''عاد'' کو صار کے معنی میں بھی ابتداءً استعمال کرتے ہیں۔ جیسے یہ آیتِ کریمہ ہے: ''حَتّٰى عَادَ كَالْعُرْجُوْنِ الْقَدِيْمِ''۔

**جوابِ ثانی:** اہل عرب یہ بات تغلیب الجماعۃ علی الواحد کے طور پر کہا کرتے ہیں، اصل میں مراد قومِ شعیبؑ کا عود فی الکفر ہے، انہوں نے ان لوگوں کو جو کفر کے بعد ایمان لے آئے تھے ان سب کو تغلیباً عود فی الکفر (کفر میں دوبارہ واپسی) کے لئے کہا۔

**سوال:** فرعون نے: ''اِنْ كُنْتَ جِئْتَ بِاٰيَةٍ'' (اگر آپ کوئی معجزہ لے کر آئے ہیں) کے بعد

"فَاْتِ بِهَا" (تو اس کو اب پیش کیجئے) کیوں کہا' اس کا کیا مطلب ہے؟
جواب: اس کا معنی یہ ہے کہ اگر تو کوئی نشانی اللہ کی جانب سے لایا ہے تو اسے میرے سامنے لے آؤ۔
سوال: یہاں تو فرمایا: "قَالَ الْمَلَاُ مِنْ قَوْمِ فِرْعَوْنَ اِنَّ هٰذَا لَسٰحِرٌ عَلِیْمٌ" (قوم فرعون میں جو سردار لوگ تھے انہوں نے کہا کہ واقعی یہ شخص بڑا ماہر جادوگر ہے) جبکہ سورۃ الشعراء میں ہے کہ فرعون نے یہ کہا تھا کہ یہ شخص (موسیٰ) بڑا ماہر جادوگر ہے' ارشاد ہے: "قَالَ لِلْمَلَاِ حَوْلَهٗۤ اِنَّ هٰذَا لَسٰحِرٌ عَلِیْمٌ" (فرعون نے اپنے اردگرد کے لوگوں سے کہا کہ یہ شخص واقعی بڑا ماہر جادوگر ہے) دونوں میں تعارض ہے' پہلی آیت میں قوم فرعون کے سرداروں کی طرف اس قول کو منسوب کیا گیا ہے اور سورۃ الشعراء کی آیتِ ہذا میں اس قول کو فرعون کی طرف منسوب کیا گیا؟۔
جواب: فرعون اور اس کی قوم کے سرداروں' دونوں نے یہ بات کہی تھی' سورۃ الشعراء میں پہلے صرف فرعون کا قول ذکر کیا گیا پھر یہاں پر قومِ فرعون کے سرداروں کے قول کو بھی بیان کیا گیا ہے۔
سوال: جادوگر تو موسیٰ علیہ السلام کے معجزہ کے رونما ہونے پر اس کو قبول کرتے ہوئے اپنی خوشی سے اللہ تعالیٰ کے سامنے سجدہ ریز ہوئے تھے تو پھر یہ کیسے فرمایا: "وَاُلْقِیَ السَّحَرَةُ سٰجِدِیْنَ" (اور ڈالے گئے جادوگر سجدے میں)؟
جواب: جب جادوگروں نے اللہ کے نبی کے ہاتھ پر اللہ تعالیٰ کا معجزہ اپنی آنکھوں سے ظاہر ہوتے دیکھا اور ان کے تمام شکوک وشبہات دور ہوگئے تو اس چیز نے ان کو فوری طور پر سجدہ ریز ہونے پر مجبور کر دیا۔ چنانچہ غایتِ مبادرت کی وجہ سے ان کا حال ایسا ہو گیا جیسے ان کو اللہ و رسول کی تصدیق کے لئے سجدہ میں ڈالا گیا ہو۔
سوال: اس کی کیا وجہ ہے کہ اس جگہ تو ایمان لانے والے جادوگروں اور فرعون کا ذکر ان الفاظ میں کیا گیا: "قَالُوْۤا اٰمَنَّا بِرَبِّ الْعٰلَمِیْنَ........ وَتَوَفَّنَا مُسْلِمِیْنَ" اور سورۃ طٰہٰ اور سورۃ الشعراء میں یہی واقعہ الفاظ کی کمی بیشی کے ساتھ بیان کیا گیا' جب یہ واقعہ ایک بار ہی پیش آیا ہے تو اس واقعہ کے الفاظ مختلف کیوں ہیں؟۔
جواب: اس کا جواب یہ ہے کہ انہوں نے یہ کلام اپنی زبان میں کہا تھا نہ کہ عربی زبان میں' اس لئے اللہ تعالیٰ نے ان کا کلام کئی بار عربی زبان میں کسی حکمت کی بناء پر نقل فرمایا جو (حکمت) تکرارِ واقعہ کا تقاضا کرتی تھی' جس کا ذکر ہم ان شاء اللہ تعالیٰ سورۃ الشعراء میں کریں گے۔ چنانچہ ایک بار تو ان کے کلام کو لفظ کی رعایت کرتے ہوئے ان کے الفاظ کے مطابق بیان فرمایا اور دوسری بار

رف معنی ومفہوم کا خیال رکھتے ہوئے اس کو نقل فرمادیا۔ جیسا کہ ب عرب کی عادت ہے کہ وہ
پنے کلام میں کبھی تفنن کا طرز اور اختلاف اسلوب سے کام لیتے ہیں کیونکہ محض عبارت کا بار بار
رار طبیعت کو بور کرتا ہے۔

ال: اس آیت کا کیا مطلب ہے: "مَهْمَا تَأْتِنَا بِهِ مِنْ اٰيَةٍ لِّتَسْحَرَنَا بِهَا" (کیسی ہی عجیب
ن ہمارے سامنے لاؤ کہ اس کے ذریعہ سے ہم پر جادو چلاؤ) پہلے تو اس کو "آیۃ" کہا پھر
سحر نا بھا" بھی کہا؟۔

اب: انہوں نے اس چیز کو آیۃ اللہ سمجھتے ہوئے اور اس کا اعتقادر کھتے ہوئے "آیۃ" نہیں کہا بلکہ
علیہ السلام نے جو اس کو آیۃ اللہ کہا اس کو انہوں نے استہزاء اور مذاق کے طور پر آیۃ کہا ہے۔

ال: ان آیات قرآنیہ میں تطبیق کی کیا صورت ہوگی یہاں فرمایا: "وَدَمَّرْنَا مَا كَانَ يَصْنَعُ
وْنُ وَقَوْمُهُ وَمَا كَانُوا يَعْرِشُونَ" (اور ہم نے فرعون کو اور اس کی قوم کے ساختہ پرداختہ کا
نوں کو اور جو کچھ وہ اونچی اونچی عمارتیں بنواتے تھے سب کو درہم برہم کر دیا) اور دوسری جگہ
ارشاد ہے: "فَاَخْرَجْنَاهُمْ مِّنْ جَنّٰتٍ وَّعُيُوْنٍ وَّ كُنُوْزٍ وَّ مَقَامٍ كَرِيْمٍ كَذٰلِكَ وَاَوْرَثْنٰهَا بَنِيْٓ
اِسْرَآءِيْلَ" (غرض ہم نے ان کو باغوں سے اور چشموں سے اور خزانوں سے اور عمدہ مکانات سے
باہر کیا یوں کیا اور ان کے بعد بنی اسرائیل کو ان کا مالک بنایا)؟

ب اوّل: اس کا معنی یہ ہے کہ فرعون اور اس کی قوم موسیٰ علیہ السلام کے خلاف جو مکروفریب
بازیاں) کیا کرتے تھے اس کو اور اس کی اس بلند عمارت کو درہم برہم کر دیا جس کے بنانے
عون نے ہامان کو اس لیے حکم دیا تھا تا کہ اس کو اس کے ذریعہ سے آسمان تک رسائی حاصل
لے۔

ب ثانی: یہ اپنے ظاہر پر ہے۔ اس لئے کہ ایک مدت تک اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کو ان
کا مالک بنایا تھا لیکن پھر ان سب کو تہس نہس کر دیا۔

: اس آیت سے کیا مراد ہے: "وَاِذْ اَنْجَيْنٰكُمْ مِّنْ اٰلِ فِرْعَوْنَ يَسُوْمُوْنَكُمْ سُوْٓءَ الْعَذَابِ ۚ
نَ اَبْنَآءَكُمْ وَيَسْتَحْيُوْنَ نِسَآءَكُمْ ۚ وَفِيْ ذٰلِكُمْ بَلَآءٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ عَظِيْمٌ" (اور جب
نے تم کو فرعون والوں سے بچالیا جو تم کو بڑی سخت تکلیفیں پہنچاتے تھے تمہارے بیٹوں کو بکثرت
لتے تھے اور تمہاری عورتوں کو زندہ چھوڑ دیتے تھے اور تمہارے رب کی طرف سے اس میں
زمائش تھی) اگر "وَفِيْ ذٰلِكُمْ" سے نجات کی طرف اشارہ ہے تو یہ تو کوئی آزمائش نہیں تھی
بلکہ تو نعمت تھی اور اگر اس سے قتل اور قید کی طرف اشارہ ہے تو اس کی آل فرعون کی طرف

اضافت کرنا زیادہ مناسبت رکھتا ہے کیونکہ آیت کے سیاق سے معلوم ہوتا ہے کہ یہاں پر امتنان (احسان جتانا) مقصود ہے اسی لئے آلِ فرعون کی طرف دو فعل "یقتلون اور یستحیون" منسوب کیے گئے؟۔

جواب: "بلاء" کا لفظ نعمت اور محنت (آزمائش) میں مشترک ہے اور یہ ابتلاء بمعنی آزمائش سے ماخوذ ہے۔ بلاہ وابتلاہ کا معنی ہوتا ہے اختبرہ یعنی اس کو آزمایا' اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کے شکر کو نعمت سے اور ان کے صبر کو محنت (آزمائش) سے آزماتے ہیں۔ جس کی تائید اس آیت کریمہ سے بھی ہوتی ہے: "وَبَلَوْنٰهُمْ بِالْحَسَنٰتِ وَالسَّيِّاٰتِ" نیز اس ارشاد سے بھی تائید ہوتی ہے: "وَنَبْلُوْكُمْ بِالشَّرِّ وَالْخَيْرِ فِتْنَةً"۔ چنانچہ آیت کا معنی یہ ہوا کہ اس نجات میں تمہارے رب کی طرف سے تم پر ایک عظیم نعمت ہے۔

سوال: ارشادِ باری تعالیٰ ہے: "وَوٰعَدْنَا مُوْسٰى ثَلٰثِيْنَ لَيْلَةً وَّ اَتْمَمْنٰهَا بِعَشْرٍ" (اور ہم نے موسیٰ سے تیس شب کا وعدہ کیا اور دس شب کو ان تیس راتوں کا تتمہ بنایا) جب راتیں روزے کا محل ہی نہیں ہے تو ان کو کیوں ذکر فرمایا' دنوں کا ذکر زیادہ اولیٰ تھا اس لئے کہ دن روزے کا محل ہے اور وہ وعدہ اسی سے متعلق ہے؟۔

جوابِ اوّل: اہلِ عرب اپنی تواریخ میں اکثر راتوں کا ذکر کیا کرتے ہیں اگر چہ ان راتوں سے دن مراد ہوتے ہیں' اس لئے کہ رات ہی زمانہ کے اعتبار سے اصل ہے۔ اور دن تو عارض ہے۔ کیونکہ ظلمت وجود میں نور پر مقدم ہے۔

جوابِ ثانی: بعض کہتے ہیں کہ موسیٰ علیہ السلام کے دین میں رات کا روزہ بھی جائز تھا۔

سوال: جب "وَوٰعَدْنَا مُوْسٰى ثَلٰثِيْنَ لَيْلَةً وَّ اَتْمَمْنٰهَا بِعَشْرٍ" سے مجموعہ وقت معلوم ہو ہی گیا تھا تو پھر مزید "فَتَمَّ مِيْقَاتُ رَبِّهٖۤ اَرْبَعِيْنَ لَيْلَةً" (سو ان کے پروردگار کا وقت پوری چالیس شب کا ہو گیا) فرمانے میں کیا فائدہ ہے؟۔

جواب: اس میں چند فوائد ہیں: پہلا فائدہ تاکید ہے۔ دوسرا فائدہ یہ ہے کہ "عشر" (دس) سے راتیں مراد ہیں نہ کہ ساعات (گھنٹے)۔ تیسرا فائدہ یہ ہے کہ کہیں یہ وہم نہ ہو کہ جس عشر پر اتمام ہوا وہ ان ثلاثین (تیس شب) میں داخل ہے۔ جیسے اس آیتِ مبارکہ میں ہے: "وَبٰرَكَ فِيْهَا وَقَدَّرَ فِيْهَاۤ اَقْوَاتَهَا فِيْۤ اَرْبَعَةِ اَيَّامٍ" جیسا کہ ہم آگے چل کر سورۃ حٰمٓ السجدہ میں اس کی وضاحت کریں گے۔

سوال: موسیٰ علیہ السلام نے یہ کیسے فرمایا: "وَاَنَا اَوَّلُ الْمُؤْمِنِيْنَ" (اور سب سے پہلے میں ایمان

لانے والا ہوں) حالانکہ ان سے قبل بھی بہت سے لوگ ایمان والے تھے جیسے انبیاء اور ان پر ایمان لانے والے لوگ؟

جوابِ اوّل: اس کا معنی یہ ہے کہ اے اللہ! سب سے پہلے میں اس بات پر ایمان لاتا ہوں کہ تیری ذات کا دیدار اس دارِ فانی میں اس جسد کے حاسۂ فانی کے ساتھ نہیں ہو سکتا۔

جوابِ ثانی: اس کا معنی یہ ہے کہ میں اپنے زمانہ میں بنی اسرائیل کے اندر سب سے پہلے ایمان لانے والا ہوں۔

جوابِ ثالث: بعض کہتے ہیں کہ "اوّل" سے مراد ایمان میں اقویٰ اور اکمل ہے۔ یعنی اے اللہ! میری دیدارِ خداوندی کے لئے طلب اور خواہش اس وجہ سے نہیں ہے کہ مجھے آپ کے وجود کے بارے میں کوئی شک ہے یا میرے ایمان میں کوئی ضعف وغیرہ ہے بلکہ دیدار کی یہ طلب اس لئے ہے تاکہ مجھے مزید کرامات واعزازات سے نوازا جائے۔

سوال: اس کا کیا معنی: "وَأْمُرْ قَوْمَكَ يَأْخُذُوا بِأَحْسَنِهَا" (اور اپنی قوم کو حکم کرو کہ اس کے اچھے اچھے احکام پر عمل کریں) حالانکہ قومِ موسیٰ تو تورات کے تمام احکامات کو بجالانے پر مامور تھی؟

جوابِ اوّل: اس کا معنی ہے "بحسنہا" یعنی احکام پر عمل کریں اس کے اچھے ہونے کی وجہ سے اور سارے احکام اچھے تھے۔

جوابِ ثانی: قومِ موسیٰ کو اس میں خیر کا حکم اور شر سے منع کیا گیا تھا' پس فعلِ خیر' ترکِ شر سے زیادہ اچھا ہے۔

جوابِ ثالث: تورات میں بعض احکام اچھے اور بعض بہت اچھے تھے جیسے قصاص لینا اور معاف کرنا۔ انتقام لینا اور صبر کرنا۔ اور بعض واجب اور مندوب ومباح تھے۔ چنانچہ ان کو عزائم وفضائل کا حکم دیا گیا یعنی جن کاموں کے کرنے پر زیادہ سے زیادہ اجر وثواب حاصل ہو۔

سوال: اس آیت کا کیا مطلب ہے: "وَاتَّخَذَ قَوْمُ مُوسَىٰ مِنْ بَعْدِهِ مِنْ حُلِيِّهِمْ عِجْلًا جَسَدًا لَهُ خُوَارٌ" (اور موسیٰ کی قوم نے ان کے بعد اپنے زیوروں کا ایک بچھڑا بنالیا جو ایک قالب تھا جس میں ایک آواز تھی) حالانکہ موسیٰ کی قوم کا بچھڑے کو معبود بنانے کا واقعہ موسیٰ کے زمانہ میں پیش آیا تھا' آیت کا سیاق بھی اس پر دال ہے؟

جوابِ اوّل: مِنْ بَعْدِهِ کا معنی یہ ہے کہ موسیٰ کے پہاڑ کی طرف جانے کے بعد۔

جوابِ ثانی: "مِنْ بَعْدِهِ" کا معنی ہے کہ ان سے اس بات کا عہد وپیمان لینے کے بعد کہ وہ غیر اللہ کی عبادت نہیں کریں گے۔

سوال: اس آیتِ مبارکہ میں: "وَلَمَّا سُقِطَ فِیْٓ اَیْدِیْہِمْ" (اور جب پشیمان ہوئے اپنے ہاتھوں کے بیچ) ندامت کو سقوط فی الید سے کیسے تعبیر کیا' دونوں میں کیا مناسبت ہے؟۔
جواب: مناسبت یہ ہے کہ جب کسی کو مافات پر بہت زیادہ حسرت اور ندامت ہونے لگتی ہے تو وہ اپنا ہاتھ غم کے مارے کاٹنے لگتا ہے پس اس کا ہاتھ اس میں مسقوط ہو جاتا ہے۔ یہ اصل میں کنائی الفاظ میں سے ہے۔ جیسے نائم کے لئے کہتے ہیں: ضرب علی اذنہ۔
سوال: یہ کیسے فرمایا: "غَضْبَانَ اَسِفًا" (غصہ سے پچھتا تا ہوا)؟ جب کہ یہ دونوں لفظ قریب المعنی ہیں؟۔
جوابِ اوّل: "آسف" غمزدہ کو کہتے ہیں۔
جوابِ ثانی: بعض کہتے ہیں "آسف" شدید غصہ والے کو کہتے ہیں۔ چنانچہ اس میں نیا فائدہ ہے۔
سوال: اس کی کیا وجہ ہے کہ: "وَاَخَذَ الْاَلْوَاحَ وَفِیْ نُسْخَتِہَا ھُدًی وَّرَحْمَۃٌ" (ان تختیوں کو اٹھالیا اور ان کے مضامین میں رحمت اور ہدایت تھی) فرمایا ہے: وَفِیْہَا' (اور اس تورات میں) نہیں فرمایا۔ نسخۃ کا معنی تو ہوتا ہے ایک چیز کو ایک مرتبہ لکھا جائے پھر اس کو نقل کیا جائے۔ پس پہلے مکتوب (لکھے ہوئے) کو نسخۃ نہیں کہا جاتا' حالانکہ وہ الواح (تختیاں) کسی دوسرے مکتوب سے نقل کر کے لکھی ہوئی نہیں تھیں؟
جوابِ اوّل: کیونکہ وہ الواح بھی رکھ دی گئی تھیں۔
جوابِ ثانی: بعض کہتے ہیں کہ دو تختیاں ٹوٹ گئی تھیں چنانچہ آپ نے ان میں موجود احکام کو سونے کی تختی میں نقل کیا' ان دو تختیوں میں ہدایت اور رحمت تھی اور بقایا تختیوں میں ہر چیز کی تفصیل تھی۔
جوابِ ثالث: بعض کہتے ہیں کہ "وفی نسختہا" اس لئے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام کو پہلے تورات تلقین کی تھی پھر ان کو اس کی کتابت کا حکم بھی دیا تھا' چنانچہ موسی علیہ السلام نے اس کو اپنے سینہ سے تختیوں میں نقل کیا' اس لئے ان کا نام "نسخۃ" رکھا۔
سوال: اس آیتِ کریمہ کا کیا مطلب ہے: "وَاتَّبَعُوا النُّوْرَ الَّذِیْٓ اُنْزِلَ مَعَہٗ" (اور اس نور کا اتباع کرتے ہیں جو ان کے ساتھ اتارا گیا ہے) "نور" سے قرآن مجید اور "معہ" سے مع النبیؐ مراد ہے' جب کہ قرآنِ مجید جبریلؑ کے ساتھ نازل کیا گیا ہے جسے وہ لے کر نبی کریم ﷺ کے پاس آئے' نبی ﷺ کے ساتھ تو نہیں اتارا گیا؟
جوابِ اوّل: "مَعَہٗ" سے مراد حضورؐ کے زمانہ سے متصل ہے۔

جوابِ ثانی: بعض کہتے ہیں کہ "مَعَہٗ" کا معنیٰ "عَلَیْہِ" ہے۔
جوابِ ثالث: بعض کہتے ہیں کہ "مَعَہٗ" کا معنیٰ "اِلَیْہِ" ہے۔
جوابِ رابع: ممکن ہے کہ "مَعَہٗ" کا تعلق اتبعوا کے ساتھ ہو انزل کے ساتھ نہ ہو۔ معنی یہ ہو جائیں گے کہ وہ قرآنِ منزل کا اتباع کرتے ہیں اور اس کے ساتھ ساتھ نبی ﷺ کی سنتوں، بھی عمل اور ان کا اتباع کرتے ہیں یا مطلب یہ ہے کہ انہوں نے قرآن کی پیروی کی جیسے خود اس کی اتباع حضورؐ نے فرمائی اس حال میں کہ وہ لوگ آپ کی اتباع میں آپ کی مصاحبت اختیار کرنے والے ہیں۔

سوال: یہ کیسے فرمایا: "فَبَدَّلَ الَّذِیْنَ ظَلَمُوْا مِنْهُمْ قَوْلًا غَیْرَ الَّذِیْ قِیْلَ لَهُمْ" (پس بدل ڈالا جنہوں نے ظلم کیا تھا ان میں سے بات کو سوائے اس کے جو کہی گئی تھی واسطے ان کے) حالانکہ انہوں نے اس بات کو بدل دیا تھا جو ان سے کہی گئی تھی یعنی ان سے کہا گیا تھا کہ "حِطَّۃٌ" کہو مگر انہوں نے اس کی بجائے "حنطة" کہا؟

جواب: سورۃ البقرۃ میں یہ سوال وجواب گزر چکا ہے۔

سوال: اس کی کیا وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: "کُوْنُوْا قِرَدَۃً خٰسِئِیْنَ" (تم ذلیل بندر بن جاؤ) حالانکہ انسانی صورت سے بندر کی صورت میں تبدیل ہونا ان کی طاقت میں تو نہیں تھا۔

جواب: یہ سوال وجواب بھی سورۃ البقرۃ میں گزر چکا ہے۔

سوال: "حلم" اللہ تعالیٰ کی صفات میں سے ایک صفت ہے تو پھر یہ کیسے فرمایا: "اِنَّ رَبَّکَ لَسَرِیْعُ الْعِقَابِ" (بلاشبہ آپ کا رب واقعی جلدی ہی سزا دیتا ہے) جلدی سزا دینا تو اس صفتِ حلم کے خلاف ہے اس لئے کہ حلیم وہ ہے جو نافرمانوں کو جلدی سزا نہ دے؟

جوابِ اوّل: سریع العقاب سے مراد شدید العقاب ہے۔
جوابِ ثانی: بعض کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے سریع العقاب ہونے کا معنی یہ ہے کہ جب اس کا سزا دینے کا وقت آپہنچتا ہے تو کوئی پھر اس کو ٹال نہیں سکتا۔

سوال: تمسک بالکتاب کا لفظ تمام عبادات کو شامل ہے جن میں اقامتِ صلوٰۃ بھی ہے لہٰذا اس آیت میں اقامتِ صلوٰۃ کی تخصیص کی کیا وجہ ہے فرمایا: "وَالَّذِیْنَ یُمَسِّکُوْنَ بِالْکِتٰبِ وَاَقَامُوا الصَّلٰوۃَ" (اور جو لوگ محکم پکڑتے ہیں کتاب کو اور قائم رکھتے ہیں نماز کو)؟

جواب: اقامتِ صلوٰۃ کی تخصیص اس لئے فرمائی تاکہ اس کی فضیلت و مرتبہ کا اظہار ہو کیوں کہ نماز دین کا ستون ہے (حدیث) اور نماز بے حیائی اور برے کاموں سے روکنے والی ہے۔

(آیتِ قرآنی)۔

سوال: اللہ تعالیٰ کے اس ارشادِ مبارک میں: ''فَمَثَلُهٗ كَمَثَلِ الْكَلْبِ اِنْ تَحْمِلْ عَلَيْهِ يَلْهَثْ'' (پس مثال اس کی مانند مثال کتے کی ہے اگر بوجھ رکھے تو او پر اس کے زبان لٹکادے) بلعم کی حالت کو مثال سے بیان کیا گیا ہے لیکن اس کے بعد فرمایا: ''سَآءَ مَثَلَا نِ الْقَوْمِ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا'' (بری ہے مثال اس قوم کی جنہوں نے جھٹلایا ہماری نشانیوں کو) حالانکہ مثال فردِ واحد کی بیان کی جاتی ہے نہ کہ قوم کی؟

جوابِ اوّل: یہ مثال اگر چہ بظاہر بلعم کی بیان کی گئی ہے لیکن اس سے تمام کفارِ مکہ مراد ہیں۔ اس لئے کہ انہوں نے بھی حضورِ اکرم ﷺ کے ساتھ اپنے مکروفریب کے ذریعہ دنیا کی لذات وشہوات کی طرف مائل ہو کر وہی برتاؤ کیا جو بلعم نے موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ کیا تھا' دونوں کا فعل آپس میں ایک دوسرے کے مشابہ تھا۔

جوابِ ثانی: ''سَآءَ مَثَلَا نِالْقَوْمِ'' کا تعلق شروع آیت سے نہیں ہے بلکہ ''مَثَلُ الْقَوْمِ'' سے ہے۔

سوال: اس آیت سے کیا مراد ہے: ''اِنْ اَنَا اِلَّا نَذِيْرٌ وَّ بَشِيْرٌ لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ'' (نہیں میں مگر ڈرانے والا اور خوشخبری دینے والا واسطے اس قوم کے کہ ایمان لاتے ہیں)

حالانکہ حضور نبی کریم ﷺ تمام لوگوں کے لئے نذیر و بشیر تھے' جیسے ارشادِ خداوندی ہے: ''وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا كَآفَّةً لِّلنَّاسِ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا''؟

جوابِ اوّل: ''لِقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ'' سے مراد ایسی قوم ہے جن کے متعلق ازل میں ہی یہ لکھا تھا کہ وہ ایمان لائے گی' اور ان کی وجہ تخصیص یہ ہے کہ ایمان والے ہی حقیقت میں انذار اور بشارت سے نفع اٹھانے والے ہوتے ہیں۔ گویا حضور صرف مومنوں کے لئے نذیر و بشیر ہیں۔ جیسے یہ ارشاد ہے: ''اِنَّمَآ اَنْتَ مُنْذِرُ مَنْ يَّخْشٰهَا''۔

جوابِ ثانی: ممکن ہے کہ نذیر کا متعلق محذوف ہو' عبارت یہ ہو: ''ان انا الا نذیر للکافرین وبشیر لقوم یؤمنون'' یعنی میں کافروں کے لئے نذیر اور مومنوں کے لئے بشیر ہوں۔ چنانچہ ایک کے ذکر سے دوسری چیز کا ذکر ضروری نہ رہا' جیسا کہ اسی آیت میں تفصیل کی ضرورت نہ سمجھی گئی' کیوں کہ آیت کا معنی یہ ہے: اور ہم نے آپ کو نہیں بھیجا مگر سب کے لئے' مومنوں کے لئے بشیر بنا کر اور کافروں کے لئے نذیر بنا کر۔

سوال: اس آیت سے کیا مراد ہے: ''جَعَلَا لَهٗ شُرَكَآءَ فِيْمَآ اٰتٰهُمَا'' (کیا واسطے اس کے شریک بیچ اس چیز کے کہ کر دیا تھا) اللہ تعالیٰ نے آدم وحواء علیہما السلام کے بارے میں یہ بات

بیان کی ہے۔ جبکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: "فَتَعٰلَی اللّٰهُ عَمَّا یُشْرِکُوْنَ" (سو اللہ پاک ہے ان کے شرک سے) انبیاءؑ تو مطلق کبائر سے معصوم ہوتے ہیں، شرک جو اکبر الکبائر ہے اس کے مرتکب کیسے ہو سکتے ہیں؟

جوابِ اوّل: "جَعَلَا لَهٗ" سے مراد ہے جَعَلَ اَوْلَادُهُمَا یعنی ان کی اولاد اللہ تعالیٰ کے شریک قرار دینے لگی۔ یعنی یہاں مضاف محذوف ہے۔ اسی طرح: "فِیْمَآ اٰتٰهُمَا" میں ان کی اولاد مراد ہے۔ اس کی تائید اس قولِ باری تعالیٰ سے ہوتی ہے: "فَتَعٰلَی اللّٰهُ عَمَّا یُشْرِکُوْنَ"

کیونکہ یہاں جمع کی ضمیر لائی گئی ہے۔ "یُشْرِکَانِ" نہیں فرمایا ہے۔ اور آدم وحوا علیہما السلام کی اولاد کا اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی چیز میں اللہ کے شریک کرنے کا معنی یہ ہے کہ انہوں نے اپنی اولاد کا نام عبدالعزیٰ، عبدمناۃ، عبدشمس وغیرہ رکھا۔ حالانکہ ان کو چاہئے تھا کہ ان ناموں کی جگہ عبداللہ، عبدالرحمٰن، عبدالرحیم وغیرہ رکھتے۔

جوابِ ثانی: "جَعَلَا" میں ضمیر ولدِ صالح کی طرف راجع ہے بمعنی سلیم الخلق۔ اور "جَعَلَا" اس لئے فرمایا کہ حوا علیہا السلام کے ہاں ایک پیٹ سے مذکر اور مؤنث دونوں پیدا ہوتے تھے۔

جوابِ ثالث: اس سے مراد ان کا اس کو عبدالحارث کے ساتھ نامزد کرنا ہے۔ حارث فرشتوں میں ابلیس کا نام تھا، اس نامزدگی کا سبب آیت کی تفسیر سے معلوم ہو سکتا ہے۔ اور "شُرَکَآءَ" محض واحد کو جمع کے قائم مقام کرتے ہوئے فرمایا ہے۔ آدم وحوا علیہما السلام کا یہ مقصد نہیں تھا کہ حارث ان کا رب ہے بلکہ مقصد یہ تھا کہ حارث نجات کا سبب تھا۔ اور جمہور مفسرین فرماتے ہیں کہ "فَتَعٰلَی اللّٰهُ عَمَّا یُشْرِکُوْنَ" کا ارشاد صرف مشرکینِ عرب کے متعلق ہے۔ قصۂ آدم وحوا علیہما السلام سے اس کا کوئی تعلق نہیں ہے۔

# سورۃ الانفال

سوال: ارشادِ باری تعالیٰ ہے: "اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِیْنَ اِذَا ذُکِرَ اللّٰهُ وَجِلَتْ قُلُوْبُهُمْ" الآیۃ (سوائے اس کے نہیں کہ ایمان والے وہ لوگ ہیں کہ جب یاد کیا جائے اللہ ڈر جاتے ہیں دل ان کے) اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ جو شخص ان مذکورہ صفات سے متصف نہ ہو وہ مومن نہیں ہے کیونکہ کلمۂ انما حصر کے لئے آتا ہے؟

جواب: یہاں عبارت مقدر ہے: "انما المؤمنون ایمانًا کاملًا" (یعنی کامل ایمان والے وہ لوگ ہیں جن میں یہ صفات موجود ہوں۔ جیسے کہتے ہیں مرد تو وہ ہے جو مشکلات کے وقت صبر سے

کام لے۔ مراد ہوتا ہے کامل مرد۔
سوال: مگر اللہ تعالیٰ کا فرمانِ عالی: ''اُولٰئِکَ ھُمُ الْمُؤْمِنُوْنَ حَقًّا'' (سچے ایمان والے یہ لوگ ہیں) مذکورہ مطلب کی نفی کرتا ہے؟
جوابِ اوّل: معنی یہ ہے کہ سچے و کامل ایمان والے یہی لوگ ہیں۔
جوابِ ثانی: اصل میں ''حقًّا'' کا تعلق مابعد سے ہے نہ کہ ماقبل سے۔ المؤمنون پر کلام تام ہوجاتا ہے۔
سوال: یہ بات کیسے کہی جاتی ہے کہ ایمان کمی وبیشی کو قبول نہیں کرتا یعنی ایمان میں کمی و زیادتی نہیں ہوتی، جبکہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے: ''وَاِذَا تُلِیَتْ عَلَیْھِمْ اٰیٰتُہٗ زَادَتْھُمْ اِیْمَانًا'' (جب اللہ کی آیتیں انکو پڑھ کر سنائی جاتی ہیں تو وہ آیتیں ان کے ایمان کو اور زیادہ کر دیتی ہیں)؟۔
جواب: یہاں مراد ایمان کے آثار ہیں یعنی دلی اطمینان، یقین اور خشیتِ الٰہیہ وغیرہ۔ اس لئے کہ ایسے دلائل سے مراد ہوتا ہے عقائد میں رسوخ اور مضبوطی، یعنی اللہ کی آیات جب پڑھی جاتی ہیں تو ان کے ایمان وعقائد میں اور زیادہ رسوخ اور مضبوطی آجاتی ہے، کیونکہ ایمان کی حقیقت تو تصدیق بالقلب اور وحدانیتِ خداوندی کا اقرار ہے۔ جس طرح خدا تعالیٰ کی وحدانیت کمی و زیادتی کو قبول نہیں کرتی اسی طرح اس وحدانیت کا اقرار بھی اس کو قبول نہیں کرتا۔
سوال: اللہ تعالیٰ کا ارشادِ عالی: ''کَمَآ اَخْرَجَکَ رَبُّکَ مِنْ بَیْتِکَ'' (جس طرح سے نکالا تجھ کو رب تیرے نے گھر تیرے سے) تشبیہ پر مشتمل ہے مگر مشبّہ اور مشبّہ بہ کہاں ہے؟۔
جوابِ اوّل: اس کا معنی یہ ہے کہ جس طرح آپ اپنے گھر سے لڑائی کے لئے حق کے ساتھ نکلے اور لوگ ناپسند کر رہے تھے اسی طرح آپ مجاہدین میں مالِ غنیمت کی تقسیم کے معاملہ میں جو مناسب اور درست خیال فرمائیں کر گزریئے۔
جوابِ ثانی: بعض کہتے ہیں کہ اس کا معنی یہ ہے کہ تم لوگ اللہ سے ڈرو اور اپنی اصلاح کرو یہ تمہارے لئے بہتر ہے اگرچہ تمہیں ناگوار ہو جیسے آپ کو اپنے گھر سے نکالنا کسی مصلحت کے ساتھ تھا۔

سوال: اس آیت سے کیا مراد ہے؟ ''لِیُحِقَّ الْحَقَّ وَیُبْطِلَ الْبَاطِلَ'' (تا کہ حق کا حق ہونا اور باطل کا باطل ہونا ثابت کرے) یہ بظاہر تحصیلِ حاصل ہے، یہ دونوں چیزیں دشوار ہیں؟۔
جواب: یہاں ''حق'' سے مراد ایمان اور ''باطل'' سے مراد شرک ہے، لہٰذا سوال نہ رہا۔
سوال: اللہ تعالیٰ کے اس ارشادِ مبارک میں: ''وَیُرِیْدُ اللّٰہُ اَنْ یُّحِقَّ الْحَقَّ بِکَلِمٰتِہٖ وَیَقْطَعَ

دَابِرَ الْكٰفِرِيْنَ.........." (اللہ تعالیٰ کو یہ منظور تھا کہ اپنے احکام سے حق کا حق ہونا ثابت کردے اور ان کافروں کی بنیاد کو قطع کردے.........) اس تکرار عبارت کا کیا فائدہ ہے؟

جواب: پہلے یہ بات بیان کی گئی کہ ان لوگوں کا ارادہ اس گروہ کو اختیار کرنے سے متعلق تھا جس میں غنیمت کا مال تھا جبکہ اللہ تعالیٰ کا ارادہ اس گروہ کو اختیار کرنے سے متعلق تھا جس کے مغلوب ہونے میں دین کی نصرت تھی چنانچہ اس کو اولاً اس لئے ذکر فرمایا تا کہ ان دونوں ارادوں میں امتیاز ہو جائے' پھر اس کو ثانیاً یہ اس حکمت بیان کرنے کے لئے ذکر فرمایا کہ اس سے کافروں کی بنیاد اور قوت کا قلع قمع ہوگا۔

سوال: کیا وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: "فَلَمْ تَقْتُلُوْهُمْ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ قَتَلَهُمْ وَمَا رَمَيْتَ اِذْ رَمَيْتَ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ رَمٰى" (سو تم نے ان کو قتل نہیں کیا لیکن اللہ تعالیٰ نے ان کو قتل کیا' اور آپ نے خاک کی مٹھی نہیں پھینکی لیکن اللہ تعالیٰ نے وہ پھینکی) حالانکہ یہ بات سب جانتے ہیں کہ بدر کی لڑائی میں مسلمانوں نے کافروں کو قتل کیا تھا اور خود نبی کریم ﷺ نے مٹھی بھر کنکریاں ان کفار پر پھینکی تھیں اور فرمایا تھا: شاهت الوجوه (چہرے بدشکل ہو جائیں) چنانچہ کوئی مشرک بھی ایسا نہ رہا جس کی آنکھوں میں کوئی نہ کوئی کنکری نہ لگی ہو' پھر وہ اپنی آنکھیں ملنے لگے اور شکست خوردہ ہوئے پھر مسلمانوں نے ان کا پیچھا کیا اور ان کو قتل کیا اور قیدی بنایا؟

جوابِ اوّل: چونکہ ان کافروں کے قتل ہونے کا قوی تر سبب فرشتوں کا مدد کرنا کافروں کے دلوں میں رعب کا ڈالے جانا اور مسلمانوں کو ثابت قدم رکھنا تھا اور یہ تمام افعال اللہ تعالیٰ کے ہیں' اس لئے اللہ تعالیٰ نے ان افعال کو اپنی طرف منسوب کرتے ہوئے ان مسلمانوں سے اس کی نفی فرمائی۔ یعنی بلاشبہ یہ کام ظاہری صورت کے لحاظ سے تم سے صادر ہوا لیکن فی الحقیقت مجھ سے ہوا' لہٰذا تمہارا کام یہ ہونا چاہئے کہ تم بجائے عجب (خود پسندی) اور اظہارِ فخر کے شکر کرو۔

یہی صورت کنکریاں مارنے کی ہے' اللہ تعالیٰ نے یہ کام' رسول اللہ ﷺ کے لئے بھی ثابت کیا کیونکہ اس کی ظاہری صورت کا تحقق آنحضرت ﷺ کی طرف سے ہوا' اور حضورؐ سے اس کام کی نفی بھی فرمائی کیونکہ اس کا وہ اثر اور تاثیر جس کا صدور عام بشر سے ممکن نہیں حقیقت میں اللہ تعالیٰ کا فعل ہے' اس کی نظیر یہ ہے کہ جیسا کہ آپ اس شخص کو جس سے کوئی اچھا قول یا برا قول صادر ہو یہ کہتے ہیں کہ یہ تیرا قول یا تیرا فعل نہیں ہے' مقصد ہوتا ہے اس سے بلند مرتبہ والے آدمی کو غالب کرنا۔

جوابِ ثانی: بعض کہتے ہیں کہ: "وَمَا رَمَيْتَ اِذْ رَمَيْتَ" کا معنی ہے کہ جب آپؐ نے ان

کافروں پر کنکریاں پھینکی تو اس وقت آپؐ نے ان کے دلوں میں رعب نہیں ڈالا' بلکہ اللہ تعالیٰ نے ان کے دلوں میں رعب ڈالا۔ اس قسم کی آیاتِ قرآنی واحادیث نبویؐ کے سلسلہ میں اہلِ حقیقت کے بیان کردہ عمدہ مباحث بھی ہیں مگر ہماری یہ مختصر کتاب ان کی متحمل نہیں ہے۔ تصوف کی کتابوں میں ایسی مباحث مفصل طور پر موجود ہیں۔

سوال: اس کی کیا وجہ ہے کہ اس ارشادِ مبارک میں: "یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْۤا اَطِیْعُوا اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَلَا تَوَلَّوْا عَنْهُ" (اے ایمان والو اللہ کا کہنا مانو اور اس کے رسول کا اور اس سے روگردانی مت کرو) امرِ اطاعت میں تو تثنیہ (دو) کا ذکر فرمایا ہے اور لیکن نہی کے سلسلہ میں مفرد ضمیر (عَنْهُ) لائے؟۔

جوابِ اوّل: جس طرح لغتِ عرب میں مفرد اسم بول کر تثنیہ اور جمع مراد لیا جاتا ہے اسی طرح مفرد ضمیر ذکر کر کے اس سے تثنیہ کی ضمیر مراد لی جاتی ہے' جیسے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: "وَاللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗۤ اَحَقُّ اَنْ یُّرْضُوْهُ" یعنی "یرضوہما" اس آیتِ کریمہ میں بھی اسی طرح ہوا ہے' چنانچہ معنی یہ ہوگا کہ "وَلَا تَوَلَّوْا عَنْهُمَا" یعنی ان دونوں سے روگردانی نہ کرو۔

جوابِ ثانی: صرف اللہ تعالیٰ کی طرف ضمیر لوٹانے کے اعتبار سے ضمیر کو مفرد لائے ہیں' کیونکہ اصل اللہ کی اطاعت ہے' اس لئے کہ اللہ کی اطاعت اور رسول کی اطاعت دونوں آپس میں لازم و ملزوم ہیں۔ جیسے فرمانِ خداوندی ہے: "مَنْ یُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰهَ" نیز فرمایا: "اِنَّ الَّذِیْنَ یُبَایِعُوْنَكَ اِنَّمَا یُبَایِعُوْنَ اللّٰهَ" چنانچہ رسولؐ سے اعراض درحقیقت اللہ تعالیٰ سے اعراض اور روگردانی ہے۔ اس لئے صرف اس (اللہ) کے ذکر پر اکتفاء کیا گیا۔

جوابِ ثالث: اس کا معنی یہ ہے کہ اس حکم سے اور اس جیسے دوسرے حکموں سے روگردانی نہ کرو۔ لہٰذا "عَنْهُ" کی ضمیر حکم کی طرف راجع ہے نہ کہ رسول علیہ الصلوٰۃ والسلام کی طرف۔

جواب: ولا تولوا عنہما (تثنیہ کے ساتھ) اس لئے نہیں فرمایا تاکہ لفظ اللہ کو مقدم کئے بغیر اللہ ورسولؐ دونوں کو ایک ہی لفظ میں ذکر کرنے سے نبی کریم ﷺ کے ادب میں کوئی کوتاہی لازم نہ آئے۔ کیونکہ ایک حدیثِ مبارک میں اللہ ورسول دونوں کو تثنیہ کی ضمیر کے ساتھ لانے سے منع فرمایا گیا ہے۔ جیسے مروی ہے کہ ایک خطیب نے لوگوں سے خطاب کرتے ہوئے یوں کہا مَنْ اَطَاعَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ فَقَدْ رَشَدَ' وَمَنْ عَصَاهُمَا فَقَدْ غَوٰی' تو رسول اللہ ﷺ نے اس کو فرمایا کہ تم اپنی قوم کے بُرے خطیب ہو' تم نے یوں کیوں نہیں کہا' ومن عصی اللہ ورسولہ فقد غوی؟

سوال: اللہ تعالیٰ کے اس ارشادِ عالی کا کیا مطلب ہے: "وَلَوْ عَلِمَ اللّٰهُ فِیْهِمْ خَیْرًا لَّاَسْمَعَهُمْ"

الآیۃ۔(اور اگر جانتا اللہ بیچ ان کے بھلائی البتہ سناتا ان کو)؟

**جوابِ اوّل:** اس کا معنی یہ ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ مستقبل میں ان میں ایمان اور تصدیق جانتے اور دیکھتے تو ان کو فہم وقبولیت والی سماعت کی توفیق دیتے۔ یا معنی یہ ہے کہ ان کے لئے ان کی فرمائش کے مطابق مُردوں کو قوتِ گویائی عطا فرمادیتے جو پھر آپ کی نبوت کی صداقت کی گواہی دیتے۔

**جوابِ ثانی:** بعض کہتے ہیں کہ ''لَاَسْمَعَهُمْ'' کا معنی ہے کہ ان کو پھر فہم و بصیرت عطا فرمادیتے۔ مگر وہ جانتے ہیں کہ یہ لوگ اپنے عناد اور ظہورِ حق کے بعد اس کا انکار کی بناء پر روگردانی اور بے رخی کریں گے۔

**سوال:** ''تولّی'' اور ''اعراض'' دونوں کا ایک ہی معنی ہے لہٰذا: ''لَتَوَلَّوْا وَهُمْ مُعْرِضُوْنَ'' کا کیا معنی ہوگا؟

**جواب:** اس کا معنی ہے: ''لتولوا عن الایمان واعرضوا عن البرهان'' یعنی وہ ایمان سے روگردانی اور برہان سے اعراض کریں گے۔

**سوال:** ارشادِ باری تعالیٰ ہے: ''فَاَمْطِرْ عَلَيْنَا حِجَارَةً مِّنَ السَّمَآءِ'' (پس برسا اوپر ہمارے پتھر آسمان سے) اس آیتِ مبارکہ میں آسمان کا ذکر کرنے میں کیا فائدہ ہے؟ ظاہر ہے مطر (برسنا) آسمان سے ہی ہوتی ہے؟

**جوابِ اوّل:** مطلق مطر (بارش) یقیناً آسمان سے ہی ہوتی ہے اور کہیں سے نہیں ہوتی، مگر یہاں پر مطر مضاف ہے یعنی مَطَرَ الْحِجَارَةِ (پتھروں کی بارش) یہ مطر کبھی پہاڑوں کے اوپر سے ہوتی ہے اور کبھی مکانات اور محلات کی دیواروں اور چھتوں سے بھی ہوتی ہے، معلوم ہوا کہ اس آیتِ کریمہ میں آسمان کا ذکر بافائدہ ہے، اس لئے کہ پتھر جب آسمان سے آئیں گے تو ظاہر ہے کہ وہ تکلیف اور ضرر میں شدید اور زیادہ ہوں گے۔

**جوابِ ثانی:** چونکہ حجارۃ (پتھر) سے عذاب کے لئے نشان زدہ متعین پتھر مراد ہیں یعنی کھنگر جن کے آسمان سے اترنے کا وقت متعین ہے، اس لئے آسمان کا ذکر کرکے ان مخصوص اور متعین پتھروں کی طرف اشارہ کردیا۔ گویا یوں فرمایا: ''فَاَمْطِرْ عَلَيْنَا حِجَارَةً مِّنْ سِجِّيْلٍ'' یعنی تو ہم پر کھنگر کے پتھر برسائیے۔ چنانچہ ''السماء'' کو سجیل'' کے قائم مقام کردیا گیا۔

**سوال:** اس آیت کا کیا معنی ہے: ''وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُعَذِّبَهُمْ وَاَنْتَ فِيْهِمْ'' (اور اللہ تعالیٰ ایسا نہ کرینگے کہ ان میں آپ کے ہوتے ہوئے انکو عذاب دیں) حالانکہ غزوۂ بدر میں اللہ تعالیٰ نے ان کو حضورؐ کے ہوتے ہوئے قتل اور قید کا عذاب دیا؟

جوابِ اوّل: اس کا معنی یہ ہے کہ اللہ ان کو عذاب نہ دینگے جبکہ آپ مکہ میں مقیم ہیں۔ اور یہ بات حقیقت پر مبنی ہے کیونکہ نبی کریم ﷺ جب تک مکہ مکرمہ میں قیام پذیر رہے مشرکین کو عذاب نہیں دیا گیا۔ لیکن جب مشرکین نے آنحضرت کو مکہ سے نکال دیا اور آپؐ سے لڑنے کے لئے میدان میں آئے تو عذاب میں گرفتار ہوئے۔

جوابِ ثانی: اس کا معنی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کو آپؐ کے ہوتے ہوئے ایسا عذاب نہ دینگے کہ وہ جڑ سے ہی اکھاڑ دیئے جائیں۔

جوابِ ثالث: اس کا معنی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کو آپؐ کے ہوتے ہوئے وہ عذاب نہیں دیں گے جس کا انہوں نے مطالبہ کیا ہے یعنی پتھروں کی بارش کا عذاب۔

سوال: پہلے تو فرمایا: ''وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُعَذِّبَهُمْ وَاَنْتَ فِيهِمْ'' الآیۃ (اللہ تعالیٰ آپ کے ان میں ہوتے ہوئے ان کو عذاب نہیں دیں گے) پھر فرمایا: ''وَمَا لَهُمْ اَلَّا يُعَذِّبَهُمُ اللّٰهُ'' (ان کا کیا استحقاق ہے کہ اللہ ان کو عذاب نہ دے) بظاہر ان آیات میں تناقض اور تعارض ہے؟۔

جوابِ اوّل: اس کا معنی یہ ہے کہ ان کا کیا استحقاق ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کو آپؐ کے اور دیگر مومنین کے ان کے درمیان سے نکلنے کے بعد عذاب نہ دے۔

جوابِ ثانی: پہلے عذاب سے مراد استیصالی عذاب (جڑ سے اکھاڑ دینے والا عذاب) ہے۔ اور دوسرے سے غیر استیصالی عذاب (جو ایسا نہ ہو) مراد ہے۔

جوابِ ثالث: پہلے عذاب سے مرد دنیا کا عذاب ہے اور دوسرے سے آخرت کا عذاب ہے۔

سوال: اس کا معنی کیا ہے: ''وَمَا كَانَ صَلَاتُهُمْ عِنْدَ الْبَيْتِ اِلَّا مُكَاءً وَّ تَصْدِيَةً'' (اور نہیں ہے نماز ان کی نزدیک کعبہ کے مگر سیٹیاں بجانا اور تالیاں بجانا) حالانکہ سیٹیاں بجانا اور تالیاں بجانا تو نماز نہیں کہلاتا؟

جواب: اس کا معنی یہ ہے کہ انہوں نے مُكَاءً (سیٹیاں بجانے) اور تَصْدِيَةً (تالیاں بجانے) کو نماز کے قائم مقام کر دیا' جیسے کوئی کہے: میں فلاں شخص سے ملا تو اس نے جفا (ظلم و زیادتی) کو میری صلہ رحمی بنایا' مطلب ہوتا ہے کہ اس نے جفا کو میرے صلہ کے قائم مقام کیا۔ فرزدق کا یہ شعر بھی اسی کی مثال ہے:

اخاف زیادًا ان یکون عطاؤہ اداھم سودًا او محدرجۃً سُمرًا

اس شعر میں ''اداھم'' سے بیڑیاں اور ''محدرجۃ'' سے کوڑے مراد ہیں' یہاں اس نے ان دونوں کو عطاو بخشش کی جگہ پر رکھ دیا۔

سوال: اس آیت کا کیا مفہوم ہے: "قُلْ لِّلَّذِیْنَ کَفَرُوْٓا اِنْ یَّنْتَهُوْا یُغْفَرْ لَهُمْ مَّا قَدْ سَلَفَ ۚ وَاِنْ یَّعُوْدُوْا" (آپ ان کافروں سے کہہ دیجئے کہ اگر یہ لوگ باز آجائینگے تو ان کے گناہ جو پہلے ہو چکے ہیں سب معاف کر دیئے جائینگے اور اگر وہ عود کریں۔۔۔) وہ تو کفر سے باز نہیں آئے پھر کیسے فرمایا: "وَاِنْ یَّعُوْدُوْا" اگر وہ عود کریں گے، حالانکہ کسی چیز کی طرف عود تو اس وقت ہوتا ہے جب اس چیز کو ترک کر دیا جائے؟

جوابِ اوّل: اس کا معنی یہ ہے کہ اگر یہ لوگ رسول اللہ ﷺ کی عداوت اور ان سے محاربت (لڑائی) سے باز آجائینگے تو ان کے سابقہ گناہ معاف کر دیئے جائینگے، اور اگر وہ حضورؐ سے قتال اور عداوت میں عود (دوبارہ) کریں گے تو ان کو سنا دیجئے کہ کفار سابقین کے حق میں قانون نافذ ہو چکا ہے یعنی جن کفار کے بدر کی لڑائی میں بنائے ہوئے منصوبے دھرے کے دھرے رہ گئے اور وہ شکست خوردہ ہوئے یا ان لوگوں کے حق میں قانون نافذ ہو چکا ہے جنہوں نے سابقہ امتوں میں اپنے نبیوں کو ناحق تکلیفیں پہنچائیں۔

جوابِ ثانی: اس کا معنی یہ ہے کہ اگر یہ لوگ کفر سے باز آکر ایمان قبول کرلیں تو ان کے کفر اور دیگر تمام معاصی معاف کر دیئے جائیں گے۔ جیسا کہ حضور نبی کریم علیہم السلام نے ارشاد فرمایا: اسلام لانے سے ماقبل کے تمام گناہ ختم ہو جاتے ہیں" اور اگر ایمان لانے کے بعد دوبارہ کفر اختیار کر کے (نعوذ باللہ) مرتد ہو گئے تو یہ لوگ جان لیں گے کہ سابقین کفار کے حق میں خدا کا قانون نافذ ہو چکا ہے یعنی اللہ نے جیسے ان کو جڑ سے اکھاڑ پھینکا اسی طرح ان لوگوں کو بھی تباہ و برباد کر دیا جائے گا۔

سوال: ارشادِ خداوندی ہے: "وَیُقَلِّلُکُمْ فِیْٓ اَعْیُنِهِمْ" (اور تم کو ان کی نگاہوں میں کم کر کے دکھا رہے تھے) مسلمانوں کی نظروں میں کافروں کو کم کر کے دکھانا تو واضح ہے کہ اس سے مسلمانوں کے دلوں سے ان کا خوف و رعب ختم ہوگا اور مسلمانوں کو ثابت قدمی حاصل ہوگی اور مسلمانوں کی کافروں کے ساتھ لڑنے کی جرأت بڑھ جائے گی لیکن کافروں کی نگاہوں میں مسلمانوں کی تعداد کم کر کے دکھانے میں کیا فائدہ ہے۔ حالانکہ اس سے تو کافروں کے دلوں سے مسلمانوں کا رعب جاتا رہے گا اور ان کے قدم مضبوط ہونگے اور پھر ان کافروں کو مسلمانوں کے ساتھ لڑنے کی ہمت اور جرأت مزید بڑھ جائیگی؟

جواب: اس کا فائدہ یہ ہے کہ اس طرح سے کفار بھرپور تیاری نہ کرینگے وہ مسلمانوں کو قلیل تعداد میں خیال کرتے ہوئے ان کے ساتھ لڑنے کی جرأت کریں گے لیکن جب مسلمانوں کی کثرت

اچانک ان کے مقابلہ میں آئیگی تو وہ حیران و سرگردان رہ جائیں گے' نیز یہ امر دین حق کی نصرت کا سبب بنے گا کیونکہ جب وہ دیکھیں گے کہ مسلمان قلت کے باوجود ان پر غالب آئے ہیں تو یقیناً ان کی آنکھیں کھلیں گی۔ دو جانبوں کی تقلیل میں ایک معارضہ ہے جو غور و فکر سے ہی معلوم ہو سکتا ہے۔

سوال: ارشاد باری تعالیٰ ہے: "وَلَا تَنَازَعُوا فَتَفْشَلُوا وَتَذْهَبَ رِيحُكُمْ" (اور نزاع مت کرو ورنہ کم ہمت ہو جاؤ گے اور تمہاری ہوا اکھڑ جائیگی) اس سے معلوم ہوتا ہے کہ جدال اور منازعہ (لڑنا جھگڑنا) حرام ہے تو پھر مناظرہ کیونکر جائز ہے۔ آخر وہ بھی جدال اور منازعہ ہے؟

جواب: اس آیت مبارکہ میں منازعہ سے مراد جنگ کے معاملہ میں جھگڑنا ہے' نہ کہ دلیل و برہان کے ذریعہ حق کے اظہار میں منازعہ کرنا۔ اور اس کی دلیل یہ ہے کہ مناظرہ کا تو حکم دیا گیا ہے۔ ارشاد خداوندی ہے: "وَجَادِلْهُمْ بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ" البتہ اس کے جواز کے لئے کچھ شرائط ضرور ہیں جو آج کل کے دور میں کمیاب ہیں: ایک شرط تو یہ ہے کہ مناظرہ سے مکمل طور پر مقصود اظہار حق ہو' خواہ اس حق کا ظہور دو فریقوں میں سے کسی کی بھی زبان سے ہو' جیسے اسلاف کا مناظرہ ہوا کرتا تھا۔ اور اس کی علامت یہ ہے کہ وہ شخص اپنی زبان سے حق کے اظہار پر اس قدر خوش نہ ہو جس قدر اپنے مدمقابل کی زبان سے حق کے اظہار پر خوش ہو۔

سوال: ابلیس نے یہ کیسے کہا: "اِنِّيْٓ اَخَافُ اللّٰهَ" (میں تو خدا سے ڈرتا ہوں) حالانکہ وہ تو اللہ سے نہیں ڈرتا' کیوں کہ اگر اس کے اندر خدا کا خوف ہوتا تو وہ حکم خداوندی کی کبھی بھی مخالفت نہ کرتا اور نہ ہی خدا کے بندوں کو گمراہ کرتا؟۔

جواب اوّل: حضرت قتادہؒ فرماتے ہیں کہ اگر ابلیس نے اپنی اس بات میں: "اِنِّيْٓ اَرٰى مَا لَا تَرَوْنَ" (میں ان چیزوں کو دیکھ رہا ہوں جو تم کو نظر نہیں آتیں) سچ بولا ہے کہ اس نے بدر کے دن مسلمانوں کی نصرت کے لئے آسمان سے اترتے ہوئے جبریل علیہ السلام اور ان کے ہمراہ فرشتوں کو دیکھا ہے تو اس نے یہ جھوٹ بھی بولا ہے کہ: "اِنِّيْٓ اَخَافُ اللّٰهَ" (میں خدا سے ڈرتا ہوں) خدا کی قسم! اسے تو خدا کا کچھ بھی خوف نہیں' اصل میں وہ جانتا تھا کہ اس کو مسلمانوں کے خلاف کچھ کرنے کی کوئی طاقت نہیں ہے۔

جواب ثانی: ابلیس نے جب فرشتوں کے نزول کو ایسی صورت میں دیکھا جس صورت میں اس نے کبھی نہیں دیکھا تھا تو اسے قیامت کے قائم ہو جانے کا خوف ہوا جو کہ اس کے لئے آخری مہلت ہے' جس کے بعد وہ موعود عذاب میں گرفتار ہوگا (اس لئے اس نے کہدیا کہ میں خدا سے

ڈرتا ہوں)۔

**جوابِ ثالث:** ''اَخَافُ اللّٰہَ'' کا معنی ہے میں جانتا ہوں کہ اللہ کا اپنے نبیؑ سے نصرت کا وعدہ سچا ہے' کیونکہ خوف' علم کے معنی میں بھی آتا ہے۔ جیسے فرمانِ الٰہی ہے: ''اِلَّآ اَنۡ یَّخَافَاۤ اَلَّا یُقِیۡمَا حُدُوۡدَ اللّٰہِ''۔

**جوابِ رابع:** میرے نزدیک اس بات کا احتمال ہے کہ وہ اس بات سے ڈرا ہو کہ
میں کہتا ہوں کہ ابلیس تو سب سے بڑا کافر فاسق ہے اس کے متعلق جھوٹ بولنے پر تعجب کیسا؟ تعجب تو اس کے سچ بولنے پر ہے۔

**سوال:** ارشادِ خداوندی ہے: ''وَمَنۡ یَّتَوَکَّلۡ عَلَی اللّٰہِ فَاِنَّ اللّٰہَ عَزِیۡزٌ حَکِیۡمٌ'' اور جو شخص اللہ پر بھروسہ کرتا ہے تو بلاشبہ اللہ تعالیٰ زبردست ہیں حکمت والے ہیں)' اس آیت میں شرط اور جزا میں کیا مناسبت ہے؟

**جواب:** جب مسلمانوں نے مشرکین کے خلاف لڑنے کے لئے اقدام کیا' حالانکہ مسلمانوں کی تعداد تین سو تیرہ کے قریب تھی اور کفار کی ایک ہزار کے قریب تھی تو منافقین کہنے لگے: دیکھو! کیسے بے وقوف ہیں' ان کو انکے دین نے دھوکہ دیا ہے' اپنے سے تین گنا بلکہ اس سے بھی زیادہ لشکر پر چڑھائی کرنے جا رہے ہیں تو اللہ تعالیٰ نے اس آیتِ مبارکہ میں منافقین کی بات کی تردید کرتے ہوئے اور مسلمانوں کی حوصلہ افزائی اور ان کی ثابت قدمی کے لئے فرمایا: ''وَمَنۡ یَّتَوَکَّلۡ عَلَی اللّٰہِ فَاِنَّ اللّٰہَ عَزِیۡزٌ حَکِیۡمٌ'' یعنی اللہ تعالیٰ غالب ہیں کہ قلیل اور ضعیف کو کثیر اور طاقتور پر مسلط کر کے ان کے خلاف نصرت و غلبہ عطا فرماتے ہیں اور وہ اپنے تمام افعال میں حکمت والا ہے۔

**سوال:** اس کی کیا وجہ ہے کہ اس طرح فرمایا: ''وَاَنَّ اللّٰہَ لَیۡسَ بِظَلَّامٍ لِّلۡعَبِیۡدِ'' (اور یہ کہ اللہ نہیں ظلم کرنے والا واسطے بندوں کے) یوں کیوں نہیں فرمایا: ''لَیۡسَ بِظَالِمٍ'' حالانکہ یہ الفاظ ذاتِ مقدسہ سے ظلم کی نفی کرنے میں زیادہ بلیغ ہیں؟

**جواب:** یہ سوال اور اس کا جواب سورۂ آلِ عمران میں گزر چکا ہے۔

**سوال:** ارشادِ خداوندی ہے: ''ذٰلِکَ بِاَنَّ اللّٰہَ لَمۡ یَکُ مُغَیِّرًا نِّعۡمَۃً اَنۡعَمَہَا عَلٰی قَوۡمٍ حَتّٰی یُغَیِّرُوۡا مَا بِاَنۡفُسِہِمۡ'' (یہ بسبب اس کے ہے کہ اللہ نہیں تھا بدلنے والا نعمت کو کہ انعام کی تھی وہ اوپر کسی قوم کے یہاں تک کہ بدل ڈالیں وہ اس چیز کو کہ جو کچھ ان کے جی کے بیچ ہے) اس ''ذٰلِکَ'' سے کفارِ مکہ اور آلِ فرعون کی ہلاکت کی طرف اشارہ ہے' حالانکہ ان کی کوئی ایسی اچھی حالت تو تھی ہی نہیں جس کو انہوں نے بدل ڈالا ہو؟

جواب: جیسے اچھی حالت بُری حالت سے بدلا کرتی ہے اسی طرح بُری حالت بھی ایسی حالت سے بدلا کرتی ہے جو اس سے بھی زیادہ بُری اور قابلِ نفرت ہوتی ہے۔
یہ لوگ بھی آنحضرت ﷺ کی بعثت سے قبل بتوں کے پجاری تھے۔ پھر جب آنحضرت ﷺ ان کے پاس روشن دلائل لے کر مبعوث ہوئے تو انہوں نے آنحضرتؐ کی تکذیب کی اور آپؐ کے دشمن بن گئے حتیٰ کہ حضورؐ کو قتل کرنے کی کوشش بھی کی لہٰذا جب انہوں نے اپنی سابقہ حالت کو بدترین حالت سے تبدیل کیا تو اللہ تعالیٰ نے بھی نعمتِ امہال (مہلت دینے کی نعمت) کو جو پہلے سے ان کو حاصل تھی تعجیلِ عذاب (جلدی عذاب دینے) سے تبدیل فرمادیا۔
سوال: اس کی کیا وجہ ہے کہ: "اِنَّ شَرَّ الدَّوَآبِّ عِنْدَ اللّٰهِ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا" (بلاشبہ بدترین خلائق اللہ کے نزدیک یہ کافر لوگ ہیں) فرمانے کے بعد یہ فرمایا ہے: "فَهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ" (تو یہ ایمان نہ لائیں گے)؟ اسکا فائدہ و مقصد کیا ہے؟
جواب: اس کا مقصد یہ بتانا ہے کہ بدترین کافر وہ ہیں جو کفر اختیار کرنے کے بعد موت تک اپنے کفر پر اڑے رہیں۔
سوال: اس کی کیا وجہ ہے کہ اس آیتِ کریمہ میں: "اِنْ يَّكُنْ مِّنْكُمْ عِشْرُوْنَ صٰبِرُوْنَ يَغْلِبُوْا مِائَتَيْنِ ......... وَاللّٰهُ مَعَ الصّٰبِرِيْنَ" (اگر ہو تم میں سے بیس صبر کرنے والے غالب آئینگے دو سو پر ......... اور اللہ تعالیٰ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے)۔ تخفیف سے پہلے اور تخفیف کے بعد کثیر التعداد لشکر کے ساتھ مقابلہ کرنے کے سلسلہ میں ایک ہی بات کو مکرر ذکر کرنے میں کیا فائدہ ہے؟
جواب: اس کا فائدہ یہ ہے کہ یہ معلوم ہو کہ اصل حالت قلت و کثرت کے باوجود ایک ہے کوئی فرق نہیں ہوتا' کیونکہ جس طرح اللہ تعالیٰ دس آدمیوں کو دو سو پر غالب کرتے ہیں اسی طرح سو آدمیوں کو ایک ہزار پر غالب و منصور کردیتے ہیں' اسی طرح جیسے اللہ تعالیٰ سو آدمیوں کو دو سو آدمیوں پر غلبہ دیتے ہیں اسی طرح ایک ہزار کے لشکر کو دو ہزار کے لشکر پر غالب فرمادیا کرتے ہیں۔
سوال: ہمارا مشاہدہ تو اس کے خلاف ہے' کیوں کہ کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ کفار کے سو آدمی مسلمانوں کے سو آدمیوں پر غالب آجایا کرتے ہیں بلکہ بعض دفعہ تو دو سو مسلمانوں کے مقابلہ میں غالب رہتے ہیں؟
جواب: اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کے اس غلبہ کا ذکر میدانِ جنگ میں صبر اور ثابت قدمی کی شرط کے ساتھ مشروط کیا ہے۔ یا یہ موعود غلبہ اس صورت میں ہے جب مسلمانوں میں ظاہری اور باطنی

ہر لحاظ سے موافقت ہو۔ چنانچہ جب شرط پائی جائیگی تو لامحالہ قلت کے باوجود غالب ومنصور ہیں گے۔ نیز یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ یہ غلبہ اس گروہ کے ساتھ خاص ہے جس کے ایک فرد آنحضرت ﷺ تھے' آیت کا سیاق بھی اس پر دال ہے۔

سوال: اس آیت سے کیا مراد ہے: "وَاللّٰهُ يُرِيْدُ الْاٰخِرَةَ" (اور اللہ ارادہ کرتا ہے آخرت کا) جب کہ اللہ تعالیٰ نے دنیا کا بھی ارادہ کیا ہے' کیونکہ اگر دنیا کا ارادہ نہ ہوتا تو اس کو بناتے ہی نہ لہٰذا اس تخصیص میں کیا فائدہ ہے؟

جواب: یہاں ارادہ سے مراد اختیار و محبت ہے۔ نہ کہ وجود کا ارادہ۔ مطلب یہ ہوگا کہ کیا تم دنیا کی زندگی کا سامان چاہتے ہو اور اس کو پسند کرتے ہو؟ جبکہ اللہ تعالیٰ اس چیز کو پسند فرماتے ہیں جو کہ حصولِ جنت کا سبب ہے اور وہ ہے اسلام کی قوت افزائی کفار کی خونریزی کے ساتھ۔

## سورۃ التوبۃ

سوال: اس کا کیا سبب ہے کہ اس سورت کی ابتداء میں بسم اللہ نہیں ہے جبکہ باقی سورتوں کے شروع میں بسم اللہ موجود ہے؟

جوابِ اوّل: چونکہ سورۃ التوبۃ اور سورۃ الانفال ایک دوسرے سے ملتی جلتی ہیں اور صحابہ کرامؓ بھی اس میں اختلاف رہا کہ یہ دونوں حقیقت میں ایک ہی سورت ہے یا دو سورتیں' اس لئے دونوں سورتوں کے درمیان جگہ چھوڑ دی گئی تا کہ ان حضرات کی بات پر عمل ہو سکے جو کہتے ہیں کہ یہ دو الگ الگ سورتیں ہیں اور ان دونوں کے درمیان بسم اللہ بھی چھوڑ دی تا کہ ان حضرات کی بات پر بھی عمل ہو جائے جو ان دونوں کے ایک (سورت) ہونے کے قائل ہیں۔ جیسا کہ حضرت قتادہؒ کا یہ قول ہے۔

جوابِ ثانی: اللہ تعالیٰ کا ایک نام سلام وامان بھی ہے' اور سورتِ براءت (سورۃ التوبۃ) میں مشرکین کے ساتھ قتل وقتال کا ذکر ہے' اس لئے یہ مناسب نہ ہوا کہ اس کے شروع میں بسم اللہ لکھی جائے۔

سوال: اللہ تعالیٰ کے اس ارشادِ مبارک: "وَاِنْ نَّكَثُوْٓا اَيْمَانَهُمْ مِّنْۢ بَعْدِ عَهْدِهِمْ وَطَعَنُوْا فِيْ دِيْنِكُمْ فَقَاتِلُوْٓا اَئِمَّةَ الْكُفْرِ" (اور اگر توڑ دیں قسمیں اپنی عہد کرنے کے بعد اور تمہارے دین (اسلام) پر طعن کریں پس لڑو تم کفر کے سرداروں سے) میں کفر کے سرداروں اور پیشواؤں کے ساتھ قتال کو خاص کیا گیا ہے' جبکہ عہد شکنی اور طعنہ زنی کچھ ان کے ساتھ مخصوص نہیں ہے بلکہ تمام

مشرکوں میں پائی جاتی ہے؟

جوابِ اوّل: اَئِمَّةَ الْکُفْرِ" سے مراد مشرکین کے سردار اوران کے قائدین ہیں۔

جوابِ ثانی: "اَئِمَّةَ الْکُفْرِ" سے مراد کفارِ مکہ ہیں۔اس لئے کہ وہی کفر میں تمام عرب کے لیڈر ہیں تو گویا عہد شکنی اور طعنہ زنی صرف انہی کی طرف سے پائی گئی کیونکہ وہ اس میں اصل کا درجہ رکھتے ہیں اسی لئے ان کو خاص طور پر ذکر فرمایا:

سوال: ارشادِ باری تعالیٰ ہے:"وَقَالَتِ الْیَهُوْدُ عُزَیْرُنِ ابْنُ اللّٰهِ وَقَالَتِ النَّصٰرَی الْمَسِیْحُ ابْنُ اللّٰهِ" (اور کہا یہود نے کہ عزیر اللہ کا بیٹا ہے اور کہا نصاریٰ نے مسیح اللہ کا بیٹا ہے) حالانکہ جب یہود ونصاریٰ سے اس کے متعلق پوچھا جاتا ہے تو وہ اس کا صاف انکار کرتے ہیں کہ ہم تو ان کو اللہ کا بیٹا نہیں کہتے؟

جواب: یہود ونصاریٰ کا ایک گروہ اس کا قائل ہے سارے یہود ونصاریٰ اس کے قائل نہیں ہیں۔ الیهود اور النصری پر الف ولام عہد کے لئے ہے نہ کہ جنس اور استغراق کے لئے۔ یا یہ کہا جائے کہ اطلاق تو کل پر کیا ہے مگر مراد بعض ہیں جیسے اس ارشاد میں ہے:"وَاِذْ قَالَتِ الْمَلٰٓئِکَةُ یٰمَرْیَمُ" حالانکہ مریم علیہا السلام سے صرف جبریل علیہ السلام نے کہا تھا۔

سوال: اس کا معنی کیا ہے:"ذٰلِکَ قَوْلُهُمْ بِاَفْوَاهِهِمْ" (یہ ان کا قول ہے ان کے منہ سے کہنے کا) جبکہ یہ بات واضح ہے کہ قول (بات) منہ سے ہی ہوتا ہے لہٰذا اس جملہ میں کیا فائدہ ہے؟

جوابِ اوّل: اس کا معنی یہ ہے کہ یہ محض الفاظ ہیں ان کی کوئی اصل نہیں ہے یہ کوئی ایسی بات نہیں ہے جس کو دلیل وبرہان کہا جاسکے۔

جوابِ ثانی: اصل میں ان کے قول کی تردید اور انکار کو مبالغہ کے طور پر ذکر کیا گیا ہے جیسے ایک آدمی دوسرے سے کہتا ہے: تو نے مجھ سے یہ بات اپنی زبان سے کہی ہے۔

سوال: ارشادِ خداوندی ہے:"هُوَالَّذِیْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰی وَدِیْنِ الْحَقِّ" (وہ اللہ ایسا ہے کہ اس نے اپنے رسول کو ہدایت اور سچا دین دے کر بھیجا ہے) اس آیت میں "دِیْنِ الْحَقِّ" کو الهدی پر معطوف کر کے ذکر کرنے کا کیا فائدہ ہے؟ آخر دینِ حق بھی منجملہ ہدایت کے ہے؟

جوابِ اوّل: یہاں ہدایت سے مراد قرآن مجید ہے اور دینِ حق سے مراد اسلام ہے یہ دونوں چیزیں الگ الگ ہیں۔

جوابِ ثانی: دینِ حق اگرچہ "الْهُدٰی" میں داخل ہے لیکن اس کو خاص طور پر اس لئے ذکر فرمایا تاکہ اس کی شرافت اور فضیلت کا اظہار ہو۔ جیسے اس ارشادِ الٰہی میں: "حَافِظُوْا عَلَی الصَّلَوٰتِ

وَالصَّلٰوۃِ الْوُسْطٰی ''اوراس فرمانِ خدوندی میں: ''وَمَلٰئِکَتِہٖ وَجِبْرِیْلَ وَمِیْکٰلَ''
سوال: اس کی کیا وجہ ہے کہ یوں ارشاد فرمایا: ''لِیُظْہِرَہٗ عَلَی الدِّیْنِ کُلِّہٖ'' (تاکہ غالب کرے اس کو اوپر دین سب کے) یوں کیوں نہیں فرمایا: ''عَلَی الْاَدْیَانِ کُلِّھَا'' (تمام ادیان پر) حالانکہ اللہ تعالیٰ نے دینِ اسلام کو تمام ادیان پر غالب کردیا ہے؟
جواب: یہاں ''الدین'' سے مراد اسمِ جنس ہے اور قاعدہ ہے کہ اسمِ جنس معرف باللام جمع کے معنی کا فائدہ دیتا ہے جیسے اہلِ عرب کہتے ہیں: ''کثر الدرھم والدینار فی ایدی الناس''
سوال: ارشادِ رب العالمین ہے: ''وَلَا یُنْفِقُوْنَھَا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ'' (اور نہیں خرچ کرتے اس کو اللہ کی راہ میں) اس کی کیا وجہ ہے کہ یہاں پر ضمیر واحد کی لائے ہیں حالانکہ پیچھے سونے اور چاندی دو چیزوں کا ذکر ہے؟
جوابِ اوّل: ضمیر کا مرجع صرف چاندی ہے اس لئے کہ یہاں چاندی کا ذکر سونے سے زیادہ قریب ہے یا اس لئے کہ چاندی لوگوں کے پاس زیادہ پائی جاتی ہے لہٰذا چاندی کا کنز ہونا زیادہ ہوگا۔ اس کی نظیر یہ ارشاد ہے: ''وَاسْتَعِیْنُوْا بِالصَّبْرِ وَالصَّلٰوۃِ وَاِنَّھَا لَکَبِیْرَۃٌ''۔
جوابِ ثانی: یہ ضمیر اصل میں معنی کی طرف لوٹتی ہے اس لئے کہ مکنوز چیز دراہم، دنانیر اور اموال ہیں اس کی نظیر یہ ہے: ''وَاِنْ طَآئِفَتَانِ مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ اقْتَتَلُوْا'' کیونکہ ہر گروہ کثیر تعداد پر مشتمل ہے۔ اسی طرح یہ فرمانِ الٰہی ہے: ''ھٰذَانِ خَصْمٰنِ اخْتَصَمُوْا فِیْ رَبِّھِمْ''۔ مراد مومنین اور کافرین ہیں۔
جوابِ ثالث: اہلِ عرب جب کوئی ایسی دو چیزیں ذکر کرتے ہیں جو معنی میں مشترک ہوں تو ان دو چیزوں میں سے کسی ایک چیز کی طرف اعادۂ ضمیر کو کافی سمجھتے ہیں کیونکہ سامع کو معلوم ہوتا ہے کہ یہ دونوں امر معنی میں مشترک ہیں۔
حضرت حسان بن ثابت کا یہ شعر اسی سے متعلق ہے:

اِنَّ شرخ الشباب والشعر الاسود ۔۔۔ وَمَالَمْ یُعاص کان حنونا

یہاں اس شعر میں مالم یعاصیا نہیں کہا گیا، اسی طرح کسی شاعر کا یہ شعر ہے:

فمن یک امسٰی بالمدینۃ رحلہ ۔۔۔ فانی وقیارٌ بھا لغریب

یہاں بھی لغریبان نہیں کہا گیا۔ اسی طرح ان آیات میں بھی یہی صورتِ حال ہے۔
''یٰاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا اَطِیْعُوا اللّٰہَ وَرَسُوْلَہٗ وَلَا تَوَلَّوْا عَنْہُ۔'' ''وَاللّٰہُ وَرَسُوْلُہٗ اَحَقُّ اَنْ یُّرْضُوْہُ'' وَاِذَا رَاَوْا تِجَارَۃً اَوْلَھْوَا انْفَضُّوْا اِلَیْھَا'' ''وَمَنْ یَّکْسِبْ خَطِیْٓئَۃً اَوْ اِثْمًا ثُمَّ یَرْمِ بِہٖ بَرِیْٓـئًا'' یہ

تمام آیات بھی اسی قبیل سے ہیں جبکہ آخری دو آیتوں میں کلمہ او بمعنی واوٗ ہو۔ نیز ان دو آیتوں میں ایک نکتہ ہے' وہ یہ ہے کہ کلام جبکہ دو امروں میں سے کسی ایک امر پر اعادۂ ضمیر کا تقاضا کرتا ہے تو اس ضمیر کو پہلی آیت میں ''تجارت'' کیطرف لوٹایا' اگرچہ وہ ابعد بھی ہے' اور مؤنث بھی ہے' اس لئے کہ تجارت لہوولعب کی بہ نسبت ایسی چیز ہے جو لوگوں کے دلوں کو اللہ کی اطاعت سے زیادہ کھینچتی ہے' اس لئے کہ تجارت میں لگنے والے لوگ زیادہ ہوتے ہیں لہوولعب میں لگنے والے لوگوں کی بہ نسبت۔ یا اس لئے کہ تجارت کا نفع لہوولعب کی بہ نسبت زیادہ ہوتا ہے' یا اس لئے کہ تجارت اصلاً تھی اور لہو تبعاً تھی کیونکہ اس آیت کی تفسیر سے معلوم ہوتا ہے کہ تجارتی قافلہ کے آنے پر طبل بجایا گیا تھا' اور دوسری آیت میں ضمیر کو ''اثم'' کی طرف لوٹایا' تا کہ قرب اور تذکیر کی رعایت ہو جائے۔

سوال: ارشادِ خداوندی ہے: ''اِنَّ عِدَّةَ الشُّهُوْرِ عِنْدَ اللّٰهِ اثْنَا عَشَرَ شَهْرًا'' (یقیناً شمار مہینوں کا کتابِ الٰہی میں اللہ کے نزدیک بارہ مہینے ہیں) اس ارشاد کا فائدہ کیا ہے' ہر امت میں عام لوگوں کے نزدیک بھی مہینوں کا شمار اسی طرح ہے خواہ مہینہ قمری ہو یا شمسی؟۔

جواب: اس کا فائدہ یہ ہے کہ سب جان لیں کہ مہینوں کی یہ تقسیم اور تعداد ان چیزوں میں سے نہیں ہے جن کو لوگوں نے خود اپنی عقلوں سے ایجاد کیا ہے بلکہ یہ ایک ایسا امر ہے جس کو اللہ تعالیٰ نے اپنے پیغمبروں کی زبانی اپنی کتابوں میں نازل کیا ہے۔

سوال: یہ کیسے فرمایا: ''فَلَا تَظْلِمُوْا فِيْهِنَّ اَنْفُسَكُمْ'' (پس مت ظلم کرو بیچ ان کے آپس میں) ظلمِ نفس کو حرمت کے چار مہینوں کے ساتھ خاص کیا گیا ہے' حالانکہ ظلمِ نفس تو ہر زمانہ میں ممنوع ہے؟

جواب: حضرت ابنِ عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں: ''فِيْهِنَّ'' کی ضمیر ''اِثْنَا عَشَرَ شَهْرًا'' کی طرف راجع ہے' نہ کہ صرف اربعة الحرم کی طرف' یا تو اس لئے کہ یہ اقرب ہے یا اس کی وجہ وہ ہے جو امام فراءؒ نے ذکر فرمائی ہے۔

وہ فرماتے ہیں: بنابریں اربعہ حرم کی وجہ تخصیص یا تو ان کی فضیلت وحرمت کی زیادتی کے لئے ہے کہ جب زمانہ جاہلیت میں یہ چار مہینے باحرمت شمار ہوتے تھے تو ان میں ظلم کرنا اور بھی زیادہ قبیح ہوگا' اس کی نظیر یہ آیت ہے: ''فَلَا رَفَثَ وَلَا فُسُوْقَ وَلَا جِدَالَ فِي الْحَجِّ'' حالانکہ غیر حج میں بھی یہ کام ممنوع ہیں' یا اس کی وجہ یہ ہے کہ یہاں ''ظلم'' سے نسیء (مہینوں میں تاخیر وتقدیم کرنا) مراد ہے اور یہ عمل انہی چار مہینوں کے ساتھ خاص تھا' یا مراد ہے ان مہینوں میں کفار سے ابتداءً قتال کرنا یا مراد یہ ہے کہ جب وہ لڑنے کی ابتداء کریں تو ان کے ساتھ قتال ترک کرنا' ظاہر ہے یہ سب باتیں اربعہ حُرم کے ساتھ مخصوص ہیں۔

سوال: ''شہر'' کا لفظ مذکر ہے تو قیاس کا تقاضا یہ ہے کہ ''فیھا'' ہو؟
جواب: ھَاء اور نون کے ساتھ ضمیرِ مؤنث کے ساتھ خاص نہیں ہے۔ اور اگر خاص بھی ہو تو کہا جائے گا کہ ''فیھنّ'' سے مراد ساعات الاشھر ہے اور یہ مؤنث ہے۔
سوال: یہ کیسے فرمایا: ''فَلَا تَظۡلِمُوۡا فِیۡهِنَّ اَنۡفُسَكُمۡ'' (پس تم ان میں اپنے اوپر ظلم مت کرو) انسان اپنے اوپر تو ظلم نہیں کیا کرتا بلکہ وہ دوسرے پر ظلم کرتا ہے؟
جوابِ اوّل: ہم یہ بات تسلیم نہیں کرتے کہ انسان اپنے اوپر ظلم نہیں کرتا۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: ''وَمَنۡ یَّعۡمَلۡ سُوۡٓءًا اَوۡ یَظۡلِمۡ نَفۡسَهٗ'' نیز فرمایا ہے: ''وَمَنۡ یَّتَعَدَّ حُدُوۡدَ اللّٰهِ فَقَدۡ ظَلَمَ نَفۡسَهٗ'' (جو شخص کوئی برائی کرتا ہے یا اپنے اوپر ظلم کرتا ہے۔ اور جو شخص اللہ کی حدود سے تجاوز کرتا ہے وہ یقیناً اپنے اوپر ظلم کرتا ہے)۔
جوابِ ثانی: اس کا معنی یہ ہے کہ تم ایک دوسرے پر ظلم مت کرو۔ جیسے ارشادِ خداوندی ہے: ''وَاِذۡ اَخَذۡنَا مِیۡثَاقَكُمۡ لَا تَسۡفِكُوۡنَ دِمَآءَكُمۡ'' نیز فرمایا: ''فَتُوۡبُوۡٓا اِلٰى بَارِئِكُمۡ فَاقۡتُلُوۡٓا اَنۡفُسَكُمۡ'' نیز فرمایا: ''وَلَا تَلۡمِزُوۡٓا اَنۡفُسَكُمۡ''۔
جوابِ ثالث: اس آیت کا معنی یہ ہے کہ تم اپنا آخرت کا حصہ نافرمانی کر کے کم نہ کرو۔ کیونکہ جو شخص نافرمانی کرتا ہے وہ بالیقین اپنے اجر و ثواب میں نقصان اور عذاب کو متوجہ کر کے اپنے اوپر ظلم کرتا ہے۔ اسی کی طرف اشارہ ہے اس فرمانِ الٰہی میں: ''وَمَنۡ یَّتَعَدَّ حُدُوۡدَ اللّٰهِ فَقَدۡ ظَلَمَ نَفۡسَهٗ''۔
جوابِ رابع: جو شخص دوسرے پر ظلم کرتا ہے تو وہ درحقیقت خود اپنے اوپر ظلم کرتا ہے' اس لئے کہ مظلوم کے حق میں اس کے ظلم کا ضرر عنقریب ختم ہو جائے گا کیونکہ وہ دنیا تک محدود ہے لیکن خود اپنی ذات کے حق میں اس کے ظلم کا ضرر ایسا ہے جس کو وہ آخرت میں بھی دیکھے گا جہاں ختم ہونے کا نام نہیں یا وہاں اس کا ضرر زیادہ شدید اور دائمی ہوگا۔
سوال: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ''اِنَّمَا النَّسِیۡٓءُ زِیَادَةٌ فِی الۡكُفۡرِ'' (یہ آگے پیچھے کر لینا کفر میں زیادتی ہے) اس سے معلوم ہوتا ہے کہ کفر' زیادت و نقصان کو قبول کرتا ہے' پس ایمان جو اس کی ضد ہے وہ بھی زیادت و نقصان کو قبول کرے گا لہٰذا یہ امام شافعیؒ کی دلیل ہوئی کہ ایمان' زیادت و نقصان کو قبول کرتا ہے؟
جواب: اس کا معنی ہے کہ یہ نسیء (آگے پیچھے کرنا) کفر میں معصیت کی زیادتی کا سبب ہے۔
سوال: ارشادِ باری ہے: ''لَا یَسۡتَاۡذِنُكَ الَّذِیۡنَ یُؤۡمِنُوۡنَ بِاللّٰهِ وَالۡیَوۡمِ الۡاٰخِرِ'' (جو لوگ اللہ پر

اور قیامت کے دن پر ایمان رکھتے ہیں وہ آپ سے رخصت نہ مانگیں گے) اگر یہ نہی ہے تو پھر جزم کہاں ہے؟ اور اگر نفی ہے تو امرِ منفی تو واقع ہوا ہے اس لئے کہ بہت سے مخلص مومنوں نے آنحضرتؐ سے کسی عذر کی بناء پر جہاد پر نہ جاسکنے کی رخصت واجازت مانگی تھی اس کی تائید اس ارشادِ خداوندی سے بھی ہوتی ہے: ''اِنَّمَا الْمُؤمِنُوْنَ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰہِ وَرَسُوْلِہٖ وَاِذَا کَانُوْا مَعَہٗ عَلٰی اَمْرٍ جَامِعٍ لَّمْ یَذْھَبُوْا حَتّٰی یَسْتَاْذِنُوْہُ'' پھر یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس سے مراد ہر وہ امرِ طاعت ہے جس پر سب لوگ جمع ہوتے ہوں۔ جیسے جہاد جمعہ اور عید وغیرہ؟

**جوابِ اوّل:** یہ نہی بصیغۂ نفی ہے۔ جیسے یہ ارشاد ہے: ''فَلَا رَفَثَ وَلَا فُسُوْقَ وَلَا جِدَالَ فِی الْحَجِّ''۔

**جوابِ ثانی:** حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں کہ یہ آیت منسوخ ہے اس آیت سے: ''لَمْ یَذْھَبُوْا حَتّٰی یَسْتَاْذِنُوْہُ''۔

**جوابِ ثالث:** ''یَسْتَاْذِنُکَ الَّذِیْنَ'' الخ' سے مراد ہے بلا عذر جہاد پر نہ جانے کی اجازت طلب کرنا اور مابعد والی آیت سے یہی مراد ہے اور ''لَمْ یَذْھَبُوْا حَتّٰی یَسْتَاْذِنُوْہُ'' میں کسی عذر کی وجہ سے کسی امرِ جامع پر نہ جاسکنے کی اجازت مانگنے کے جواز کا ذکر ہے۔ لہٰذا دونوں آیتوں پر عمل ممکن ہونے کی وجہ سے یہاں نسخ کی کوئی صورت نہیں ہے۔ اس لئے کہ ہر حکم کا محل مختلف ہے اور وہ ہے عذر کا پایا جانا اور عذر کا نہ پایا جانا۔

**سوال:** ارشادِ خداوندی ہے: ''وَقِیْلَ اقْعُدُوْا مَعَ الْقٰعِدِیْنَ'' (اور یوں کہہ دیا گیا کہ بیٹھ رہو ساتھ بیٹھ رہنے والوں کے) اس آیت سے تو معلوم ہوتا ہے کہ ان کو جہاد پر نہ جانے کا حکم دیا گیا ہے جبکہ اللہ تعالیٰ نے ان کے جہاد پر نہ جانے اور نہ جانے کی اجازت مانگنے پر مذمت بیان فرمائی ہے؟

**جوابِ اوّل:** آیتِ ہذا سے یہ نہیں معلوم ہوتا کہ اللہ نے ان کو اس کا حکم دیا ہے کہ وہ جہاد پر نہ جائیں بلکہ بعض علماء کے قول کے مطابق اس کا آمر دراصل شیطان ہے جو وساوس اور تزیین کے ذریعہ ان کو جہاد پر نہ جانے کا امر کرتا ہے۔

**جوابِ ثانی:** اس آیت کا مطلب یہ ہے کہ وہ ایک دوسرے کو اس کا حکم دیتے ہیں۔

**جوابِ ثالث:** یہ بات درحقیقت نبیِ کریم ﷺ نے ان سے غصہ کی حالت میں فرمائی تھی۔

**جوابِ رابع:** یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے امرِ توبیخی وتہدیدی ہے۔ جیسے یہ ارشاد ہے: ''اِعْمَلُوْا مَا شِئْتُمْ'' اس کی تائید اگلا جملہ ''مَعَ الْقٰعِدِیْنَ'' کر رہا ہے یعنی ان عورتوں، بچوں اور اپاہجوں کے

ساتھ بیٹھ رہو جن کا کام ہی گھروں میں بیٹھے رہنا ہے۔

**سوال:** جب اللہ تعالیٰ کے علم میں یہ بات پہلے سے تھی کہ یہ منافق لوگ اگر مسلمانوں کے ہمراہ جہاد پر نکلیں گے تو فتنہ وفساد ہی برپا کریں گے تو پھر اللہ جل جلالہ نے ان کو مسلمانوں کے ساتھ جہاد کے لئے نکلنے کا حکم کیسے دیا؟۔

**جواب:** اللہ تعالیٰ نے ان کو بھی خروجِ جہاد کا اس لئے حکم دیا تاکہ ان کا نفاق آشکارا ہو اور ان پر حجت لازم وقائم کردی جائے۔

**سوال:** اللہ تعالیٰ کے اس فرمانِ عالی: "قُلْ اَنْفِقُوْا طَوْعًا اَوْ كَرْهًا لَّنْ يُّتَقَبَّلَ مِنْكُمْ اِنَّكُمْ كُنْتُمْ قَوْمًا فٰسِقِيْنَ" (آپ فرمادیجئے کہ تم خواہ خوشی سے خرچ کرو یا ناخوشی سے تم سے کسی طرح مقبول نہیں بلاشبہ تم فاسق قوم ہو) سے پتہ چلتا ہے کہ فسق وفجور طاعات کی قبولیت سے مانع ہے؟

**جواب:** یہاں فسق سے مراد مطلق فسق نہیں ہے بلکہ کفر ونفاق کا فسق ہے۔ ظاہر ہے یہ فسق طاعات کی قبولیت سے مانع ہے اس کی تائید اس ارشادِ الٰہی سے ہوتی ہے: "وَمَا مَنَعَهُمْ اَنْ تُقْبَلَ مِنْهُمْ نَفَقٰتُهُمْ" الایۃ۔

**سوال:** اس کی کیا وجہ ہے کہ آیتِ صدقہ میں آخری چار مصارف میں بجائے کلمۂ لام کے "فی" کا کلیہ لائے ہیں؟۔

**جواب:** یہ بتانے کے لئے کہ یہ آخری چار مصارف سابق الذکر مصارف کی بہ نسبت استحقاقِ صدقہ میں زیادہ قوی ہیں اس لئے کہ "فی" ظرفیت کے لئے آتا ہے چنانچہ اس سے تنبیہ فرمائی کہ یہ لوگ اس بات کے زیادہ حق دار ہیں کہ صدقات ان میں رکھے جائیں کیونکہ یہ لوگ ایسے ہیں کہ ان کی عبادت مذکورہ لوگوں کے مقابلہ میں زیادہ مشقت آمیز ہے مسافر کو دیکھ لیا جائے کہ وہ اپنے اہل وعیال سے بھی دور ہے اور اس کے علاوہ فقر کا بھی شکار ہے اسی طرح اگر کوئی غلام کسی کی ملکیت میں ہے اس کو آقا کی ملکیت سے مال دے کر آزاد کرانا زیادہ مشقت والا کام ہے جبکہ مذکورہ لوگوں کا حال ایسا نہیں ہے جیسے مؤلفۃ القلوب۔ اب ان میں بعض تو تھے ہی غیر مسلم اور بعض مسلمان تھے مگر نیت کے کمزور لہٰذا ان آخری چار مصارف کا مذکورہ مصارف سے تعارض
٦ نہیں ہوتا۔ یا اس کی وجہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے علم میں تھا کہ مؤلفۃ القلوب کو صدقات دینے کا وجوب عنقریب منسوخ ہو جائیگا اسی لئے اس مصرف کو قسمِ اول میں رکھا جو کہ اضعف ہے۔

**سوال:** آخر اس میں کیا حکمت ہے کہ آخری چار مصارف کو بیان کرنے کے سلسلہ میں کلمہ "فی" مکرر نہیں لائے؟

جواب: یہ بتانے کے لیئے کہ آخری دو مصراے استحقاق صدقہ میں رقاب اور غارمین پر مقدم اور راجح ہیں' کیونکہ عامل کا اعادہ قوت تاکید کی زیادتی پر دلالت کرتا ہے' جیسے آپ کہتے ہیں: مررت بزید وبعمرو"۔

سوال: اس کی کیا وجہ ہے کہ اس فرمان میں ایمان باللہ کے سلسلہ میں تو فعل ایمان کو "باء" کے ساتھ متعدی کیا اور ایمان بالمؤمنین میں "لام" کے ساتھ متعدی کیا "يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَيُؤْمِنُ لِلْمُؤْمِنِيْنَ" (ایمان لاتا ہے ساتھ اللہ کے اور یقین کرتا ہے واسطے مسلمانوں کے)

جواب: اس لئے کہ اس سے مراد تصدیق باللہ ہے جو کفر باللہ کی ضد ہے' اس لئے اس کو "باء" کے ساتھ متعدی کیا' جیسے اس کی ضد کو "باء" کے ساتھ متعدی کیا جاتا ہے' اور ایمان مؤمنین سے مراد حضور کا ان مسلمانوں کی خبروں کا انقیاد اور تسلیم ہے کیونکہ وہ مسلمان حضورؐ کے نزدیک صادق ہیں۔ اس لئے اس کو اس چیز کے ساتھ متعدی کیا گیا جس کے ساتھ تسلیم وانقیاد کو متعدی کیا جاتا ہے' اس کی تائید ان ارشادات سے ہوتی ہے: "وَمَا اَنْتَ بِمُؤْمِنٍ لَّنَا وَلَوْ كُنَّا صٰدِقِيْنَ" "فَمَا اٰمَنَ لِمُوْسٰى اِلَّا ذُرِّيَّةٌ مِّنْ قَوْمِهٖ" "اَنُؤْمِنُ لَكَ وَاتَّبَعَكَ الْاَرْذَلُوْنَ" اور اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد مبارک: "قَالَ اٰمَنْتُمْ لَهٗ قَبْلَ اَنْ اٰذَنَ لَكُمْ" مشترک الدلالات ہے' اس لئے کہ ایک دوسرے مقام پر فرمایا ہے: "قَالَ فِرْعَوْنُ اٰمَنْتُمْ بِهٖ قَبْلَ اَنْ اٰذَنَ لَكُمْ"۔ ابن قتیبہ فرماتے ہیں: اس سوال کا جواب یہ ہے کہ "باء" اور "لام" زائد ہیں' اور ایمان سے "تصدیق" مراد ہے' معنی یہ ہو جائے گا کہ وہ اللہ کی اور مومنین کی تصدیق کرتے ہیں۔

سوال: ارشادِ باری ہے: "اَلَمْ يَعْلَمُوْا اَنَّهٗ مَنْ يُّحَادِدِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ فَاَنَّ لَهٗ نَارَ جَهَنَّمَ خَالِدًا فِيْهَا" (کیا ان کو خبر نہیں کہ جو شخص اللہ کی اور اس کے رسول کی مخالفت کرے گا تو یہ بات ٹھہر چکی ہے کہ ایسے شخص کو دوزخ کی آگ اس طور پر نصیب ہوگی کہ وہ اس میں ہمیشہ رہے گا) اس سے معلوم ہوتا ہے کہ کبیرہ گناہ کا مرتکب خلود فی النار کا مستحق ہے۔ اس لئے کہ "محادة" سے مراد مخالفت وعداوت ہے؟

جواب: یہ خبر: "اَلَمْ تَعْلَمُوْا" ان منافقین کے بارے میں ہے جن کا سابق میں ذکر ہوا ہے لہٰذا اس "محادة" سے مراد کفر ونفاق ہوگا' اور یہ چیز خلود فی النار کا سبب ہے۔

سوال: اس ارشادِ الٰہی کا کیا مطلب ہے: "يَحْذَرُ الْمُنٰفِقُوْنَ اَنْ تُنَزَّلَ عَلَيْهِمْ سُوْرَةٌ" (ڈرتے ہیں منافق یہ کہ اتاری جائے اوپر ان کے کوئی سورت) حالانکہ قرآن کی سورتیں حضور نبی کریم ﷺ پر نازل ہوتی تھیں نہ کہ منافقین پر؟

جوابِ اوّل: اسکا معنی یہ ہے کہ وہ ڈرتے ہیں کہ کہیں ان کے بارے میں کوئی سورت نازل نہ ہو جائے۔ یہاں "علیٰ" "کلمہ" "فی" "کے معنی میں ہے جیسے اس ارشاد میں: "علیٰ مُلکِ سُلیمان"

جوابِ ثانی: یہاں "انزال" "قراءت کے معنی میں ہے مطلب یہ ہوگا کہ وہ ڈرتے ہیں کہ کہیں کوئی سورت ان کے خلاف نہ پڑھی جائے۔

سوال: جب اس مذکورہ آیت میں منافقین کی طرف سے نزولِ سورت پر خوف و ڈر واقع اور ظاہر ہو چکا ہے تو پھر اس کا کیا معنی ہے: "قُلِ اسْتَهْزِءُوْا ج اِنَّ اللّٰهَ مُخْرِجٌ مَّا تَحْذَرُوْنَ" (آپ فرما دیجیے کہ اچھا تم استہزاء کرتے رہو بیشک اللہ تعالیٰ اس چیز کو ظاہر کر کے رہے گا جس سے تم اندیشہ کرتے تھے)؟

جوابِ اوّل: اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ سورت نازل فرما کر تمہارے اس نفاق کا اظہار کریں گے جس کے اظہار سے تم ڈرتے ہو اور یہ (جواب) مناسب ہے کیونکہ اس کے آگے یہ ہے: "تُنَبِّئُهُمْ بِمَا فِيْ قُلُوْبِهِمْ"۔

جوابِ ثانی: یعنی تم جو نزولِ سورت سے اندیشہ کرتے ہو اس کو اللہ آشکارا کر کے چھوڑیں گے۔

سوال: اس کا کیا مفہوم ہے: "تُنَبِّئُهُمْ بِمَا فِيْ قُلُوْبِهِمْ" (کہ خبر دیوے ان کو ساتھ اس چیز کے کہ بیچ دلوں ان کے ہے) یہ تو تحصیلِ حاصل ہے کیونکہ وہ منافق تو اپنے مافی ضمیر سے پہلے ہی واقف ہیں پھر اس قول کا کیا فائدہ ہے؟۔

جواب: مطلب یہ ہے کہ وہ سورت ان کے مافی الضمیر پر ان کو اطلاع دے گی کہ ان کے سربستہ راز اور پوشیدہ نفاق شائع ذائع ہے اور وہ سورت پھر ان کے اعتقادات کو طشت از بام کر کے ان کو رسوا کرے گی وہ تو سمجھتے ہیں کہ ان کے علاوہ اور کسی کو بھی ان کے مخفی رازوں کی خبر نہیں ہے ظاہر ہے یہ تحصیلِ حاصل نہیں ہے؟۔

سوال: اس کی کیا وجہ ہے کہ منافقین کے بارے میں تو یوں فرمایا: "اَلْمُنٰفِقُوْنَ وَالْمُنٰفِقٰتُ بَعْضُهُمْ مِّنْۢ بَعْضٍ" (منافق مرد اور منافق عورتیں سب ایک طرح کے ہیں) اور مومنین کے بارے میں یہ طرز اختیار فرمایا: "وَالْمُؤْمِنُوْنَ وَالْمُؤْمِنٰتُ بَعْضُهُمْ اَوْلِيَآءُ بَعْضٍ" (اور مسلمان مرد اور مسلمان عورتیں آپس میں ایک دوسرے کے رفیق ہیں) حالانکہ کلمہ "مِنْ" مشابہت پر زیادہ دلالت کرتا ہے کیونکہ یہ جزئیت اور بعضیت کا تقاضا کرتا ہے اس لئے مومنین کے لئے یہ کلمہ (مِنْ) زیادہ قرینِ قیاس تھا اس لئے کہ مومنین اخلاق و عادات میں زیادہ مشابہت رکھتے ہیں؟

جواب: اللہ تعالیٰ کے ارشادِ عالی: "بَعْضُهُمْ مِّنْۢ بَعْضٍ" سے مراد یہ ہے کہ وہ ایک دوسرے

کے دین پر ہیں یعنی ایک دوسرے کی عادت و کردار پر ہیں یہاں لفظ دین یا خُلق مضمر ہے۔ کیونکہ "مِنْ" "علی" کے معنی میں آتا ہے جیسے: "وَنَصَرْنٰهُ مِنَ الْقَوْمِ الَّذِیْنَ كَذَّبُوْا بِاٰیٰتِنَا"۔ نیز جیسے: "لِلَّذِیْنَ یُؤْلُوْنَ مِنْ نِّسَآىٕهِمْ" یعنی جو اپنی بیویوں سے ہمبستری پر قسم کھاتے ہیں۔ نیز حضور اکرم ﷺ کے اس ارشاد میں بھی یہی معنی مراد ہے: "فمن رغب عن سنتی فلیس منی" نیز "من غشنا فلیس منا" اور اس ارشاد باری: "بَعْضُهُمْ اَوْلِیَآءُ بَعْضٍ" سے مراد یہ ہے کہ وہ دین کے معاملہ میں ایک دوسرے کے مددگار اور معاون ہیں۔ اگرچہ دونوں فریق اس عبارت کے لائق ہیں مگر منافقین کو اس عبارت کے ساتھ اس لئے خاص کیا گیا تا کہ ان کی اس قسم میں تکذیب کی جائے جو انہوں نے پہلے کھائی تھی: "وَیَحْلِفُوْنَ بِاللّٰهِ اِنَّهُمْ لَمِنْكُمْ" نیز تا کہ اس ارشادِ خداوندی: "وَمَا هُمْ مِّنْكُمْ" کی تقریر و تاکید ہو جائے۔

سوال: اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد میں کیا نکتہ ہے: "فَاسْتَمْتَعُوْا بِخَلَاقِهِمْ" (تو انہوں نے اپنے حصہ سے خوب فائدہ حاصل کیا) جب کہ اللہ جل جلالہ کا یہ ارشاد: "فَاسْتَمْتَعْتُمْ بِخَلَاقِكُمْ كَمَا اسْتَمْتَعَ الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ بِخَلَاقِهِمْ" (پس فائدہ اٹھایا تم نے بھی اپنے حصہ کے ساتھ جیسا کہ فائدہ اٹھایا ان لوگوں نے جو تم سے پہلے پہلے تھے اپنے حصہ کے ساتھ) اسمِ ضمیر کی جگہ اسمِ ظاہر کو رکھتے ہوئے ماقبل جملہ کو مستغنی کر دیتا ہے جیسے یہ ارشاد بلا تکرار کے ہے: "وَخُضْتُمْ كَالَّذِیْ خَاضُوْا" (اور بحث کی تم نے جیسے بحث کی تھی انہوں نے)؟

جواب: اس کا فائدہ سابقہ لوگوں کی برائی کے ساتھ تشبیہ کی تقدیم و تصدیر ہے جو آیت میں مشبہ بہ ہیں یعنی جیسے پہلے لوگوں کو دنیا کا مال و متاع دیا گیا اور وہ اس سے محظوظ ہوئے اور اخروی صلاح و فلاح کی طلب کو چھوڑ کر ناپائیدار دنیوی شہوات میں پڑ گئے اسی طرح یہ لوگ بھی ہیں۔ گویا ان منافقین کی حالت کی شناعت و قباحت بیان کرنا مقصود ہے تا کہ بعد میں ان لوگوں کی سابقہ لوگوں کے ساتھ مذمت میں تشبیہ ابلغ درجہ کی ہو سکے۔ جیسے آپ کسی ظالم کو اس کے ظلم کی قباحت بتانے کے لئے کہتے ہیں۔ تم فرعون کے مثل ہو۔ وہ لوگوں کو ناحق قتل کرتا تھا اور ظلم و فسق کرتا تھا اور تم بھی اس کے فعل کے مثل کرتے ہو۔

اور باقی رہی بات اس ارشاد کی: "وَخُضْتُمْ كَالَّذِیْ خَاضُوْا" تو چونکہ یہ ماقبل پر معطوف ہے یعنی اس تشبیہ پر جو صدر کلام میں ہے اس لئے اس سابقہ امر کے اعادہ کی ضرورت نہیں ہے۔

سوال: اس فرمانِ الٰہی سے کیا مراد ہے: "اُولٰٓىٕكَ حَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ فِی الدُّنْیَا وَالْاٰخِرَةِ" (اور ان لوگوں کے اعمال دنیا و آخرت میں ضائع ہو گئے) حبطِ عمل سے مراد اگر ثواب کا بطلان ہے

تو یہ صرف آخرت میں ہوگا اور اگر حبطِ عمل سے مراد منفعت کا بطلان ہے تو منافقین کے اعمال دنیا میں تو باطل المنفعت نہیں ہیں' کیونکہ وہ تو اپنی جان و مال کے محفوظ ہونے اور مسلمانوں والے احکام ان پر لاگو ہونے کی وجہ سے دنیا سے منتفع ہو رہے ہیں؟۔

جواب: حبوط فی الدنیا سے مراد ان کے دنیوی اعمال ہیں' جیسے ان کا نفاق اور مکر و فریب' جس کے ذریعہ وہ اللہ تعالیٰ کی آیات و بینات اور اس کے نور کو بجھانا چاہتے ہیں' جبکہ اللہ تعالیٰ بہر حال اپنے نور کا اتمام کریں گے خواہ مشرکین کو کتنا ہی ناگوار ہو' چنانچہ ان کی یہ آرزو اور تمنا پوری نہ ہوئی کہ وہ دینِ خداوندی کو مغلوب اور نبوتِ محمدی ﷺ کو مستور کر دیں گے۔

اور حبوط فی الآخرۃ سے مراد ان کے دینی اعمال ہیں' یعنی ان کی عبادات و طاعات' اس لئے کہ انہوں نے تمام عبادتیں نفاق اور ریاکاری کے طور پر کی ہیں' اس لئے آخرت میں ان کا ثواب رائگاں ہوگا۔ اور اگر ان کے اعمال سے مراد محض دینی اعمال ہوں تو ان کے حبوط فی الدنیا سے مراد ان کا قبول نہ ہونا ہے۔ اس لئے کہ اللہ تعالیٰ دنیا میں عبادت کو قبول کرتے ہیں اور آخرت میں پھر اس کا ثواب عطا فرماتے ہیں۔ لہٰذا حبوط فی الدنیا سے مراد ہے ان اعمال کا بارگاہِ خداوندی میں قبول نہ ہونا اور ان پر اچھے ناموں کا اطلاق نہ ہونا۔ جیسے عبادت اور قربت و حسنہ وغیرہ۔

اور یہ بات اس ارشاد کے مقابل میں ہے: ''وَاٰتَيْنٰهُ اَجْرَهٗ فِي الدُّنْيَا وَاِنَّهٗ فِي الْاٰخِرَةِ لَمِنَ الصّٰلِحِيْنَ'' چنانچہ معلوم ہوا کہ طاعات پر دنیا میں بھی ایک ایسا اجرِ معجّل ہے جو آخرت کے اجرِ مؤجل کے علاوہ ہے۔ اور وہ ہے اعمال کی قبولیت' حسنِ ثناء' ذکرِ خیر اور مخلوق کے دلوں میں محبت کا القاء۔ جیسے اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: ''اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ سَيَجْعَلُ لَهُمُ الرَّحْمٰنُ وُدًّا'' بعض علماء کہتے ہیں کہ اس کا معنی ہے کہ اللہ تعالیٰ ان سے محبت کرے گا اور بلا سبب اپنے بندوں کے دلوں میں ان کی محبت پیدا کر دے گا' اور نافرمانوں اور فاسقوں کا حال برعکس ہے کہ اللہ تعالیٰ ان سے بغض رکھتا ہے اور بندوں کے دلوں میں بھی بلا سبب بغض ڈال دیتا ہے۔

سوال: ارشادِ باری ہے: ''وَمَا لَهُمْ فِي الْاَرْضِ مِنْ وَّلِيٍّ وَّلَا نَصِيْرٍ'' (اور ان کا زمین میں نہ کوئی یار ہے اور نہ مددگار) زمین کی تخصیص کی وجہ کیا ہے' حالانکہ منافقین کو عذابِ خداوندی سے بچانے والا کوئی یار و مددگار نہ زمین میں ہے اور نہ آسمان میں اور نہ دنیا میں ہے اور نہ آخرت میں؟

جوابِ اوّل: چونکہ منافقین' خدا تعالیٰ کی وحدانیت کا اعتقاد نہیں رکھتے تھے اور نہ ہی آخرت کو مانتے تھے اور یار و مددگار کے بارے میں ان کا اعتقاد صرف دنیا میں مقصور تھا اس لئے دنیا کو زمین کے ساتھ تعبیر فرمایا ہے' اور صرف زمین کا ذکر کیا ہے۔

جوابِ ثانی: یہاں ''ارض'' سے مرادارضِ دنیاوآخرت ہے۔گویایوں فرمایا:''وَما لهم فی الدنیا والآخرة من وَلي ولا نَصير''۔

سوال: اس کی کیاوجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس آیتِ مبارکہ میں:''اِنْ تَسْتَغْفِرْ لَهُمْ سَبْعِيْنَ مَرَّةً فَلَنْ يَّغْفِرَ اللّٰهُ لَهُمْ'' (اگرآپ ان کے لئے ستر بار بھی استغفار کریں گے تب بھی اللہ تعالیٰ ان کو نہ بخشے گا) ستر کا عدد خاص طور پر ذکر کیا گیا ہے'حالانکہ اللہ تعالیٰ منافقین کی مغفرت کبھی نہیں کریں گے'خواہ رسول اللہ ﷺ ہزار بار بھی ان کے لئے مغفرت طلب کریں جس کی دلیل یہ ارشاد ہے: ''سَوَآءٌ عَلَيْهِمْ اَسْتَغْفَرْتَ لَهُمْ اَمْ لَمْ تَسْتَغْفِرْلَهُمْ لَنْ يَّغْفِرَ اللّٰهُ لَهُمْ'' نیز اس لئے کہ وہ مشرک ہیں' اللہ تعالیٰ شرک کو کبھی معاف نہیں فرمائیں گے؟۔

جواب: اہلِ عرب کی عادت ہے کہ وہ اکائیوں میں سات کے عدد سے مَثَل بیان کرتے ہیں اور دہائیوں میں ستر کے عدد سے مَثَل بیان کرتے ہیں۔اور سینکڑوں کے سلسلہ میں سات سو کے عدد سے مَثَل بیان کرتے ہیں' اس سے ان کا مقصد اس امر کی کثرت کو بیان کرنا ہوتا ہے' یہ مقصد نہیں ہوتا کہ صرف یہی عدد مقصود ہے' یعنی اس کے ذکر سے حصر مقصود نہیں ہوتا۔تو گویا یوں فرمایا ہے:

اگرآپ ان منافقین کے لئے سب سے بڑے عدد سے بھی مغفرت طلب کریں گے تب بھی اللہ تعالیٰ ہرگز ان کی مغفرت نہیں فرمائیں گے۔اس ارشاد کے بعد خود اس عدمِ مغفرت کا سبب بیان فرمادیا:''ذٰلِکَ بِاَنَّهُمْ كَفَرُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِه'' یعنی یہ اس وجہ سے ہے کہ انہوں نے اللہ اور اس کے رسولؐ کے ساتھ کفر کیا۔

سوال: اگر اس سے مراد وہی ہے جو ابھی ذکر ہوا تو نبی کریم ﷺ پر یہ مراد مخفی نہ رہتی حالانکہ آپؐ افصح العرب تھے اور کلام کے اسالیب اور تمثیلات سے سب سے زیادہ واقف تھے۔کیونکہ جب یہ آیتِ کریمہ نازل ہوئی تو آپؐ نے فرمایا: اللہ تعالیٰ نے مجھے رخصت دی ہے چنانچہ میں ستر مرتبہ سے زیادہ مغفرت مانگوں گا۔دوسری روایت میں یہ الفاظ ہیں:''میں نے ان کے لئے ستر بار سے بھی زیادہ مغفرت طلب کروں گا ممکن ہے اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت کردیں؟۔

جواب: آپؐ پر یہ مراد مخفی نہ تھی' حضورؐ نے جو کچھ فرمایا اس سے مراد آپؐ کا ان لوگوں پر رحمت ورأفت کا غلبہ ہے جن کی طرف آپؐ مبعوث فرمائے گئے۔جیسے خود اللہ تعالیٰ نے آپؐ کے اوصاف میں فرمایا ہے:''لَقَدْ جَآءَكُمْ رَسُوْلٌ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ'' الاية۔آپؐ اپنی امت پر بڑے مہربان اور شفیق تھے' اس میں امت کو بھی ترغیب ہے کہ وہ بھی ایک دوسرے کے ساتھ رحمت وشفقت کا برتاؤ کیا کرے۔انبیاءِ کرام علیہم السلام کا یہی شیوہ رہا ہے۔کیا حضرت ابراہیم علیہ

السلام کا یہ قول یاد نہیں ہے؟: ''وَمَنْ عَصَانِیْ فَإِنَّکَ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ''

سوال: اس کا کیا معنی ہے: مَا عَلَى الْمُحْسِنِيْنَ مِنْ سَبِيْلٍ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ'' ان نیکو کاروں پر کوئی الزام نہیں ہے اور اللہ تعالیٰ بڑی مغفرت والے بڑی رحمت والے ہیں۔ مغفرت اور رحمت تو مسیئین (گنہگاروں) کے لئے ہوتی ہے نہ کہ محسنین (نیک کاروں) کے لئے؟۔

جواب اوّل: اس کا معنی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ مسیئین کے لئے غفور ورحیم ہے جب وہ توبہ کریں۔ اس کا تعلق محذوف کے ساتھ ہے، محسنین کے ساتھ نہیں ہے۔ اس لئے کہ محسنین نے تو اپنے احسان (نیک کاری) کی وجہ سے عقاب و مذمت کی راہ کو مسدود کردیا ہے لہٰذا ان پر کوئی الزام نہیں۔

جوابِ ثانی: کوئی بھی محسن (نیک کار) ہو وہ اپنے احسان میں کتنا ہی منتہی ہو جائے اللہ تعالیٰ کی بے ادبی یا کسی مخلوق کی برائی سے خالی نہیں ہوسکتا۔ البتہ اگر وہ کبیرہ گناہوں سے اجتناب کرکے محسن بنے تو اللہ تعالیٰ اس کے صغیرہ گناہ بھی معاف فرمادیتے ہیں اور اس پر رحمت فرماتے ہیں، جیسے فرمایا: ''اِنْ تَجْتَنِبُوْا کَبَائِرَ مَا تُنْهَوْنَ عَنْهُ'' الآیۃ۔

سوال: اس آیت کا کیا معنی ہے: ''فَسَيَرَى اللّٰهُ عَمَلَكُمْ وَرَسُوْلُهٗ'' (پس البتہ اللہ دیکھے گا تمہارے عمل اور اس کا رسول) اللہ کی رویت کا معنی اللہ کا جاننا ہے۔ حالانکہ اللہ تعالیٰ تو سب کے حال و مآل کو پہلے سے جاننے والے ہیں؟۔

جواب: اللہ تعالیٰ کے حق میں اس کا معنی یہ ہے کہ جیسے وہ اس کو غیبی طور پر جانتا ہے اسی طرح واقع اور موجود ہونے کے اعتبار سے بھی جان لے گا، اس لئے کہ اللہ تعالیٰ ہر چیز کو جانتے ہیں کہ وہ کس حالت میں ہے، چنانچہ منتظر کو منتظر امر کے طور پر اور واقع کو واقع کے طور پر جاننے والا ہے۔ اور رسول علیہ الصلوٰۃ والسلام کے حق میں اس کا معنی اپنے ظاہری مفہوم پر ہے۔

سوال: ارشادِ خداوندی ہے: ''وَاَجْدَرُ اَلَّا يَعْلَمُوْا حُدُوْدَ مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ عَلٰى رَسُوْلِهٖ'' (اور بہت لائق ہیں کہ نہیں جانتے حدّیں اس چیز کی کہ اتارا ہے اللہ نے اوپر اپنے رسولؐ کے) اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے اہلِ عرب کو جہالت کے ساتھ موصوف کیا ہے۔ تو پھر اہلِ عرب کے الفاظ واشعار سے کتاب اللہ اور سنتِ رسول اللہ ﷺ پر استدلال کیسے درست ہے؟

جواب: اللہ تعالیٰ نے ان کو قرآنی احکام کے بارے میں جہالت کے ساتھ موصوف کیا ہے۔ نہ کہ قرآنی الفاظ میں۔ ہم احکام کے سلسلہ میں لغتِ عرب سے استدلال نہیں کرتے ہیں، بلکہ الفاظ کے معنی معلوم کرنے کے لیے ان کی لغت سے استدلال کرتے ہیں، کیونکہ قرآن اور سنت اہل

عرب کی لغت پر نازل ہوئے ہیں۔

سوال: اللہ تعالیٰ نے اس جگہ تو منافقین کے بارے میں فرمایا: "لَا تَعْلَمُهُمْ نَحْنُ نَعْلَمُهُمْ" (آپ ان کو نہیں جانتے ہم ہی ان کو جانتے ہیں) اور دوسری جگہ یوں فرمایا: "وَلَتَعْرِفَنَّهُمْ فِي لَحْنِ الْقَوْلِ" (اور آپ ان کو طرزِ کلام سے ضرور پہچان لیں گے) یہ دونوں باتیں کیسے جمع ہوں گی؟۔

جواب: یہ آیت اس آیت سے پہلے نازل ہوئی' لہٰذا کوئی تعارض نہیں ہے' اس لئے کہ ایک زمانہ میں علم کی نفی ہے اور دوسرے زمانہ میں علم کا اثبات ہے۔

سوال: ارشادِ الٰہی ہے: "خَلَطُوْا عَمَلاً صَالِحًا وَّاٰخَرَ سَيِّئًا" (ملا دیا ہے عمل اچھا اور اور برا) دونوں کو مخلوط قرار دیا ہے تو پھر مخلوط بہ (جس کے ساتھ ملایا) کہاں ہے؟

جواب: ہر ایک مخلوط بھی ہے اور مخلوط بہ بھی' اس لئے کہ اس کا معنی ہے' انہوں نے ہر ایک کو دوسرے کے ساتھ ملا دیا۔ جیسے آپ کہتے ہیں' خلطت الماء واللبن' یعنی میں نے پانی اور دودھ کو ملا دیا۔ مراد یہ ہوتی ہے کہ ہر ایک کو دوسرے کے ساتھ ملا دیا' اس طرز میں وہ مبالغہ ہے جو اس قول میں نہیں ہے خلطت الماء باللبن یعنی میں نے پانی کو دودھ کے ساتھ ملا دیا۔ اس لئے "باء" کے ساتھ آپ نے پانی کو مخلوط اور دودھ کو مخلوط بہ بنا دیا۔ اور "واؤ" کے ساتھ آپ نے پانی اور دودھ دونوں کو مخلوط بھی اور مخلوط بہ بھی بنا دیا۔ گویا کہ آپ نے یوں کہا: میں نے پانی کو دودھ کے ساتھ اور دودھ کو پانی کے ساتھ ملا دیا' اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ واؤ بمعنی باء ہو۔ جیسے اہلِ عرب کہتے ہیں: بعت شاة ودرهما' مراد ہوتا ہے کہ بکری کو درہم کے عوض بیچا۔

سوال: اس کی کیا وجہ ہے کہ "وَالنَّاهُوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ" (اور بری باتوں سے باز رکھنے والے ہیں) کو "واؤ" کے ساتھ اور ماقبل کی صفات کو بغیر واؤ کے ذکر کیا ہے؟

جوابِ اوّل: اس لئے کہ یہ آٹھویں صفت ہے' اہلِ عرب سات کے بعد "واؤ" داخل کرتے ہیں تاکہ معلوم ہو کہ عدد تام ہے۔ کیونکہ ان کے نزدیک سات کا عدد عقدِ تام ہے جیسے ہمارے ہاں دس کا عدد ہے۔ اس لئے وہ حرفِ عطف لاتے ہیں جو معطوف اور معطوف علیہ کے درمیان مغایرت پر دلالت کرتا ہے۔ اس کی نظیر یہ ارشادِ خداوندی ہے: "وَثَامِنُهُمْ كَلْبُهُمْ" جبکہ اس سے قبل دو مرتبہ عدد بغیر واؤ کے ذکر ہوا' اسی طرح جنت کی صفت میں یہ ارشاد ہے: "وَفُتِحَتْ اَبْوَابُهَا" واؤ کے ساتھ لائے کیونکہ جنت کے ابواب آٹھ ہیں' اور جہنم کی صفت میں فرمایا: "فُتِحَتْ اَبْوَابُهَا" یعنی بغیر واؤ کے۔ کیونکہ اس کے ابواب سات ہیں۔ لیکن یہ ارشاد: "ثَيِّبٰتٍ وَّاَبْكَارًا" اس قبیل سے نہیں ہے۔ اس لئے کہ اگر اس میں واؤ حذف کر دیں تو معنی بدل جاتے

ہیں۔ کیونکہ دونوں صفتیں (ثیبہ اور باکرہ) آپس میں متعارض ہیں۔

جوابِ ثانی: اس پر واؤ اس لئے لائے تاکہ معلوم ہو کہ آمر بالمعروف امر بالمعروف کی حالت میں ناہی عن المنکر بھی ہوتا ہے۔ تو یہ دونوں صفات ایسی ہیں کہ ان میں تلازم پایا جاتا ہے جبکہ باقی مذکورہ صفات کا حال ایسا نہیں ہے یعنی ان میں تلازم نہیں ہے۔ یہ قاعدہ اس فرمانِ الٰہی کی وجہ سے مخدوش یا منقوض نہیں ہوتا: ''اَلرَّاکِعُوْنَ السَّاجِدُوْنَ'' کیونکہ یہ دونوں صفات متلازم نہیں ہیں۔ اس لئے کہ سجود تو رکوع کو لازم ہے لیکن رکوع سجود کو لازم نہیں ہے۔ دلیل یہ ہے کہ اس کے سوا بھی سجدۂ تلاوت اور سجدۂ شکر ہے۔ زمخشریؒ نے اس واؤ کے بارے میں کوئی بات نہیں بیان فرمائی ہے۔

سوال: اس کا معنی کیا ہے: ''لِیَجْزِیَھُمُ اللّٰہُ اَحْسَنَ مَا کَانُوْا یَعْمَلُوْنَ'' (تاکہ اللہ تعالیٰ ان کو ان کے کاموں کا اچھے سے اچھا بدلہ دے) یعنی ان کے سب سے اچھے عمل کا بدلہ دے حالانکہ ارشادِ خداوندی ہے: ''فَمَنْ یَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّۃٍ خَیْرًا یَّرَہٗ'' یعنی ادنیٰ سے ادنیٰ نیکی کا بھی بدلہ ملے گا؟۔

جوابِ اوّل: اس کا مطلب یہ ہے کہ اس اچھائی کا بدلہ دے گا جو وہ کیا کرتے تھے اور وہ تمام نیکیوں میں کوئی بھی نیکی ہو سورۃ الروم میں: ''وَھُوَ اَھْوَنُ عَلَیْہِ'' کے تحت اس کی وضاحت آ ئیگی ان شاء اللہ تعالیٰ۔

جوابِ ثانی: اس کا معنی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کے اعمال کا خوب سے خوب بدلہ دے گا۔

سوال: اللہ تعالیٰ کے اس ارشادِ مبارک: ''فَاَمَّا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا فَزَادَتْھُمْ اِیْمَانًا'' (پس جو لوگ کہ ایمان لائے پس زیادہ کیا ان کو ایمان میں) اس سے معلوم ہوا کہ ایمان زیادت کو قبول کرتا ہے؟

جواب: امام مجاہدؒ فرماتے ہیں: اس کا معنی ہے کہ وہ سورت ان کے علم میں اضافہ کرتی ہے اس لئے کہ علم ایمان کے ثمرات میں سے ہے چنانچہ ایمان کو مجازاً ذکر کیا۔

## سورۃ یونس

سوال: اس کا کیا مطلب ہے: ''یُفَصِّلُ الْاٰیٰتِ لِقَوْمٍ یَّعْلَمُوْنَ'' (مفصّل بیان کرتا ہے نشانیوں کو واسطے اس قوم کے جو جانتی ہے) حالانکہ اللہ تعالیٰ نے اہلِ علم اور اہلِ جہالت سب کے لئے آیات کو مفصّل بیان کیا ہے؟

جواب: چونکہ آیات کی تفصیل اور پھر اس تفصیل سے اکثر انتفاع علماء کے ساتھ مخصوص ہے اس

لئے تفصیل کی اضافت علم والوں کی طرف کر دی اور انہی کو خاص طور سے ذکر کیا۔

سوال: اس کا کیا معنی ہے: "وَاٰخِرُ دَعْوٰهُمْ اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ" (اور ان کی اخیر بات یہ ہوگی الحمد للہ رب العالمین) حالانکہ جنتیوں کے اقوال واحوال کی کوئی اخیر نہیں ہے کیونکہ جنت' دار الخلود ہے؟۔

جواب: اس کا معنی یہ ہے کہ ہر مجلسِ ذکرو دعا یا ہر محفلِ تسبیح میں ان کی آخری بات یہ ہوگی۔ کیونکہ اہلِ جنت تسبیح پڑھا کریں گے اور ذکر کیا کریں گے تا کہ اس ذکر و تسبیح سے انہیں لذت و سُرور حاصل ہو۔

سوال: اللہ تعالیٰ نے کفار کا مشیتِ خداوندی سے استدلال کرنا ناپسند کیا ہے' فرمایا: "وَلَوْ شَاءَ اللّٰهُ مَا اَشْرَكْنَا وَلَا آبَاؤُنَا" اور اسی لئے کسی گنہگار اور نافرمان کے لئے بھی یہ جائز نہیں ہے کہ وہ یوں کہے کہ اگر اللہ کو منظور ہوتا تو میں یہ معصیت نہ کرتا' لہٰذا مجھ پر حد قائم نہ کرو' تو پھر نبی اکرم ﷺ نے یہ کیسے فرمایا: "لَوْ شَاءَ اللّٰهُ مَا تَلَوْتُهٗ عَلَيْكُمْ" (اگر خدا تعالیٰ کو منظور ہوتا تو میں تم کو یہ پڑھ کر نہ سناتا)؟۔

جواب: حضور نبی کریم ﷺ نے یہ جملہ بامرِ خداوندی فرمایا' اس لئے کہ اللہ تعالیٰ نے حضورؐ کو فرمایا: "قُلْ لَّوْ شَاءَ اللّٰهُ مَا تَلَوْتُهٗ عَلَيْكُمْ" (آپ کہہ دیجئے کہ اگر خدا تعالیٰ کو منظور ہوتا تو میں تم کو یہ (کلام) پڑھ کر نہ سناتا)۔ جب اللہ تعالیٰ بندے کو مشیتِ الٰہیہ سے استدلال کرنے کا حکم دے تو پھر بندے کے لئے جائز ہو جاتا ہے کہ وہ اللہ کی مشیت سے استدلال کرے۔ بصورتِ دیگر محض مشیتِ خداوندی سے استدلال کرنا جائز نہیں ہے' مذکورہ سوال کا تعلق اسی سے ہے کہ حکمِ الٰہی کے بغیر صرف مشیتِ الٰہیہ سے استدلال کرنا ممنوع و ناپسند ہے۔

سوال: اس ارشاد کا کیا مطلب ہے: "فَلَمَّآ اَنْجٰهُمْ اِذَا هُمْ يَبْغُوْنَ فِي الْاَرْضِ بِغَيْرِ الْحَقِّ" (پس جب نجات دی ان کو ناگہاں وہ سرکشی کرتے ہیں زمین میں ناحق) حالانکہ "بغی" کہتے ہی اس چیز کو ہیں جو ناحق ہو' کیونکہ "بغی" کا معنی ہے فساد و تعدّی۔ جیسے کہتے ہیں: "بغی الجرح یعنی زخم خراب ہوگیا' کذا قالہ الاصمعی' لہٰذا اس کو "بغیر الحق" کے ساتھ مقید کرنے میں کیا نکتہ ہے؟

جواب: کبھی فساد' بالحق بھی ہوتا ہے' جیسے مسلمانوں کا کفار کی سرزمین پر غلبہ پانا اور ان کے گھروں کو منہدم کرنا' ان کے کھیتوں کا نذرِ آتش کرنا اور ان کے درختوں کو کاٹنا۔ جیسے خود رسولِ کریم ﷺ نے بنو قریظہ کے ساتھ کیا تھا۔

سوال: اللہ تعالیٰ نے اس آیتِ مبارکہ میں حیاتِ دنیوی کو آسمان کے پانی کے ساتھ تشبیہ دیتے

ہوئے فرمایا: ''اِنَّمَا مَثَلُ الْحَیٰوۃِ الدُّنْیَا كَمَآءٍ اَنْزَلْنٰهُ مِنَ السَّمَآءِ'' (پس دنیوی زندگی کی حالت تو ایسی ہے جیسے ہم نے آسمان سے پانی برسایا) دونوں میں وجہ تشبیہ کیا ہے؟

جوابِ اوّل: وجہ تشبیہ یہ ہے کہ جیسے آسمان کے پانی یعنی بارش کے کسب میں بندے کا کوئی دخل عمل نہیں ہے اور نہ ہی اس کی کمی وزیادتی میں بندے کی کوئی تدبیر کارگر ہے اسی طرح حیات کی کمی وزیادتی میں بندے کا کوئی اختیار نہیں ہے۔

جوابِ ثانی: جیسے آسمان کے پانی (بارش) سے نفع اٹھانے میں تمام مخلوق برابر ہے خواہ وہ مالدار ہو یا نادار' بلند مرتبہ ہو یا کم مرتبہ' حیوان ہو یا کوئی اور' جیسے حجر' شجر' ثمر وغیرہ' اسی طرح حیاتِ دنیوی ہے۔ چنانچہ حیات کو بارش کے ساتھ تشبیہ دینے میں بہت مناسبت ومطابقت ہے۔

سوال: یہاں فرمایا: ''وَيَوْمَ نَحْشُرُهُمْ جَمِيْعًا ثُمَّ نَقُوْلُ لِلَّذِيْنَ اَشْرَكُوْا مَكَانَكُمْ اَنْتُمْ وَشُرَكَآؤُكُمْ'' (اور جس دن اکٹھا کرینگے ہم ان کو سب کو پھر کہیں گے ہم واسطے ان لوگوں کے کہ شریک لائے تھے کھڑے رہو اپنی جگہ پر تم اور تمہارے شریک) اور دوسری جگہ فرمایا: ''وَلَا يُكَلِّمُهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ'' (اور قیامت کے دن ان سے کلام نہیں کرینگے)۔ دونوں آیتوں میں تطبیق کس طرح ہوگی؟

جوابِ اوّل: قیامت کے دن مقامات مختلف ہوں گے' چنانچہ ایک مقام میں تو اللہ تعالیٰ ان سے کلام نہیں کریں گے' اور ایک مقام میں کلام کریں گے۔ اس کی نظیر یہ ہے: ''فَيَوْمَئِذٍ لَّا يُسْئَلُ عَنْ ذَنْۢبِهٖٓ اِنْسٌ وَّلَا جَآنٌّ'' نیز یہ ارشاد بھی اس کی نظیر ہے: ''فَوَرَبِّكَ لَنَسْئَلَنَّهُمْ اَجْمَعِيْنَ عَمَّا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ''۔

جوابِ ثانی: اس سے مراد یہ ہے کہ ان سے اکرام والا کلام نہ فرمائیں گے بلکہ توبیخ والا کلام فرمائیں گے۔

سوال: ارشادِ الٰہی ہے: ''قُلْ مَنْ يَّرْزُقُكُمْ مِّنَ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ'' آخر آیت تک۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ لوگ اس بات کا اعتراف کرتے تھے کہ اللہ تعالیٰ ہی خالق' رازق اور تمام مخلوقات کے امور کا مدبر ہے' ان تمام باتوں کے باوجود پھر کیسے وہ بت پرستی کرتے تھے؟

جواب: اصل میں ان کا عقیدہ یہ تھا کہ اس بت پرستی سے اللہ تعالیٰ کی عبادت کا قرب حاصل ہوتا ہے' ایک گروہ کہتا تھا کہ ہم اپنی حقارت اور اللہ تعالیٰ کی عظمتِ شان کی وجہ سے اللہ تعالیٰ کی بلاواسطہ عبادت کرنے کے لائق نہیں ہیں' اس لئے وہ بتوں کو واسطہ بناتے تھے' جیسے ارشادِ خداوندی ہے: ''مَا نَعْبُدُهُمْ اِلَّا لِيُقَرِّبُوْنَآ اِلَى اللّٰهِ زُلْفٰى'' جب کہ ایک گروہ یہ کہتا تھا کہ ہم اصل

یں فرشتوں کی صورت پر بُت بناتے ہیں اور پھر ان کو اس لئے پوجتے ہیں تا کہ فرشتے اللہ کے ہاں ہماری سفارش کریں اور ہمیں اس کا مقرب بنادیں۔ اور ایک گروہ کا خیال یہ تھا کہ یہ بُت اصل میں اللہ کی عبادت کے سلسلہ میں ہمارا قبلہ ہیں۔ جیسے کعبہ اس کی عبادت کے لئے قبلہ ہے۔ اور ایک گروہ جو کہ زیادہ تعداد میں تھا یہ خیال کرتا تھا کہ ہر بت پر ایک شیطان جو منجانب اللہ مقرر ہے لہٰذا جو بت کی کماحقہ عبادت کرتا ہے تو وہ مقرر کردہ شیطان اللہ کے حکم سے اس کی مراد کے مطابق اس کی حاجات کو پورا کرتا ہے اور جو بُت کی عبادت میں کوتاہی کرتا ہے تو وہ شیطان بحکمِ خداوندی اسے کوئی گزند پہنچا دیتا ہے معلوم ہوا کہ یہ تمام گروہ جو بتوں کو پوجنے والے تھے اپنی اس بُت پرستی کو خدا تعالیٰ کی عبادت اور اس کے تقرب کا ذریعہ خیال کرتے تھے۔ البتہ ہر گروہ کا طریق کار مختلف ہوتا تھا۔

سوال: ارشادِ خداوندی ہے: "قُلْ هَلْ مِنْ شُرَكَائِكُمْ مَنْ يَبْدَؤُا الْخَلْقَ ثُمَّ يُعِيدُهُ" (آپ کہئے کہ کیا تمہارے شرکاء میں کوئی ایسا ہے جو پہلی بار بھی پیدا کرے پھر دوبارہ بھی پیدا کرے) مشرکین تو اعادہ (دوبارہ پیدا کرنا) کے تو بالکل بھی معترف نہیں تھے نہ اللہ کی طرف سے اور نہ کسی اور کی طرف سے؟۔

جواب: چونکہ اعادہ ظہورِ حجت کی وجہ سے ظاہر الوجود ہے اور وہ ہے پہلی بار پیدا کرنے کی قدرت۔ اور اعادہ ہماری نسبت سے اہون ہے اس لئے اعادہ ان کو لازم ہوا لہٰذا یہ ایسا ہی جیسے وہ اس اعادہ کے وجود کو بحیثیتِ ظہورِ حجت تسلیم کرتے ہیں۔

سوال: اللہ تعالیٰ نے فرمایا: "فَإِلَيْنَا مَرْجِعُهُمْ ثُمَّ اللّٰهُ شَهِيدٌ عَلٰى مَا يَفْعَلُونَ" (سو ہمارے پاس تو ان کو آنا ہی ہے پھر اللہ ان کے سب افعال کی اطلاع رکھتا ہے) اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے ان کے افعال پر اپنے مطلع ہونے کو قیامت کے دن ان کے رجوع الی اللہ پر مرتب کیا ہے حالانکہ اللہ تعالیٰ دنیا و آخرت دونوں میں ان کے افعال پر مطلع ہیں؟

جواب: اس آیت میں ذکر شہادت کا ہے اور مراد اس کا مقتضٰی اور نتیجہ ہے اور وہ ہے جزاء وعقاب گویا یوں فرمایا: "ثم اللّٰہ یعاقب علی ما یفعلون "یعنی پھر اللہ ان کے افعال پر انکو عقاب دے گا۔ جیسے یہ ارشاد ہے: "وَمَا تَفْعَلُوا مِنْ خَيْرٍ يَعْلَمْهُ اللّٰهُ" قرآنِ عزیز میں اس طرح کی آیات بہت زیادہ ہیں۔

سوال: اس کی کیا وجہ ہے کہ یہاں پر "بَيَاتًا اَوْ نَهَارًا" کہا ہے "لَيْلًا اَوْ نَهَارًا" نہیں ہے۔ حالانکہ نہار کے ساتھ لیل کی زیادہ مطابقت ہے؟

جواب: اس کی وجہ یہ ہے کہ کلام عرب میں ہلاکت' بطش' وعید وتہدید کے موقعوں پر معمولاً مانوس لفظ "بیات" ہے' خواہ اس کے ساتھ "نہار" کو ملایا جائے یا نہ ملایا جائے' اس لئے اس کے ساتھ "لیلا" نہیں کہا۔

سوال: ارشاد باری ہے: "مَاذَا يَسْتَعْجِلُ مِنْهُ الْمُجْرِمُوْنَ" (کون چیز ایسی ہے کہ مجرم لوگ اس کو جلدی مانگ رہے ہیں) آیت کا اوّل حصہ مواجہت کے لئے ہے؟

جواب: مجرمین کا ذکر کیا اور مراد ترک استعجال کے مقتضی پر دلالت ہے اور وہ جرم ہے۔ اس لئے کہ مجرم کو تو اپنے جرم پر عذاب کا خوف کرنا چاہئے اور عذاب کے آنے پر گھبرانا چاہئے اگرچہ وہ عذاب مؤخر ہو' چہ جائیکہ وہ عذاب کو جلدی طلب کرے۔

سوال: ارشاد باری تعالیٰ ہے: "قُلْ بِفَضْلِ اللّٰهِ وَبِرَحْمَتِهٖ فَبِذٰلِكَ فَلْيَفْرَحُوْا" (آپ کہہ دیجئے تو بس لوگوں کو خدا کے اس انعام اور رحمت پر خوش ہونا چاہئے) جب مشار الیہ "فضل" اور "رحمت" تثنیہ ہے تو "فَبِذٰنِكَ" کہنا چاہئے؟

جواب: اس طرح کا سوال وجواب سورۃ البقرۃ میں: "عَوَانٌ بَيْنَ ذٰلِكَ" کے تحت گزر چکا ہے۔

سوال: اللہ تعالیٰ نے فرمایا: "وَمَا ظَنُّ الَّذِيْنَ يَفْتَرُوْنَ عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ يَوْمَ الْقِيَامَةِ" (اور جو لوگ اللہ پر جھوٹ افتراء باندھتے ہیں ان کا قیامت کی نسبت کیا گمان ہے) اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد تہدید وتنبیہ پر مبنی ہے کیونکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ ان کا اس بارے میں کیا گمان وخیال ہے کہ اللہ تعالیٰ قیامت کے دن ان کے افتراء پر ان کے ساتھ کیا سلوک کرے گا' جب اس میں تہدید مقصود ہے تو اس کے بعد والا ارشاد: "اِنَّ اللّٰهَ لَذُوْ فَضْلٍ عَلَى النَّاسِ" (تحقیق لوگوں پر اللہ کا بڑا ہی فضل ہے) اس کے مناسب کیسے ہوگا؟۔

جواب: یہ مناسب ہے' اس لئے کہ اس کا معنی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کا لوگوں پر واقعی یہ بڑا فضل ہے کہ ان کو عقل ووحی اور ہدایت جیسی نعمت سے نوازا اور عذاب کو مؤخر کیا اور توبہ کا دروازہ کھول دیا' ان تمام تر نعمتوں کے ہوتے ہوئے یہ لوگ اللہ پر جھوٹ وافتراء کیسے باندھتے ہیں؟۔

سوال: اس کی کیا وجہ ہے کہ: "وَمَا تَكُوْنُ فِيْ شَاْنٍ وَّمَا تَتْلُوْا مِنْهُ مِنْ قُرْاٰنٍ" (آپ کسی حال میں ہوں' آپ کہیں سے قرآن پڑھتے ہوں) میں تو صیغہ مفرد لائے (ماتکون' اور ماتتلوا) اور "وَلَا تَعْمَلُوْنَ مِنْ عَمَلٍ" (اور تم جو کام بھی کرتے ہو) میں جمع کا صیغہ لائے ہیں؟ حالانکہ ان سب میں خطاب نبی کریم ﷺ کو ہے؟

جواب: ابن الانباریؒ فرماتے ہیں: تیسرے فعل کو جمع اس لئے لائے تاکہ معلوم ہو جائے کہ امت

پہلے دوفعلوں میں نبی ﷺ کے ساتھ شامل ہے۔ بعض دوسرے علماء کہتے ہیں کہ فعلِ ثالث سے مراد بھی نبی ﷺ ہیں' آپ ؐ کی تفخیم و تعظیم کی خاطر جمع لائے۔ جیسے اس فرمانِ خداوندی میں ابن عباسؓ کے قول پر جمع لائے ہیں: ''اَفَتَطۡمَعُوۡنَ اَنۡ یُّؤۡمِنُوۡا لَکُمۡ'' نیز جیسے ''یٰۤاَیُّهَا الرُّسُلُ کُلُوۡا مِنَ الطَّیِّبٰتِ'' حالانکہ اس ''رُسُل'' سے مراد صرف نبی کریم ﷺ ہیں۔ کذا قاله ابن عباس والحسن وغيرهما واختاره ابن قتيبة والزجاج۔

سوال: اس کی کیا وجہ ہے کہ اس آیتِ مبارکہ میں: ''وَمَا یَعۡزُبُ عَنۡ رَّبِّکَ مِنۡ مِّثۡقَالِ ذَرَّۃٍ فِی الۡاَرۡضِ وَلَا فِی السَّمَآءِ'' (اور نہیں چھپتی تیرے پروردگار سے کچھ چیز ذرّہ برابر بھی زمین میں اور نہ آسمان میں) زمین کو آسمان پر مقدم ذکر کیا ہے اور سوۃ سباء میں اس آیتِ کریمہ کے اندر: ''عَالِمُ الۡغَیۡبِ لَا یَعۡزُبُ عَنۡهُ مِثۡقَالُ ذَرَّۃٍ فِی السَّمٰوٰتِ وَلَا فِی الۡاَرۡضِ'' آسمان کا ذکر زمین سے پہلے کیا گیا ہے؟۔

جوابِ اوّل: اگرچہ آسمان کا یہ حق ہے کہ وہ زمین پر مطلقاً مقدم ہو' کیونکہ وہ اشرف ہے' لیکن چونکہ صدرِ آیت میں اللہ تعالیٰ کے مطلع ہونے کا ذکر ہے کہ وہ اہلِ ارض کے تمام افعال' اقوال اور احوال سے باخبر ہے اس لئے مناسب ہوا کہ زمین کو آسمان سے پہلے ذکر کر دیا جائے۔

جوابِ ثانی: واوٗ کے ساتھ عطف' تثنیہ کے مثل ہے اور اس کا وہی حکم ہے جو تثنیہ کا ہے۔ لہٰذا یہ عطف بالواوٗ تثنیہ کی طرح رتبہ کا فائدہ نہیں دے گا۔

سوال: یہاں تو فرمایا: ''اِنَّ الۡعِزَّۃَ لِلّٰهِ جَمِیۡعًا'' (تحقیق عزت ساری اللہ کے واسطے ہے) جب کہ دوسری جگہ میں فرمایا: ''وَلِلّٰهِ الۡعِزَّۃُ وَلِرَسُوۡلِهٖ وَلِلۡمُؤۡمِنِیۡنَ'' (اور اللہ کے لئے ہے عزت اور اس کے رسول کے لئے اور مومنین کے لئے)' دونوں میں تطبیق کس طرح ہوگی؟۔

جواب: اللہ تعالیٰ کے حق میں ''عزۃ'' بمعنی قدرت وغلبہ ہے' اور رسول اللہ ﷺ کے حق میں ''عزۃ'' اعلائے کلمہ اور اظہارِ دین کے معنی میں ہے اور مومنین کے حق میں دشمنوں کے خلاف نصرت وامداد کے معنی میں ہے۔ لہٰذا نفسِ عزۃ میں اشتراک ثابت کیا گیا ہے' اور اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد: ''اِنَّ الۡعِزَّۃَ لِلّٰهِ جَمِیۡعًا'' سے مراد وہ عزتِ کاملہ ہے جس میں الٰہ ہونے' خلق کرنے' موت وحیات دینے کی عزت اور دائمی بقاء وغیرہ مندرج ہیں' لہٰذا کوئی تعارض نہیں ہے۔

سوال: جب تمام آسمان وزمین' ان کے مابین کی مخلوقات اور ان کے ماسوا تمام چیزوں کے خالق ومالک اللہ تعالیٰ ہیں تو پھر: ''مَنۡ فِی السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ'' (جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جتنے زمین میں ہیں) کی تخصیص کا کیا فائدہ ہے؟

جواب: صرف ملائکہ اور جن وانس کو جو اہلِ عقل میں سے ہیں خاص طور پر اس لئے ذکر فرمایا تاکہ معلوم ہو جائے کہ جب یہ ذی عقل مخلوق اس کی عبد ہے اور وہ ان کا رب ہے اور ان میں سے کوئی بھی نہ ربوبیت کا حقدار ہے اور نہ ہی خدا کے ساتھ شرکت کا اہل تو پھر ان کے سوا جو غیر ذوی العقول ہیں جیسے کواکب' اصنام وغیرہ تو وہ اس کے زیادہ حق دار ہیں کہ وہ نہ خدا کے ہمسر ہوں اور نہ ہی شریک۔

سوال: اس کی کیا وجہ ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ان سے بطورِ استفہام فرمایا: "اَتَقُولُوْنَ لِلْحَقِّ لَمَّا جَآءَ کُمْ ط اَسِحْرٌ هٰذَا" (کیا کہتے ہو تم واسطے حق کے جب آیا تمہارے پاس کیا یہ جادو ہے) حالانکہ انکی قوم نے بصورت اخبار یاانّ اور لامِ تاکید کے ساتھ کلام کو مؤکد بنا کر یوں کہا تھا: "فَلَمَّا جَآءَ هُمُ الْحَقُّ مِنْ عِنْدِنَا قَالُوْا اِنَّ هٰذَا لَسِحْرٌ مُّبِیْنٌ" (پس جب آیا ان کے پاس حق ہمارے پاس سے تو انہوں نے کہا تحقیق یہ البتہ جادو ہے صریح) نہ کہ بطورِ استفہام؟۔

جواب: عبارت مقدر ہے: "اتقولون للحق لما جاء کم ان هذا لسحر مبین" پھر ان کے قول کا انکار کرتے ہوئے فرمایا: "اسحر هذا" لہٰذا اس استفہام کا تعلق قولِ موسیٰ سے ہے نہ کہ قومِ موسیٰ کے قول کا مفعول ہے۔

سوال: اس کی کیا وجہ ہے کہ اس ارشادِ عالی میں خطاب کو مختلف انواع میں لائے ہیں: "وَاَوْحَیْنَآ اِلٰی مُوْسٰی وَاَخِیْهِ اَنْ تَبَوَّاٰ لِقَوْمِکُمَا بِمِصْرَ بُیُوْتًا وَّاجْعَلُوْا بُیُوْتَکُمْ قِبْلَةً وَّاَقِیْمُوا الصَّلٰوةَ ط وَبَشِّرِ الْمُؤْمِنِیْنَ" (اور وحی بھیجی ہم نے موسیٰ کی طرف اور ان کے بھائی کی طرف یہ کہ اپنی قوم کے واسطے جگہ دو مصر میں گھر اور اپنے گھروں کو کرو روبقبلہ یعنی مسجدیں بناؤ اور قائم رکھو نماز کو اور بشارت دو ایمان والوں کو)؟۔

جواب: پہلے حضرت موسیٰ و حضرت ہارونؑ سے خطاب کیا گیا کہ اپنی قوم کے لئے عبادت خانہ کا انتخاب کرو یہ ایسا کام ہے جو انبیاء علیہم السلام کے سپرد کیا جاتا ہے پھر عام خطاب کیا گیا جس میں حضرت موسیٰ و حضرت ہارونؑ بھی اور ان کی قوم بھی شامل ہے کہ مسجدیں بناؤ اور ان میں نماز قائم کرو اس لئے کہ یہ جمہور پر واجب ہے۔ پھر صرف موسیٰ علیہ السلام کو بشارت کے لئے خاص کیا گیا' اس بشارت کی عظمت و شرافت یا خود موسیٰ علیہ السلام کی عظمت کی بناء پر۔

سوال: اس کی کیا وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے دُعا کی نسبت موسیٰ و ہارون علیہما السلام دونوں کی طرف کرتے ہوئے فرمایا ہے: "قَدْ اُجِیْبَتْ دَّعْوَتُکُمَا" (تحقیق تم دونوں کی دعا قبول کر لی گئی) حالانکہ دُعا صرف موسیٰ علیہ السلام نے کی تھی' جیسے ارشادِ خداوندی ہے: "وَقَالَ مُوْسٰی رَبَّنَآ اِنَّکَ

اٰتَیۡتَ فِرۡعَوۡنَ وَمَلَاَہٗ زِیۡنَۃً ''الآیۃ؟۔

جوابِ اوّل: منقول ہے کہ موسیٰ علیہ السلام دعا کرتے تھے اور ہارون علیہ السلام ان کی دعا پر آمین کہتے جاتے تھے' آمین کہنا بھی ایک معنی میں دُعا ہے۔ اس لئے دعا کی نسبت دونوں کی طرف کی گئی ہے۔

جوابِ ثانی: یہ بھی ممکن ہے کہ ہارون علیہ السلام نے بھی موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ دعا کی ہو۔ مگر اللہ تعالیٰ نے صرف موسیٰ علیہ السلام کا ذکر کیا' یا تو اس لئے کہ موسیٰ علیہ السلام دعا میں سبقت لیجانے والے تھے یا دعا کے زیادہ حریص تھے یا ان کی دعا میں اخلاص زیادہ تھا۔

سوال: اگر بات ایسی تھی تو پھر تثنیہ کے ساتھ اللہ تعالیٰ فرماتے؟۔

جواب: چونکہ ''دعوت'' مصدر ہے اور مصدر واحد' تثنیہ اور جمع سب کو شامل ہے' اس کی نظیر یہ ارشاد ہے: ''خَتَمَ اللّٰہُ عَلٰی قُلُوۡبِہِمۡ وَعَلٰی سَمۡعِہِمۡ وَعَلٰۤی اَبۡصَارِہِمۡ غِشَاوَۃٌ''۔

سوال: یہ کیسے فرمایا: ''فَاِنۡ کُنۡتَ فِیۡ شَکٍّ مِّمَّاۤ اَنۡزَلۡنَاۤ اِلَیۡکَ'' (پس اگر آپ شک میں ہوں جس کو ہم نے آپ کے پاس بھیجا ہے) ''اِنۡ'' تو محتمل الوجود چیز پر داخل ہوتا ہے حالانکہ حضور ﷺ کا قرآن کے بارے میں شک کرنا قطعاً منفی اور باطل ہے؟

جواب: یہاں خطاب نبی ﷺ کو نہیں ہے بلکہ اس شخص کو ہے جو قرآنِ کریم کے متعلق اور حضورِ اکرم ﷺ کی نبوت و رسالت کے متعلق شک کرنے والا ہو' گویا کہ یوں فرمایا: ''اے انسان! اگر تو کسی شک و شبہ میں ہے''۔

سوال: آیت کا یہ حصہ: ''مِمَّاۤ اَنۡزَلۡنَاۤ اِلَیۡکَ'' بتاتا ہے کہ خطاب صرف نبی کریم ﷺ کو ہے اور کسی کو نہیں ہے؟

جوابِ اوّل: اس سے یہ معلوم نہیں ہوتا' اس کی دلیل یہ آیات ہیں: ''یٰۤاَیُّہَا النَّاسُ قَدۡ جَآءَکُمۡ بُرۡہَانٌ مِّنۡ رَّبِّکُمۡ وَاَنۡزَلۡنَاۤ اِلَیۡکُمۡ نُوۡرًا مُّبِیۡنًا۔ ''یَحۡذَرُ الۡمُنٰفِقُوۡنَ اَنۡ تُنَزَّلَ عَلَیۡہِمۡ سُوۡرَۃٌ''

جوابِ ثانی: خطاب تو حضور ﷺ کو ہے مگر مراد آپؐ کے علاوہ دوسرے ہیں۔ جیسے اس فرمانِ خداوندی میں ہے ''یٰۤاَیُّہَا النَّبِیُّ اتَّقِ اللّٰہَ وَلَا تُطِعِ الۡکٰفِرِیۡنَ وَالۡمُنٰفِقِیۡنَ'' نیز اس کی تائید ان آیاتِ کریمات سے بھی ہوتی ہے: ''اِنَّ اللّٰہَ کَانَ بِمَا تَعۡمَلُوۡنَ خَبِیۡرًا'' اور ''قُلۡ یٰۤاَیُّہَا النَّاسُ اِنۡ کُنۡتُمۡ فِیۡ شَکٍّ مِّنۡ دِیۡنِیۡ''

جوابِ ثالث: یہاں ''اِنۡ'' ''ما'' کے معنی میں ہے: تقدیرِ عبارت یہ ہوگی: ''فما کنت فی شک مما انزلنا الیک فسئل ......'' مطلب یہ ہے کہ ہم آپ کو اس بات کا حکم نہیں دیتے

کہ آپ یہود ونصاریٰ کے عالموں سے اپنی کتاب کی صداقت کے بارے پوچھیں کیونکہ آپ اس کے متعلق شک میں ہیں بلکہ اس لئے تا کہ آپ کی بصیرت اور یقین واطمینان میں ترقی ہو۔

جوابِ رابع: خطاب نبی کریم ﷺ کو ہے اور اس کے ساتھ ساتھ آپ سے شک قطعی طور پر منفی ہے یا اس سے مراد شک کرنے والے کافروں پر الزام حجت ہے۔ جیسے اللہ تعالیٰ عیسیٰ علیہ السلام سے پوچھیں گے: "ءَ اَنْتَ قُلْتَ لِلنَّاسِ اتَّخِذُوْنِیْ وَاُمِّیَ اِلٰهَیْنِ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ" حالانکہ اللہ تعالیٰ کو معلوم ہوگا کہ یہ بات عیسیٰ علیہ السلام نے نہیں فرمائی تھی، معلوم ہوا صرف نصاریٰ پر حجت لازم کرنے کے لئے فرمائیں گے۔

سوال: ارشادِ خداوندی ہے: "وَلَوْ شَآءَ رَبُّکَ لَاٰمَنَ مَنْ فِی الْاَرْضِ کُلُّهُمْ جَمِیْعًا" (اور اگر چاہتا تیرا پروردگار البتہ ایمان لاتے جو کوئی ہیں زمین کے بیچ میں سب سارے) جب "کُلُّهُمْ" فرمادیا تھا تو پھر مزید "جَمِیْعًا" فرمانے میں کیا نکتہ ہے؟ "کلهم" تمام چیزوں کے شمول اور احاطہ کا فائدہ دیتا ہے؟۔

جواب: "کل" کا لفظ شمول اور احاطہ کا فائدہ دیتا ہے مگر اجتماعی صفت کے ساتھ وجودِ ایمان پر دلالت نہیں کرتا۔ جبکہ "جمیعًا" بحالتِ واحدہ وجودِ ایمان پر بھی دلالت کرتا ہے۔ جیسے آپ کہتے ہیں: "جاء نی القوم جمیعًا" یعنی میرے پاس قوم مجتمع ہو کر آئی۔ اس کی نظیر یہ ہے: "فَسَجَدَ الْمَلٰٓئِکَةُ کُلُّهُمْ اَجْمَعُوْنَ"

سوال: ارشاد ہوتا ہے: "قُلِ انْظُرُوْا مَا ذَا فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ" (آپ کہہ دیجئے کہ تم غور کرو (اور دیکھو) کہ کیا کیا چیزیں ہیں آسمانوں میں اور زمین میں) یہ حکم کیسے صحیح ہوسکتا ہے جبکہ ہم آسمانوں اور زمین کی تمام چیزیں نہ جانتے ہیں اور نہ دیکھتے ہیں؟۔

جواب: یہ حکم عام ہے اور اس سے مراد وہ چیزیں ہیں جن کا ہم اپنی بصارت سے ادراک کرسکتے ہیں جیسے سورج، چاند، ستارے، پہاڑ، دریا و سمندر، کانیں، حیوانات اور نباتات وغیرہ، جو صانع کے وجود، اس کی توحید اور عظیم قدرت پر دلالت کرتی ہیں۔ چنانچہ ان چیزوں سے ماوراء پر استدلال کیا جاسکتا ہے۔

سوال: ارشادِ خداوندی ہے: "وَاِنْ یَّمْسَسْکَ اللّٰهُ بِضُرٍّ فَلَا کَاشِفَ لَهٗ" الآیة اس میں کیا حکمت ہے کہ "ضُرٍّ" (تکلیف) کے ساتھ مس کا لفظ ذکر فرمایا ہے اور "خیر" (راحت) کے ساتھ ارادہ کا لفظ ذکر فرمایا ہے؟

جواب: اس کی وجہ یہ ہے کہ مس اور ارادہ دونوں کا استعمال ضر اور خیر دونوں کے لئے ہے۔

کیونکہ اگر اللہ تعالیٰ تکلیف پہنچانا چاہے یا راحت پہنچانا چاہے تو اس کو کوئی دور نہیں کر سکتا اور نہ اس کو ہٹا سکتا ہے۔ مگر یہاں کلام میں اختصار کیا گیا کہ ایک میں مس کا ذکر کر دیا اور دوسرے میں ارادہ کا ذکر کر دیا' تاکہ یہ چیز غیر مذکور پر دلالت کرے' جبکہ سورۃ الانعام میں مس کا ذکر ضُر اور خیر دونوں کے ساتھ کیا گیا ہے' لہٰذا سورۃ الانعام میں جو لفظِ مس مذکور ہے یہاں اس سے عدول کیا اور لفظِ ارادہ لے آئے' اس لئے کہ یہاں پر شرط کی جزا ''فلا رادّ لفضله'' ہے اور ''ردّ'' اس چیز میں ہوتا ہے جو تا حال واقع نہ ہوئی ہو۔ اور ''مس'' کا تعلق اس چیز کے ساتھ ہوتا ہے جو واقع ہو چکی ہو' اسی لئے وہاں یوں فرمایا: ''وَاِنْ یَّمْسَسْکَ بِخَیْرٍ فَهُوَ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ'' اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر وہ چاہے تو اس خیر کو دائمی کر دے اور اگر چاہے تو اس کو زائل کر دے لہٰذا کسی چیز کی زیادتی اور دوام اسی ذاتِ اقدس سے طلب کرنی چاہئے۔

# سورۃ ھود

سوال: اللہ تعالیٰ نے: ''وَاَنِ اسْتَغْفِرُوْا رَبَّکُمْ ثُمَّ تُوْبُوْا اِلَیْهِ'' (اپنے رب سے مغفرت طلب کرو پھر تم توبہ کرو) کیوں فرمایا' حالانکہ توبہ استغفار سے پہلے ہوتی ہے؟

جوابِ اوّل: اس آیت کا مطلب یہ ہے پہلے اپنے رب سے شرک کے گناہ کی معافی طلب کرو پھر اطاعت کے ذریعے اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرو' جیسا کہ مقاتلؒ نے فرمایا ہے: ''اور اس قسم کا استغفار توبہ سے مقدم ہوتا ہے''۔

جوابِ ثانی: اس میں تقدیم و تاخیر ہے۔

جوابِ ثالث: ''ثُمَّ تُوْبُوْا اِلَیْهِ'' میں لفظ ''ثم'' واو کے معنی میں ہے اور واو مطلق جمع کے لئے آتی ہے جمع مع الترتیب کا فائدہ نہیں دیتی لہٰذا کوئی اشکال نہیں رہا۔

سوال: فرمان باری ہے: ''وَاَنِ اسْتَغْفِرُوْا رَبَّکُمْ ثُمَّ تُوْبُوْا اِلَیْهِ یُمَتِّعْکُمْ مَتَاعًا حَسَنًا'' بقول ابن عباسؓ اور ابن قتیبہؒ جو شخص توبہ و استغفار نہ بھی کرے اس کو بھی اللہ تعالیٰ وقتِ مقررہ تک متاعِ حسن عطا فرماتا ہے۔ تو اس آیت میں متاعِ حسن کو توبہ اور استغفار کے ساتھ مشروط کرنے کا کیا فائدہ ہے؟

جواب: حضرت عبداللہ بن عباسؓ اور ابن قتیبہؒ کے علاوہ دیگر مفسرین نے اس کی تفسیر ایسی حیات سے کی ہے جو اطاعت الٰہی اور قناعت کے ساتھ ہو' اس قسم کی زندگی صرف توبہ و استغفار کرنے والوں کو ہی حاصل ہے۔

سوال: فرمانِ الٰہی: ''وَمَا مِنْ دَآبَّةٍ فِي الْاَرْضِ '' میں فِی الارض فرمایا: علی الارض کیوں نہیں فرمایا؟ حالانکہ دابۃ کے ساتھ ''علیٰ'' بہت زیادہ مناسب ہے۔ اس لئے کہ ''دابۃ'' کہتے ہیں زمین کے اوپر رینگنے والے کو۔

جوابِ اوّل: جیسا کہ فرمانِ باری تعالیٰ: ''وَلَاُصَلِّبَنَّكُمْ فِيْ جُذُوْعِ النَّخْلِ '' میں لفظ ''فی'' اور ''اَمْ لَهُمْ سُلَّمٌ يَّسْتَمِعُوْنَ فِيْهِ '' میں ''فی'' ''علی'' کے معنی میں ہیں اس طرح یہاں بھی ''فی'' ''علی'' کے معنی میں ہے۔

جوابِ ثانی: ''علیٰ'' کے مقابلے میں لفظ ''فی'' میں عموم وشمول زیادہ ہے یعنی ''فی'' زمین کے اوپر چلنے والی مخلوقات کو بھی شامل ہے اور زیرِ زمین چلنے والوں کو بھی شامل ہے جبکہ ''علی'' صرف زمین کے اوپر چلنے والوں کو شامل ہے (اس لئے آیت میں ''علی'' کے بجائے ''فی'' استعمال کیا گیا)۔

سوال: اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے صرف زمین پر چلنے والی مخلوق کو رزق دینے کا ذمہ لیا حالانکہ ہوا میں اڑنے والے پرندوں کو بھی اللہ ہی رزق عطا فرماتا ہے۔ اور یہ ''دابۃ'' میں داخل بھی نہیں ہے۔ جیسا کہ آیت: ''وَمَا مِنْ دَآبَّةٍ فِي الْاَرْضِ وَلَا طٰٓئِرٍ يَّطِيْرُ بِجَنَاحَيْهِ '' میں ''طائر'' کا ''دابۃ'' پر عطف بھی مغائرت پر دلالت کرتا ہے؟۔

جواب: ''دابۃ'' کے خصوصیت کے ساتھ ذکر کرنے کی وجہ یہ ہے کہ چوپائے پرندوں کے مقابلے میں زیادہ ہیں اور پرندوں کے مقابلے میں زمین پر چلنے والی مخلوق میں بڑے بڑے جسم والے جانور ہیں جیسا کہ ہاتھی بڑی بڑی عظیم الجثہ مچھلیاں ہیں جو رزق کے زیادہ ضرورت مند ہیں اسی وجہ سے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو بطورِ خاص رزق کی بہم پہنچانے کا ذکر فرمایا۔

سوال: اللہ پاک نے کیسے فرمایا: ''اِلَّا عَلَى اللّٰهِ رِزْقُهَا'' (مگر اللہ کے ذمے ہے اس کی روزی) جبکہ ''علی'' وجوب کے لئے آتا ہے۔ حالانکہ اللہ تعالیٰ پر کس کو رزق دینا واجب نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ محض اپنے فضل اور مہربانی سے مخلوق کو رزق عطاء فرماتا ہے؟۔

جوابِ اوّل: یہاں ''علی'' ''من'' کے معنی میں ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا قول: ''اِذَا اكْتَالُوْا عَلَى النَّاسِ يَسْتَوْفُوْنَ '' (جب ماپ لیں لوگوں سے پورا بھر لیں) میں ''علی'' ''مِنْ'' کے معنی میں ہے۔

جوابِ ثانی: وجوب کے صیغے کے ساتھ ذکر اس لئے کیا تاکہ بندوں کو حصولِ رزق کے متعلق مزید سکون واطمینان نصیب ہو جائے۔

سوال: ''لِيَبْلُوَكُمْ اَيُّكُمْ اَحْسَنُ عَمَلاً'' (تا کہ تم کو آزماوے کہ تم میں اچھا عمل کرنے والا کون ہے) کیسے فرمایا: حالانکہ خطاب عام ہے، مؤمنین اور کافرین سب کو شامل ہے۔ کافر کے اعمال میں تفاوت حسن اور احسن کے اعتبار سے نہیں ہوتا۔ عمل کا اچھا اور سب سے اچھا ہونا مؤمن کے اعمال میں ہوتا ہے۔ کافر کے اعمال میں تفاوت قبح میں ہوتی ہے۔ تو اس آیت میں دونوں کو کیسے مخاطب کیا گیا؟۔

جواب: ''لِيَبْلُوَكُمْ'' عام ہے مراد اس سے خاص لیا گیا ہے یعنی مومنین ہی مراد ہیں۔ عام بول کر خاص مراد لینے کی وجہ مومنین کو خصوصیت اور شرف دینا ہے۔

سوال: آیت میں ''وَضَائِقٌ بِهٖ صَدْرُكَ'' فرمایا گیا ہے 'وضیق بہ صدرک نہیں فرمایا گیا' کیوں؟

جواب: یہ بتانے کے لئے ایسا کیا گیا کہ آپ ﷺ کا دل تنگ ہونا عارضی ہے اس لئے کہ آپ ﷺ کا سینہ مبارک سب سے وسیع تھا' یہ بالکل ایسا ہے جیسا کہ اہلِ عرب کہتے ہیں زید سائد و جائد' جب اس کی سیادت و سخاوت عارضی ہو۔ اور یہ بتانا مقصود ہو کہ زید سیادت اور سخاوت کے ساتھ ہمیشہ متصف ہے تو کہتے ہیں ''زید سید'' ''زید جواد'' زمخشریؒ نے بھی اس طرح بیان کیا ہے۔

سوال: فرمان باری تعالیٰ ہے: ''فَاْتُوْا بِعَشْرِ سُوَرٍ مِّثْلِهٖ مُفْتَرَيٰتٍ'' ترجمہ (تم بھی اس جیسی دس سورتیں بنائی ہوئی لے آؤ) اس آیت میں قرآن کے مثل لانے کا حکم دیا گیا' حالانکہ کفار جو پیش کریں گے وہ ہرگز قرآن کی طرح نہیں ہوسکتا اس لئے کہ جو وہ لائیں گے وہ یقیناً من گھڑت ہوگا' اور قرآن من گھڑت نہیں ہوسکتا۔

جوابِ اوّل: یہاں مثلِ قرآن سے مراد مضامین میں مثل نہیں بلکہ فصاحت و بلاغت میں مثل مراد ہے۔

جوابِ ثانی: بعض نے کہا: تم بھی گھڑ کر لاؤ قرآن کی طرح جیسا کہ تمہارے زعم کے مطابق قرآن من گھڑت ہے۔

سوال: فرمانِ باری تعالیٰ: ''قُلْ فَاْتُوْا'' (آپ فرمادیجئے پس لاؤ) میں ''قل'' کو مفرد اور ''فَاِنْ لَّمْ يَسْتَجِيْبُوْا لَكُمْ فَاعْلَمُوْا'' (پھر یہ کفار تم لوگوں کا کہنا نہ کر سکے تو تم یقین کرلو) میں ''لکم'' اور ''فاعلموا'' کو جمع کے صیغے کے ساتھ لایا گیا ہے' کیوں؟۔

جوابِ اوّل: دونوں جگہ خطاب نبی کریم ﷺ ہی کو ہے البتہ آپ کے لئے جمع کا صیغہ استعمال کرنا آپ ﷺ کی تعظیم اور تفخیم شان کے لئے ہے۔

جوابِ ثانی: ''لکم'' اور ''فاعلموا'' سے خطاب صرف حضور اکرم ﷺ کو نہیں بلکہ صحابہ کرامؓ کو بھی

ہے۔اس لئے کہ نبی کریم ﷺ اور صحابہ قرآن کریم کے ذریعے کفار کو چیلنج کرتے تھے۔لیکن اس آیت: "فَاِنْ لَمْ یَسْتَجِیْبُوْا لَکَ فَاعْلَمْ" (پھر اگر یہ لوگ آپ کا کہنا نہ کر سکے تو آپ یقین کرلیں) سے پہلے جواب کی تائید ہوتی ہے۔

جوابِ ثالث: "لکم" اور "فاعلموا" میں خطاب مشرکین کو ہے۔

اور "لَمْ یَسْتَجِیْبُوْا" کی ضمیر من استطعتم کی طرف راجع ہے۔مطلب یہ ہے اگر وہ لوگ جن کو تم اس کام کی دعوت دے رہو اس کلام کے ساتھ معارضہ کرنے کے متعلق تم کو جواب نہ دے سکیں تو سمجھ لو یہ کلام کسی انسان کا کلام نہیں ہے بلکہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے اُتارا ہوا کلام ہے۔یہ لطیف جواب ہے۔

سوال: اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: "وَحَبِطَ مَا صَنَعُوْا فِیْهَا" (اور انہوں نے جو کچھ کیا تھا آخرت میں ناکارہ ہوگا)۔یہ آیت دلالت کررہی کفار کے اعمال کے باطل ہونے پر۔پھر اس کے بعد" وبٰطِلٌ مَا کَانُوْا یَعْمَلُوْنَ ذکر کرنے کا کیا فائدہ؟۔

جواب: " وَحَبِطَ مَا صَنَعُوْا فِیْهَا" کا مطلب ہے، دنیا میں ان لوگوں نے جو نیک اعمال کئے ان کا ثواب باطل ہوگیا اور "بَاطِلٌ مَّا کَانُوْا یَعْمَلُوْنَ" کا مطلب ہے جو عمل وہ دکھلاوے کے لئے کرتے تھے وہ تو تھے ہی باطل۔

سوال: حضرت نوح علیہ السلام نے اپنی قوم کو خطاب کرکے فرمایا: "وَیٰقَوْمِ لَآ اَسْئَلُکُمْ عَلَیْهِ" واو کے ساتھ خطاب کیا یہی الفاظ حضرت ہود علیہ السلام نے بھی استعمال کئے اور فرمایا "یٰقَوْمِ لَآ اَسْئَلُکُمْ عَلَیْهِ" بغیر واو کے۔فرق کی کوئی وجہ؟

جوابِ: دونوں جگہ "علیہ" میں "ہ" ضمیر تبلیغ رسالت کی طرف لوٹ رہی جس پر دونوں قصے دلالت کررہے ہیں۔البتہ نوح علیہ السلام کے قصے میں ضمیر اور مرجع کے درمیان دوسرے کلام سے فصل آئی ہے۔تو واو ابتداء لایا گیا۔اور ہود علیہ السلام کے قصے میں ضمیر اور مرجع کے درمیان کوئی دوسرا کلام واقع نہیں ہوا تو واوٴ ابتداء میں لانے کی ضرورت بھی نہ پڑی۔میری سمجھ میں یہی آیا ہے۔واللہ اعلم بالصواب۔

سوال: فرمان تعالیٰ: "لَا عَاصِمَ الْیَوْمَ مِنْ اَمْرِ اللّٰهِ" (آج اللہ کے قہر سے کوئی بچانے والا نہیں)۔سے (الا مَنْ رَحِمَ) (لیکن جس پر ہم رحم کریں) کا استثناء بظاہر درست نہیں اس لئے کہ مرحوم معصوم ہوتا ہے ظاہر کلام کا تقاضہ یہی ہے "لَا مَعْصُوم الامن رَحِمَ" ہونا چاہئے یعنی طوفان میں غرق ہونے سے کوئی نہیں بچ سکتا مگر وہ بچ جائے گا جسے اللہ تعالیٰ کشتی کے ذریعے

بچائیں گے؟۔
جوابِ اوّل: آیت میں ''عاصم'' معصوم کے معنی میں ہے: جیسا ''مِنۡ مَاءٍ دَافِقٍ'' میں دافق مدفوق کے معنی میں ہے۔ اس طرح ''فَهُوَ فِیۡ عِیۡشَةٍ رَاضِیَةٍ'' میں راضیة مرضیہ کے معنی میں ہے۔ اور اہل عرب کا قول اور سِرٌّ کا تمٌ'' میں کاتم مکتوم کے معنی میں ہے۔
جوابِ ثانی: مَن رَحِم مرحوم کے معنی میں نہیں بلکہ رَاحِمۡ کے معنی میں ہے۔ وہ ہے راحم اللہ تعالیٰ۔ تو مطلب یہ ہوگا لاعاصم الیوم الا اللہ۔ یعنی بچانے والا صرف اللہ ہی ہیں۔
جوابِ ثالث: اِلَّا مَنۡ رَّحِمَ میں مضاف مقدر ہے۔ یعنی الامکان من رحم ہے یعنی غرق ہونے سے کوئی بچانے والا نہیں سوائے ان لوگوں کی جگہ جن پر اللہ کا رحم ہوا ہے یعنی مومنین کا مکان یعنی کشتی ہی اللہ کے حکم سے بچانے والا ہے اور فرمان تعالیٰ: ''وَقَالَ ارۡكَبُوۡا فِيۡهَا بِسۡمِ اللّٰهِ مَجۡرٖهَا وَمُرۡسٰهَا اِنَّ رَبِّیۡ لَغَفُوۡرٌ رَّحِيۡمٌ'' (اور فرمایا کہ اس کشتی میں سوار ہو جاؤ اس کا چلنا اور اس کا ٹھہرنا اللہ ہی کے نام سے ہے۔ بالیقین میرا رب غفور ہے رحیم ہے) آخری جواب اس آیت کے مناسب ہے۔ اس لئے کہ جب نوح علیہ السلام کے بیٹے نے کہا پہاڑ مجھے غرق ہونے سے بچائے گا تو جواب میں حضرت نوح علیہ السلام نے فرمایا: آج اللہ کے عذاب سے کوئی نہیں بچا سکتا سوائے اللہ کے یا اس مکان کے جسمیں پناہ لینے کا اللہ تعالیٰ نے حکم دیا ہے اور وہ ہے کشتی۔
سوال: ''وَقِيۡلَ يٰۤاَرۡضُ ابۡلَعِىۡ مَآءَكِ وَ يٰسَمَآءُ اَقۡلِعِىۡ'' ترجمہ (اور حکم ہو گیا کہ اے زمین اپنا پانی نگل جا اور اے آسمان تھم جا)۔ اس آیت میں زمین و آسمان کو حکم دیا گیا ہے حالانکہ حکم عاقل کو دیا جاتا ہے جب کہ زمین آسمان غیر عاقل ہیں؟۔
جوابِ اوّل: زمین و آسمان کو یہ حکم صورۃ دیا گیا ہے درحقیقت یہ امر ان فرشتوں کو ہے جو زمین و آسمان کے امور کی تدبیر کرتے ہیں۔
جوابِ ثانی: یہ امر، امر ایجاد ہے امر ایجاب نہیں۔ امر ایجاد کے لئے عقل و فہم شرط نہیں ہے۔ اس لئے کہ تمام اشیاء امر ایجاد کے اعتبار سے مطیع اور فرمانبردار ہیں، جیسا کہ اس فرمان باری تعالیٰ میں ہے: ''اِنَّمَا اَمۡرُنَا لِشَیۡءٍ اِذَاۤ اَرَدۡنٰهُ اَنۡ نَّقُوۡلَ لَهٗ كُنۡ فَيَكُوۡنُ'' (جب ہم کسی کام کو کرنے کا ارادہ کرتے ہیں تو صرف کُن کہتے ہیں تو وہ ہو جاتا ہے)۔ اس طرح اس آیت ''فَقَالَ لَهَا وَلِلۡاَرۡضِ ائۡتِيَا طَوۡعًا اَوۡ كَرۡهًا'' میں ''فقال'' کو (ف) کے ساتھ لایا اور حضرت زکریاؑ کے قصے میں آیت ''اِذۡ نَادٰى رَبَّهٗ نِدَآءً خَفِيًّا قَالَ رَبِّ'' میں قال بغیر فاء کے لایا۔ کیوں؟
جوابِ ثالث: یہاں سورۃ ھود میں نداء سے مراد ارادۂ نداء ہے تو ''ف'' لائے جو سببیت پر

دلالت کرتا ہے۔ اس لئے کہ ارادہ ندا ندا کا سبب ہے۔
گویا یوں فرمایا: ''واراد نوح نداء ربه فقال کیت و کیت'' اور حضرت زکریا علیہ السلام کے قصے میں نداء سے ارادہ نداء نہیں بلکہ حقیقت نداء مقصود ہے۔ لہٰذا یہاں سبب نداء نہ ہونے کی وجہ سے ''ف'' لانے کی ضرورت نہ رہی۔

**سوال:** حضرت ہودؑ نبی تھے۔ انہوں نے کوئی معجزہ ظاہر نہیں کیا جیسا کہ ان کی قوم نے بھی ان سے یہ کہا: ''یٰھُوۡدُ مَا جِئۡتَنَا بِبَیِّنَةٍ'' (اے ہود آپ نے کوئی معجزہ ہمارے سامنے پیش نہیں کیا) جب انہوں نے کوئی معجزہ پیش نہیں کیا تو ان کی رسالت کو ماننا ان کی قوم پر کیسے لازم ہو گیا؟۔

**جوابِ اوّل:** معجزہ لانے کی ضرورت اس رسول کو پیش آتی ہے جو صاحب شریعت ہو۔ تاکہ ان کی امت ان کی پیروی کرے۔ یہ ضرورت اس لئے پیش آتی ہے کہ ہر شریعت میں بظاہر کوئی نہ کوئی امر عقل کی کسوٹی میں نہیں اترتا۔ تو رسول کو خرق عادت امر یعنی معجزہ لانے کی ضرورت ہوتی ہے تاکہ اس کے ذریعے سے ان کا اشکال ختم ہو اور رسول کی تصدیق کریں' اور یہ معجزہ ان کی صداقت پر گواہ ہو۔ اور وہ رسول جو صاحب شریعت نہ ہو' اور خلاف عقل امور کا حکم نہ دیتا ہو۔ اس کے لئے معجزہ لانے کی ضرورت نہیں ہوتی تو حضرت ہود علیہ السلام بھی صاحب شریعت نبی نہ تھے اس لئے انہیں بھی معجزہ دکھانے کی ضرورت پیش نہیں آئی۔

**جوابِ ثانی:** حضرت ہودؑ سے بھی معجزہ ظاہر ہوا ہے وہ یہ ہے کہ سخت تند و تیز ہوا آپ کے حکم سے چلتی تھی جو ان کے لئے مسخر تھی۔

**سوال:** بقول آپ کے ہود علیہ السلام کے احکامات سارے کے سارے اگر عقل کے موافق ہوں تو قوم ان کی مخالفت نہ کرتی' اور نہ ان کو جھٹلاتی اور نہ ہی ان کو مجنون کہتی جیسا کہ اس آیت میں انہوں یہ سب کچھ کہا انہوں نے کہا: ''یٰھُوۡدُ مَا جِئۡتَنَا بِبَیِّنَةٍ وَّمَا نَحۡنُ بِتَارِکِیۡۤ اٰلِهَتِنَا عَنۡ قَوۡلِکَ وَمَا نَحۡنُ لَکَ بِمُؤۡمِنِیۡنَ'' ترجمہ (اے ہود! آپ ہمارے پاس کوئی دلیل نہیں لائے اور ہم آپ کے کہنے پر اپنے معبودوں کو نہیں چھوڑتے۔ اور نہ ہی تجھ پر ایمان لاتے ہیں)۔

**جواب:** یہ قول ان کی امت کے عقلمندوں کا نہیں بلکہ یہ کم عقل اور معاند و مکابر قسم کے لوگوں کا ہے۔ جیسا کہ ہر نبی کے ساتھ واضح معجزہ لانے کے باوجود ایسا معاملہ ہوتا ہے۔

**سوال:** ''اِنِّیۡۤ اُشۡهِدُ اللّٰهَ وَاشۡهَدُوۡۤا اَنِّیۡ بَرِیۡٓءٌ مِّمَّا تُشۡرِکُوۡنَ'' (بے شک میں اللہ کو گواہ بناتا ہوں اور تم بھی گواہ رہو کہ تمہاری شرک سے میں بے زار ہوں'' واشھدو'' (تم گواہ بنو) کے بجائے ''اُشۡهِدُکُم'' (میں تمہیں گواہ بناتا ہوں) لاتے تو پہلے اور دوسرے دونوں جملوں میں تناسب ہوتا۔

ایسا کیوں نہیں کیا گیا؟۔
جواب: شرک سے براءت پر اللہ تعالیٰ کو گواہ بنانا تو صحیح اشہاد ہے اور توحید کی تاکید میں مفید ہے مگر کافروں کو گواہ بنانے میں ان کی توہین اور تہکم ہے مگر نااہل کو گواہ بنانا لازم آئے گا اس لئے کہ کافر گواہی کا اہل نہیں ہے تو تعبیر بدل دی جس میں ان کی توہین اور تہکم تو ہے مگر عدم مبالات لازم نہیں آتا۔ جیسا کہ زیادہ اصرار کرنے والے کو اشہدانی لاحبک کہا کرتے ہیں۔
سوال: "فَاِنْ تَوَلَّوْا فَقَدْ اَبْلَغْتُكُمْ" (پھر اگر تم پھرے رہو گے تو میں تم کو پہنچا چکا ہوں) آیت میں تبلیغ کو تولی (روگردانی) کے لئے جزاء بنایا گیا ہے حالانکہ تبلیغ پہلے اور روگردانی بعد میں ہوتی ہے تو تولی کو شرط اور ابلاغ کو جزاء بنانا کیسے درست ہوا؟۔
جوابِ اوّل: ابلاغ تولّی کے لئے جزاء نہیں ہے۔ بلکہ جزاء یہاں محذوف ہے۔ تقدیر عبارت یوں ہے: "فَاِنْ تَوَلَّوْا لَمْ اُعاتب على تفريط فى الابلاغ او تقصير فيه یعنی فقد ابلغتکم " جزاء نہیں ہے بلکہ جزاء لَمْ اُعاتب ہے۔ جزاء کے محذوف ہونے پر "فَقَدْ اَبْلَغْتُكُمْ" دلالت کررہا ہے۔
جوابِ ثانی: امام مقاتل فرماتے ہیں: تقدیر عبارت یوں ہے: "فَاِنْ تَوَلَّوْا فَقُلْ لَهُمْ قَدْ اَبْلَغْتُكُمْ" اگر وہ روگردانی کریں تو ان سے کہدو تحقیق میں اللہ کا پیغام تم تک پہنچا چکا ہوں یہاں جزا "فَقُلْ لَهُمْ" ہے لہٰذا کوئی اشکال نہیں۔
سوال: "وَلَمَّا جَآءَ اَمْرُنَا نَجَّيْنَا هُوْدًا وَّالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ بِرَحْمَةٍ مِّنَّا ۚ وَنَجَّيْنٰهُمْ مِّنْ عَذَابٍ غَلِيْظٍ" (اور جب ہمارا حکم پہنچا ہم نے ہود کو اور جو ان کے ہمراہ اہل ایمان تھے ان کو اپنی عنایت سے بچالیا۔ اور ان کو ایک بہت ہی سخت عذاب سے بچالیا)۔ "نَجَّيْنَا هُوْدًا وَّالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ" کے بعد دوبارہ نَجَّيْنٰهُمْ کو مکرر لانے کا کیا فائدہ ہے؟۔
جواب: اس میں تکرار نہیں ہے۔ اس لئے کہ پہلی نجات سے مراد قوم ہود پر بادسموم کے عذاب سے نجات ہے۔ اور دوسری نجات سے مراد عذاب آخرت سے نجات ہے جس کی قوم ہود اپنے کفر کی وجہ سے مستحق ہوتی تھی۔
سوال: "اَلَا بُعْدًا لِّعَادٍ قَوْمِ هُوْدٍ" ترجمہ (خوب سن لو رحمت سے دوری ہوئی عاد کو جو کہ ہود کی قوم تھی) "بُعد" کہتے ہیں بار بار ہلاکت کے لئے بددعا کرنے کو؟۔
جواب: یہاں یہ بتانا مقصود ہے کہ یہ لوگ ہلاکت کے مستحق اور اس کے لائق ہیں جب کہ اس کی نقیض سے معلوم ہوتی ہے۔

شعر: اخوتی لا تبعدوا بدا' وبلی واللہ قد بَعُدُوا
بار بار ہلاک نہ ہونے کی دعاء کرکے شاعر یہ بتلانا چاہتا ہے۔ کہ میرے بھائی بار بار ہلاک ہونے کے مستحق وسزاوار نہیں ہیں۔

سوال: آیت ''لَا تَنْقُصُوا الْمِكْيَالَ وَالْمِيْزَانَ'' (ناپ تول میں کمی نہ کرو) ناپ تول میں کمی کرنے سے روکنا دراصل ناپ تول پورا کرنے کا حکم دیتا ہے۔ لہٰذا ''لا تَنْقُصُوا الْمِكْيَالَ وَالْمِيْزَانَ'' کے بعد ''وَيٰقَوْمِ اَوْفُوا الْمِكْيَالَ وَالْمِيْزَانَ'' ترجمہ (اے میری قوم: پورا پورا ناپ تول کرو) لانے کا کیا فائدہ؟۔

جواب: ناپ تول میں کمی کے وہ عادی تھے۔ اس عمل کی زیادہ برائی بیان کرنے اور ان کے مرتکبین کو عار دلانے کے لئے پہلے صراحۃً اس سے روکا پھر عدل وبرابری کے بہتر ہونے کی وجہ سے اس کی طرف ترغیب دینے کے لئے صراحۃً پورا پورا ناپنے' تولنے کا حکم دیا۔

سوال: آیت: ''وَلَا تَعْثَوْا فِي الْاَرْضِ مُفْسِدِيْنَ'' ترجمہ (اور زمین میں فساد کرتے ہوئے حد سے مت نکلو)۔ ''عثو'' کا معنی فساد ہے' تو آیت کا معنی ہوگا: ''وَلَا تُفْسِدُوْا فِي الْاَرْضِ مُفْسِدِيْنَ'' فساد کرتے ہوئے فساد مت کرو)؟

جواب: بعینہٖ یہی سوال مع جواب سورۂ بقرہ میں گذرا ہے دوسرا جواب یہ ہے کہ آیت کا مطلب ہے زمین میں کفر کا فساد اور ناپ تول میں کمی کا فساد بار بار مت کرو۔

سوال: فرمانِ الٰہی ہے: ''بَقِيَّتُ اللّٰهِ خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ'' (اللہ کا دیا ہوا جو کچھ بچ جائے وہ تمہارے لئے بدرجہا بہتر ہے اگر تم کو یقین آئے)۔ آیت میں بقیۃ اللہ کی بہتری کو ایمان کے ساتھ مشروط کیا گیا۔ حالانکہ اس کی بہتری مشروط بالایمان نہیں ہے۔ بلکہ مطلق ہے۔ اس لئے کہ بقیۃ اللہ کا مطلب ہے صحیح صحیح ناپ تول کے بعد جو مال باقی بچے گا وہ بقیۃ اللہ ہے۔ اور وہ مسلمان اور کافر سبھی کے لئے خیر ہے اس لئے کہ اس وجہ سے ناپ تول میں کمی کے عذاب سے بچیں گے؟۔

جوابِ اوّل: البقیۃ کے بہترین ہونے کو ایمان سے مشروط اس لئے کیا گیا کہ اس کا بہترین ہونا اور فائدہ مند ہونا ایمان کی موجودگی کے ساتھ زیادہ ظاہر اور واضح ہے۔ اس لئے کہ ایمان کی وجہ سے عذاب سے بچنے کے ساتھ ساتھ ثواب کا بھی مستحق ہوگا۔

جبکہ کفر کی موجودگی میں اس کا فائدہ وبہتری پردہ خفاء میں جائیگا کیوں کہ کفر کا عذاب اتنا شدید ہے کہ ناپ تول میں عذاب نہ بھی ہو تب بھی کوئی خاص فائدہ نہیں ہوگا۔

جوابِ ثانی: ''اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ'' میں مومنین کا اصطلاحی معنی مراد نہیں ہے بلکہ ایمان کا لغوی معنی تصدیق مراد ہے۔ توان کنتم مصدقین کے معنی میں یعنی تم اگر میری باتوں پر یقین کرو گے تو بقیۃ تمہارے لئے بہتر ہے۔

سوال: ''وَمَا قَوْمُ لُوْطٍ مِّنْكُمْ بِبَعِيْدٍ'' (قوم لوط تم سے کوئی دور تو نہیں ہے) لفظ قوم کا اطلاق مردوں کی جماعت پر ہوتا ہے اس لئے ''بعید'' کے بجائے ''بعیدین'' ہونا چاہئے: قرآن کریم میں دوسری جگہوں میں قوم کی طرف جمع کی ضمیر لوٹائی گئی۔ جیسا کہ فرمانِ الٰہی: ''اَنْ اَنْذِرْ قَوْمَكَ مِنْ قَبْلِ اَنْ يَّاْتِيَهُمْ'' یاتیھم میں ''ھم'' اور ''لَا يَسْخَرْ قَوْمٌ مِّنْ قَوْمٍ عَسٰى اَنْ يَّكُوْنُوْا خَيْرًا مِّنْهُمْ'' میں ''یکونوا'' کی ضمیر ہے اور منھم بھی سب ضمیریں قوم کی طرف لوٹ رہی ہیں؟۔

جوابِ اوّل: یہاں مضاف مقدر ہے تقدیر عبارت یوں ہے ''ماھلاک قوم لوط'' قوم لوط کا ہلاک ہونا یا ''وما کان قوم لوط'' ہے۔ قومِ لوط کا مقام ومکان ان سے زیادہ دور نہیں تھا۔ اور نہ ہی ان کی ہلاکت کا زمانہ دور تھا۔ فعیل کا صیغہ واحد، تثنیہ اور جمع سبھی کے لئے برابر استعمال ہوتا ہے۔ جوہری فرماتے ہیں: اہل عرب کہتے ہیں ''وما انتم منا ببعید'' قرآنِ کریم میں بھی جمع کے لئے ''فعیل'' کا صیغہ استعمال ہوا ہے۔ فرمانِ الٰہی ہے ''وَالْمَلٰٓئِكَةُ بَعْدَ ذٰلِكَ ظَهِيْرٌ'' دوسری جگہ ارشاد ہے: ''عَنِ الْيَمِيْنِ وَعَنِ الشِّمَالِ قَعِيْدٌ''۔

سوال: فرمانِ الٰہی ہے: ''لَوْلَا رَهْطُكَ لَرَجَمْنٰكَ وَمَآ اَنْتَ عَلَيْنَا بِعَزِيْزٍ'' (اور اگر نہ ہوتے تیرے بھائی بند تو تجھ کو ہم سنگسار کرتے۔ ہماری نگاہ میں تیری کچھ عزت نہیں) حضرت شعیب علیہ السلام اور ان کے بھائی بندوں کے متعلق ہے یعنی بھائی بندوں کو حضرت شعیبؑ سے برتر اور معزز سمجھ رہے تھے تو حضرت شعیب علیہ السلام کا یہ کہنا ''اَرَهْطِيْٓ اَعَزُّ عَلَيْكُمْ مِّنَ اللّٰهِ'' (اللہ کے مقابلے میں میرے بھائی بند تمہارے لئے زیادہ معزز ہیں) کیسے درست ہوگا؟

جواب: اللہ کے نبی کے ساتھ بے احترامی کا معاملہ کرنا اللہ کے ساتھ بے احترامی کرنا ہے۔ لہٰذا جب انہوں نے اللہ کے نبی پر ان کی قوم کو ترجیح دی اور معزز سمجھا تو گویا قوم کو اللہ کے مقابلے میں بھی معزز گردانا۔ دیکھئے: قرآن کریم میں رسول کی اطاعت کو اللہ کی اطاعت قرار دیا گیا ہے فرمانِ باری تعالیٰ ہے: ''مَنْ يُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰهَ'' جس نے رسول کی اطاعت کی اس نے اللہ تعالیٰ کی اطاعت کی اس طرح پیغمبر کے ہاتھ میں بیعت کرنے کو اللہ تعالیٰ کے ساتھ بیعت قرار دیا گیا ارشاد باری تعالیٰ ہے: ''اِنَّ الَّذِيْنَ يُبَايِعُوْنَكَ اِنَّمَا يُبَايِعُوْنَ اللّٰهَ'' (جو لوگ آپ کے ساتھ بیعت کرتے ہیں وہ اللہ ہی کے ساتھ بیعت کرتے ہیں)

**سوال:** فرمایا: ”وَیٰقَوْمِ اعْمَلُوْا عَلٰی مَکَانَتِکُمْ اِنِّیْ عَامِلٌ ط سَوْفَ تَعْلَمُوْنَ مَنْ یَّاْتِیْهِ عَذَابٌ یُّخْزِیْهِ وَمَنْ هُوَ کَاذِبٌ“ (اے میری قوم کام کئے جاؤ اپنی جگہ میں بھی کام کرتا ہوں آگے معلوم کرلو گے کس پر رسوا کرنے والا عذاب آتا ہے اور جھوٹا کون ہے) حضرت شعیب علیہ السلام نے کفار اور اپنے عمل کے اپنی اپنی جگہ بیان کرنے کے بعد عمل کرنے والوں کا انجام بیان کیا ظاہر فہم کے مطابق و موافق یوں کہنا تھا ”وَمَنْ یَّاْتِیْهِ عَذَابٌ وَمَنْ هُوَ صَادِقٌ“ (کس پر آتا ہے عذاب رسوا کرنے والا اور کون سچا ہے) تا کہ رسوا کرنے والے عذاب کی نسبت ان کی طرف اور سچائی کی نسبت حضرت شعیب علیہ السلام کی طرف ہوتی؟۔

**جواب:** قیاس تو وہی ہے جو سوال میں ذکر کیا گیا' لیکن کفار اپنے زعم میں حضرت شعیبؑ کو جھوٹا سمجھتے تھے ”من هو کاذب“ کہہ کر یہ بتلایا جارہا ہے۔ کہ وقت بتائے گا کہ کون جھوٹا ہے۔ تم یا حضرت شعیب۔

**سوال:** کیسے فرمایا اللہ تعالیٰ نے: ”وَاِذَا اَخَذَ الْقُرٰی وَهِیَ ظَالِمَةٌ“ (اور جب پکڑتا ہے بستیوں کو اس حال میں کہ وہ ظلم کرتے ہوتے ہیں) حالانکہ بستیاں ظلم نہیں کیا کرتی ہیں۔ اس لئے کہ ظلم کرنا ذوی العقول یا حیوانات کی صفت ہے نہ کہ جمادات کی؟۔

**جواب:** بستی کی طرف ظلم کو مجازاً منسوب کیا گیا ہے۔ مراد اس سے اہل بستی ہیں جیسا کہ دوسری جگہ ارشاد باری ہے: ”اَخْرِجْنَا مِنْ هٰذِهِ الْقَرْیَةِ الظَّالِمِ اَهْلُهَا“ بیان التباس کا کوئی خطرہ نہیں تھا۔ اس لئے ظلم کو قریہ کی طرف منسوب کیا۔

**سوال:** ان آیات میں کیسے تطبیق ہوگی (۱) ”یَوْمَ یَاْتِ لَا تَکَلَّمُ نَفْسٌ اِلَّا بِاِذْنِهٖ“ ترجمہ (اور جس وقت وہ دن آئے گا کوئی شخص بدوں خدا کی اجازت کے بات تک نہ کرسکے گا)۔

(۲) ”یَوْمَ تَاْتِیْ کُلُّ نَفْسٍ تُجَادِلُ عَنْ نَّفْسِهَا“

اس روز ہر جان اپنے ساتھ مجادلہ کرتی ہوئی آئے گی۔

(۳) ”هٰذَا یَوْمُ لَا یَنْطِقُوْنَ وَلَا یُؤْذَنُ لَهُمْ فَیَعْتَذِرُوْنَ“ ترجمہ (یہ وہ دن ہے کہ نہ بولیں گے اور نہ ان کو حکم ہوگا کہ توبہ کریں)

چنانچہ تیسری آیت نفی اذن میں پہلی آیت کی معارض ہے' اور دونوں آیتیں عدم کلام میں پہلی آیت کے معارض ہیں؟۔

**جواب:** شروع کی دو آیتوں میں تطبیق تو ظاہر ہے۔ کیوں کہ دوسری آیت کا معنی ہے تجادل عن نفسها باذنه“ یعنی مجادلت عن النفس بھی اللہ تعالیٰ کے اذن سے ہوگی' اس طرح اگر پہلی

آیت میں ہم یوں کہیں کہ استثناء عن النفی اثبات نہیں ہے' اس لئے کہ پہلی آیت وجود اذن کی متقاضی نہیں ہے' بلکہ انتفاء اذن کی وجہ سے نفی کلام کا تقاضا کرتی ہے' تو تیسری اور پہلی آیتوں میں کوئی تناقض نہ ہوگا۔ ہاں اگر یوں کہیں کہ نفی سے استثناء ہے تو بظاہر تعارض ہوسکتا ہے مگر حقیقت میں کوئی تناقض نہیں ہے اس لئے کہ قیامت کا دن ایک انتہائی طویل دن ہے جس میں مختلف موقف و موطن ہوں گے چنانچہ بعض مقامات میں بولنے پر پابندی ہوگی اور اجازت کلام نہیں ملے گی۔ اور بعض مقامات پر ان کی زبانوں پر مہر سکوت ثبت کردی جائیگی۔ ان کے ہاتھ بول پڑیں گے ٹانگیں شہادت دیں گی۔ لیکن آیت "هَٰذَا يَوْمُ لَا يَنطِقُونَ" یہ ایک ایسا دن ہے کہ نہ بول سکیں گے) سے اس جواب پر اشکال وارد ہوگا۔ جسمیں یہ کہا گیا ہے کہ قیامت کے دن کوئی بول نہ سکے گا۔ عموم نفی کا تقاضا ہے کہ اس تمام دن میں کسی کو بولنے کی اجازت نہ ہو۔ لہٰذا تمہارا مذکورہ جواب صحیح نہیں ہوا۔

مگر اس اشکال کا جواب یہ دیا جائے گا کہ تیسری آیت سے ایک خاص طبقہ مراد ہے۔ جو ان لوگوں کے علاوہ ہے جن کا تذکرہ پہلی دو آیتوں میں کیا گیا ہے' ثابت ہوا آیتوں میں کوئی تناقض و تعارض نہیں۔

سوال: اللہ تعالیٰ نے آیت "فَمِنْهُمْ شَقِيٌّ وَسَعِيدٌ" (ان میں بدبخت اور نیک بخت ہیں) کو "من" تبعیضیہ کے ساتھ کیسے بیان کیا' حالانکہ یہ واضح بات ہے کہ لوگوں کے صرف دو طبقات ہیں۔ نیک بخت اور بدبخت؟۔

جواب اوّل: یہاں تبعیض صحیح ہے۔ اس لئے کہ قیامت کے دن لوگوں کے طبقات ہوں گے۔ ایک طبقہ نیک بخت ہوگا جو جنت میں جائیگا۔ ایک قسم بدبختوں کی ہوگی جو جہنم میں جائیگی۔ ایک قسم نہ نیک بخت ہوگی نہ بدبخت رہے گی جو اعراف میں رہیں گے۔

جوابِ ثانی: "فَمِنْهُمْ شَقِيٌّ وَمِنْهُمْ سَعِيدٌ" کچھ ان میں سے شقی ہیں اور کچھ ان میں سے سعید ہوں گے۔ اس کا تقاضا ہے کہ شقی بعض لوگ میں اور سعید دونوں بعض میں۔ معاملہ بھی ایسا ہے۔ یہ مطلب نہیں کہ شقی اور سعید بعض لوگ ہیں۔ جیسا کہ کہا جاتا "من الحیوان انسان من الحیوان غیر انسان' کل الحیوان اما انسان او غیر انسان"

سوال: "خٰلِدِيْنَ فِيْهَا مَا دَامَتِ السَّمٰوٰتُ وَالْاَرْضُ" ترجمہ (جنت میں رہیں گے جب تک آسمان و زمین باقی رہیں گے)۔ آیت سے معلوم ہوتا ہے جنتی جنت میں زیادہ دیر رہیں گے۔ یعنی جب تک زمین و آسمان رہیں گے۔ حالانکہ جنتی جنت میں ہمیشہ رہیں گے۔ اور زمین

آسمان کا دوام منقطع ہوگا۔اس لئے کہ قیامت کے دن یہ دونوں منہدم ہوں گے۔جیسا کہ فرمان باری تعالیٰ ہے:"کَلَّا اِذَا دُکَّتِ الْاَرْضُ دَکًّا دَکًّا" دوسری جگہ ارشاد ہے:"اِذَا السَّمَآءُ انْفَطَرَتْ" ایک اور جگہ ارشاد خداوندی ہے:"یَوْمَ نَطْوِی السَّمَآءَ کَطَیِّ السِّجِلِّ لِلْکُتُبِ" یہ آیات اوران جیسی بہت سی آیات آسمان وزمین کے خراب ہونے پر دلالت کرتی ہیں؟۔

جوابِ اوّل: اہلِ عرب ابد کے معنی کے لئے مختلف الفاظ استعمال کرتے ہیں۔جسمیں ابد کا معنی مراد ہوتا ہے'توقیت مقصود نہیں ہوتا۔مثلاً کہتے ہیں:"لا افعل کذا ما اختلف اللیل والنہار" میں اس کام کو نہیں کروں گا جب تک دن رات کا اختلاف باقی ہے کہتے ہیں۔"مَادَامَتِ السَّمٰوٰتُ وَالْاَرْضُ" یعنی جب تک زمین وآسمان دائم ہیں میں اس کام کو نہیں کروں گا۔مراد اس سے یہ ہے کہ اس کام کو ہمیشہ تا ابد نہ کروں گا۔قطع نظر اس سے کہ اس کام میں توقیت ہے یا نہیں۔

جوابِ ثانی:"مَا دَامَتِ السَّمٰوٰتُ وَالْاَرْضُ" ان کے عقیدے کے مطابق کہا کیوں کہ ان کے عقیدے کے مطابق زمین وآسمان بھی زائل نہیں ہوں گے ہمیشہ رہیں گے۔

جوابِ ثالث: اس سے مراد ان لوگوں کے اپنی قبروں میں ہونے کی حالت ہے۔کہ قبور میں یا اچھی حالت میں ہوں گے۔یا مبتلاء عذاب ہوں گے جیسا کہ حدیث شریف میں آتا ہے'قبر جنت کے باغوں میں سے ایک باغ ہے یا جہنم کے گڑھوں میں سے ایک گڑھا ہے'لہٰذا جو ان باغوں میں سے کسی باغ میں ہے تو وہ گویا جنت میں ہے۔اور جو آگ کے گڑھوں میں ہے تو وہ جہنم میں ہے۔تو اس صورت میں"مَادَامَتِ السَّمٰوٰتُ وَالْاَرْضُ" کا مطلب ہوگا۔جب تک آسمان وزمین برقرار ہیں اس وقت تک وہ ان حالات میں ہوں گے یعنی قیامت تک جو جس حالت میں ہے اسی حالت میں رہے گا۔

جوابِ رابع: یہاں السموات والارض سے مراد دنیا کے آسمان اور دنیا کی زمین مراد نہیں۔بلکہ آخرت کے آسمان وزمین مراد ہیں چنانچہ قرآنِ کریم میں اس کی طرف اشارہ ملتا ہے'فرمانِ باری تعالیٰ ہے۔"یَوْمَ تُبَدَّلُ الْاَرْضُ غَیْرَ الْاَرْضِ وَالسَّمٰوٰتُ"(جس روز دوسری زمین بدل دی جائے گی اس زمین کے علاوہ آسمان بھی) آخرت کے آسمان وزمین قائم دائم ہوں گے زائل ہوں گے نہ فناء۔یا اس سے مراد عرش الٰہی ہے۔جیسا کہ حدیث شریف میں آیا ہے۔اہلِ جنت عرشِ الٰہی کے سائے کے نیچے ہوں گے۔عربی زبان میں ہر سایہ کرنے والی چیز کو سماء کہتے ہیں'اسی طرح جنت کے متعلق احادیث میں آیا ہے جنت کی مٹی زعفران کی ہے اس حدیث سے معلوم ہوا

کہ جنت کی زمین بھی ہے تو ''مَادَامَتِ السَّمٰوٰتُ وَالْاَرْضُ'' سے مراد یہی جنت کے آسمان وزمین مراد ہیں۔

سوال: اگر اس دوام سے ایسا دوام خلود ہو جس کی کوئی انتہا نہ ہو تو (اِلَّا مَاشَآءَ رَبُّکَ. مگر جو آپ کا رب چاہے) کا استثناء کیسے صحیح ہوگا؟۔

جوابِ اوّل: یہاں ''اِلَّا'' غیر اور سوی کے معنی میں ہے۔ تو آیت کا مطلب یہ ہوگا وہ جنت میں رہیں گے جب تک آسمان وزمین موجود رہیں گے علاوہ مشیت خداوندی کے یعنی اس وقت تو رہیں گے ہی اس کے علاوہ ہمیشہ اور ابدالاباد تک رہنا مشیت الٰہی سے ہے۔ یہ جواب اس صورت میں صحیح ہوگا جب السموات والارض' سے دنیاء کے زمین وآسمان مراد ہوں۔ ابن قتیبہ فرماتے ہیں: اس کی مثال کلام میں عرب میں یوں ہے: جیسا کہتے ہیں ''لاسکنک فی ھذہ ا الدار حولا الا ماشئت'' (ایک سال تجھ کو اس گھر میں سکونت دوں گا علاوہ میری چاہت کے یعنی فراخی چاہا تو ایک سال سے زیادہ بھی ٹھہرا سکتا ہوں۔

جوابِ ثانی: یہاں استثناء ''اِلَّا مَاشَآءَ رَبُّکَ'' کی تفسیر میں حضرت ابن عباسؓ کے اس قول: ''وَقَدْ شَآءَ ان یخلدوا فیھا'' کا مطلب بھی یہی مطلب ہے۔ زجاجؒ نے کہا: اس استثناء کے ذریعے ہمیں بتانا مقصود ہے اگر اللہ ان کو تا ابد رکھنا نہ چاہتے تو نہ رکھتے۔ مگر اللہ نے ان کو ہمیشہ تا ابد رکھنے کا ہی ارادہ فرمایا ہے۔

جوابِ ثالث: یہ استثناء بعث بعد الموت' میدان حشر میں جمع ہونے اور حساب وکتاب کے لئے پیش کرنے کے لئے وقوف کے لئے ہے' اس لئے کہ نیک بخت اور بد بخت اس سارے زمانے میں نہ جنت میں ہوں گے نہ ہی جہنم میں۔

جوابِ رابع: ''الا ماشاء'' میں لفظ ''ما'' ''من'' کے معنی میں ہے۔ تو اس صورت میں ''اِلَّا مَاشَآءَ رَبُّکَ'' کا مطلب ہوگا۔ توحید پرستوں میں جو لوگ جہنم میں داخل ہوں گے' وہ اپنے گناہوں کی بقدر عذاب پائیں گے پھر جہنم سے نکلیں گے اور جنت میں داخل ہوں گے۔ مگر استثناء کا یہ مطلب جب ہوگا جبکہ استثناء صرف اشقیاء سے ہو۔

جوابِ خامس: مستثنیٰ اہلِ اعراف کا جنت میں داخل ہونے سے قبل اعراف میں رہنے کا زمانہ ہے۔ مگر یہ اس وقت درست ہوگا جب استثناء سُعداء سے ہو۔ اس لئے کہ سعداء جھنم میں داخل نہیں ہوں گے۔

جوابِ سادس: یہ خلود فی عذاب النار اور خلود فی نعیم الجنۃ سے استثناء ہے۔ اس لئے کہ بد بختوں

کا عذاب صرف آگ میں جلنے سے نہیں ہوگا۔ بلکہ زمہریر (انتہائی ٹھنڈک) وغیرہ سے بھی عذاب دیئے جائیں گے۔ اور غضب الٰہی کا عذاب تو اور بھی سخت ہے۔

اس طرح نیک بخت جنت کی نعمتوں کے علاوہ اور بھی انعامات الٰہی سے نوازے جائیں گے جو جنت کی نعمتوں سے بھی بڑھکر نعمتیں ہوں گی۔ وہ زیارت ہے جسکا تذکرہ اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں کیا ہے: ''لِلَّذِیْنَ اَحْسَنُوا الْحُسْنٰی وَزِیَادَةٌ'' جن لوگوں نے اچھے اعمال کیۓ ان کے لئے جنت ہے اور زیادہ ہے) اسی طرح اللہ تعالیٰ کی رضامندی کی نعمت جو تمام نعمتوں سے اعلیٰ وارفع ہے۔ جیسا کہ فرمانِ باری تعالیٰ ہے: ''وَعَدَ اللّٰهُ الْمُؤْمِنِیْنَ وَالْمُؤْمِنٰتِ جَنّٰتٍ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِیْنَ فِیْهَا وَمَسٰكِنَ طَیِّبَةً فِیْ جَنّٰتِ عَدْنٍ وَرِضْوَانٌ مِّنَ اللّٰهِ اَكْبَرُ'' (وعدہ دیا اللہ نے ایمان والے مردوں اور عورتوں کو باغ بہتی ہے نیچے ان کے نہریں رہا کریں ان میں اور مکان ستھرے رہنے کے باغوں میں اور رضامندی اللہ کی سب سے بڑی یہی ہے بڑی مراد ملنی۔

اور ارشادی باری تعالیٰ: ''فَلَا تَعْلَمُ نَفْسٌ مَّآ اُخْفِیَ لَهُمْ مِّنْ قُرَّةِ اَعْیُنٍ'' کسی کو معلوم نہیں جو چھپا رہتا ہے ان کے واسطے جو ٹھنڈک ہے آنکھوں کی اسی طرح ''الا ما شاء ربک'' کے بعد ''اِنَّ رَبَّكَ فَعَّالٌ لِّمَا یُرِیْدُ'' بے شک تمہارا ربّ کر ڈالتا جو چاہے۔ ذکر کرنا بھی اس جواب کے لئے مؤید ہے۔ اسی طرح سعداء کے ذکر کے بعد ''عَطَآءً غَیْرَ مَجْذُوْذٍ'' لانے سے بھی جواب سادس کی تائید ہوتی ہے یعنی اللہ تعالیٰ جہنمیوں کو جو چاہے عذاب دے سکتا ہے۔ اور اہل جنت کو نہ ختم ہونے والے انعامات سے نوازتا ہے۔

**سوال:** ''وَاِنَّا لَمُوَفُّوْهُمْ نَصِیْبَهُمْ'' ہم ان کے حصے پورے پورے دیں گے' کے بعد ''غَیْرَ مَنْقُوْصٍ'' بغیر کمی کے' لانے کا کیا فائدہ ہے اس لئے کہ پورا پورا اعطاء کرنا جب ہوتا ہے جب اسمیں کمی نہ ہو تو غیر منقوص لانے کا کوئی بظاہر فائدہ نہیں؟۔

**جواب:** یہ ماقبل کی تاکید ہے۔

**سوال:** آیت ''وَلِذٰلِكَ خَلَقَهُمْ'' میں ''لذلک'' سے کس چیز کی طرف اشارہ ہے؟

**جوابِ اوّل:** اس کا مشار الیہ سابق میں بیان کردہ دو فریق اہل اختلاف اور اہل رحمت کا منشاء اختلاف ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ نے اہلِ اختلاف کو دین میں اختلاف کرنے اور اہلِ رحمت کو رحمت کے لئے پیدا فرمایا۔ حضرت عبداللہ بن عباسؓ اس کی تفسیر بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے دو فریق پیدا فرمائے: ایک فریق کے ساتھ رحمت کا معاملہ کیا تو وہ اختلاف میں نہ پڑا اور

ایک پر اللہ کی نظر کرم نہیں ہوئی تو اختلاف کرنے لگا۔
جوابِ ثانی: یہ بھی کہا گیا ہے ''ذلک'' کا مشار الیہ رحمۃ ہے یعنی ایک دوسرے پر رحم کرنا' اس صورت میں ''خَلَقَهُمْ'' میں ''ھم'' ضمیر کا مرجع وہ لوگ ہوں گے جن کے ساتھ رحمت خداوندی شامل حال رہی جس کی برکت سے اختلاف سے بچ گئے۔
جوابِ ثالث: بعض نے کہا: ذلک کا مشار الیہ اختلاف ہے جس کا سابق میں ذکر ہوا'' خَلَقَهُمْ'' میں ''ھُم'' ضمیر مختلفین (اختلاف کرنے والوں) کی طرف لوٹے گی۔ اور ''لذلک'' کا ''ل'' پہلے اور تیسرے جواب کے اعتبار سے لام المعاقبۃ (انجام بتانے والا) ہوگا۔ نہ کہ لام کی (سبب بیان کرنے والا) ہوگا۔ اس لئے کہ دین میں اختلاف کرنے کے لئے پیدا کرنا حکمت و دانائی کے شایان شان نہیں ہے۔
اس لام کی مثال فرمانِ الٰہی: '' فَالْتَقَطَهٗ اٰلُ فِرْعَوْنَ لِيَكُوْنَ لَهُمْ عَدُوًّا وَّحَزَنًا '' (تو فرعون کے لوگوں نے موسیٰ کو اٹھالیا' تا کہ وہ ان لوگوں کے لئے دشمنی اور غم کا باعث بنے) میں '' لِیَکُوْنَ '' کا ''ل'' ہے۔ اسی طرح شاعر کے اس شعر:

اَعِدُّوْا لِلْمَوْتِ وابنوا للخراب ☆ فکلکم یصیر الی التراب

(موت کے لئے تیاری کرو بے آباد کی تعمیر کرو' تم سب مٹی کی طرف لوٹ جاؤ گے) میں ''للموت'' کا ''لام'' ہے۔
جوابِ رابع: بقول بعض یہ لام لام تمکین (قدرت وطاقت کے معنی دیتے ہیں) جیسا کہ آیت: '' جَعَلَ لَكُمُ الَّيْلَ لِتَسْكُنُوْا فِيْهِ '' ''لتسکنوا'' کا ''ل'' اور آیت: '' وَالْخَيْلَ وَالْبِغَالَ وَالْحَمِيْرَ لِتَرْكَبُوْهَا '' میں ''لترکبوا'' کا ''ل'' لام تمکین ہے۔ تو ''لذلک'' کا لام بھی لام تمکین ہے۔ یہاں آیت کا مطلب یہ ہوگا۔ کہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے ان کو حکم اختلاف کو قبول کرنے کی طاقت و تمکین دی ہے۔
جوابِ خامس: ''لذلک'' کا لام بمعنی علیٰ ہے یعنی علیٰ ذلک کے معنی میں ہے جیسا کہ فرمانِ باری '' وتَلَّهٗ لِلْجَبِيْنِ '' اور ارشادِ خداوندی '' يَخِرُّوْنَ لِلْاَذْقَانِ سُجَّدًا '' تو ٹھوڑیوں کے بل سجدے میں گر پڑے) دونوں جگہ ''ل'' ''علیٰ'' کے معنی میں ہے۔
سوال: آیت '' وَكُلًّا نَّقُصُّ عَلَيْكَ مِنْ اَنْۢبَآءِ الرُّسُلِ مَا نُثَبِّتُ بِهٖ فُؤَادَكَ '' (اور سب چیز بیان کرتے ہیں ہم تیرے پاس رسولوں کے احوال سے جس سے تسلی دیں تیرے دل کو اور آیت '' وَرُسُلًا قَدْ قَصَصْنٰهُمْ عَلَيْكَ مِنْ قَبْلُ وَرُسُلًا لَّمْ نَقْصُصْهُمْ '' میں بظاہر تعارض ہے تطبیق کی

کیا صورت ہوسکتی ہے؟۔

جوابِ اوّل: پہلی آیت کا مطلب یہ ہے کہ ہم رسولوں کے احوال سے جو کچھ آپ کے سامنے بیان کرتے ہیں اس کے ذریعے آپ کے دل کو مضبوط کرتے ہیں۔ "مَا نُثَبِّتُ فُؤَادَکَ" میں لفظ ما حالتِ رفعی میں ہے مبتداء محذوف کی خبر ہے وہ ہے لفظ "ھو"۔ تو اس صورت میں آیت سے تمام انبیاء کے اخبار واحوال بیان کرنا مقصود نہیں ہے۔ لہٰذا کوئی تعارض بھی نہیں ہے۔

جوابِ ثانی: "کلاً" میں لفظ کل سے کل مراد نہیں بلکہ بعض مراد ہے جیسا کہ قرآن کریم کی متعدد آیات میں "کل" بعض کے معنی میں مستعمل ہوا ہے جیسا کہ آیت: "ثُمَّ اجْعَلْ عَلٰی کُلِّ جَبَلٍ مِّنْهُنَّ جُزْءًا" دوسری آیت "وَجَآءَهُمُ الْمَوْجُ مِنْ كُلِّ مَكَانٍ اور اُوْتِیَتْ مِنْ کُلِّ شَیْءٍ۔ اور آیت "کُلَّ اِنْسَانٍ اَلْزَمْنٰهُ طٰٓئِرَهٗ فِیْ عُنُقِهٖ" وغیرہ آیات ہیں اسی طرح "لبید" کا شعر

اَلَا کُلُّ شَیْءٍ مَا خلا اللّٰہ باطل ☆ وکُلُّ نَعِیْمٍ لا مَحَالَۃَ زَائِلُ

خبردار: اللہ تعالیٰ کے سوا ہر شی باطل ہے۔ ہر نعمت لامحالہ زائل ہونے والی ہے۔

حالانکہ بہت سے ماسوا اللہ حق بھی ہیں، جیسا کہ نبی علیہ السلام، ایمان، جنت وغیرہ اسی طرح جنت کی نعمتیں زائل ہونے والی نہیں ہیں تو معلوم ہوا ان تمام مقامات پر لفظ "کل" بعض کے معنی میں استعمال ہوا ہے اسی طرح مذکورہ آیت کے اندر ہوا۔

سوال: "وَجَآءَکَ فِیْ هٰذِهِ الْحَقُّ" (اور آئی تیرے پاس اس سورۃ میں تحقیقی بات)۔ حق کو اس سورت کے ساتھ خاص کیوں کیا گیا حالانکہ قرآن کریم کی ہر سورت میں حق ہی آیا ہے؟۔

جوابِ اوّل: اس کی وجہ اس سورۃ کو مزید فضیلت وشرافت دینا ہے دوسری سورتوں کے اس میں مشارکت کے ساتھ ساتھ بھی اس حق جیسا کہ فرمانِ الٰہی اَنَّ الْمَسَاجِدَ لِلّٰہِ (تمام مسجد اللہ کی ہیں) اور آیت "وَمَلٰٓئِکَتِهٖ وَجِبْرِیْلَ وَمِیْکٰلَ اور حَافِظُوْا عَلَی الصَّلَوٰتِ کے بعد وَالصَّلٰوۃِ الْوُسْطٰی" لانا ان کی مزید خصوصیت اور تشریف کے لئے ہے۔

جوابِ ثانی: بعض حضرات نے کہا: "فی هذه الحق" میں "هذه" کا مشار الیہ سورۃ نہیں ہے بلکہ اس کا مشار الیہ "الدنیاء" ہے۔ البتہ جمہور علماء ومفسرین "هذه" کا مرجع السورۃ ہی قرار دیتے ہیں۔

اور اس سورۃ کو دوسری سورتوں پر خصوصیت دینے کی وجہ یہ قرار دینا کہ اس میں موجود آیت "وَاسْتَقِمْ کَمَآ اُمِرْتَ" (استقامت اختیار کیجئے جیسا کہ آپ کو حکم دیا گیا) میں استقامت کا ذکر

ہوا ہے اور عارفین کے نزدیک استقامت اعلیٰ مقام ہے درست نہیں۔ اس لئے کہ یہ آیت سورۃ "ہود" کے علاوہ دوسری جگہ بھی آیا ہے جیسا کہ حٰمٓعسٓقٓ میں فرمان خداوندی ہے "فَاسْتَقِمْ كَمَآ اُمِرْتَ وَلَا تَتَّبِعْ اَهْوَآءَهُمْ" تو یہ اس تخصیص کی علت نہیں ہو سکتی۔

## سورۃ یوسف

سوال: "اِنِّىْ رَاَيْتُ اَحَدَ عَشَرَ كَوْكَبًا وَّالشَّمْسَ وَالْقَمَرَ" (میں نے گیارہ ستاروں کو اور سورج کو اور چاند کو دیکھا) فرمایا گیا: "ثلاثة عَشَرَ كَوْكَبًا" میں نے تیرہ ستارے دیکھے) نہیں فرمایا' حالانکہ یہ مختصر بھی ہے؟۔

جواب: "والشمس والقمر" کو کواکب پر عطف کر کے علیحدہ طور پر ان کا نام لینے سے ستاروں پر ان کی فضیلت اور افادیت کو بیان کرنا مقصود ہے' یہ بالکل ایسا ہے جیسا کہ ملائکہ پر جبریل اور میکائیل کو عطف کر کے علیحدہ بیان کرنا اور "حَافِظُوْا عَلَى الصَّلَوٰتِ" پر والصلوٰۃ الوسطٰی کو عطف کر کے علیحدہ ذکر کرنا ان کی افادیت اور خصوصیت بیان کرنے کے لئے ہے۔ اس طرح یہاں بھی دوسرے تمام ستاروں پر شمس و قمر کو فضیلت دینے کے لئے ان دونوں کا مستقل بیان کیا۔

سوال: "رَاَيْتُهُمْ لِىْ سٰجِدِيْنَ" (میں نے ان کو اپنے سامنے سجدہ ریز ہوتے دیکھا) میں رؤیت کو مکرر لانے کا کیا فائدہ؟۔

جواب: علامہ زمخشری نے فرمایا ہے: یہاں رؤیت کا تکرار نہیں ہے بلکہ یہ نیا کلام ہے حضرت یعقوب علیہ السلام کی طرف سے پیدا ہونے والے ایک سوال مقدر کا جواب ہے' جب حضرت یوسف علیہ السلام نے کہا میں نے گیارہ ستاروں' چاند سورج کو دیکھا تو سوال پیدا ہوا ان کو کس حالت دیکھا؟ تو جواب دیا "رَاَيْتُهُمْ لِىْ سٰجِدِيْنَ" ان کو سجدہ کرنے کی حالت میں دیکھا۔ علامہ زجاج نے فرمایا: "فعل رؤیت" کا تکرار کلام کے طویل ہونے کی وجہ سے تاکید کے لئے کیا۔ جیسا کہ اس آیت "هُمْ عَنِ الْاٰخِرَةِ هُمْ غٰفِلُوْنَ" وَهُمْ بِالْاٰخِرَةِ كٰفِرُوْنَ" میں "ھم" کا تکرار ہے' بعض مفسرین نے فرمایا: تکرار فعل اس خواب کی عظمت کو بیان کرنے کے لئے ہے۔

سوال: ستاروں کو عقلاء کے درجے میں لا کر "ھم" کی ضمیر کیوں لائے؟ حالانکہ وہ غیر عاقل ہیں لہٰذا "رَاَيْتُهَا" کہنا چاہئے تھا۔

جواب: جب ان کی صفت "ساجدین" (جو عقلاء کی صفت ہے) بیان کی تو ان کو بھی عقلاء کا درجہ دیا۔ کلام عرب میں یہ طریقہ شائع ذائع ہے۔ قرآن کریم میں بھی اس کی نظیر ملتی ہے' جیسا کہ

آیت: " قَالَتْ نَمْلَةٌ يٰٓاَيُّهَا النَّمْلُ ادْخُلُوْا " میں نمل غیر عاقل کے لئے "ادخلوا" کا صیغہ استعمال کیا ہے۔

اس طرح ارض وسماء کے متعلق فرمایا گیا: " قَالَتَآ اَتَيْنَا طَآئِعِيْنَ " یعنی آسمان وزمین کے لئے طائعین جمع مذکر سالم کا صیغہ جو عقلاء کے لئے استعمال ہوتا ہے لایا گیا۔

سوال: " نرتع ونلعب " (ہم کھلیں گے) جب یعقوب علیہ السلام کے بیٹوں نے کھیلنے کی اجازت طلب کی حالانکہ وہ عاقل بالغ تھے اور بعض کے قول کے مطابق نبی بھی تھے تو حضرت یعقوبؑ نے انہیں اجازت کیوں دی؟۔

جواب: اس میں ایک قراءت " يَرْتَعْ وَيَلْعَبْ " بھی ہے یعنی وہ (یوسف) کھیلے گا اس صورت میں کوئی اشکال نہیں ہے' اس لئے کہ بچے کے لئے کھیلنے کی اجازت ہے۔ نرتع کی قراءت کے مطابق جواب یہ ہوگا۔ وہ ناجائز کھیل نہیں کھیلتے تھے بلکہ بھاگنے میں مقابلہ' تیر اندازی میں مسابقت کرتے تھے یہ دونوں نہ صرف جائز ہیں بلکہ جہاد کی تیاری اور دشمنوں کے ساتھ مقابلہ کرنے کے لئے خود کو ان چیزوں کی عادت ڈلوانا محمود اور مستحسن امر ہے۔ اور " اِنَّا ذَهَبْنَا نَسْتَبِقُ " سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے؟ چونکہ یہ صورت کھیل کی طرح ہے' اس لئے لعب کا لفظ اختیار کیا گیا۔

سوال: حضرت یعقوب علیہ السلام کے بیٹوں نے یوسف علیہ السلام کو اپنے ساتھ لے جانے کی جب اجازت طلب کی تو حضرت یعقوب علیہ السلام نے دو عذر بیان کئے۔ (۱) یہ کہ جب تم اس کو ساتھ لے جاوگے تو میں سخت غمگین ہوں گا حضرت یعقوب علیہ السلام ان کے بغیر ایک لمحہ بھی نہیں رہ سکتے تھے۔

(۲) دوسرا عذر یہ بیان کیا کہ کہیں بھیڑیا اس کو نہ کھاجائے۔ تو بیٹوں نے دوسرے عذر کا جواب دیا۔ پہلے کا جواب نہ دیا۔ کیوں؟

جواب: سارا جھگڑا ہی اس بات پر تھا کہ حضرت یعقوب علیہ السلام کی محبت یوسف علیہ السلام کے ساتھ زیادہ تھی۔ دوسرے بیٹوں پر ان کو ترجیح دیتے تھے۔ ان کے بغیر ایک گھڑی بھی نہیں رہ سکتے۔ یہی ان کے غیظ وغضب میں اضافے کا باعث اور ان کے لئے تکلیف کا سبب تھا۔ اس لئے اس کو سرے سے ذکر نہیں کیا اور جواب بھی نہیں دیا۔

سوال: " وَاَوْحَيْنَآ اِلَيْهِ " (اور ہم نے یوسف کی طرف وحی بھیجی) اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں۔ ہم نے ان کی طرف وحی بھیجی۔ حالانکہ اس وقت حضرت یوسف علیہ السلام بالغ بھی نہیں ہوئے تھے۔ جبکہ

وحی چالیس سال کی عمر بعد آتی ہے۔؟
جواب: اس وحی سے مراد وحی الہام ہے وحی رسالت نہیں۔ چالیس سال کے بعد وحی رسالت آتی ہے۔ الہام پر بھی وحی کا اطلاق ہوتا ہے۔ جیسا کہ فرمان الٰہی ہے: "وَاَوْحَیْنَا اِلٰی اُمِّ مُوْسٰی اَنْ اَرْضِعِیْهِ" اور آیت "وَاَوْحٰی رَبُّکَ اِلَی النَّحْلِ" دونوں جگہ وحی سے الہام مراد ہے۔
سوال: حضرت یوسف علیہ السلام کے متعلق اللہ تعالیٰ نے فرمایا: "وَلَمَّا بَلَغَ اَشُدَّهٗ اٰتَیْنٰهُ حُکْمًا وَّعِلْمًا" (اور جب پہنچ گیا اپنی قوت کو دیا ہم نے اس کو حکم اور علم) اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بارے فرمایا: "وَلَمَّا بَلَغَ اَشُدَّهٗ وَاسْتَوٰی اٰتَیْنٰهُ حُکْمًا وَّعِلْمًا" (اور جب پہنچ گیا اپنی قوت کو اور برابر ہو گیا دیا ہم نے اس کو حکم اور علم) حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بارے میں "واستوی" فرمایا اور حضرت یوسف علیہ السلام کے متعلق کیوں نہیں فرمایا؟۔
جواب: قوت کو پہنچنے سے مراد چالیس سال سے کم عمر ہے اور "استوی" سے مراد چالیس سال یا اس سے زیادہ کی عمر ہے اور ان سے ہر ایک کو حکم اور علم دینا اس زمانے کے اعتبار سے ہے۔ اس کو بیان کیا گیا۔
سوال: "وَغَلَّقَتِ الْاَبْوَابَ" میں "ابواب" کو جمع اور "وَاسْتَبَقَا الْبَابَ" (وہ دونوں دروازے کی طرف بھاگے) میں الباب کو واحد لانے کی وجہ کیا ہے؟
جواب: احتیاط کے لئے تمام دروازوں کو بند کیا جاتا ہے۔ تمام دروازوں کو بند کئے بغیر مکمل احتیاط نہیں ہو سکتا۔ اور بھاگنا پہلے ایک دروازے پھر دوسرے دروازے کی طرف ہوتا ہے۔ اور یوسف علیہ السلام بھاگتے وقت لازمی طور پر پہلے قریب تر دروازے کی طرف گئے ہوں گے۔ پھر دوسرے اس کے بعد تیسرے دروازے کی طرف اس لئے اول نکلنا قریب دروازے سے ہے۔ اسی لئے اس کو واحد لائے۔
سوال: اللہ تعالیٰ نے کیسے فرمایا: "وَشَهِدَ شَاهِدٌ" (اور گواہی دی ایک گواہ نے) حالانکہ بولنے والے بچے کے الفاظ میں شہادت کے الفاظ نہیں تھے۔
جواب: اس قول سے حضرت یوسف علیہ السلام کی بات کی تصدیق اور زلیخا کے قول کا بطلان ہو رہا تھا۔ اس لئے "شہادت" کے لفظ سے تعبیر فرمایا۔ دوسرا جواب یہ ہے یہاں "شهد" کا معنی بیان کرنا اور سمجھانا ہے۔
سوال: "وَاِنْ کَانَ قَمِیْصُهٗ قُدَّ مِنْ دُبُرٍ فَکَذَبَتْ وَهُوَ مِنَ الصّٰدِقِیْنَ" (اور اگر کرتا اس کا پھٹا پیچھے سے تو یہ جھوٹی ہے اور وہ سچا ہے) آیت دلالت کر رہی ہے کہ زلیخا جھوٹی ہے اور وہی ان

کے پیچھے چلی اوران کی قمیص پیچھے سے کھینچی اور وہ پھٹ گئی۔ پیچھے سے قمیص پھٹنے سے زلیخا کا جھوٹا ہونا کیسے ثابت ہوا؟۔

جواب: تصدیق دو وجہ سے ہوتی ہے۔

وجہ اوّل: اگر بالفرض یوسف علیہ السلام "زلیخا" سے دست درازی کی کوشش کرتے اور ہاتھاپائی ہوتی تو یوسف علیہ السلام کی قمیص آگے سے پھٹتی۔

وجہ ثانی: اگر بالفرض "زلیخا" خود کو بچانے کے لئے بھاگتی اور یوسف علیہ السلام اس کے پیچھے پیچھے بھاگتے۔اور کرتا کسی چیز میں پھنستا اور پھٹ جاتا۔

سوال: " وَقَالَتِ اخْرُجْ عَلَيْنَا" میں "اُخرج" کے صلہ میں "علی" کیسے لایا۔حالانکہ خرج کا صلہ "الی" ہوتا ہے؟۔

جواب: خروج اگر غصے غلبے یا جمال وزینت یا کسی امر عظیم کی وجہ سے ہو تو "علی" کے ذریعے بھی متعدی ہوسکتا ہے۔جیسا کہ اہل عرب کہتے ہیں:" خَرَجَ علينا فی سفرنا قطاع الطریق" ہمارے سفر کے دوران ڈاکو ہمارے سامنے آگئے۔قرآن کریم میں بھی اس طرح آیا ہے جیسا کہ آیت:" فَخَرَجَ عَلٰى قَوْمِهٖ فِیْ زِيْنَتِهٖ "اس طرح "فَخَرَجَ عَلٰى قَوْمِهٖ مِنَ الْمِحْرَابِ" میں دونوں جگہ خروج کے صلہ میں "علی" آیا ہے۔

سوال: مصر کی عورتوں نے:" مَا هٰذَا بَشَرًا اِنْ هٰذَآ اِلَّا مَلَكٌ كَرِيْمٌ "(یہ شخص آدمی نہیں ہے یہ تو کوئی بزرگ فرشتہ ہے) کہہ کر یوسف علیہ السلام کو فرشتہ کے ساتھ تشبیہ کیسے دی؟ حالانکہ وہ فرشتوں کو بھی دیکھا تک نہیں۔ان دیکھے تشبیہ دینا کیسے درست ہوگا؟۔

جوابِ اوّل: فرشتوں کو اگرچہ دیکھا نہیں لیکن ان کی صفات سے تو واقف تھیں اور ان کے متعلق معلومات تو رکھتی تھیں۔

جوابِ ثانی: اللہ تعالیٰ نے انسانی طبیعتوں میں فرشتوں کی اچھائی کو بھی اسی طرح جاگزین کیا ہے جیسا کہ شیطان کی قباحت کو دل میں ڈالدیا ہے۔یہی وجہ ہے ہر انتہائی خوبصورت چیز کو فرشتہ کے ساتھ اور ہر قبیح ترین چیز کو شیطان کے ساتھ تشبیہ دی جاتی ہے۔

سوال: یوسف علیہ السلام نے کیسے فرمایا" اِنِّیْ تَرَكْتُ مِلَّةَ قَوْمٍ لَّا يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَهُمْ بِالْاٰخِرَةِ هُمْ كٰفِرُوْنَ "(میں نے چھوڑا دین اس قوم کا کہ وہ ایمان نہیں لاتے اللہ پر اور آخرت سے وہ لوگ منکر ہیں) حالانکہ "ترک" کہتے ہیں کسی کام کے ارتکاب کے بعد اس کو چھوڑنے کو ۔جیسا کہ کہتے ہیں فلاں نے شرابِ پینا چھوڑ دیا، سوُر کھانا چھوڑ دیا جبکہ حضرت یوسف علیہ السلام

کبھی بھی ملت کفر میں نہیں تھے؟۔
جواب: ترک کی دو قسمیں ہیں۔(۱) کسی کام کو کرنے کے بعد اسے چھوڑنا' اس ترک کو ترک انتقال کہتے ہیں۔(۲) کسی کام کو شروع ہی سے نہ کرنا' اس کو ترک اعراض کہا جاتا ہے۔ جیسا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے متعلق اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے"وَيَذَرَكَ وَاٰلِهَتَكَ "اور تجھ کو اور تیرے معبودوں کو چھوڑ دیگا حالانکہ موسیٰ علیہ السلام نے کسی وقت بھی فرعون یا اس کے معبودوں کی عبادت نہیں کی ہے' لہٰذا مذکورہ آیت میں ترک سے مراد ترک اعراض ہے کہ نہ ترک انتقال۔
اس کی نظیر سورۂ ابراہیم میں" اَوْ لَتَعُوْدُنَّ فِیْ مِلَّتِنَا " ہے۔
سوال:" اَمَرَ اَنْ لَّا تَعْبُدُوْا اِلَّا اِيَّاهُ "(اس نے حکم دیا نہ پوجو مگر اسی کو) اس میں امر کی تفسیر نہی سے کی گئی ہے۔ یا جزو نہی سے کی گئی ہے۔ حالانکہ امر اور نہی آپس میں متضاد ہیں۔(امر حکم دینے کو اور نہی روکنے کو کہتے ہیں)۔
جوابِ اوّل: یہاں ایک لفظ امراً محذوف ہے۔ تقدیر عبارت یوں ہے۔" امرا امرا اقتضی ان لا تعبدوا الا ایاہ" یعنی اللہ تعالیٰ نے ایک حکم دیا جسکا مقتضی یہ ہے کہ صرف اس کی عبادت کی جائی اور حکم یہ ہے" فَاِيَّایَ فَاعْبُدُوْنِ " خاص میری ہی عبادت کرو۔ یہاں مفعول کے مقدم ہونے سے حصر پیدا ہوا (اس لئے کہ تقدیم ما حقہ تاخیر حصر کا فائدہ دیتی ہے) جیسا کہ" اِيَّاكَ نَعْبُدُ وَاِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ " ہے ہم خاص تیری ہی عبادت کرتے ہیں اور تجھ ہی سے مدد طلب کرتے ہیں۔
جوابِ ثانی:" اَمَرَ" کے بعد" نَهٰى " محذوف ہے' تقدیر عبارت یوں ہے۔" امر ونہی " پھر امر اور نہی کی علیحدہ علیحدہ تفسیر" اَنْ لَّا تَعْبُدُوْا اِلَّا اِيَّاهُ" اور" فَاِيَّایَ فَاعْبُدُوْنِ " سے کی۔
جوابِ ثالث: لفظ" اَنْ لَّا تَعْبُدُوْا "اگرچہ لفظاً نہی ہے مگر من حیث المعنی امر ہے۔
سوال: حضرات انبیاء کرام تمام لوگوں سے بڑھ کر آخرت کی فکر کرنے والے اور دنیاوی مناصب کو ترک کرنے والے ہوتے ہیں۔ تو حضرت یوسف علیہ السلام نے یہ کیوں فرمایا:" قَالَ اجْعَلْنِیْ عَلٰى خَزَآئِنِ الْاَرْضِ "(حضرت یوسف علیہ السلام نے کہا:"مجھ کو مقرر کر ملک کے خزانوں پر"۔ آپؑ نے ملک کے خزانوں کے متولی ہونے کا مطالبہ کیا یہ تو بہت بڑا دنیاوی منصب ہے۔
جواب: یوسف علیہ السلام نے اس منصب پر فائز ہونے کا مطالبہ اس لئے کیا تا کہ اس کے ذریعے سے اللہ تعالیٰ کے احکامات کو نافذ کرنے اور عدل وانصاف قائم کرنے پر قادر ہو جائیں۔ جو انبیاء کرام کی بعثت کے مقاصد میں سے ہے۔ اور اس بات کو یقین کی حد تک جاننے کی وجہ سے

کہ یہ کام اس کے علاوہ کسی اور صحیح طریقے سے سرانجام نہیں دیا جاسکتا۔ لہٰذا حضرت یوسف علیہ السلام کا یہ مطالبہ کرنا اللہ کی رضامندی اور اللہ تعالیٰ کے بندوں کو نفع پہنچانے اور ان کی مصلحتوں کے لئے تھا۔ ملک و منصب اور حب دنیا کے لئے نہیں تھا۔ اس کی تائید اللہ تعالیٰ کے اس قول سے ہوتی ہے، فرماتے ہیں: "وَلَوْ كُنْتُ اَعْلَمُ الْغَيْبَ لَاسْتَكْثَرْتُ مِنَ الْخَيْرِ" یعنی اگر میں غیب جانتا ہوتا کہ قحط کب آئے گا تو قحط کے زمانے کے لئے بہت کچھ کھانے پینے کی اشیاء جمع کر لیتا۔ یہ جمع کرنا مالی لالچ اور حرص کی وجہ سے نہیں۔ بلکہ ضرورت و تنگدستی کے زمانے میں فقیروں محتاجوں اور ضعیفوں کی اشک شوئی اور مدد کے لئے ہے۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ اس کا علم صرف انہیں کے پاس ہو۔ اور کسی کے پاس نہ ہونے کی وجہ سے اس کا مطالبہ کرنا ان پر واجب ہو۔

**سوال:** یوسف علیہ السلام کے لئے کیسے جائز ہوا کہ وہ اعلان کرنے والے سے یہ اعلان کرائیں: "اَيَّتُهَا الْعِيرُ اِنَّكُمْ لَسٰرِقُوْنَ" (اے قافلہ والو! تم تو البتہ چور ہو) یہ تو کھلا بہتان ہے۔ غیر چور کو چور کے نام سے پکارنا اور بے ضرر شخص کو جھٹلانا ہے۔

**جوابِ اوّل:** "اِنَّكُمْ لَسٰرِقُوْنَ" کا یہ لفظ بطورِ توریہ تھا۔ کہ انہوں نے حضرت یوسفؑ کے ساتھ جو کچھ کیا تھا وہ ایک طرح چوری کا فعل تھا۔ ان کے اس فعل کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ان کو "سارق" کے لفظ کے ساتھ پکارا گیا۔

**جوابِ ثانی:** یہ اعلان اعلان کرنے والے شخص کے الفاظ تھے حضرت یوسفؑ کے الفاظ نہیں تھے۔

**جوابِ ثالث:** یہ حیلہ شرعیہ ہے۔ جس کے ذریعے ضروری مصلحتوں اور منافع دینیہ تک رسائی ہوتی ہے۔ جیسا کہ حضرت ایوبؑ کے متعلق فرمان الٰہی ہے: "وَخُذْ بِيَدِكَ ضِغْثًا فَاضْرِبْ بِهٖ وَلَا تَحْنَثْ" (اور پکڑ اپنے ہاتھ میں سینکوں کا مٹھا پھر ان سے مارلے اور تم میں جھوٹا نہ ہوئیں ہے) اسی طرح حضرت ابراہیم علیہ السلام کا کافر بادشاہ کے ہاتھ سے بچانے کے لئے اپنی بیوی کو میری بہن کہنا وغیرہ۔

**سوال:** "يَا اَسَفٰى عَلٰى يُوْسُفَ" (اور بولا اے افسوس! یوسف پر) حضرت یعقوب علیہ السلام نے بنیامین کے نہ آنے پر افسوس نہیں کیا۔ بلکہ یوسفؑ پر افسوس کیا۔ حالانکہ نئی مصیبت پرانی مصیبت کے مقابلے میں نفس پر زیادہ اثر انداز ہوتی ہے؟

**جواب:** نئی مصیبت پرانی سے زیادہ شدید اس وقت ہوتی ہے جب دونوں برابر ہوں۔ یہاں معاملہ ایسا نہیں۔ بلکہ یوسف کی گم شدگی پر زمانہ دراز گذرنے کے باوجود غم تازہ تھا۔

**سوال:** اللہ تعالیٰ نے کیسے فرمایا: "وَابْيَضَّتْ عَيْنٰهُ مِنَ الْحُزْنِ" (ان کی آنکھیں غم سے سفید

ہو گئیں) حالانکہ غم سے آنکھوں کا سفید ہونا ثابت نہیں ہوتا۔ نہ طب کے رو سے اور نہ ہی عقل کے اعتبار سے۔

جواب: حضرت عبداللہ بن عباسؓ نے "مِنَ الْحُزْنِ" کی تفسیر "ای من البکاء (رونے کی وجہ سے) سے کی ہے یعنی حزن کی وجہ سے رونا پڑتا ہے رونے سے آنکھیں خراب ہوتی ہیں۔ اور کثرت بکاء سے آنکھ کی سیاہی جاتی رہتی ہے حضرت یعقوب علیہ السلام کے ساتھ بھی یہی کچھ تھا۔

سوال: حضرت یعقوب علیہ السلام نے کیسے فرمایا: "اِنَّهٗ لَا يَايْئَسُ مِنْ رَّوْحِ اللّٰهِ اِلَّا الْقَوْمُ الْكٰفِرُوْنَ" (بے شک ناامید نہیں ہوتے اللہ کے فیض سے مگر وہی لوگ جو کافر ہیں) حالانکہ بعض ایمان والے بھی شدید مصیبت میں مبتلا ہو کر یا گناہوں کی کثرت کی وجہ سے اللہ کے فیض سے ناامید ہوتے ہیں۔ جیسا کہ حدیث شریف میں آتا ہے کہ ایک شخص نے مرتے وقت اپنے گھر والوں کو حکم دیا کہ مرنے کے بعد اس کو جلا کر اس کی راکھ سمندر اور خشکی میں پھیلا دیں۔ چنانچہ اس کے مرنے کے بعد اس کے ورثاء نے ایسا ہی کیا۔ پھر اللہ تعالیٰ نے اس کی بخشش کر دی جیسا کہ صحیح حدیث شریف میں مذکور ہے۔ اس شخص نے رحمت خداوندی سے ناامیدی ظاہر کی، اور اس ناامیدی کی وجہ سے ایک اور گناہ کر بیٹھا۔ وہ یہ کہ یہ عقیدہ رکھا کہ تم اگر اس کو جلا کر اس کی راکھ سمندروں اور ہوا میں پھیلا دی جائے تو اللہ تعالیٰ عذاب دینے پر قادر نہیں ہوں گے اور عذاب سے بچ جائے گا اس سب کچھ کے باوجود اسے معاف کیا گیا تو معلوم ہوا کہ وہ شخص ایمان کی حالت میں مرا ہے نہ کہ کفر کی حالت میں۔

جواب: ظاہر آیت کا تقاضا یہی ہے کہ اللہ کی رحمت سے مایوسی کفر ہے۔ لہٰذا جس مؤمن سے اللہ سے ناامیدی متحقق ہو جائے وہ کافر ہوگا جب تک کہ دوبارہ اللہ تعالیٰ کی رحمت سے پر امید ہو کر دوبارہ حلقہ بگوشِ اسلام نہ ہو جائے۔ اور حدیث شریف میں جس شخص کی مغفرت کا ذکر اوپر کیا گیا ہے کہ ہم نہیں مانتے وہ اللہ کی رحمت سے ناامید ہو کر کافر نہیں ہوا۔ بلکہ جب اللہ تعالیٰ نے اس کو دوبارہ دنیا میں پیدا کیا تو وہ رحمتِ خداوندی پر یقین کرتے ہوئے دوبارہ مسلمان ہوا۔ اسی وجہ سے اس کی مغفرت ہوئی۔ اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ موت سے کچھ دیر قبل رحمت الٰہی سے پر امید ہوا ہو اور اپنی وصیت سے رجوع کرنے کا موقع نہ ملا ہو۔ اور حالتِ اسلام میں مرا ہو۔

سوال: "وَخَرُّوْا لَهٗ سُجَّدًا" (اور سب گر گئے ان (یوسف علیہ السلام) کے سامنے سجدہ میں) غیر اللہ کے سامنے سجدہ کرنا ان کے لئے کیسے جائز ہوا؟۔

جوابِ اوّل: ہو سکتا ہے یہ سجدہ سجدۂ تعظیمی و تکریمی ہو۔ جیسا کہ ہم کسی کی عزت و تکریم کے لئے

کھڑے ہوتے ہیں اور مصافحہ کرتے ہیں۔

جوابِ ثانی: یہ پیشانی کو زمین پر رکھ کر سجدہ نہیں تھا۔ بلکہ رکوع کی مانند محض جھکنا تھا۔ مگر لفظ خرَّ اس جواب کے منافی ہے۔ جہاں تک "خَرَّ رَاكِعًا" کا تعلق ہے اس سے مراد رکوع نہیں سجدہ ہے۔ جیسا کہ "وَارْكَعُوا مَعَ الرّٰكِعِيْنَ" میں رکوع سے مراد نماز ہے۔

جوابِ ثالث: بقول بعض علماء یہ ہے کہ "خَرُّوْا لَهٗ" میں "ل" تعدیہ کے لئے نہیں ہے بلکہ "ل" سببیہ ہے۔ یعنی حضرت یوسف کی وجہ سے اللہ تعالیٰ کی تمام نعمتوں کے شکرانے کے لئے اللہ کے سامنے سجدہ ریز ہو گئے۔

جوابِ رابع: بعض نے کہا: کہ "لَهٗ" میں ضمیر اللہ تعالیٰ کی طرف لوٹ رہی ہے۔ یعنی اللہ کے سامنے سجدہ میں گر گئے۔ مگر اگلی آیت "يٰۤاَبَتِ هٰذَا تَاْوِيْلُ رُءْيَایَ مِنْ قَبْلُ قَدْ جَعَلَهَا رَبِّيْ حَقًّا" ابا جان! یہ بیان ہے میرے اس پہلے خواب کا۔ اس کو میرے رب نے سچ کر دیا) اس جواب کی مساعد نہیں۔

سوال: حضرت یوسف علیہ السلام نے جیل سے نکلنے کی نعمت کو ان الفاظ "وَقَدْ اَحْسَنَ بِيْۤ اِذْ اَخْرَجَنِيْ مِنَ السِّجْنِ" (اس (اللہ) نے انعام کیا مجھ پر جب مجھ کو نکالا قید خانے سے) سے ذکر کیا، مگر کنویں سے نکلنے کی نعمت عظمیٰ کو بیان نہیں کیا، حالانکہ کنواں سے نکلنا جان بچنے کی وجہ سے سب سے بڑی نعمت ہے؟۔

جواب: قید خانہ سے خلاصی کی نعمت کا تذکرہ کرنا اور کنویں سے نجات پانے کی نعمت کو ذکر نہ کرنے کی چند وجوہ ہیں۔

پہلی وجہ: قید کی محنت و مشقت مدت کے طویل ہونے کی بنا پر کنویں کی تکلیف سے بڑھ کر ہے۔ اس لئے کہ قید خانے میں سالہا سال رہے۔ اور کنویں میں چند دن رہے۔

دوسری وجہ: کنویں کا تذکرہ اس لئے نہیں کیا کہ بھائیوں کو معاف کرنے کے بعد ان کے لئے توبیخ و تقبیح نہ ہو۔

تیسری وجہ: قید خانے سے نکلنا حکمرانی و عزت و شرف ملنے کا سبب بنا اور کنویں سے نکلنا غلامی اور قیدی کا پیش خیمہ ہوا اس لئے اس کا تذکرہ نہیں کیا۔

چوتھی وجہ: قید خانہ کی زندگی کنویں کی زندگی سے زیادہ دشوار اور مشکل تھی۔ اس لئے کہ اس میں اوباش رذیل لوگوں اور دین کے دشمنوں کے ساتھ مصاحبت تھی، جبکہ کنویں کی زندگی میں حضرت جبریل علیہ السلام اور دیگر ملائکہ کرام سے ملاقات تھی جس کی وجہ سے اُنس حاصل ہوتا۔

سوال: حضرت یوسف علیہ السلام نے "تَوَفَّنِیْ مُسْلِمًا" (اے اللہ حالتِ اسلام میں مجھے وفات دیجئے) کیسے فرمایا؟ جبکہ وہ اس کو جانتے تھے کہ ہر نبی اسلام ہی کی حالت میں مرتا ہے؟۔

جوابِ اوّل: ممکن ہے یہ الفاظ انتہائی خوف کے عالم میں فرمائے ہوں اور انتہائی شدید خوف کی وجہ سے یہ علم ذہول ہو گیا ہو۔

جوابِ ثانی: علم کے باجود ایسی دعا اس لئے کی تا کہ عبودیت ظاہر ہو اور خاتمہ کے صحیح ہونے کی طلب میں شدید رغبت ہو۔ اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ یہ اپنی امت کی تعلیم کے لئے ہو یا ثواب کے حصول کے لئے ہو۔

سوال: "وَمَا یُؤْمِنُ اَکْثَرُھُمْ بِاللّٰہِ اِلَّا وَھُمْ مُشْرِکُوْنَ" (اور نہیں ایمان لاتے اللہ پر بہت لوگ مگر ساتھ ہی شرک بھی کرتے ہیں)۔ ایمان اور شرک آپس میں ایک دوسرے کی ضد ہیں۔ ایک شخص مومن اور مشرک کیسے ہو سکتا ہے؟۔

جوابِ اوّل: مطلب یہ ہے کہ: نہیں ایمان لاتے ان میں سے اکثر اس بات پر کہ اللہ ان کا رازق اور خالق ہے اور زمین و آسمان کا خالق ہے۔ زبانی مسلمان ہوتے ہیں مگر بت پرستی کر کے اپنے فعل سے شرک کے مرتکب ہوتے ہیں۔

جوابِ ثانی: اس سے مراد منافقین ہیں۔ جو زبان سے ایمان لاتے ہیں مگر اعتقاد اور دل سے شرک کرتے ہیں۔

جوابِ ثالث: اس سے مراد اس وقت کے عرب کا تلبیہ ہے۔ یعنی وہ اپنے تلبیہ میں یہ کہا کرتے تھے: "لبیک لا شریک لک الا شریکا ھو لک تملکه وما ملک" تو اول تلبیہ میں شریک خداوندی کی کر کے ایمان کا اظہار اور آخر تلبیہ میں شریک ثابت کر کے شرک کرتے ہیں۔

اگر کوئی یہ کہے کہ یہ تلبیہ سارے کا سارا توحید پر مشتمل ہے۔ اس میں شرک نہیں ہے۔ اس لئے کہ ان کے قول "الا شریکا ھو لک تملکه" کا مطلب ہے "الا شریکا" ہو مملوک لک ہے یعنی ایسے شریک جن کے آپ مالک ہیں وہ آپ کا مملوک ہیں یعنی "لک" میں لام تملیک کے معنی میں ہے۔ برابری میں تعلق پیدا کرنے کے لئے نہیں ہے۔ الا شریکا میں بھی دو احتمال ہیں (۱) حقیقی استثناء ہو (۲) مجازی ہو پہلی صورت کی توضیح یہ ہے۔ اگر لام کو عام معنی یعنی اختصاص کے معنی میں لیں تو ان کے قول "لا شریک لک" اللہ تعالیٰ کے تمام شریکوں کی نفی ہو گی۔ چاہے برابری کی صورت میں۔ یا مملوکیت کی صورت میں پھر اس پر استثناء آجائے تو وہ استثناء استثناءِ حقیقی ہو گا۔ اور اگر "لک" کے لام کو اپنے تینوں معانی ملک، استحقاق، اختصاص اور

علیت میں مشترک مانیں تو بھی ان کا قول "لا شریک لک" عام ہوگا ان لوگوں کے نزدیک جو عموم مشترک کے قائل ہیں تو اس صورت میں بھی استثناء استثناءِ حقیقی ہوگا۔
اور جو لوگ عموم مشترک کے قائل نہیں ہیں تو اس وقت لام اپنے معانی میں سے کسی ایک معنی پر محمول ہوگا جو شرکت کے تعلق کے لئے ہوگا۔ اس صورت میں استثناء مجازی ہوگا جو مدح کی تاکید کے لئے ہوگا جو بظاہر مشابہ ذم ہے۔ یہ بھی بلاغت کی ایک قسم ہے جو علم بیان میں مذکور ہے۔ جیسا کہ مندرجہ ذیل شعر میں ہے۔ شعر:

ولا عیب فیھم غیران سیوفھم ☆ بھنّ فلول من قراع الکتائب

ان میں کوئی عیب نہیں سوائے اس کے کہ ان کی تلواریں فوجوں کے ساتھ ٹکرانے کی وجہ سے کند ہو گئیں ہیں۔
مطلب یہ ہے: اگر یہ عیب ہے تو ان میں یہ عیب موجود ہے حالانکہ یہ عیب نہیں ہے۔ تو ان میں بھی کوئی عیب نہیں ہے۔ اس طرح مسئلہ زیر بحث میں ہے کہ اگر تیرے مملوک کے اندر تیرے برابری کی صلاحیت ہے تو یہ تیرے شریک ہوں گے حالانکہ ان میں تیرے شریک بننے کی صلاحیت ہرگز نہیں، تو پھر تیرا شریک بھی کوئی نہیں، اس لئے کہ جو کوئی بھی آپ کا شریک ہونے کا دعوی کریگا وہ آپ کا مملوک ہے۔
جواب رابع: پہلی صورت کی بابت ہم کہیں گے یہ صحیح نہیں ہے۔ اس لئے کہ اگر ہم "لام" کو اس کے حقیقی معنی عام یعنی اختصاص پر محمول کریں گے تو اس سے کفر لازم آئے گا، اس طور پر کہ شریک کی نفی بغیر استثناء کے کی گئی۔

# سورۃ الرعد

سوال: "سَوَآءٌ مِّنكُم مَّنْ أَسَرَّ الْقَوْلَ وَمَن جَهَرَ بِهِ وَمَنْ هُوَ مُسْتَخْفٍ ۭ بِالَّيْلِ وَسَارِبٌ بِالنَّهَارِ" (برابر ہے تم میں جو آہستہ بات کہے اور جو کہے پکار کر، اور جو چھپ رہا ہے رات میں اور جو گلیوں میں پھرتا ہے دن کو) کیا وجہ ہے مَن ھو مستخف میں مَن لایا اور "سارِبٌ" سے پہلے مَن نہیں لایا۔ یعنی مَن ھو سارب نہیں فرمایا: حالانکہ اس صورت میں چھپنے اور ظاہر ہونے والے دونوں برابر ہوتے۔ اور ماقبل کے جملوں من اسرّ اور من جَھَرَ" کے ساتھ موافقت بھی ہوتی؟
جواب: "سَارِبٌ" کا عطف "مستخفٍ" پر نہیں ہے بلکہ "مَن" پر ہے۔ تو استواء کا معنی "مستخف" پر ہوا اور لفظ "مَن" "تثنیہ کے معنی میں ہے۔ یعنی دونوں کو شامل ہے، جیسا کہ اس

شعر میں ہے: ''نکن مثل من یاذئب یصطحبان'' (اے بھیڑیے! ہم ان دونوں کی طرح ہوں گے جو ایک ساتھ ہوتے ہیں) کہ یہاں لفظ من تثنیہ کے معنی میں ہے' اسی طرح آیت مذکورہ میں ہے یعنی تم میں سے رات کو چھپنے والا اور دن کو ظاہر ہونے والا دونوں برابر ہیں۔

سوال: اللہ تعالیٰ نے کیسے فرمایا: ''وَمَا دُعَآءُ الْكٰفِرِيْنَ اِلَّا فِيْ ضَلٰلٍ'' (اور جتنی پکار ہے کافروں کی سب گمراہی اور بے کار ہے)۔ حالانکہ سخت شدائد و خوفناک وقت میں بھی جب کفار دعا کرتے ہیں تو اللہ تعالیٰ ان کی دعاء قبول فرماتے ہیں؟۔

جواب: اس کا مطلب ہے کہ کفار جو بتوں کی عبادت کرتے ہیں وہ گمراہی ہے یعنی یہاں دعاء عبادت کے معنی میں ہے۔ اور آیت (وَالَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِهٖ) سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے۔ یہاں یدعون' یعبدون کے معنی میں ہے۔

سوال: ''لَوْلَآ اُنْزِلَ عَلَيْهِ اٰيَةٌ مِّنْ رَّبِّهٖ'' (کیوں نہ اتری اس پر کوئی نشانی اس کے رب کی طرف سے) اور آیت ''قُلْ اِنَّ اللّٰهَ يُضِلُّ مَنْ يَّشَآءُ وَيَهْدِيْٓ اِلَيْهِ مَنْ اَنَابَ'' (کہد ے اللہ گمراہ کرتا ہے جس کو چاہے اور راہ دکھلاتا ہے اپنی طرف اس کو جو رجوع کرے) میں مطابقت کیسے ہوگی۔

جواب: اصل یہ کلام تعجب کے قائم مقام ہے' یعنی تعجب کے معنی میں استعمال ہوا ہے' اس لئے کہ آپ ﷺ کو جو کثیر معجزات عطا کئے گئے ہیں۔ آپ سے پہلے کسی نبی کو اتنے معجزات سے نہیں نوازا گیا۔ صرف ایک قرآن معجزہ در معجزہ ہے' جب ان کفار نے آپ کے اس عظیم معجزے کو معجزہ ہی شمار نہیں کیا اور کہنے لگے کہ کوئی معجزہ آپ سے صادر نہیں ہوا تو یہ انتہائی تعجب کا مقام ہے۔ گویا ان سے یہ کہا گیا ہے کہ تمہارا عناد کتنا بڑا ہے؟ اور اپنے کفر پر تم کس طرح برقرار رہتے ہو؟۔

سوال: فرمانِ الٰہی: ''اَفَمَنْ هُوَ قَآئِمٌ عَلٰى كُلِّ نَفْسٍ ۢ بِمَا كَسَبَتْ'' (بھلا جو لئے کھڑا ہے ہر کسی کے سر پر جو کچھ اس نے کیا ہے)۔ اور آیت ''وَجَعَلُوْا لِلّٰهِ شُرَكَآءَ'' (اور اللہ کے ساتھ برابر ٹھہراتے ہیں) کے درمیان مطابقت کیسے ہوگی۔

جواب: اس میں کچھ محذوف ہے۔ تقدیر عبارت یوں ہے: ''افمن هو رقيب على كل نفس صالحة وطالحة يعلم ما كسبت من خير وشر وبعد لكل جزاء كمن ليس كذلك وهو صنم'' یعنی کیا وہ ذات جو ہر نفس نیک ہو یا بد کے ہر عمل کو جانتی ہے اور ہر عمل کا بدلہ اور سزا دے سکتی ہے' برابر ہو سکتی ہے اس چیز کے جو اس جیسی نہیں ہے۔ نہ جانتی ہے نہ سن سکتی ہے ہرگز برابر نہیں ہو سکتی۔ یہ بیان کرنے کے بعد کفار کے بارے فرمایا کہ یہ کفار اللہ تعالیٰ کے لئے شریک

ٹھہراتے ہیں، یا تقدیر عبارت یوں ہوگی" افمن کان بهذه الصفة يغفل عن اهل مكة"
یعنی جو ذات ان عظیم صفات سے متصف ہو کیا وہ اہل مکہ کے اقوال و افعال اور ان کی بت پرستی
سے غافل ہو سکتی ہے؟۔
سوال: فرمانِ الٰہی: " قُلْ اِنَّمَآ اُمِرْتُ اَنْ اَعْبُدَ اللّٰهَ " (مجھ کو یہی حکم ہوا ہے کہ بندگی کروں اللہ
کی) کا ماقبل آیت: " وَمِنَ الْاَحْزَابِ مَنْ يُّنْكِرُ بَعْضَهٗ " (اور بعض فرقے نہیں مانتے اس کی
بعض بات) کے ساتھ کیا جوڑ ہے؟۔
جواب: اصل میں یہ منکرین کو جواب ہے۔ مطلب یہ ہے کہ میرے پاس جو وحی آئی ہے اس میں
مجھے یہی حکم دیا گیا ہے کہ میں صرف ایک اللہ کی عبادت کروں اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ
ٹھہراؤں۔ ان کا بعض چیزوں کا انکار اللہ کی عبادت اور توحید کا انکار ہے، یہی جواب علامہ زمخشری
نے دیا ہے۔
سوال: اللہ تعالیٰ نے اپنے فرمان: " وَقَدْ مَكَرَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ " (اور فریب کر چکے ہیں جو
ان سے پہلے تھے) سے ان کے لئے مکر کو ثابت کیا اور اپنے فرمان: " فَلِلّٰهِ الْمَكْرُ جَمِيْعًا "
(سو اللہ کے ہاتھ میں ہے سب فریب) سے ان کے مکر کی نفی کی؟۔
جوابِ اوّل: اس کا مطلب یہ ہے کہ ماکرین کا مکر بھی اللہ کا پیدا کردہ ہے، سب کام اللہ کے
ارادے سے ہوتے ہیں۔ اسی وجہ سے اللہ کی طرف مکر کو منسوب کرنا درست ہوا۔
جوابِ ثانی: ان کی سازش و مکر کو اللہ کی تدبیر کے مقابلے میں گویا کالعدم قرار دیا، لہٰذا ان کے
لئے مکر کا اثبات باعتبارِ کسب اور ان سے اس کی نفی باعتبارِ خلق کے ہے۔

## سورۃ ابراہیم

سوال: آیت: " وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا بِلِسَانِ قَوْمِهٖ لِيُبَيِّنَ لَهُمْ " (اور کوئی رسول نہیں
بھیجا ہم نے مگر بولی بولنے والا اپنی قوم کی۔ تاکہ ان کو سمجھائے) یہ قول نبی کریم ﷺ کے علاوہ
دوسرے انبیاءِ کرام کے حق میں تو مناسب ہے۔ اس لئے کہ آپ ﷺ کے علاوہ دوسرے انبیاءِ
کرام تمام عالم کے لئے مبعوث نہیں ہوتے تھے۔ بلکہ اپنی اپنی قوم کے لئے مبعوث ہوتے تھے، تو
اسی قوم کی زبان میں انہیں پیغام پہنچاتے تاکہ وہ پیغامِ الٰہی کو سمجھ سکیں، اور پیغامِ الٰہی کو نہ سمجھنے کا
بہانہ نہ کر سکیں۔
جہاں تک نبی کریم ﷺ کا تعلق ہے۔ آپ تو تمام انسانوں کے لئے پیغمبر بنا کر بھیجے گئے

تمہ۔ارشادِ باری تعالیٰ ہے: "قُلْ يَا أَيُّهَا النَّاسُ إِنِّي رَسُولُ اللّٰهِ إِلَيْكُمْ جَمِيعًا" (آپ فرما دیجئے: اے لوگو! میں تم سب کے لئے پیغمبر بنا کر بھیجا گیا ہوں) دوسری آیت میں ارشاد ہے: "وَمَا أَرْسَلْنٰكَ إِلَّا كَافَّةً لِّلنَّاسِ" (ہم نے نہیں مبعوث کیا آپ کو مگر تمام انسانوں کے لئے) اگر یوں کہا جائے کہ آپ کو اپنی قوم عرب کی طرف ساتھ مبعوث کرنا اہلِ عرب کی حجت کو قطع کرنے کے لئے ہے تو عرب کے علاوہ دیگر انسانوں کی حجت تو جوں کی توں برقرار رہے گی؟۔

جوابِ اوّل: ایک زبان میں قرآن کا نزول تمام کے لئے کافی ہے۔ اس لئے کہ ترجمہ باقی زبان والوں کی ضرورت کو پورا کرتا ہے۔

جوابِ ثانی: ایک زبان میں نازل ہونا تحریف وتبدیل کے لئے بعید تر ہے اور نزاع سے محفوظ ہے۔

جوابِ ثالث: اگر تمام لوگوں کی زبانوں میں نازل ہوتا۔ اور ہر زبان میں معجزہ ہوتا اور نبی ہر قوم کی زبان میں ان سے کلام کرتے تو یہ ایک قسم کا مجبور کرنا ہوتا۔ انبیاء کرام کی بعثت کا مقصد کسی کو مجبور کر کے اسلام میں داخل کرنا نہیں بلکہ ہر ایک کو اختیار ہے۔ لہٰذا ایک زبان میں نازل ہونا کافی ہے تو بہتر ہے کہ اس زبان میں نازل ہو جو نبی کے قریب ترین لوگوں کی زبان ہے تا کہ ان کے قریب تر ہونے کی وجہ سے ان سے فیض یاب ہونے میں آسانی ہو۔

سوال: "وَيُذَبِّحُونَ أَبْنَاءَكُمْ" (اور آلِ فرعون ذبح کرتے تمہارے بیٹوں کو) سورۃ بقرہ میں "يُذَبِّحُونَ" اور سورۃ اعراف میں "يقتلون" بغیر واؤ کے لاتے اور یہاں "وَيُذَبِّحون" واؤ کے ساتھ لائے حالانکہ قصہ ایک ہی ہے؟۔

جواب: جہاں بغیر واؤ کے "يذبّحون" ہے وہاں ذبح اور قتل کو عذاب کی تفسیر و تفصیل کے طور پر لایا گیا ہے اور جہاں "واؤ" کے ساتھ لایا گیا ہے وہاں مستقل طور پر عذاب کو علیحدہ بیان کیا گیا ہے اس لئے اس کا مستقل عذاب ہونا زیادہ واضح ہے۔ اس لئے اس کے مکمل عذاب ہونے کو بیان کرنے کے لئے واؤ کو لایا گیا۔ جو زیادہ ابلغ ہے۔

سوال: فرمانِ باری تعالیٰ: "لِيَغْفِرَ لَكُمْ مِّنْ ذُنُوبِكُمْ" (تا کہ بخشے تم کو کچھ گناہ تمہارے) میں کچھ گناہ بخشنے کا کیا مطلب ہے؟۔

جوابِ اوّل: من تبعیضیہ کے ساتھ مغفرت صرف کفار سے خطاب میں آئی ہے جیسا کہ سورۂ نوح میں "يَغْفِرْ لَكُمْ مِّنْ ذُنُوبِكُمْ" اور سورۃ الاحقاف میں "يٰقَوْمَنَا أَجِيبُوا دَاعِيَ اللّٰهِ وَآمِنُوا بِهٖ يَغْفِرْ لَكُمْ مِّنْ ذُنُوبِكُمْ" (اے قوم میری مانو! اللہ کے بلانے والے کو اور اس پر یقین لاؤ کہ بخشے تم کو کچھ گناہ تمہارے) اور مومنین کے ساتھ خطاب میں بغیر تبعیض کے آیا ہے جیسا کہ

سورۃ الصف میں "يَآ اَيُّهَا الَّذِينَ اٰمَنُوا اتَّقُو اللّٰهَ وَقُولُوا قَوْلًا سَدِيْدًا يُصْلِحْ لَكُمْ اَعْمَالَكُمْ وَيَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوْبَكُمْ" ان آیات اور دوسری آیات میں مسلمانوں کے ساتھ خطاب میں مِن تبعیضیہ نہیں لائی گئی جبکہ اور خطاب کفار میں لائی گئی ہے۔

یہ صرف دونوں مخاطبین کے ساتھ خطابوں میں فرق بیان کرنے کے لئے کیا گیا۔ تا کہ وعدہ میں دونوں مخاطبین برابر نہ ہوں یہ مطلب نہیں کہ کفار کے کفر پر برقرار رہنے کے باوجود ان کے بعض گناہ معاف ہوں گے اس جواب کی تائید سورۂ نوح اور سورۃ الاحقاف کی ان آیتوں سے بھی ہوتی ہے کہ جن میں مغفرت کو ایمان کے ساتھ مشروط کیا گیا ہے۔

جوابِ ثانی: بعض گناہوں کو معاف کرنے کا مطلب ہے کہ حقوق اللہ میں کمی کے گناہ معاف ہوں گے اور حقوق العباد کے گناہ معاف نہیں ہوں گے۔

جوابِ ثالث: "مِنْ ذُنُوْبِكُمْ" میں لفظ "مِنْ" زائد ہے۔

سوال: پہلے فرمایا: "وَعَلَى اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُوْنَ" (اور اللہ پر بھروسہ چاہئے بھروسے والوں کو) توکل کو مکرر کیوں لایا گیا؟

جواب: پہلا امر توکل پیدا کرنے کے لئے ہے اور دوسرا امر توکل کو اپنے قلب ونظر میں جاگزیں کرنے کے لئے ہے۔ اسی بنا پر توکل کو دوبار استعمال کیا گیا۔

سوال: کفار نے رسولوں سے: "اَوْ لَتَعُوْدُنَّ فِيْ مِلَّتِنَا" (یا لوٹ آؤ ہمارے دین میں) کیوں کہا؟ عود تو سابقہ حالت کی طرف لوٹنے کو کہتے ہیں۔ اور رسولؑ کبھی بھی ملتِ کفر پر نہیں ہوتے تو لوٹنے کا کیا مطلب؟۔

جوابِ اوّل: لفظ "عود" کلام عرب میں اکثر تبدیلی کے معنی میں بھی مستعمل ہوتا ہے اہلِ عرب کہتے ہیں: "عاد فلان یکلمنی" فلاں شخص مجھ سے باتیں کرنے لگا "وعاد لفلان مال" "فلان کو مال مل گیا" جیسے الفاظ استعمال کرتے ہیں۔ قرآنِ کریم میں بھی "عود" اسی معنی میں استعمال ہوا ہے جیسا کہ "حَتّٰى عَادَ كَالْعُرْجُوْنِ الْقَدِيْمِ"۔

جوابِ ثانی: کفار نے اپنے زعم فاسد کے مطابق رسولوں کو خطاب کیا۔ کہ ان کے زعم کے مطابق رسول پہلے اپنی قوم کی ملت میں ہوتا ہے بعد میں اس سے پھر جاتا ہے۔

جوابِ ثالث: کفار نے رسولؑ اور ان پر ایمان لانے والے مومنین سب کو خطاب کیا۔ اور خطاب میں اکثریت کو واحد پر غلبہ دیا (یعنی امت پہلے اپنے کفریہ دین پر ہوتی ہے پھر اپنے دین کو چھوڑ کر نبی کے دین کی طرف منتقل ہو جاتی ہے)۔

اس آیت کی نظیر سورۃ الاعراف: ''اَوْلَتَعُوْدُنَّ فِیْ مِلَّتِنَا'' اور سورۃ یوسف میں: ''تَرَکْتُ مِلَّةَ قَوْمٍ لَّا یُؤْمِنُوْنَ'' کے الفاظ کے ساتھ گذر گئی ہے۔

سوال: اس آیت میں جواب سوال کے کس طرح مطابق ہے: ''وَبَرَزُوْا لِلّٰهِ جَمِیْعًا فَقَالَ الضُّعَفٰٓؤُا لِلَّذِیْنَ اسْتَکْبَرُوْٓا اِنَّا کُنَّا لَکُمْ تَبَعًا فَهَلْ اَنْتُمْ مُّغْنُوْنَ عَنَّا مِنْ عَذَابِ اللّٰهِ مِنْ شَیْءٍ قَالُوْا لَوْهَدٰىنَا اللّٰهُ لَهَدَیْنٰکُمْ'' (اور سامنے کھڑے ہوں گے اللہ کے سارے، پھر کہیں گے کمزور بڑائی والوں کو، ہم تو تمہارے تابع تھے سو بچاؤ گے ہم کو اللہ کے عذاب سے کچھ؟ وہ (بڑائی والے) کہیں گے، اگر ہدایت کرتا ہم کو اللہ تو البتہ ہم تم کو ہدایت کرتے)۔

جوابِ اوّل: تابع لوگ جب اپنے مذکورہ قول سے اپنے بڑوں کی توبیخ کریں گے تو مستکبرین گمراہ ہونے اور گمراہ کرنے کے گناہ کو اللہ تعالیٰ پر ڈالدیں گے اور کہیں گے'' لَوْهَدٰىنَا اللّٰهُ لَهَدَیْنٰکُمْ'' اور'' لَوْ شَآءَ اللّٰهُ مَآ اَشْرَکْنَا وَلَآ اٰبَآؤُنَا'' (اگر اللہ چاہتے تو ہم نہ ہمارے اباء واجداد شرک کرتے) اور'' وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ مَا عَبَدْنَا مِنْ دُوْنِهٖ مِنْ شَیْءٍ'' (اور اگر اللہ چاہتے تو ہم ان کے علاوہ کسی اور کی عبادت نہ کرتے ہوتے)۔

یہی بات منافقین بھی کہیں گے، جس کو اللہ تعالیٰ نے یوں بیان فرمایا ہے: '' یَوْمَ یَبْعَثُهُمُ اللّٰهُ جَمِیْعًا فَیَحْلِفُوْنَ لَهٗ کَمَا یَحْلِفُوْنَ لَکُمْ'' اس دن اللہ تعالیٰ ان (منافقین) کو اٹھائیں گے تو وہ اللہ کے سامنے قسمیں کھائیں گے جیسے تمہارے سامنے قسمیں کھاتے ہیں۔

جوابِ ثانی: اگر اللہ تعالیٰ نے ہمیں آخرت میں راہ نجات پر ڈالدیا تو ہم تمہاری رہنمائی کریں گے اور تمہیں بھی راہِ جنت میں ساتھ لے چلیں گے۔ جیسا کہ دنیا میں تمہیں راہِ ہلاکت پر چلاتے تھے۔

سوال: '' سَوَآءٌ عَلَیْنَآ اَجَزِعْنَآ اَمْ صَبَرْنَا'' (اب برابر ہے ہمارے حق میں ہم بیقراری کریں یا صبر کریں) کا ماقبل کے ساتھ کیا ربط ہے؟۔

جواب: ماقبل سے اس کا جوڑ اور ربط یہ ہے کہ ضعفاء کا اپنے مقتداؤں کو ڈانٹنا اور عذاب میں مبتلا ہو کر جزع وفزع کی وجہ سے ہے۔ تو جواب میں ان کے سرداروں اور مقتداؤں نے کہا: ''سَوَآءٌ عَلَیْنَآ اَجَزِعْنَآ اَمْ صَبَرْنَا مَا لَنَا مِنْ مَّحِیْصٍ'' (یعنی ہم اور تم دونوں اس عذاب میں مبتلا ہیں۔ جزع وفزع سے کچھ کام نہیں بنتا نہ ہی توبیخ وعتاب کا کوئی فائدہ ہے۔ کیوں کہ معاملہ اس سے کہیں بڑھ کر ہے۔

سوال: ''وَقَالَ الشَّیْطٰنُ لَمَّا قُضِیَ الْاَمْرُ اِنَّ اللّٰهَ وَعَدَکُمْ وَعْدَ الْحَقِّ الخ'' (اور بولا

شیطان جب فیصلہ ہو چکا سب کا' بے شک اللہ نے تم سے کیا تھا سچا وعدہ) اللہ نے شیطان کے قول کو لفظ ماضی سے تعبیر کیا حالانکہ اس قول کو شیطان قیامت کے دن کہے گا؟۔

جواب: اگر التباس کا خطرہ نہ ہو تو ماضی کی جگہ مضارع اور مضارع کی جگہ ماضی کا صیغہ استعمال کرنا جائز ہے۔

چنانچہ قرآنِ کریم میں متعدد جگہ اس کی مثالیں موجود ہیں' ماضی کی جگہ مضارع کا صیغہ استعمال ہونے کی مثال: ''وَاتَّبَعُوْا مَا تَتْلُوا الشَّیٰطِیْنُ عَلٰی مُلْکِ سُلَیْمٰنَ'' میں تتلوا مضارع کا معنیٰ تلت'' ہے اسی طرح دوسری مثال: فرمان باری تعالیٰ: '' فَلِمَ تَقْتُلُوْنَ اَنْبِیَآءَ اللّٰہِ مِنْ قَبْلُ'' تقتلون بمعنیٰ قتلتم ہے'اور حطیۃ نامی شاعر کا شعر ہے۔[1]

شهد الحطيئة يوم يلقى ربه ☆ ان الوليد احق بالغدر

لہٰذا مذکورہ مثالوں میں علی ملک سلیمٰن''من قبل ''اور لفظ لما قضی الامر'' کی وجہ التباس نہیں ہو رہا ہے۔اس لئے ماضی کی جگہ مضارع اور مضارع کی جگہ ماضی استعمال کی گئی۔

سوال: اللہ تعالیٰ نے'' وَیُضِلُّ اللّٰہُ الظّٰلِمِیْنَ ''(بچلا دیتا ہے اللہ بے انصافوں کو) کیسے فرمایا؟ جب کہ ہم دیکھتے ہیں اللہ تعالیٰ نے بہت سے ظالموں کو ہدایت کی دولت سے نوازا۔اسلام سے مشرف ہوئے۔سابقہ سرکشیوں سے توبہ کی اور متقی بن گئے؟۔

جوابِ اوّل: '' یُضِلُّ اللّٰہُ الظّٰلِمِیْنَ '' کا مطلب ہے کہ یہ ظالم لوگ جب تک اپنے ظلم اور کفر پر مسلسل برقرار رہیں گے اور غور وفکر سے کام نہیں لیں گے تو اللہ تعالیٰ ان کو ہدایت نہیں دیں گے۔

جوابِ ثانی: اس سے مراد وہ ظالمین ہیں جن کے بارے میں ازل سے یہ فیصلہ ہو چکا ہے کہ یہ لوگ مرتے دم تک ایمان نہیں لائیں گے۔اللہ تعالیٰ ان کو اس گمراہی سے نہیں نکال لیں گے بلکہ ان کو گمراہی پر برقرار رکھیں گے۔جیسا کہ اللہ تبارک وتعالیٰ مومنین کو کلمہ توحید پر ثابت قدم رکھتے ہیں۔

جوابِ ثالث: آیت کا معنیٰ ہے کہ قیامت کے دن مشرکین کو جنت کی راہ پر نہیں چلائیں گے۔

سوال: اللہ تعالیٰ نے کفار کے بارے میں یہ کیسے فرمایا:'' وَجَعَلُوْا لِلّٰہِ اَنْدَادًا لِّیُضِلُّوْا عَنْ سَبِیْلِہٖ '' (اور ٹھہرائے اللہ کے لئے مقابل کہ بہکائیں لوگوں کو اس کی راہ سے) حالانکہ بت پرستی سے ان کا مقصود دوسروں کو بہکانا نہیں تھا بلکہ وہ تو بتوں کی عبادت تقرب الی اللہ کی غرض سے کرتے تھے جیسا کہ ان کے متعلق اللہ تعالیٰ نے بھی فرمایا ہے:'' مَا نَعْبُدُھُمْ اِلَّا لِیُقَرِّبُوْنَآ اِلَی

للہِ زُلفٰی"
جواب: اس سے قبل سورۃ یونس میں ہم بیان کر چکے ہیں کہ "لِیُضِلُّوا" کا "ل" لام غرض نہیں ہے بلکہ انجام وعاقبت کے لئے ہے۔ جیسا کہ آیت " فَالْتَقَطَهُ اٰلُ فِرْعَوْنَ لِيَكُوْنَ لَهُمْ عَدُوًّا وَّحَزَنًا" میں لیکون کا "لام" عاقبت وانجام کار کے معنی میں ہیں۔
اور شعر: لدوا للموت وابنوا للخراب
میں بھی لام انجام کے معنی میں ہے۔ مندرجہ ذیل شعر میں بھی "ل" اسی معنی میں ہے۔

فللموت تغذوا الوالدات سخالها ☆ کما لخراب الدهر تبنی المساکن

تو آیت کا مطلب یہ ہے: اللہ کے ساتھ دوسروں کو برابر ٹھہرانا مفضی الی الضلال یا اضلال ہے تو گویا انہوں نے بت پرستی ہی گمراہ کرنے کے لئے اختیار ہے۔
سوال: " قُلْ لِّعِبَادِيَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا يُقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَيُنْفِقُوْا مِمَّا رَزَقْنٰهُمْ سِرًّا وَّعَلَانِيَةً مِّنْ قَبْلِ اَنْ يَّاْتِيَ يَوْمٌ لَّا بَيْعٌ فِيْهِ وَلَا خِلٰلٌ " (کہہ دے میرے بندوں کو جو ایمان لائے ہیں، قائم رکھیں نماز اور خرچ کریں ہماری دی ہوئی روزی میں سے پوشیدہ اور ظاہر، پہلے اس سے کہ آئے وہ دن جسمیں نہ سودا بازی ہے اور نہ دوستی)۔ اس دن "لَا بَيْعٌ فِيْهِ وَلَا خِلٰلٌ" کے وصف کے ساتھ امر بالصلوۃ اور حکم بالانفاق کی کیا مطابقت ہے؟
جواب: آیت کا معنی ہے، کہ میرے بندوں سے کہد یجئے اس دن (یوم القیامۃ) آنے سے پہلے کہ جس میں دنیاوی تجارت اور عوض معاوضے کام نہیں آئیں گے نماز، صدقات وغیرہ نیک اعمال کو ادا کریں تا کہ وہ اس دن کام آئیں گے۔ دنیاوی سکے وہاں نہیں چلیں گے۔
سوال: اللہ تعالیٰ نے کیسے فرمایا (لَا بَيْعٌ فِيْهِ وَلَا خِلٰلٌ) قیامت کے دن نہ کوئی بیع ہوگی نہ دوستی) حالانکہ قیامت کے دن دوستی ہوگی۔ جیسا کہ دوسری آیت سے معلوم ہو رہا ہے: " اَلْاَخِلَّاءُ يَوْمَئِذٍ بَعْضُهُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ اِلَّا الْمُتَّقِيْنَ " اور حدیث سے بھی قیامت کے دن کی دوستی کا ثبوت ملتا ہے، فرمان رسولؐ ہے" المرء مع من احب " انسان کا حشر اس کے ساتھ ہوگا جس کے ساتھ اس کی محبت ہو۔
جواب: نماز نہ پڑھنے والوں اور زکوۃ نہ دینے والوں میں اس دن کوئی دوستی نہیں ہوگی۔ جہاں تک نماز قائم کرنے والوں اور زکوۃ ادا کرنے والوں کا تعلق ہے ان کی آپس میں دوستی ہوگی۔ جیسا کہ اوپر کی آیت سے معلوم ہو رہا ہے۔
سوال: اللہ تعالیٰ نے کیسے فرمایا: "وَسَخَّرَ لَكُمُ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ دَآئِبَيْنِ وَسَخَّرَ لَكُمُ اللَّيْلَ

وَالنَّهَارَ'' (اور کام پر لگادیا تمہارے سورج اور چاند کو ایک دستور پر برابر اور کام میں لگادیا تمہارے رات اور دن کو)۔ حالانکہ مسخر اس کو کہتے ہیں جو انسان کی اطاعت کرتا ہو اور جیسے چاہے ان کو استعمال کرسکتا ہو۔ اور اپنے کے حکم کے مطابق چلا سکتا ہو جیسا کہ غلام' چوپائے وغیرہ ہیں جب کہ شمس وقمر' لیل ونہار انسان کے اختیار سے نہیں چلتے ؟۔

جوابِ اوّل: جب سورج وچاند کا طلوع وغروب اور دن ورات کے یکے بعد دیگرے آمدورفت ہمارے فائدے کے لئے ہے۔ اور ان سے ہماری منفعتیں متعلق ہیں چاہے یہ مخلوقات چاہیں یا نہ چاہیں یہ منفعتیں انسان کو حاصل ہیں۔ تو مسخر کے مشابہ ہوگئے۔ اسی وجہ سے اس کے لئے تسخیر کے الفاظ استعمال کیے گئے۔

جوابِ ثانی: یہ مخلوقات ہماری منفعت اور ہماری ضروریات کی وجہ سے بحکم الٰہی چلتی ہیں انہی کو مسخر کہتے ہیں۔ تسخیر کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف درست ہے۔ اس لئے کہ وہ فاعل تسخیر ہیں۔ اور بندوں کی طرف بھی درست ہے۔ اس کی اس تسخیر کے منافع سے ہم بہرہ مند ہو رہے ہیں۔

سوال: اللہ تعالیٰ نے کیسے فرمایا: '' وَاٰتٰکُمۡ مِّنۡ کُلِّ مَا سَاَلۡتُمُوۡہُ '' (اور عطا کرتا ہوں تمہیں جو کچھ تم مانگتے ہو) جب کہ جو کچھ ہم مانگتے ہیں تمام کا تمام عطاء نہیں ہوتا بلکہ بعض دعا قبول ہوتی ہے اور بعض نہیں؟

جوابِ اوّل: یعنی یہاں ''من'' تبعیضیہ ہے' مطلب ہے تمہارے کل مسؤلات میں بعض تمہیں عطاء کرتا ہوں۔

سوال: جواب مذکور دو وجہوں سے صحیح نہیں ہے۔

پہلی وجہ: پورا عطاء نہ کر کے احسان جتلانا اچھا نہیں ہے۔

دوسری وجہ: یہ جواب: '' وَاِنۡ تَعُدُّوۡا نِعۡمَةَ اللّٰهِ لَا تُحۡصُوۡهَا '' (اگر تم اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کو شمار کرنا چاہو تو پوری شمار نہیں کرسکو گے) کے مطابق نہیں ہے۔

جوابِ اوّل: اللہ تعالیٰ کی طرف سے عطاء کردہ نعمتیں منع کردہ سے زیادہ ہیں' اور ہماری مصلحتوں کی وجہ سے جو کچھ نہیں ملا ہے اس کا بھی انفع اور فائدہ اس لئے اور جو ہمارے فائدے میں نہیں ہے ان کا عطا نہ ہونا ہی بہتر ہے اور اس پر احسان جتلانا بھی اچھا ہے' اس طرح مابعد کی آیت سے بھی ربط ہوگیا۔

جوابِ ثانی: اصل سوال کا دوسرا یہ جواب بھی دیا گیا ہے۔ ممکن ہے کہ اللہ تعالیٰ نے تمام دعاء کرنے والوں کے دعاؤں اور مانگنے والوں کے ہر ہر سوال کے بعض حصے عطاء کئے ہوں۔ اس

صورت میں: '' وَآتَاكُم مِنْ كُلِّ مَا سَأَلْتُمُوهُ'' کہنا درست ہوگا۔ اس کی توضیح یہ ہے کہ ہوسکتا ہے ایک شخص نے جو کچھ مانگا۔ وہ اس کو نہیں دیا گیا لیکن کسی خاص مصلحت اور خاص فائدے کے لئے کسی دوسرے کو دے دیا گیا۔ لہٰذا انسانوں کو مانگی ہوئی تمام چیزیں عطاء تو ہوئیں لیکن سب کو سب چیزیں نہیں ملیں۔ مصلحت اور حکمت کے تقاضے کے مطابق بعض کو بعض، اور بعض کو دوسری چیزیں عطاء کی گئیں۔

سوال: اللہ تعالیٰ نے کیسے فرمایا: '' وَاِنْ تَعُدُّوا نِعْمَتَ اللّٰهِ لَا تُحْصُوهَا'' حالانکہ احصاء، اور ''عدد (شمار کرنا) دونوں ہم معنی ہیں'' جوہری نے دونوں کو ہم معنی بتایا ہے'' تو آیت کا معنی یہ ہوگا: '' وَاِنْ تَعُدُّوا نِعْمَتَ اللّٰهِ لَا تَعُدُّوهَا'' اگر تم اللہ کی نعمتوں کو گنو گے تو نہیں گنو گے۔ یہ تو باہم متناقض ہے، یہ بالکل ایسا ہے! جیسا کہ کہو۔ اگر تم زید کو دیکھو گے تو نہیں دیکھو گے''؟۔

جواب: بعض مفسرین نے احصاء کا معنی حصر بتایا ہے لہٰذا اگر نعمت کے اعتبار سے احصاء حصر کے معنی میں ہو تو سوال ہی نہیں ہوتا۔ زمخشری کے ''لا تحصوها'' کی تفسیر ''لا تحصروها ولا تطیقوه عدها وبلوغ آخرها'' ''تم مکمل طور نہیں گن سکو گے اور شمار کر کے اس کی انتہاء کو نہیں پہنچ سکو گے'' سے کرنے سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے۔ دوسرا جواب یہ بھی دیا جا سکتا ہے کہ اس میں عبارت مقدر ہے۔ تقدیر عبارت یوں ہے: '' وان ترید واعدَّ نعمة الله لا تعدوها'' (اگر تم اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کو گننے کا ارادہ رکھتے ہو تو گن نہیں سکتے)

سوال: اللہ نے ''لا تحصوها'' کیسے فرمایا؟ حالانکہ نعماءِ الٰہی کے لامتناہی ہونے کا وہم ہوتا ہے۔ اس کے لئے اللہ تعالیٰ نے جس نعمت سے بھی نوازا ہے وہ مخلوق ہے، اور ہر مخلوق متناہی ہے؟۔

جواب: ہم یہ تسلیم نہیں کرتے کہ اس سے نعمت الٰہی کا لامتناہی ہونا معلوم ہوتا ہے۔ اس لئے کہ آیت سے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ انسان نعمت الٰہیہ کو شمار نہیں کرسکتا۔ یا شمار کر کے پورا نہیں کرسکتا۔ اور ممکن ہے کہ ایک چیز فی نفسہ متناہی تو ہو لیکن انسان اس کو مکمل شمار نہ کر سکے۔ جیسا کہ میدان و بیابان کی ریت کے تمام ذرات محدود و متناہی تو ضرور ہیں لیکن انسان ان کو گن کر پورا نہیں کرسکتا۔ اسی طرح دریا کے قطرات اور درختوں کے پتے وغیرہ۔

سوال: حضرت ابراہیم علیہ السلام نے کیسے فرمایا: ''واجْنُبْنِي وَبَنِيَّ أَنْ نَعْبُدَ الْأَصْنَامَ'' (مجھ کو اور میری اولاد کو بت پرستی سے دور رکھئے) جب حضرات انبیاء کرامؑ بالاجماع کفر سے معصوم ہوتے ہیں تو حضرت ابراہیم علیہ السلام کو اس طرح کی دعاء کیسے زیبا ہے؟۔

جواب: آپؑ نے یہ سوال انتہائی خوف کی حالت میں کیا تھا جس کی وجہ سے اس علم کا ذہول ہوا اس لئے کہ حضرات انبیاءِ کرام کو تمام لوگوں سے زیادہ اللہ تعالیٰ کی معرفت حاصل ہوتی ہے۔اس لئے کہ سب سے زیادہ خوف الٰہی کے حامل بھی یہی ہوتے ہیں۔خوف کی حالت میں اس طرح کی دعا کرنا عذر کی بناء پر ہے۔

سوال: اللہ پاک نے کیسے فرمایا: ''رَبِّ اِنَّهُنَّ اَضْلَلْنَ كَثِيْرًا مِّنَ النَّاسِ'' (اے میرے رب! ان بتوں نے بہت سارے لوگوں کو گمراہ کیا) اس آیت میں بتوں کو گمراہ کرنے والے بتایا گیا ہے' اور گمراہ کرنے والا نقصان دینے والا بھی ہوتا ہے۔اور ایک آیت میں فرماتے ہیں: ''وَيَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَالَا يَضُرُّهُمْ وَلَا يَنْفَعُهُمْ'' اور وہ (کفار) اللہ کے سوا بتوں کی عبادت کرتے ہیں جو فائدہ پہنچا سکتے ہیں نہ نقصان' یعنی نفع نقصان پہنچانے پر قادر نہیں ہیں تو ان دونوں آیتوں میں تطبیق کیسے ہوگی؟۔

جواب: اضلال (گمراہ کرنے) کی نسبت ان کی طرف تشابہ کی بنا پر مجازاً ہے۔اس کی وجہ یہ ہے کہ جب کفار ان بتوں کی عبادت کر کے گمراہ ہوئے تو گویا ان بتوں نے ان کو گمراہ کیا۔جب کہ عام محاورے میں کہا جاتا ہے کہ دنیاء نے ان کو فتنہ میں ڈالدیا اور دھوکہ دیا۔مطلب ہے کہ دنیا کے سبب سے دھوکہ میں پڑ گئے۔اسی طرح سے ''دواء مسہل'' ''سیف قاطع'' کاٹنے والی تلوار' طعام مُشبِع' پیٹ بھرنے والا کھانا' ماء مُرّ'' کڑوا'' پانی' اور ان جیسی بہت سی مثالیں ہیں ان سب کا مطلب یہ ہے اثرات ان اشیاء کے سبب سے ہیں فاعل حقیقی اللہ تعالیٰ ہیں۔

سوال: ''فَاجْعَلْ اَفْئِدَةً مِّنَ النَّاسِ تَهْوِيْ اِلَيْهِمْ'' (سو رکھ بعض لوگوں کے دل مائل ہوں ان کی طرف) میں ''اَفْئِدَةَ النَّاسِ'' کیوں نہیں کہا گیا جیسا کہ'' قلوبا من الناس'' کی جگہ قلوب الناس کہا جاتا ہے۔

جواب: حضرت عبداللہ بن عباسؓ فرماتے ہیں: ''حضرت ابراہیم علیہ السلام اپنی دعاء میں ''افئدة من الناس'' کی بجائے اگر'' افئدة الناس'' فرماتے تو تمام ملتوں والے حج کرتے' کعبہ کے پاس لوگوں کا رش زیادہ ہوتا جس کی وجہ سے مومنین کو جگہ نہ ملتی جبکہ غیر موحدین کا حج غیر معتبر اور غیر مفید ہے۔لہٰذا ''من الناس'' فرمایا: دوسرا جواب دیا جا سکتا ہے۔کہ یہاں ''اَفْئِدَة'' جماعت کے معنی میں ہے یعنی جماعة من الناس۔

سوال: جب اللہ نے اپنے بندوں کو رزق پہنچانے کا خود ذمہ لیا ہے تو حضرت ابراہیم علیہ السلام نے ''وَارْزُقْهُمْ مِّنَ الثَّمَرَاتِ'' (اے اللہ ان کو ثمرات میں سے رزق عطاء فرما) کہہ کر اپنی اولاد

کے لئے رزق کی دعاء کیوں کی؟۔

جواب: اللہ تعالیٰ نے بندوں کے اس رزق کا ذمہ لیا ہے جو ان کی حیات کے لئے ضروری ہے' پھل دینے یا اور کسی خاص قسم کا رزق پہنچانے کا ذمہ نہیں لیا ہے۔

جبکہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے خاص ثمرات کی دعاء کی تھی۔

سوال: فرمانِ الٰہی ہے: "اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ وَهَبَ لِیْ عَلَى الْكِبَرِ اِسْمٰعِیْلَ وَاِسْحٰقَ" (شکر ہے اللہ کی جس نے بخشا مجھ کو بڑی عمر میں اسماعیل اور اسحاق) کی بعد والی آیت "اِنَّ رَبِّیْ لَسَمِیْعُ الدُّعَآءِ" (بے شک میرا رب سنتا ہے پکار) کے ساتھ کیا مناسبت ہے؟۔

جواب: جب حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنے رب سے ان الفاظ: "رَبِّ هَبْ لِیْ مِنَ الصّٰلِحِیْنَ" سے دعاء کی تو اللہ تعالیٰ نے اولاد عطاء فرما کران کی دعاء قبول کی۔ اس لئے آپؑ نے اللہ تعالیٰ کے شکر اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الخ سے ادا کیا۔ اس کے بعد اپنے رب کی صفت ان ربی لسمیع الدعاء بیان کی' جو کہ شکر کے مناسب ہے اس لئے کہ سمع یہاں اجاب (قبول کیا) کے معنی میں ہے اگر بادشاہ کسی کے درخواست قبول کرے تو کہا جاتا ہے "وسمع الملک قول فلان" یعنی یہی معنی "سمع اللہ لمن حمدہ" کا ہے یعنی جو بھی اللہ کی تعریف وتحمید بیان کرتا ہے اللہ تعالیٰ اس کو قبول فرماتا ہے اور ثواب عطاء کرتا ہے۔

سوال: "رَبِّ اغْفِرْلِیْ وَلِوَالِدَیَّ" (اے میرے رب! مجھے اور میرے والد کو بخش دے) حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنے والدین کی بخشش کی دعاء کی حالانکہ وہ کافر تھے۔ اور کافروں کے لئے دعاءِ استغفار جائز نہیں؟۔

جوابِ اوّل: والدین کے لئے یہ استغفار ایمان کے ساتھ مشروط ہے' تقدیر عبارت یوں ہے: "وَلِوَالِدَیَّ اِنْ اٰمَنَا" (بخش دے میرے والدین کو اگر وہ مؤمن ہوں) ہے۔

جوابِ ثانی: یہاں "وَالِدَیَّ" سے مراد آدم وحواء علیہما السلام ہیں۔ اور حضرت عبداللہ بن مسعودؓ اور ابی نخعیؒ اور زہریؒ اس کو "وَلِوَالِدَیَّ" (میرے بچوں کو بھی) پڑھا اس قرات کی صورت میں کوئی اشکال ہی نہیں ہوتا ہے۔

جوابِ ثالث: بعض علماء نے یہ بھی کہا ہے جو یہ مشہور قراءت "وَلِوَالِدَیَّ" (میرے والدین کو) کے مطابق ہی ہے۔ کہ یہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی ایک لغزش تھی۔ جس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں: "وَالَّذِیْ اَطْمَعُ اَنْ یَّغْفِرَلِیْ خَطِیْٓئَتِیْ یَوْمَ الدِّیْنِ" (میری امید ہے کہ اللہ تعالیٰ بروز قیامت میری خطاء معاف فرمائیں گے)۔

سوال: اللہ تبارک وتعالیٰ غفلت سے مبرّا ومنزّہ ہیں۔ اور حضور ﷺ تمام لوگوں میں سب سے زیادہ اللہ تعالیٰ کی جلالتِ شان، اس کی صفات وکمال سے واقف ہیں۔ تو اللہ تعالیٰ کو غافل کیسے سمجھ سکتے ہیں حتیٰ کہ ان کو تنبیہ کی گئی کہ: ''لَا تَحْسَبَنَّ اللّٰهَ غَافِلًا عَمَّا يَعْمَلُ الظّٰلِمُوْنَ'' (اور مت خیال کر کہ اللہ بے خبر ہے ان کاموں سے جو کرتے ہیں بے انصاف)؟

جوابِ اوّل: ممکن ہے کہ یہ نہی آپ ﷺ کے علاوہ لوگوں کے لئے ہو جو اپنی جہالت کی بناء پر ایسے گمان کرتے ہوں۔ اور اس کے بعد آنے والا فرمانِ الٰہی اس پر دلالت کر رہا ہے کہ ممکن ہے اس سے آپ ﷺ کے علاوہ کوئی مراد ہو اگرچہ بظاہر خطاب نبی کریم ﷺ کو ہے۔

جوابِ ثانی: یہاں معنی مجازی مراد ہے۔ یعنی تم یہ خیال نہ کرنا کہ اللہ تعالیٰ ظالموں کے بارے اہمال سے کام لیں گے۔ اور ان کو سزا دیئے بغیر چھوڑ دیں گے۔ چونکہ انسانوں سے ایسا عمل صادر ہوتا ہے غفلت کی وجہ سے۔ اس وجہ سے یہاں پر غفلت کے الفاظ سے تعبیر کی گئی۔

جوابِ ثالث: نہی مجازی نہیں بلکہ حقیقی ہے۔ اور خطاب بھی نبی کریم ﷺ کو ہے۔ آیت کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کو حاضر وناظر اور غافل نہ ہونے کے عقیدے پر ثابت قدم رہو۔ جیسا کہ آیت: ''وَلَا تَكُوْنَنَّ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ'' (ہرگز مشرکین میں سے مت ہو جائیو) اور دوسری آیت: ''لا تَدْعُ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا آخَرَ'' (اللہ تعالیٰ کے ساتھ کسی اور معبود کو مت پکارو)

ان تینوں آیات کا یہی مفہوم ہے کہ جس صفت پر ہو اسی صفت پر ثابت قدم ہو۔

# سورۃ الحجر

سوال: کافروں نے یہ کیسے کہا کہ: ''يٰاَيُّهَا الَّذِيْ نُزِّلَ عَلَيْهِ الذِّكْرُ اِنَّكَ لَمَجْنُوْنٌ'' (اے شخص! کہ تجھ پر اتری ہے نصیحت تو مقرر دیوانہ ہے)۔

کفار نے پہلے نبی کریم ﷺ کی نبوت کا اعتراف کیا پھر مجنون کہا۔ اس لئے کہ ذکر سے مراد قرآن ہے۔ نزولِ قرآن وحی ہے کا کا اعتراف کرنا نبوت کا اعتراف کرنا ہے؟۔

جوابِ اوّل: ''نزل علیه الذکر'' تصدیق کے لئے نہیں۔ بلکہ استہزاء اور تمسخر کے طور پر کہا گیا ہے۔ جیسا کہ فرعون نے اپنے کارندوں کو خطاب کر کے کہا تھا: ''اِنَّ رَسُوْلَكُمُ الَّذِيْ اُرْسِلَ اِلَيْكُمْ لَمَجْنُوْنٌ'' (جو پیغمبر تمہاری طرف مبعوث ہے وہ مجنون ہے)۔ اور جس طرح حضرت شعیب علیہ السلام کی قوم نے کہا تھا: ''اِنَّكَ لَاَنْتَ الْحَلِيْمُ الرَّشِيْدُ''۔

جوابِ ثانی: یہاں عبارت مقدر ہے۔ تقدیرِ عبارت یوں ہے: ''يَا اَيُّهَا الَّذِيْ تَدَّعِيْ اَنَّكَ

نُزِّلَ عَلَیْکَ الذِّکْرُ"۔ ترجمہ: "اے وہ شخص جو دعویٰ کرتا ہے کہ تجھ پر ذکر نازل ہوا ہے"۔

سوال: اللہ تعالیٰ نے کیسے فرمایا: "وَاِنَّا لَنَحْنُ نُحْیٖ وَنُمِیْتُ وَنَحْنُ الْوَارِثُوْنَ" (اور تحقیق ہم ہی جلاتے ہیں اور ہم ہی مارتے ہیں اور ہم ہی سب کے وارث ہیں)۔ وارث اسے کہتے ہیں جو مورث کے انتقال کے بعد نئی ملکیت ملے۔ یعنی وہ مال ملے جو پہلے اس کی ملک میں نہ ہو۔ جب کہ اللہ تعالیٰ ہی ازل سے تمام عالم کا مالک ہے۔ تو وارث کا لفظ استعمال کرنا کیسا درست ہوگا۔

جوابِ اوّل: بعض کے فنا ہونے کے بعد باقی بچے ہوئے کی ملکیت کو ہونا لغت میں وارث ہیں۔ چاہے تجدد ملک ہو یا نہ ہو۔ تو آیت کا مفہوم یہ ہوگا۔ کہ مخلوق کے فنا ہونے کے بعد ہم باقی رہنے والے ہیں۔

جوابِ ثانی: مخلوق (انسان وجنات) بھی خود کو اپنے پاس موجود اموال کا جب مالک سمجھتے ہیں تو مجازاً یا اللہ تعالیٰ کے نائب ہونے کی بنا پر ان کو مالک کے نام سے موسوم بھی کیا جاتا ہے۔ جس پر آیت: "تُؤْتِی الْمُلْکَ مَنْ تَشَآءُ" (آپ جس کو چاہتے ہیں ملک عطا فرماتے ہیں) دلالت کرتی ہے۔ لہٰذا جب تمام مخلوق مر جائے گی۔ تو سارے اموال اللہ تعالیٰ کے سپرد ہوں گے۔ اس اعتبار سے وارث کہنا صحیح ہے۔ فرمانِ الٰہی: "لِمَنِ الْمُلْکُ الْیَوْمَ" (آج کی بادشاہت کس کی ہے) اس کی نظیر ہے۔ اس لئے کہ ازل سے ابد تک تمام بادشاہت اللہ ہی کے لئے ہے۔ لیکن دنیا میں دوسرے بادشاہوں کو مجازاً بادشاہ کا نام دیا گیا ہے۔ قیامت کے دن وہ مجازی بادشاہت بھی ختم ہو جائے گی۔ اس طرح انسان ان اموال کا مجازی مالک ہے۔

سوال: آیت: "فَسَجَدَ الْمَلٰٓئِکَةُ کُلُّهُمْ" (تمام فرشتوں نے سجدہ کیا) تمام فرشتوں کے سجدہ کرنے پر دلالت کرتی ہے تو "اَجْمَعُوْنَ" لانے کا کیا فائدہ ہے؟

جواب: امام خلیل اور امام سیبویہ رحمہما اللہ فرماتے ہیں کہ یہ تاکید در تاکید ہے جس سے مفہوم ذہن میں پختہ ہوتا ہے لہٰذا یہ بے فائدہ نہیں ہے۔ اور امام مبرد فرماتے ہیں: لفظ "اَجْمَعُوْنَ" زمانہ سجود میں سب کے یک جا ہونے پر اور کلمۃ "کُلُّهُمْ" تمام کے سجدہ کرنے پر دلالت کرتا ہے۔ گویا آیت کے معنی یہ ہوئے تمام کے تمام فرشتوں نے ایک ہی وقت سجدہ کیا۔ ابن الانباریؒ نے مبرد کے قول کو پسند کیا۔ امام زجاج اور اکثر علماء نے سیبویہ کے قول کو ترجیح دی ہے۔ اس وجہ سے کہ اگر امام مبردؒ کے قول کو مان لیا جائے تو "اجمعون" ترکیبی اعتبار سے حال ہونا چاہئے کیونکہ یہ حال کے مقام میں واقع ہے حالانکہ ترکیب میں حال واقع نہیں ہو رہا۔ کیونکہ یہ مرفوع ہے۔ اور حال منصوب ہوتا ہے۔ اور یہ تمام الفاظ تاکید کی طرح معرفہ ہیں جبکہ حال کے لئے نکرہ ہونا شرط ہے۔

**سوال:** آیت: "نَبِّئْهُمْ عَنْ ضَيْفِ اِبْرَاهِيْمَ" (اور حال سنا دے ان کو ابراہیم کے مہمانوں کا) اور ماقبل کی آیت: "نَبِّیءْ عِبَادِیْ" میں کیا تعلق ہے۔ بظاہر کوئی معنوی ارتباط معلوم نہیں ہو رہا ہے؟

**جوابِ اوّل:** جب اللہ پاک نے "نَبِّیءْ عِبَادِیْ" سے آخر تک دو آیتیں نازل فرمائیں اور اہل بخشش اور اہلِ عذاب کو متعین نہیں کیا۔ تو صحابہؓ پر خوف طاری ہوا تو اللہ تعالیٰ نے اس کے بعد حضرت ابراہیم علیہ السلام کے مہمانوں کا قصہ ذکر فرمایا: تا کہ صحابہ کرام کا خوف جاتا رہے۔ اور ان کے دل مطمئن ہو جائیں کیونکہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے پاس آنے والے مہمان (فرشتے) (حضرت ابراہیم علیہ السلام اللہ کے دوست کے پاس بشارت اور ان کے دشمنوں یعنی قوم لوط کے پاس عذاب لیکر آئے تھے اس طرح ماقبل کی دو آیتیں دوست اور دشمن دونوں کے متعلق نازل ہوئی ہیں صرف دوست کے متعلق نہیں۔

**جوابِ ثانی:** دونوں آیتوں میں وجہ ارتباط یہ ہوسکتی ہے کہ اگر کوئی انسان اپنے گناہوں کی کثرت کی وجہ سے مغفرت الٰہی سے ناامید بھی ہو جائے تو بعید نہیں کہ رحمت الٰہی اس کے ساتھ شاملِ حال ہو۔ کیونکہ ہوسکتا ہے کہ گناہوں کی کثرت اور اپنی مغفرت سے ناامیدی کے باوجود اللہ تعالیٰ اس کو بخشش دے اور اس کے گناہوں کو معاف کر دے۔ جیسا کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام سو سال کی عمر کو پہنچ کر اولاد کی پیدائش کے متعلق ناامید ہو گئے اس کے باوجود اللہ تعالیٰ نے ان کو اس عمر میں سے اولاد سے نوازا دیا۔

**سوال:** فرشتوں نے حضرت لوط علیہ السلام کی بیوی کے متعلق: "قَدَّرْنَآ اِنَّهَا لَمِنَ الْغٰبِرِيْنَ" (ہم نے فیصلہ کیا وہ ہے رہ جانے والوں میں) کیسے کہا۔ حالانکہ فیصلہ کرنا اللہ تعالیٰ کا کام ہے نہ کہ فرشتوں کا؟۔

**جواب:** فیصلے کی نسبت فرشتوں کی طرف مجازی ہے۔ جیسا کہ بادشاہ کے خاص کارندے بادشاہ کے حکم سے کوئی کام سرانجام دیکر کہتے ہیں ہم نے اس کی منصوبہ بندی کی، ہم نے حکم دیا، ہم نے فلاں کام سے فلاں کو روکا حالانکہ یہ سب کرنے والے بادشاہ ہیں۔ مگر اس کے نائبین اس کی نسبت اپنی طرف مجازاً کرتے ہیں۔ اس طرح مذکورہ آیت میں فیصلے کو اپنی طرف مجازاً منسوب کیا گیا ہے۔

**سوال:** اللہ تبارک وتعالیٰ نے کیسے فرمایا: "وَلَقَدْ كَذَّبَ اَصْحٰبُ الْحِجْرِ الْمُرْسَلِيْنَ" (اور تحقیق جھٹلایا حجر والوں نے رسولوں کو) "اصحٰب الحجر" سے مراد صالح علیہ السلام کی قوم

ہے۔ حجر ان کے شہر یا وادی کا نام ہے جس کی طرف نسبت کر کے انہیں اصحاب الحجر کہا گیا۔ سوال یہ ہے اصحاب حجر کی طرف کئی پیغمبر نہیں بلکہ صرف حضرت صالح علیہ السلام مبعوث ہوئے تھے۔ تو انہوں نے صرف صالح علیہ السلام کو جھٹلایا تھا نہ کہ رسولوں کو؟۔

جواب: ایک رسول کو جھٹلانا گویا تمام رسولوں کو جھٹلانا ہے۔ اس لئے کہ لوگوں کو خدا تعالیٰ کی وحدانیت کی طرف دعوت دینے میں تمام رسول متفق ہیں۔

سوال: آیت: "فَوَ رَبِّکَ لَنَسْئَلَنَّهُمْ اَجْمَعِیْنَ عَمَّا کَانُوْا یَعْمَلُوْنَ" (سو قسم ہے تیری رب کی ہم کو پوچھنا ہے ان سب سے جو وہ کام کرتے تھے) اور فرمانِ الٰہی: "فَیَوْمَئِذٍ لَّا یُسْئَلُ عَنْ ذَنْۢبِهٖ اِنْسٌ وَّلَا جَآنٌّ" (اس روز کسی جن وانس سے اس کے گناہ کے متعلق سوال نہیں کیا جائے گا) میں بظاہر تعارض ہے۔ پہلی آیت میں کہا جارہا ہے یہ ضرور پوچھیں گے۔ اور دوسری میں کہارہا ہے کہ نہیں پوچھا جائے گا؟۔

جواب: اس کے دو جواب ہیں۔ ایک جواب سورہ ھود میں گذرا ہے وہاں دیکھا جائے۔ دوسرا جواب یہ ہے کہ یہاں جو کہا جارہا ہے کہ ہم ضرور پوچھیں گے یہ سوال توبیخ اور ڈانٹ ڈپٹ کے طور پر ہوگا یعنی یہ فلاں کام تم نے کیوں کیا؟۔ اور سورہ رحمٰن کی آیت جسمیں کہا جارہا ہے کہ ہم ان کے گناہوں کے متعلق سوال نہیں کریں گے۔ اس سے مراد سوال استعلام ہے یعنی ہم معلومات حاصل کرنے کے لئے کہ یہ کام تم نے کیا ہے یا نہیں کیا؟ ایسا سوال نہیں ہوگا۔ لہٰذا دونوں آیتوں میں کوئی تعارض نہیں؟۔ تیسرا جواب یہ ہے کہ قیامت کے مختلف مقامات ہیں۔ بعض مقامات میں سوال جواب ہوں گے۔ اور بعض مقامات پر نہیں ہوں گے۔ اس کی نظیر ماقبل میں گذر چکی ہے۔

# سورۃ النحل

سوال: "وَلَکُمْ فِیْهَا جَمَالٌ حِیْنَ تُرِیْحُوْنَ وَحِیْنَ تَسْرَحُوْنَ" (اور تم کو ان (چوپایوں) سے رونق ہے جب شام کو پھیر لاتے ہو اور جب چراتے ہو)۔ "اراحۃ" (چرا کر شام کو گھر واپس لانا) کو "سروح" (صبح چرانے کے لئے لے جانا) پر کیوں مقدم کیا گیا؟ حالانکہ فی الواقع چرانے کے لئے پہلے لے جاتے ہیں بعد میں واپس لاتے ہیں۔

جواب: اراحۃ کی تقدیم کی وجہ یہ ہے کہ جانور چر کر شام کے وقت آتے ہوئے اچھے لگتے ہیں۔ اس لئے اس وقت وہ بھرے پیٹ اور بھرے تھنوں کے ساتھ آتے ہیں۔ اور چلتے ہوئے سکون اور اطمینان کے ساتھ ایک دوسرے کے پیچھے چلتے ہیں۔ بخلاف صبح چرانے کے لئے لے جاتے

وقت تک ان کے پیٹ بھرے ہوتے ہیں۔ نہ تھنوں میں دودھ ہوتا ہے اور وہ بھوک کی وجہ سے صحیح چل بھی نہیں سکتے۔

سوال: "وَتَحْمِلُ أَثْقَالَكُمْ إِلَى بَلَدٍ لَّمْ تَكُونُوا بَالِغِيهِ إِلَّا بِشِقِّ الْأَنفُسِ" (اٹھا کر چلتے ہیں بوجھ تمہارے ان شہروں تک کہ تم نہ پہنچتے وہاں مگر مشقت کے ساتھ) اگر آیت کا مطلب یہ ہے کہ تم مشقت کے ساتھ پہنچتے ہو۔ تو اس میں احسان جتلانا کیسا ہے؟ اگر مطلب یہ ہے تم ان جانوروں کے بغیر وہاں مشقت سے پہنچتے تھے' تو ان جانوروں کی موجودگی میں بھی مشقت سے پہنچا جاتا ہے تو ان کا کیا فائدہ؟۔

سوال: "تحمل اثقالکم" کا مطلب ہے کہ تم اپنے جسموں کو اپنے سامان کے ساتھ دور دراز کے شہروں تک ان جانوروں کے بغیر مشقت سے پہنچاتے تھے۔ اب ان کی موجودگی میں خود بھی ان پر سواری کرتے ہو۔ اور اپنے سامان کو بھی ان پر لادتے ہو۔ اگر یہ نہ ہوتے تو پیدل سامان کو پشت پر اٹھا کر سفر کرنا بھی کتنا باعث مشقت ہوتا' آیت میں مذکور مشقت سے مراد پیدل چلنے یا سامان پیٹھ پر اٹھا کر چلنے کی مشقت ہے۔ مطلق سفر کی مشقت مراد نہیں ہے۔ اس سے ان جانوروں کا فائدہ مند ہونا خوب واضح ہو گیا۔

سوال: آیت: "وَالْخَيْلَ وَالْبِغَالَ وَالْحَمِيرَ لِتَرْكَبُوهَا وَزِينَةً" (اور گھوڑے اور خچریں اور گدھے کہ ان پر سوار ہو اور زینت حاصل کرو) جس طرح خچر اور گدھے کی حرمت کا تقاضا کرتی ہے۔ اس طرح گھوڑے کی حرمت کی بھی متقاضی ہے۔ اس لئے کہ آیت میں ان کی منفعت زینت اور سواری کرنا بتلایا گیا ہے' لہٰذا یہی منفعتیں اس سے حاصل کی جائیں گی۔ اس لئے کہ کسی کام کی علت بیان کرنے سے وہ اس میں منحصر رہتا ہے۔ لہٰذا اس سے رکوب اور زینت کے علاوہ اور کام لینا اس قاعدے کے خلاف ہوگا۔

جواب: یہ قاعدہ کلیہ نہیں ہے۔ بعض جگہ ٹوٹ جاتا ہے' مثلاً گدھے وغیرہ کو سواری کے علاوہ سامان لادنے اور دوسرے امور میں استعمال کرنا' بالاتفاق جائز ہے۔ حالانکہ آیت میں یہ نہیں بتلایا گیا ہے۔

سوال: اگر کوئی اس جواب کو رد کرتے ہوئے یوں کہہ دے کہ سامان وغیرہ لادنے کا حلال و جائز ہونا بھیڑ بکریوں پر قیاس کرنے کی وجہ سے ہے۔ اور چوپایوں سے یہ کام لینا منصوص علیہ ہے۔ فرمانِ الٰہی ہے: "وَالْأَنْعَامَ خَلَقَهَا لَكُمْ فِيهَا دِفْءٌ وَمَنَافِعُ" (اور اس نے چوپایوں کو بنایا' ان میں تمہارے جاڑے کا بھی سامان ہے)۔ اس منفعت سے منفعتِ عرفی مراد ہے۔ نہ کہ تمام

منفعت اور یہی منفعت گھوڑے خچر اور گدھے میں بھی پائی جاتی ہے۔
سوال: آیت: "یُنۡبِتُ لَکُمۡ بِہِ الزَّرۡعَ وَالزَّیۡتُوۡنَ وَالنَّخِیۡلَ وَالۡاَعۡنَابَ وَمِنۡ کُلِّ الثَّمَرَاتِ"
(اس پانی سے تمہارے لئے کھیتی اور زیتون اور کھجور اور انگور اور ہر قسم کے پھل اُگاتا ہے)۔
یہاں (مِنۡ کُلِّ الثَّمَرَاتِ ہر قسم کے پھلوں میں سے اگاتا ہے) فرمایا۔ حالانکہ تمام پھل پانی کے ذریعے ہی اگتے ہیں؟۔
جوابِ اوّل: دنیاء میں تمام پھل نہیں ہیں۔ تمام پھل صرف جنت میں ملیں گے۔ دنیاء میں تو صرف جنت کے بعض پھلوں کے نمونے ہیں۔ لہٰذا آیت میں "من" تبعیضیہ اس اعتبار سے استعمال کیا گیا۔
جوابِ ثانی: جو لوگ کلام اثبات میں "من" کے زائد ہونے کے قائل ہیں ان کے نزدیک "من" زائد بھی ہوسکتا ہے۔
سوال: "اَفَمَنۡ یَّخۡلُقُ کَمَنۡ لَّا یَخۡلُقُ" (بھلا جو پیدا کرے برابر ہے اس کے جو پیدا نہ کرے) میں "مَنۡ لَّا یَخۡلُقُ" سے مراد بت ہے۔ اگلی آیت سے اس کی تائید ہوتی ہے۔ بت غیر عاقل ہیں۔ غیر عاقل کے لئے لفظ ما استعمال ہوتا ہے نہ کہ "مَن" تو آیت میں مَنۡ لَّا یَخۡلُقُ کیوں فرمایا گیا؟
جواب: اللہ نے کفار کے اعتقاد کے مطابق ان سے خطاب فرمایا اس لئے کہ ان کفار نے ان بتوں کو الٰہ کا نام دیا ان کی پرستش کی اور ان کو عقلاء کا درجہ دیا۔ قرآنِ کریم میں اس جیسی مثالیں موجود ہیں مثلاً اس آیت میں فرمایا گیا: "اَلَہُمۡ اَرۡجُلٌ یَّمۡشُوۡنَ بِہَا" ان کے لئے عقلاء کی ضمیر استعمال کی گئی۔ قاعدے کے رو سے اُلھا ہونا چاہئے۔
مگر اس جواب پر اعتراض وارد ہوتا ہے۔ وہ یہ کہ اگر ان کا اعتقاد غلط اور باطل تھا تو حکمت کا تقاضا یہ تھا کہ اس غلط اعتقاد کی بیخ کنی ہو دل و دماغ سے اس کو اکھاڑ پھینکا جائے نہ کہ ان کو اس پر برقرار رکھا جائے اور ان کو ان کے اعتقاد کے مطابق خطاب کیا جائے اور ان کو موقع دیا جائے کہ وہ اپنے معتقدات کو درست سمجھیں۔
جوابِ اوّل: کفار کو سمجھانے کے لئے یہ کہا گیا ہے۔ اگر ان کے اعتقاد کے خلاف یوں خطاب کیا جاتا: "اَفَمَنۡ یَّخۡلُقُ کَمَنۡ لَّا یَخۡلُقُ" تو کفار سمجھتے کہ اس میں بتوں کے علاوہ دوسرے جمادات مراد ہیں۔ (اور اپنے بتوں کی بے بسی و بے کسی کو نہ سمجھتے)۔
جوابِ ثانی: ابن الانباری نے کہا بتوں کے لئے عاقل کا صیغہ اس لئے استعمال کیا گیا کہ ان کو

عالم کے ساتھ ذکر کیا گیا۔ تو ان پر عالم کا حکم غالب آ گیا۔

سوال: کفار کو غیر اللہ کی عبادت اور ان کو الٰہ کہنے پر ملزم ٹھہرایا گیا ہے اس کا تقاضا یہ ہے کہ یوں بیان کیا جاتا: ''اَفَمَنْ لَا یَخْلُقُ کَمَنْ یَخْلُقُ'' (کیا وہ جو پیدا نہیں کر سکتا ہے برابر ہو سکتا ہے اس کے جو پیدا کر سکتا ہے)۔

جواب: جب انہوں نے بتوں کو خدا سمجھ کر اللہ کی عبادت کی طرح ان کی عبادت کی۔ تو گویا انہوں نے بتوں اور ان کے خالق کے درمیان قطعی برابری کی لہٰذا کسی کو بھی مقدم کیا جائے بتوں کا انکار ثابت ہوتا ہے۔ البتہ خالق کو مقدم کرنے کی وجہ اس کے اشرف ہونے کی وجہ سے یا تقدیم کی وجہ یہ ہے کہ کلام سے مقصود ہی خالق کا بیان ہے اس کی تنزیہہ و تعظیم کی بناء پر۔

سوال: ''اَمْوَاتٌ غَیْرُ اَحْیَاءٍ'' (مردے ہیں جن میں جان نہیں) اموات کہنے کے بعد غیر احیاء (زندہ نہیں ہیں) کہنے کا کیا فائدہ ہے؟۔

جوابِ اوّل: غیر احیاء کہنا بے فائدہ نہیں۔ اس سے مقصود یہ بیان کرنا ہے کہ ان کے مرنے کے بعد حیات نہیں ہے جب کہ بعض مردوں کے لئے مرنے کے بعد حیاۃ ہے۔ جیسے کہ نطفے' انڈے' دوسرے احسام' غیر احیاء کا لفظ ان کے مردہ پن کو خوب ظاہر کرتا ہے فی الحال بھی مردے ہیں۔ فی المال غیر احیاء ہیں۔

جوابِ ثانی: ''غیر احیاء'' بتوں کی صفت نہیں ہے۔ بلکہ بت پرستوں کی صفت ہے مطلب یہ ہے کہ ان بتوں کی عبادت کرنے والوں کے دل زندہ نہیں ہیں۔

جوابِ ثالث: ''غیر احیاء'' کہنا یہ بتانے کے لئے ہے کہ یہ فی الحال بھی مردے ہیں (تم مردوں کی عبادت کرتے ہو) نہ یہ کہ اب زندہ ہیں بعد میں مر جائیں گے۔

سوال: ''وَمَا یَشْعُرُوْنَ اَیَّانَ یُبْعَثُوْنَ'' (ان کو یہ بھی خبر نہیں کہ مردے کب اٹھائے جائیں گے) اس آیت میں بتوں اور بت پرستوں کا عیب بیان کیا گیا ہے کہ وہ قیامت میں اٹھائے جانے کے وقت سے بے خبر ہیں۔ حالانکہ مؤمنین وموحدین کو بھی اس وقت کا علم نہیں وہ بھی بے خبر ہیں تو یہ عیب جوئی کیسے؟۔

جواب: ان بتوں کو یہ معلوم نہیں کہ ان کی عبادت کرنے والے کب اٹھائے جائیں گے۔ تو جاہل کیسے معبود ہو سکتا ہے؟ آیت کا یہ مطلب بھی ہو سکتا ہے کہ بتوں کی عبادت کرنے والے بعث بعد الموت کے متعلق کچھ بھی نہیں جانتے نہ تفصیلی نہ ہی اجمالی۔ اس لئے بعث بعد الموت کے منکر ہو گئے۔ بخلاف موحدین کے کہ وہ بعث بعد الموت کو مجملاً جانتے ہیں کہ وہ قیامت کا دن ہے۔

اگرچہ تفصیلا نہیں جانتے۔
سوال: ''وَاِذَا قِيْلَ لَهُمْ مَاذَآ اَنْزَلَ رَبُّكُمْ قَالُوْٓا اَسَاطِيْرُ الْاَوَّلِيْنَ '' (اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ تمہارے رب نے کیا چیز نازل فرمائی تو کہتے ہیں وہ تو محض بے سند باتیں ہیں جو پہلوں سے (منقول) چلی آرہی ہیں)۔
جواب: اس طرح کا سوال وجوب سورۃ الحجر میں آیت ''وَقَالُوْا يٰٓاَيُّهَا الَّذِىْ نُزِّلَ عَلَيْهِ الذِّكْرُ اِنَّكَ لَمَجْنُوْنٌ'' کے تحت گذر چکے ہیں۔
سوال: اس سورۃ میں فرمان ہے ''لِيَحْمِلُوْٓا اَوْزَارَهُمْ كَامِلَةً يَّوْمَ الْقِيٰمَةِ وَمِنْ اَوْزَارِ الَّذِيْنَ يُضِلُّوْنَهُمْ بِغَيْرِ عِلْمٍ '' (ان لوگوں کو قیامت کے دن اپنے گناہوں کا پورا بوجھ اور جن کو یہ لوگ بے علمی سے گمراہ کررہے ان کے گناہوں کا بھی کچھ بوجھ اپنے اوپر اٹھانا پڑیگا)۔
دوسری جگہ ارشاد ہے: ''وَلَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰى '' (کوئی شخص بھی دوسرے کا بوجھ نہیں اٹھائے گا)۔
جواب: پہلی آیت کا مطلب یہ ہے کہ دوسروں کو گمراہ کرنے کا بوجھ اٹھائیں گے چنانچہ اپنے کفر کا بوجھ اور سبب بننے کی وجہ سے دوسروں کے کفر کا بوجھ اٹھائیں گے، اور دوسری آیت جس میں ہے کہ دوسرے کا بوجھ نہیں اٹھائیں گے اس کا مطلب ہے کہ ایک دوسرے کا ایسا بوجھ نہیں اٹھائے گا جس کے ساتھ اس کا ادنیٰ تعلق بھی نہ ہو۔ نہ ارتکاب کا اور نہ سبب کا۔
سوال: ''اِنَّمَا قَوْلُنَا لِشَىْءٍ اِذَآ اَرَدْنٰهُ اَنْ نَّقُوْلَ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ '' (ہم جس چیز کو (پیدا کرنا) چاہتے ہیں بس اس سے ہمارا اتنا کہنا (کافی) ہوتا ہے کہ تو ہوجا بس وہ ہوجاتی ہے)۔
یہ آیت اس بات پر دلالت کررہی ہے کہ معدوم چیز بھی شئی ہے۔ اور اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ معدوم کو خطاب کرنا جائز ہے۔ حالانکہ اکثر علماء کے نزدیک معدوم شئی نہیں ہے۔ اور معدوم کو خطاب کرنا بالاجماع جائز نہیں ہے؟
جواب: معدوم کو مایؤل یعنی آئندہ ہونے کے اعتبار سے مجازاً شئی کہا گیا ہے۔ قرآن میں اس کی نظریں موجود ہیں۔ مثلاً یہ آیت: ''اِنَّ زَلْزَلَةَ السَّاعَةِ شَىْءٌ عَظِيْمٌ '' اور دوسری آیت: ''اِنَّكَ مَيِّتٌ وَّاِنَّهُمْ مَّيِّتُوْنَ '' اور شئی معدوم کو یہ خطاب' خطاب امر و نہی نہیں ہے بلکہ خطاب تکوین ہے' اس کے ذریعہ اللہ تعالیٰ کی قدرت کا اثر ظاہر ہوتا ہے۔ اس خطاب میں مخاطب کا خطاب سے پہلے موجود ہونا ممتنع ہے بخلاف خطاب امر و نہی کے اس میں مخاطب کا موجود نہ ہونا ممنوع ہے۔
سوال: ''وَلِلّٰهِ يَسْجُدُ مَا فِى السَّمٰوٰتِ وَمَا فِى الْاَرْضِ مِنْ دَآبَّةٍ '' (اللہ ہی کے مطیع ہیں

جتنی چیزیں چلنے والی آسمان میں (جیسے فرشتے) اور جتنے چوپائے زمین میں موجود ہیں)۔
آیت میں لفظ ما" استعمال کیا گیا ہے اگر لفظ "من" لایا جاتا اور یوں کہا جاتا: "مَنْ فِی السَّمواتِ وَمَنْ فِی الْاَرضِ" تو عقلاء کو غلبہ حاصل ہوتا اور غیر عقلاء تبعاً شامل ہو جاتے)۔
جواب: "مَنْ" کو چھوڑ کر "ما" اس لئے لایا گیا تا کہ یہ تمام دابّہ کو شامل ہو۔ چونکہ دونوں کے لئے استعمال ہوتا ہے۔ اور اگر من لایا جاتا تو صرف عقلاء کے ساتھ خاص ہو جاتا۔
سوال: "وَلَوْ يُؤَاخِذُ اللّٰهُ النَّاسَ بِظُلْمِهِمْ مَّا تَرَكَ عَلَيْهَا مِنْ دَآبَّةٍ" (اور اگر اللہ تعالیٰ لوگوں پر ان کے ظلم کے سبب دارو گیر فرماتے تو سطح زمین پر کوئی حرکت کرنے والا نہ چھوڑتے)۔
اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ اگر ظالمین پر عذاب آتا تو غیر ظالم بھی اس کے زد میں آتے اور زمین پر چلنے والی تمام مخلوق ہلاک ہو جاتی۔ حالانکہ ظالم کے ظلم کی وجہ سے غیر ظالم کو سزا دینا حکیم ذات کو زیب نہیں دیتا۔

جوابِ اوّل: یہاں ظلم سے مراد کفر ہے۔ اور دابہ سے دابہ ظالمہ یعنی کافر مراد ہے' حضرت عبداللہ بن عباسؓ نے بھی اس طرح فرمایا ہے۔ بعض نے جواب دیا' اگر آباء کو ہلاک کیا جاتا تو ابناء بھی نہ ہوتے۔

جوابِ ثانی: یہ ممکن ہے ظلم اور ظلم کے اثر تک کو زمین سے مکمل طور پر ختم کرنے کے لئے سب کو ہلاک کر دیا جاتا تا کہ ظلم کا اثر ختم ہو جیسے پچھلی امتوں کے ساتھ یہ واقعہ ہوا ہے۔ چنانچہ حضرت نوح علیہ السلام کی قوم کے ظلم کی بنا پر طوفان آیا اور تمام مخلوق کو بہالے گیا۔ کشتی میں سوار لوگوں اور جانوروں کے علاوہ سطح زمین پر چلنے والی تمام مخلوق غرقاب ہوگئی۔ اس لئے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: "وَاتَّقُوْا فِتْنَةً لَّا تُصِيْبَنَّ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا مِنْكُمْ خَآصَّةً" البتہ غیر ظالم جو اس عذاب کے زد میں آگئے ان کو اللہ تعالیٰ اس کے بدلے قیامت کے دن اجرِ عظیم عطا فرمائیں گے۔
جوابِ ثالث: ہر انسان مکلّف ہے ظاہر بات ہے کہ کوئی انسان گناہ سے بچ نہیں سکتا۔ اگرچہ صغیرہ ہی کیوں نہ ہو۔ گناہ کرنا ظلم ہے' تو ہر انسان ظالم ہوا۔ تو اگر انسان اپنے ظلم کی پاداش میں ہلاک ہوگا۔ تو جانوروں کو بھی ہلاک کر دیا جائے گا۔ اس لئے کہ یہ انسانوں کی ضرورت کے لئے پیدا کئے گئے ہیں جب انسان نہیں رہے۔ تو ان جانوروں کی ضرورت بھی باقی نہ رہی۔ لہٰذا یہ بھی ختم ہوں گے۔
سوال: ہم یہ تسلیم نہیں کرتے کہ انسان کے علاوہ مخلوق انسانی مصالح کے لئے پیدا کی گئی ہے۔ اس لئے کہ کتب شرعیہ سے ثابت ہے کہ ان کی تخلیق انسان سے پہلے ہے۔ حدیث میں اس مخلوق

کی انسان سے پہلے پیدائش پر صراحت موجود ہے۔ اگر اس بات کو تسلیم بھی کر لیں کہ یہ انسان کی مصلحت کے لئے پیدا ہے پھر تو ان مخلوقات کا انسان کے ساتھ ہلاک ہونا انسان کے عذاب اور مصیبت میں کمی کریگا۔ خصوصاً اگر ہلاکت کا سبب بھی ایک ہی ہو۔ کیونکہ کہا جاتا ہے کہ مصیبت اگر عام ہو جائے تو آسان ہو جاتی ہے۔

جواب: اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: ''خَلَقَ لَكُمْ مَّا فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا'' (پیدا کیا تمہارے لئے جو کچھ زمین میں ہے سب کا سب)۔ چنانچہ انسان کی تخلیق سے ان مخلوق کی پیدائش انسانی مصالح کے لئے پیدا کئے جانے کے منافی نہیں ہے۔ جیسا کہ بڑے لوگ اپنی اولاد کی پیدائش سے پہلے ان کے لئے مکانات' محلات' سواریاں خدام اور کپڑے وغیرہ تیار کر رکھتے ہیں۔ جہاں تک مصیبت کے عام ہونے سے تکلیف میں تخفیف ہونے کا تعلق ہے۔ ہم یہ نہیں کہتے کہ سب اکٹھے ہلاک ہوں گے۔ بلکہ یہ مال مویشی وغیرہ ان کے سامنے پہلے ہلاک کر دئے جائیں گے تا کہ ان کی چیزیں ہلاک ہونے سے ان کی تکلیف میں اضافہ ہو۔

سوال: ''اَنِ اتَّخِذِيْ مِنَ الْجِبَالِ بُيُوْتًا وَّمِنَ الشَّجَرِ'' (کہ تو پہاڑوں میں گھر بنالے اور درختوں میں) ''فی الجبال' اور فی الشَّجر'' کے بجائے من الجبال اور من الشجر کیوں فرمایا؟ حالانکہ عام استعمال میں اس کے لئے فی استعمال ہوتا ہے۔

جواب: علامہ زمخشریؒ نے فرمایا ہے: ''فی'' کے بجائے ''من'' کا استعمال بعضیت کے معنی پیدا کرنے کے لئے کیا گیا ہے۔ اس لئے کہ ہر پہاڑ یا ہر درخت میں مکان نہیں بنایا جاتا۔ یہ تھا زمخشریؒ کا قول' جہاں تک میرا خیال ہے کہ ''فی'' کی جگہ ''من' استعمال کر کے یہ بتلایا جا رہا ہے۔ کہ ان کے مکانات پہاڑ اور درختوں کے مجموعے سے بنائے جاتے تھے۔ کیونکہ ہم دیکھتے ہیں کہ شہد کی مکھیاں پہاڑوں میں اپنے لئے چھتے لکڑیوں سے بناتی ہیں۔ اگر ''من'' کے بجائے لفظ ''فی'' استعمال کیا جاتا تو یہ مفہوم اداء نہیں ہو سکتا تھا۔ اس کی نظیر دوسری جگہ بھی ہے چنانچہ ارشادِ گرامی ہے: ''وَتَنْحِتُوْنَ مِنَ الْجِبَالِ بُيُوْتًا''۔

سوال: اللہ تعالیٰ نے کیسے فرمایا: ''وَاللّٰهُ جَعَلَ لَكُمْ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ اَزْوَاجًا'' (اور اللہ تعالیٰ نے تم ہی میں سے تمہارے لئے بیبیاں بنائیں) جب کہ ہماری بیویاں ہمارے نفسوں میں سے نہیں ہیں۔ اور وہ بھی ہو نہیں سکتیں اس لئے کہ ہمارے نفسوں سے ہوتیں تو ہمارے لئے ان سے فائدہ اٹھانا حلال نہ ہوگا۔ اس لئے کہ اپنے جز سے نکاح جائز نہیں ہے؟۔

جوابِ اوّل: آیت کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آدمؑ کو پیدا فرمایا۔ پھر حضرت آدم علیہ

السلام کے پہلو سے حضرت حواء علیہا السلام کو پیدا کیا۔ جیسا کہ فرمان الٰہی ہے: ''اَلَّذِیْ خَلَقَکُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَۃٍ وَّخَلَقَ مِنْهَا زَوْجَهَا''

جوابِ ثانی: ''من انفسکم'' کا مطلب ہے ''من جنسکم'' ہے جیسا کہ فرمانِ تعالیٰ ہے ''لَقَدْ جَآءَکُمْ رَسُوْلٌ مِّنْ اَنْفُسِکُمْ''

سوال: ''وَیَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَالَا یَمْلِکُ لَهُمْ رِزْقًا مِّنَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ شَیْئًا وَّلَا یَسْتَطِیْعُوْنَ'' (اور اللہ کو چھوڑ کر ایسی چیزوں کی عبادت کرتے ہیں جو ان کو نہ آسمان میں سے رزق پہنچانے کا اختیار رکھتی ہے۔ اور نہ زمین سے اور نہ وہ قدرت رکھتے ہیں)۔

بتوں کے لئے جمع مذکر سالم کا صیغہ استعمال کیا گیا ہے جب کہ وہ غیر عاقل ہیں۔

جواب: بعض کفار عقلاء کی عبادت کرتے رہے ہیں۔ مثلاً یہودی حضرت عزیرؑ کی، عیسائی حضرت عیسیٰؑ کی اور بعض کفار فرشتوں کی عبادت کرتے رہے ہیں، اس وجہ سے عقلاء کو غلبہ دیکر عاقل کا صیغہ استعمال کیا۔

سوال: ان بتوں کے لئے ''مالا یملک'' میں مفرد کا صیغہ اور لا یستطیعون جمع کا صیغہ لایا گیا ہے، کیوں؟۔

جواب: ''ما'' کے لفظ کا اعتبار کرتے ہوئے مفرد کی ضمیر اور معنی کا اعتبار کرتے ہوئے جمع کی ضمیر لوٹائی گئی، جیسا کہ مندرجہ ذیل آیت میں ''ما'' کے لفظ کا اعتبار کر کے ضمیر مفرد اور معنی کا اعتبار کر کے ''ظهور'' کو جمع لایا گیا: ''وَجَعَلَ لَکُمْ مِّنَ الْفُلْکِ وَالْاَنْعَامِ مَا تَرْکَبُوْنَ لِتَسْتَوٗا عَلٰی ظُهُوْرِهٖ''

سوال: لَا یَمْلِکُ (قدرت نہیں رکھتے) کے بعد (وَلَا یَسْتَطِیْعُوْنَ) (طاقت نہیں رکھتے) کا کیا فائدہ ہے؟ کیونکہ دونوں ہم معنی ہیں؟۔

جوابِ اوّل: ''یستطیعون'' میں مفعول (رزق) کی ضمیر نہیں ہے۔ بلکہ مطلق استطاعت کی نفی ہے یعنی رزق اور غیر رزق دونوں کی طاقت ہی ان میں نہیں ہے۔ اس لئے کہ وہ جماد محض ہیں۔ اور ''لا یملک'' کا مفعول رزق ہے۔ یعنی رزق پہنچانے پر قادر نہیں ہے لہٰذا معلوم ہوا کہ ''لا یستطیعون'' بے فائدہ نہیں ہے۔

جوابِ ثانی: اگر ''لَا یَسْتَطِیْعُوْنَ'' میں مفعول کی ضمیر محذوف ہو یعنی ''لا یستطیعونه ہو اور وہ رزق کی طرف لوٹے تب بھی ''لا یملک'' کے بعد اس کو لانا فائدے سے خالی نہیں ہے اس لئے کہ بسا اوقات انسان کسی چیز کا مالک تو نہیں ہوتا لیکن اس کا مالک بننے کی استطاعت رکھتا ہے

برخلاف ان بتوں کے کہ نہ تو یہ کسی چیز کے مالک ہیں اور نہ ہی ان میں مالک بننے کی استطاعت وصلاحیت ہے۔

سوال: "ضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا عَبْدًا مَّمْلُوْكًا لَّا يَقْدِرُ عَلٰى شَيْءٍ وَّمَنْ رَّزَقْنٰهُ مِنَّا رِزْقًا حَسَنًا" (اللہ نے بتلائی ایک مثال کہ ایک غلام مملوک ہے کہ کسی چیز کا اختیار نہیں رکھتا اور جس کو ہم نے روزی دی اپنی طرف سے (اچھی روزی) سوال یہ ہے "عَبْدًا" کے مملوکا لانے اور "مملوکاً" کے بعد لا یقدر علی شیء (کسی چیز کا اختیار نہیں رکھتا) لانے کا کیا فائدہ ہے؟ اس لئے کہ عبد ہوتا ہی مملوک ہے اور مملوک کا اپنا کوئی اختیار نہیں ہوتا؟۔

جواب: لفظ عبد غلام اور آزاد دونوں کے لئے استعمال ہوسکتا ہے اس لئے کہ آزاد اور غلام دونوں اللہ کے عبید ہیں۔ لہٰذا "عَبْدًا" کے "مملوکاً" لانا آزاد سے ممتاز کرنے کے لئے ہے اور 'مملوکاً" کے بعد "لا یقدر" لانا عبد ماذون اور مکاتب سے جدا کرنے کے لئے ہے۔ اس لئے کہ عبد ماذون اور مکاتب مستقل تصرف پر قادر ہوتے ہیں۔

سوال: مذکورہ آیت جس کو بطور مثال بیان کیا گیا ہے وہ دو ہیں ایک مملوک دوسرا وہ شخص جس کو رزق حسن دیا گیا لہٰذا قاعدے کے رو سے تثنیہ کا صیغہ "ہل یستویان" ہونا چاہئے۔ جبکہ آیت میں جمع کا صیغہ "ہل یستوون" ہے؟۔

جوابِ اوّل: آیت میں معین مالک اور متعین مملوک مراد نہیں ہے۔ بلکہ جنس مالکین اور جنس مملوکین مراد ہے۔

جوابِ ثانی: دو کو جماعت کے حکم کردے دیا گیا۔

جوابِ ثالث: "مَنْ رَّزَقْنٰهُ" میں لفظ "مَنْ" جمع کے معنی میں ہے۔

سوال: "وَمَآ اَمْرُ السَّاعَةِ اِلَّا كَلَمْحِ الْبَصَرِ اَوْ هُوَ اَقْرَبُ" (اور قیامت کا معاملہ بس ایسا ہوگا جیسے آنکھ جھپکنا یا اس سے بھی جلدی) "اَوْ" خبر میں شک کے لئے آتا ہے اور اللہ تعالیٰ کے لئے شک محال ہے۔ تو آیت مذکور میں "اَوْ" کیسے استعمال کیا گیا؟۔

جوابِ اوّل: بعض حضرات نے اس کا جواب یہ دیا ہے کہ یہاں "اَوْ" "بَلْ بلکہ معنی میں ہے" جیسے آیت "اِلٰى مِائَةِ اَلْفٍ اَوْ يَزِيْدُوْنَ" میں او بلکہ کے معنی میں ہے یعنی "بل یزیدون" ہے۔ اور آیت "فَهِيَ كَالْحِجَارَةِ اَوْ اَشَدُّ قَسْوَةً" میں بھی او کے معنی میں ہے۔ اسی طرح "فَكَانَ قَابَ قَوْسَيْنِ اَوْ اَدْنٰى" میں بھی "اَوْ" بلکہ کے معنی میں ہے۔ لیکن اس جواب پر یہ اشکال ہوگا کہ بل (بلکہ) ماقبل کلام سے رجوع کرنے کے لئے آتا ہے جو اللہ تعالیٰ کے لئے محال ہے۔

جوابِ ثانی: ان آیات میں ''اَوْ'' واو کے معنی میں ہے۔
جواب ثالث: تمام آیات میں لفظ ''اَوْ'' شک کے لئے ہے لیکن ہمارے لئے ہے نہ کہ اللہ تعالیٰ کے لئے۔
اسی طرح ''فَكَانَ قَابَ قَوْسَيْنِ اَوْ اَدْنٰى'' میں نبی کریم ﷺ کے دیکھنے کے اعتبار سے ہے۔
اور علامہ زجاج نے فرمایا ہے کہ: آیت کا یہ مطلب نہیں کہ قیامت پلک جھپکنے سے بھی جلدی واقع ہوگی بلکہ آیت کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ جب چاہے جلدی سی لانے پر قادر ہے۔
سوال: ''وَجَعَلَ لَكُمْ سَرَابِيْلَ تَقِيْكُمُ الْحَرَّ'' (تمہارے لئے ایسے کرتے بنائے جو گرمی سے تمہاری حفاظت کریں)۔ کرتے صرف گرمی سے بچاؤ ہی کے لئے نہیں بلکہ سردی سے بچاؤ کے لئے بھی ہوتے ہیں' آیت میں صرف گرمی سے بچاؤ کا ذکر ہے' سردی سے بچاؤ کا ذکر نہیں؟
جواب: قرینہ کی موجودگی میں اس کو حذف کیا گیا' اس لئے کہ اس کی ضد (گرمی) اس پر دلالت کر رہی ہے۔ جیسا کہ ایک آیت میں فرمایا گیا ''بِيَدِكَ الْخَيْرُ'' والشر نہیں فرمایا گیا۔ اس طرح کسی شاعر نے بھی کہا۔

وَما ادری اذایممت ارضا ☆ ارید الخیر ایھما یلینی

(جب میں کسی جگہ جانے کا ارادہ کرتا ہوں تو خیر و بھلائی چاہتا ہوں۔ مگر مجھے نہیں معلوم کہ مجھے خیر و شر میں سے کس سے واسطہ پڑتا ہے) تو شاعر نے بھی ''خیر'' کو ذکر کر کے شر کو حذف کیا۔ اس لئے ''خیر'' اس پر دلالت کر رہی ہے۔
سوال: اگر ایسا ہے تو برد (سردی) اور ''شر'' کو ذکر کر کے الحر اور الخیر کو محذوف کرتے' انہیں چھوڑ کر انہیں ذکر کرنے میں کیا حکمت ہے؟۔
جواب: اس میں یہ حکمت ہے کہ خیر مطلوب و مرغوب ہے' اللہ سے لوگ خیر ہی مانگتے ہیں۔ اور شر کے مقابلے میں وجود کے لحاظ سے زیادہ بھی ہے۔ اور ''الحر'' کو ذکر کرنے کی حکمت یہ ہے کہ قرآن کریم کے سب سے پہلے مخاطب اہل حجاز ہیں۔ ان کے لئے گرمی سے بچاؤ کی اہمیت زیادہ ہے۔ اس لئے کہ ان کے ہاں سردی کے مقابلے میں گرمی سے بچاؤ کا اہتمام زیادہ ہے۔
سوال: اللہ نے کیسے فرمایا: ''يَعْرِفُوْنَ نِعْمَةَ اللّٰهِ ثُمَّ يُنْكِرُوْنَهَا وَاَكْثَرُهُمُ الْكٰفِرُوْنَ'' (خدا کی نعمتوں کو تو پہچانتے ہیں تو مگر پہچان کر پھر اس کے منکر ہو جاتے ہیں اور زیادہ ان میں سے ناشکرے ہیں) حالانکہ وہ سب کافر ہیں۔
جواب: زمخشریؒ نے کہا: بہتر یہ ہے کہ یہاں اکثر سے تمام مراد لئے جائیں' مگر یہ جواب قابل

غور ہے۔ اس لئے کہ بعض کا اطلاق کل پر نہیں ہوتا' البتہ کل کا اطلاق بعض پر ہوتا بھی ہے۔
سوال: قیامت کے دن کفار کا اپنے معبودوں کو دیکھ کر یہ کہنے کا کیا فائدہ کہ: "رَبَّنَا هٰؤُلَاءِ شُرَكَاؤُنَا الَّذِيْنَ كُنَّا نَدْعُوْا مِنْ دُوْنِكَ" (جب مشرک لوگ اپنے شریکوں کو دیکھیں گے تو کہیں گے کہ اے ہمارے پروردگار! وہ ہمارے شریک ہی ہیں کہ آپ کو چھوڑ کر ہم ان کی پوجا کرتے تھے) کیونکہ اللہ تعالیٰ کو اس کا علم پہلے سے ہے۔
جوابِ اوّل: جب کفار "وَاللّٰهِ رَبِّنَا مَا كُنَّا مُشْرِكِيْنَ" کہہ کر شرک کرنے کا انکار کریں گے۔ تو اللہ تعالیٰ بطور عقاب کے ان کی زبانوں پر سکوت طاری کر کے ان کے اعضاء سے بلوائیں گے۔ وہ جب ان شریکوں کو دیکھیں گے جن کی وہ دنیا میں پوجا کرتے تھے تو کہہ اٹھیں گے "رَبَّنَا هٰؤُلَاءِ شُرَكَاؤُنَا" (اے ہمارے رب! یہی ہمارے شرکاء ہیں) یعنی گویا وہ یہ کہیں گے کہ ہم انکار کے بعد اقرار کرتے ہیں' جھوٹ بولنے کے بعد سچ بتاتے ہیں اے اللہ! آپ کی رحمت کے طلب گار ہونے کے لئے اور آپ کے غضب سے بچنے کے لئے۔ لہٰذا ان کا یہ بتانا کہ یہ ہمارے معبود تھے اپنے گناہوں کے اعتراف کے لئے ہوگا نہ کہ اللہ تعالیٰ کو بتانے کے لئے۔
جوابِ ثانی: کفار جب سخت ترین عذاب کا نظارہ کریں گے اور اللہ کی سخت ترین ناراضگی کا مشاہدہ کریں گے۔ تو خود کو بچانے کے لئے بتوں کو موردِ الزام ٹھہرا کر بول پڑیں گے "رَبَّنَا هٰؤُلَاءِ شُرَكَاؤُنَا" اس لئے کہ یہ لوگ اپنی دانست میں ان بتوں کو عاقل سمجھتے ہیں' اور یہ کہیں گے۔ کہ ان لوگوں نے ہمیں گمراہ کیا۔
سوال: یہ معبود مشرکین کو: "اِنَّكُمْ لَكٰذِبُوْنَ" (بیشک تم جھوٹ بولتے ہو) کیوں کہیں گے؟ حالانکہ مشرکین اپنے اس قول (کہ یہ ہمارے شرکاء ہیں) میں سچے ہیں۔
جواب: یہ اس لئے ہوگا تا کہ ان مشرکین کی فضیحت وذلت میں مزید اضافہ ہو۔ وہ اس طرح ہوگا کہ بت تو جماد ہیں' بے روح ہیں وہ یہ جانتے تک نہیں کہ ان کی کوئی عبادت بھی کرتا ہے۔ تو اس سے ظاہر ہوگا وہ ایسی مخلوق کی عبادت کرتے تھے جو اپنے عابدین کو جانتی تک نہیں' اس سے ان کفار کو مزید شرمندگی ہوگی۔ اس کی نظیر یہ آیت بھی ہے: "وَاتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اٰلِهَةً لِّيَكُوْنُوْا لَهُمْ عِزًّا كَلَّا سَيَكْفُرُوْنَ بِعِبَادَتِهِمْ وَيَكُوْنُوْنَ عَلَيْهِمْ ضِدًّا"
سوال: "وَنَزَّلْنَا عَلَيْكَ الْكِتٰبَ تِبْيَانًا لِّكُلِّ شَيْءٍ" ترجمہ (ہم نے آپ پر کتاب نازل فرمائی جو ہر چیز کو بیان کرنے والی ہے) سوال یہ ہے اگر قرآن دین کے تمام امور کے لئے واضح بیان ہے تو ائمہ کے درمیان دینی معاملات میں اختلاف کیوں ہوا۔؟

جواب: حضرت ائمہ کے درمیان اختلاف اس لئے واقع ہوا کہ قرآن کریم میں تمام امور دین بیان نہیں ہوئے ہیں۔ بلکہ بعض کا بیان صراحۃً ہے اور بعض احکام بذریعہ غور وفکر مستنبط ہیں اور ہر ایک امام کا طریقہ استدلال علیحدہ ہے۔ اس لئے اختلاف واقع ہوا۔

سوال: شریعت کے بہت سے احکامات قرآن سے نہ نصاً ثابت ہیں اور نہ ہی استنباط واستخراج کے ذریعے سے۔ جیسا نماز کی رکعات کی تعداد، مدت سفر، مدت مسح، مدت حیض، چوری کا نصاب اور اس جیسے بہت سارے احکامات۔

جواب: قرآن کریم نے تمام دینی امور کو بیان کیا ہے۔ بعض کو خود بیان کر دیا ہے اور بعض کو سنت رسولؐ پر یہ کہہ کر چھوڑ دیا: ''وَمَا اٰتٰكُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْهُ وَمَا نَهٰكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوْا'' ترجمہ (جو کچھ تم کو رسولؐ اللہ دیں اس کو لے لو اور جس چیز سے روکیں اس سے رک جاؤ)

دوسری جگہ ارشاد ہے: ''وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْيٌ يُّوْحٰى'' ترجمہ (اور آپؐ اپنی خواہش سے نہیں بولتے بلکہ وحی ہے جو اللہ کی طرف سے آپؐ پر کی جاتی ہے)

اور یہ بھی فرمایا ''وَيَتَّبِعْ غَيْرَ سَبِيْلِ الْمُؤْمِنِيْنَ''

اور: ''فَاعْتَبِرُوْا يٰٓاُولِي الْاَبْصَارِ'' فرما کر قیاس کرنے کا حکم دیا۔ یہ چار طریقے ہیں۔ شریعت کا کوئی حکم ان چار سے باہر نہیں۔ ان چاروں کا تذکرہ قرآن میں موجود ہے۔ لہٰذا قرآن کو'' تبیانا لکل شیء'' کہنا صحیح ہوا۔

سوال: ''لَا تَتَّخِذُوْٓا اَيْمَانَكُمْ دَخَلًا بَيْنَكُمْ فَتَزِلَّ قَدَمٌ بَعْدَ ثُبُوْتِهَا'' (اور نہ ٹھہراؤ قسموں کو دھوکا آپس میں کہ ڈگ نہ جائے کسی کا پاؤں جمنے کے پیچھے) میں لفظ ''قَدَمٌ'' کو مفرد اور نکرہ کیوں لایا گیا۔ معرفہ ''اَلقدم'' یا جمع ''الاقدام'' کیوں نہ فرمایا گیا ایمان جمع کے ساتھ زیادہ مناسب بھی ہے؟۔

جواب: ''قَدَمٌ'' کو مفرد اور نکرہ لانا اس بات کی اہمیت اور بڑائی کو بیان کرنے کے لئے کیا۔ اگر ایک قدم راہ جنت سے دوری کا سبب بن سکتا ہے تو بہت سارے اقدام کیسے نہ پھسل جائیں گے؟

سوال: ''مَنْ عَمِلَ صَالِحًا مِّنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰى'' (جس نے نیک کام کیا مرد ہو یا عورت) لفظ من مذکر اور مؤنث دونوں کو شامل ہے اس کا اطلاق دونوں پر ہوتا ہے۔ جیسے مندرجہ ذیل آیات میں ان دونوں کو شامل ہے: ''مَنْ جَآءَ بِالْحَسَنَةِ'' (جو نیک کام کرے) ''وَلِلّٰهِ عَلَى النَّاسِ حِجُّ الْبَيْتِ مَنِ اسْتَطَاعَ اِلَيْهِ سَبِيْلًا'' اس طرح: ''فَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَّرَهٗ'' جو مثقال بھر عمل کریگا اچھا اس کو دیکھ لے گا'' وغیرہ آیات میں مَنْ مرد وعورت دونوں کو شامل ہے تو

یہاں آیت مذکور میں مِنۡ ذَکَرٍ اَوۡ اُنۡثٰی لانے کی کیا ضرورت ہے؟۔
جواب: یہاں دو صنفوں کو علیحدہ علیحدہ بیان کرنے کا ایک سبب ہے وہ یہ کہ عورتوں نے کہا کہ قرآن میں اللہ تعالیٰ نے مردوں کا خیر کے ساتھ ذکر کیا ہے مگر عورتوں کا کوئی تذکرہ نہیں ہے۔ اگر ہمارے اندر خیر و بھلائی ہوتی تو ہمارا بھی تذکرہ قرآن کریم میں ہوتا۔ تو اللہ تبارک و تعالیٰ نے مندرجہ ذیل آیات اتاری: ''اِنَّ الۡمُسۡلِمِیۡنَ وَالۡمُسۡلِمٰتِ وَالۡمُؤۡمِنِیۡنَ وَالۡمُؤۡمِنٰتِ الخ'' اور آیت: ''مَنۡ عَمِلَ صَالِحًا مِّنۡ ذَکَرٍ اَوۡ اُنۡثٰی وَھُوَ مُؤۡمِنٌ فَلَنُحۡیِیَنَّہٗ حَیٰوۃً طَیِّبَۃً'' جب یہ آیات اتریں جن میں عورتوں کا بھی تذکرہ ہے تو ان کا وہم دور ہو گیا۔
سوال: آیت میں فرمایا گیا ہے۔ جو مرد یا عورت نیک عمل کریگا ہم اس کو پاکیزہ زندگی دیں گے۔ حالانکہ دیکھا یہ گیا ہے کہ بہت سے صلحاء و اتقیاء کی زندگیاں مصائب و تکالیف' محنت و مشقت اور مختلف آزمائشوں میں صرف ہوئی ہیں۔ جو جتنا نیک ہوا اتنی مشکلات سے دوچار ہوا؟۔
جواب: یہاں حیات سے مراد حیاتِ قناعت ہے۔ اور بعض نے کہا: اس سے رزقِ حلال مراد ہے۔ اور بعض نے کہا اس سے مراد نیکیوں کی توفیق نصیب ہونا ہے۔ اور بقول بعض طاعت کی لذت و شیرینی مراد ہے۔ بعض علماء کے نزدیک حیات طیبہ سے مراد فیصلہ خداوندی پر راضی ہونا ہے۔ اور بعض نے کہا۔ اس سے قبر کی زندگی مراد ہے۔ جیسا کہ آیت میں فرمایا گیا ہے: ''وَلَا تَحۡسَبَنَّ الَّذِیۡنَ قُتِلُوۡا فِیۡ سَبِیۡلِ اللّٰہِ اَمۡوَاتًا ؕ بَلۡ اَحۡیَآءٌ عِنۡدَ رَبِّھِمۡ یُرۡزَقُوۡنَ'' (اور اللہ کے راستے میں قتل کیے جانے والوں کو تم مردہ مت سمجھو۔ بلکہ وہ زندہ ہیں۔ ان کے رب کے ہاں ان کو رزق دیا جاتا ہے)۔
بعض نے کہا اس سے مراد آخرت کی زندگی ہے' درحقیقت اصل زندگی آخرت کی زندگی ہے۔ اس لئے کہ اس کے بعد پھر موت نہیں ہے اور یہ لوگ ہمیشہ ہمیشہ باقی رہنے والی نعمتوں میں ہوں گے۔ مگر چند آیات کی روشنی میں دیکھا جائے تو بظاہر اس سے دنیا کی زندگی مراد ہے۔ ''وَلَنَجۡزِیَنَّھُمۡ اَجۡرَھُمۡ وَعۡدَ اللّٰہِ ثَوَابَ الدُّنۡیَا وَالۡاٰخِرَۃِ'' ''فَاٰتٰھُمُ اللّٰہُ ثَوَابَ الدُّنۡیَا وَحُسۡنَ ثَوَابِ الۡاٰخِرَۃِ''
سوال: اللہ پاک نے کیسے فرمایا: ''اِنَّ اللّٰہَ لَا یَھۡدِی الۡقَوۡمَ الۡکٰفِرِیۡنَ'' اللہ تعالیٰ کافر لوگوں کو ہدایت نہیں کیا کرتا)
حالانکہ بہت سارے صحابہ کافر تھے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کو ہدایت کی دولت سے نوازا؟۔
جواب: ان کافروں سے وہ کافر مراد ہیں جنکی موت اللہ تعالیٰ کے علم کے مطابق کفر پر آئیگی۔

بعد کی دو آیتوں سے بھی اس جواب کی تائید ہوتی ہے۔

سوال: "یَوْمَ تَاْتِیْ کُلُّ نَفْسٍ تُجَادِلُ عَنْ نَّفْسِهَا" (جس دن آئے گا ہر جی جواب وسوال کرتا اپنی طرف سے) آیت میں نفس کی اضافت نفس کی طرف ہے حالانکہ نفس کے لئے اور کوئی نفس نہیں ہوتا؟۔

جواب: نفس سے مراد روح ہے جو جوہر ہے اور قائم بذاتہ ہے اور جسم کے ساتھ اس کا تعلق انتظام کا ہے۔ اور بعض نے کہا کہ نفس کا اطلاق انسان پر بھی ہوتا ہے۔ جیسا کہ اس آیت میں ہے: "کُلُّ نَفْسٍ ذَآئِقَةُ الْمَوْتِ" دوسری جگہ ارشاد ہے: "کَتَبْنَا عَلَیْهِمْ فِیْهَا اَنَّ النَّفْسَ بِالنَّفْسِ" اور نفس کا اطلاق ذات شئی پر بھی ہوتا ہے۔ جیسا کہ کہا جاتا ہے "نفس الذهب والفضة محبوبة" سونا چاندی کی ذات پسندیدہ ہے لہٰذا آیت میں پہلے نفس سے مراد انسان اور دوسرے سے مراد اس کی ذات ہے۔ آیت کا مطلب یہ ہے کہ انسان قیامت کے دن اپنی ہی ذات سے محو گفتگو ہوگا۔ کسی کی طرف دھیان نہیں جائے گا۔ اور ہر ایک کہیگا۔ نفسی نفسی۔

سوال: اللہ تعالیٰ نے کیسے فرمایا: "فَاَذَاقَهَا اللّٰهُ لِبَاسَ الْجُوْعِ وَالْخَوْفِ" (اور پھر چکھایا اس کو اللہ تعالیٰ نے بھوک اور خوف کا لباس) حالانکہ لباس کے ساتھ چکھانے کا لفظ مناسب نہیں ہے۔ بلکہ اس کے مناسب پہنانا ہوتا ہے۔

جواب: لفظ اذاقہ (چکھانا) مستعار لہ جوع (بھوک) کے مناسب ہے جو متقاضی الاکل کے ہے۔ جس کے لئے چکھنا استعمال ہوتا ہے۔ مگر مستعار (لباس) کے مناسب نہیں ہے۔ اگر "اذاقہا" کے بجائے کساہا" (اس کو پہنایا) مذکور ہوتا تو مستعار کے موافق تو ہوتا مگر مستعار لہ کے مطابق نہیں ہوتا۔ دونوں طریقے علم بیان میں رائج ہیں۔ پہلے کو تجرید الاستعارہ کہتے ہیں اور دوسرے کو ترشیح الاستعارہ کہا جاتا ہے۔ اس آیتِ کریمہ میں تجرید الاستعارہ سے کام لیا ہے۔ ان تمام طریقوں کو میں نے اپنی تصنیف "روضۃ الفصاحۃ" کے اندر تفصیل کے ساتھ لکھ دیا ہے۔"

لباس الجوع والخوف "ان اہل بستی پر پیلا پن اور کمزوری کے اثرات سے کنایہ ہے۔ جیسا "لباس التقوی" استعارہ ہے متقی کے چہرے پر تقوی کے اثرات کے لئے۔

اور بعض نے کہا: کہ آیت میں عبارت محذوف ہے۔ تقدیر عبارت یوں ہے: "فَاَذَاقَهَا اللّٰهُ طَعْمَ الْجُوْعِ وَكَسَاهَا لِبَاسَ الْخَوْفِ" (اللہ تعالیٰ نے ان کو بھوک کا مزہ چکھایا اور خوف کا لباس پہنایا)

# سورۃ الاسراء

سوال: ''سُبْحٰنَ الَّذِیْ اَسْرٰی بِعَبْدِہٖ لَیْلًا'' (پاک ذات ہے جو لے گیا اپنے بندے کو راتوں رات) آیت میں ''بعبدہٖ'' فرمایا گیا ''بنبیہ'' یا برسولہٖ یا بحبیبہ یا بصفیہ نہیں فرمایا۔ حالانکہ اس سے آپ کی تعظیم مراد ہے)۔

جواب: آپ کو عظیم ترین مقام میں لفظ عبد کے ساتھ یاد کیا گیا جیسا کہ فرمانِ الٰہی ہے: ''فَاَوْحٰی اِلٰی عَبْدِہٖ مَآ اَوْحٰی'' اس لئے کہ آپ کی امت غلط فہمی میں مبتلاء ہو کر عیسائیوں کی طرح گمراہ نہ ہو جائے۔ عیسائیوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو ''الٰہ'' کہا جبکہ بعض حضرات نے کہ عبد اس لئے کہا گیا کہ آپ عجب میں مبتلا نہ ہوں۔

سوال: اسراء کہتے ہیں رات کے وقت چلانے کو تو پھر ''لیلا'' کے اضافے کا کیا فائدہ ہے؟۔

جواب: لیلا لانے کا فائدہ یہ ہے کہ لیلا کو نکرہ لایا گیا ہے جو یہ بتا رہا ہے کہ مکہ سے بیت المقدس اور بیت المقدس سے آسمانوں کا سفر پھر وہاں سے واپس مکہ مکرمہ آمد رات کے بعض حصے میں ہوئی۔ حالانکہ مکہ سے بیت المقدس کا یک طرفہ سفر چالیس دن کا ہے۔ یعنی یہ عظیم سفر کم ترین وقت میں ہوا۔

تنکیر بعضیت پر دلالت کرتی ہے۔ حضرت عبداللہؓ اور حضرت حذیفہؓ کی قراءت سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے جو اسریٰ بعبدہٖ من اللیل ہے یعنی رات کے کچھ حصے میں۔ اسی طرح اس آیت ''وَمِنَ الَّیْلِ فَتَهَجَّدْ بِهٖ نَافِلَةً لَّکَ'' میں مِنْ تبعیضہ ہے۔

سوال: حضور ﷺ کو معراج کے لئے لے جاتے وقت مکہ سے بیت المقدس اور وہاں سے آسمانوں کی طرف لے جانے میں کیا حکمت ہے؟ اگر مکہ سے سیدھا آسمان کی طرف لے جایا جاتا تو کیا حرج تھا؟۔

جوابِ اوّل: کیوں کہ بیت المقدس تمام خلائق کی جمع ہونے کی جگہ ہے۔ آپؐ کے قدم مبارک وہاں پڑنے کی برکت سے امت کے لئے وہاں ٹھہرنا آسان ہو جاتا۔ اس لئے آپ کو بیت المقدس لے جایا گیا۔

جوابِ ثانی: بیت المقدس انبیاء کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام کی ارواح جمع ہونے کی جگہ ہے۔ اللہ تعالیٰ نے تمام انبیاء کو آنحضرت ﷺ کی زیارت سے مشرف کرنے کا ارادہ فرمایا۔ چنانچہ آپ کو وہاں لے جایا گیا۔

جوابِ ثالث: بیت المقدس اس لئے لے جایا گیا تا کہ آپ ﷺ بیت المقدس کے احوال و کیفیات اوراس کی صفات کا مشاہدہ فرمائیں تا کہ لیلۃ المعراج کی صبح کو کفار کو اس سفر کے متعلق بیت المقدس کی صفات اوراس کے احوال بتا سکیں اوراپنے رب کی تصدیق کریں۔

سوال: "بٰرَکْنَا حَوْلَهٗ" (جس کے آس پاس ہم نے برکتیں کررکھی ہیں) "بٰرَکْنَا حَوْلَهٗ" فرمایا بارکنا علیہ یا بارکنا فیہ" نہیں فرمایا باوجودیکہ برکت آس پاس کے مقابلے میں مسجد میں زیادہ ہوتی ہے۔خصوصاً بیت المقدس تو برکتوں کا مرکز ہے؟۔

جوابِ اوّل: یہاں برکت سے دنیاوی برکت مراد ہے یعنی انہار، اشجار اور پھل وغیرہ یہ سب خارج مسجد میں ہیں نہ کہ داخل مسجد میں۔

جوابِ ثانی: برکت سے برکت دینی مراد ہے۔اس لئے کہ بیت المقدس حضرات انبیاء کرام کے رہنے کی جگہ' ان کا مقام عبادت اوران پر وحی کا مقامِ نزول اور ملائکہ کا مقامِ نزول ہے۔اور "مَا حَوْلَه" " اس لئے فرمایا تا کہ برکت عام ہواور سب کو شامل ہو۔اور جب کے اس کے آس پاس برکت ہے تو بیت المقدس میں برکتیں یقیناً زیادہ ہوں گی۔

اور بعض نے کہا کہ اس سے مراد برکت دنیاویہ اور دینیہ دونوں ہیں مذکورہ وجوہ کی بنا پر

سوال: آیت:"اِنَّهٗ کَانَ عَبْدًا شَکُوْرًا" (بے شک وہ (نوح علیہ السلام) بڑے شکر گزار بندے تھے) کا ماقبل کے ساتھ کیا ربط ومناسبت ہے؟۔

جواب: آیت کا مطلب یہ ہے کہ میرے علاوہ کسی کو رب مت مانو ایسا کرنے کی صورت میں تم بھی ناشکر بن جاؤ گے اور حضرت نوح علیہ السلام زیادہ شکرادا کرنے والے بندہ تھے اورتم ان پر ایمان لانے والوں کی اوران کے ساتھ کشتی میں سوار ہوکر بچ جانے والوں کی اولاد ہو۔لہٰذا تم بھی اپنے آباء واجداد کی طرح شکر کرو۔

سوال: اللہ تعالیٰ نے کیسے فرمایا:"وَاِنْ اَسَاْتُمْ فَلَهَا" (اگر برائی کی تو اپنے لئے) اور آیت:"وَمَنْ عَمِلَ صَالِحًا فَلِنَفْسِهٖ وَمَنْ اَسَاءَ فَعَلَيْهَا" کی طرح یہاں "وَاِنْ اَسَاْتُمْ فَعَلَيْهَا" نہیں فرمایا۔؟

جوابِ اوّل: یہاں "لہا" کا لام "علیٰ" کے معنی میں ہے۔جیسا کہ "وَتَلَّهٗ لِلْجَبِيْنِ" میں لام "علیٰ" کے معنی میں ہے اوراس آیت میں لام علیٰ کے معنی میں ہیں۔"وَيَخِرُّوْنَ لِلْاَذْقَانِ" اور بعض نے کہا اس کے بعد عبارت مقدر ہے:"فلها رجاء بالرحمة يا فلها مخلص بالتوبه والاستغفار" ہے۔

صحیح یہ ہے کہ لام اپنے حقیقی معنی یعنی اختصاص کے لئے ہے۔ اور ہر عمل کرنے والا اپنے عمل کی جزاء کے ساتھ متصف ہوتا ہے چاہے وہ عمل نیک ہو یا بد۔ یہ بحث پوری تفصیل کے ساتھ سے سورۃ بقرہ کی آیت: ''لَهَا مَا كَسَبَتْ وَعَلَيْهَا مَا اكْتَسَبَتْ'' کے تحت گزر چکی ہے۔

سوال: ''وَجَعَلْنَا اللَّيْلَ وَالنَّهَارَ اٰيَتَيْنِ'' (ہم نے رات اور دن کو دو نشانیاں بنایا) میں اٰيَتَيْنِ کو تثنیہ لایا اور آیت: ''وَجَعَلْنٰهَا وَابْنَهَا اٰيَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ'' میں اور ''وَجَعَلْنَا ابْنَ مَرْيَمَ وَاُمَّهٗ اٰيَةً'' دونوں جگہ آیۃ کو مفرد لایا گیا۔ حالانکہ اکیلے حضرت مسیح علیہ السلام کے اندر کئی آیات (نشانیاں) تھیں۔ مثلاً انہوں نے پنگوڑے میں لوگوں سے بات کی۔ مردوں کو زندہ کرتے تھے مادرزاد اندھوں اور برص کے مریضوں کو ٹھیک کیا کرتے ہیں۔ مٹی سے پرندے بنا کر اڑا دیتے تھے وغیرہ وغیرہ وہ ان معجزات کے حامل تھے اور ان کی والدہ مستقل ایک معجزے کی حامل تھیں۔ یعنی بغیر شوہر کے حاملہ ہونا۔ تو آیۃ کو مفرد لانا کیسے درست ہوگا؟۔

جوابِ اوّل: یہاں آیت سے مراد وہ آیت (نشانی) ہے جو ماں بیٹے کی مشترکہ نشانی ہے اور ان دونوں کے بغیر نامکمل ہے۔ اور وہ ہے بغیر مرد کے بچے کی پیدائش ہے۔ بخلاف لیل ونہار شمس وقمر کے کیونکہ وہاں ہر ایک کی علیحدہ علیحدہ نشانی مراد ہے۔

جوابِ ثانی: آیت میں عبارت محذوف ہے وہ یہ ہے۔: '' وجعلنا ابن مریم آیة وامه آیة''

سوال: ''وَجَعَلْنَا اٰيَةَ النَّهَارِ مُبْصِرَةً'' (اور ہم نے بنایا دن کی نشانی کو دیکھنے والی) دیکھنا زندوں کی صفت اور آیت النہار سے یا تو سورج مراد ہے یا خود دن۔ دونوں دیکھنے کی صفت کے ساتھ متصف نہیں ہو سکتے؟۔

جوابِ اوّل: المبصرۃ لغت میں المضیئہ (روشن کرنے والا) کے معنی میں ہے۔ امام جوہری بھی یہی کہتے ہیں۔ اور دوسرے اہلِ لغت کہتے ہیں کہ المبصرۃ کا معنی واضح نشانی ہے۔ اور آیت: ''وَاٰتَيْنَا ثَمُوْدَ النَّاقَةَ مُبْصِرَةً'' میں مُبْصِرَۃ اسی معنی میں ہے آیت کا ترجمہ یہ ہے کہ ہم نے ثمود کو اونٹ کی صورت میں واضح نشانی عطاء کی۔ اسی طرح آیت: ''فَلَمَّا جَآءَتْهُمْ اٰيٰتُنَا مُبْصِرَةً'' میں بھی مُبْصِرَۃ بھی واضح نشانی کے معنی میں ہے۔

جوابِ ثانی: مبصرۃ کا معنی ہے اس کے مدد سے دیکھا جاتا اگر سورج کی طرف نسبت ہو اور اس کے معنی روشن کے ہیں اگر دن کی طرف نسبت ہے۔

جوابِ ثالث: یہ رباعی ہے جو ثلاثی سے ہمزہ کے ساتھ منقول ہے جس کے معنی ہے سمجھنے اور بصیرت حاصل کرنے کے معنی میں ہے۔ آیت کا مطلب ہے نشانیاں بصیرت پیدا کرنے کے

لئے ہیں۔ چنانچہ امام اخفش نے۔ آیت: ”فَلَمَّا جَآءَتْهُمْ اٰيٰتُنَا مُبْصِرَةً“ میں بھی مُبْصِرَۃً کو اسی معنی پر محمول کیا ہے۔

سوال: آیت ”لِتَعْلَمُوْا عَدَدَ السِّنِيْنَ وَالْحِسَابَ“ ترجمہ (برسوں کا شمار اور حساب معلوم کرو۔ سالوں کا شمار حساب میں داخل ہے) میں عَدَدَ سنین لانے کا کیا فائدہ ہے صرف لتعلمو الحساب فرماتے تو بھی تو عدد السنین اس میں داخل ہوتا۔

جواب: حساب کا موضوع تمام اعداد ہیں۔ جیسا کہ بدن انسان علم طب کا ”اور افعال المکلفین“ علم فقہ کا موضوع ہے۔ ہر علم کا موضوع اس کا مغایر ہوا کرتا ہے۔ اس کا جزء نہیں ہوتا ہے۔ جیسا کہ بدن انسانی علم طب کا جزء نہیں ہے اس طرح عدد علم الحساب کا جزو نہیں ہے۔ لہذا سنین کا ذکر اور اس کو مقدم کرنے کی وجہ یہ ہے رات کے محو ہونے اور دن کے مبصر ہونے سے اصل مقصود مہینوں اور سالوں کے عدد کو جاننا ہے۔ پھر اس سے تاریخ کے حساب مدتوں اور اوقات کی پہچان ہے۔

سوال: یہاں: ”كَفٰى بِنَفْسِكَ الْيَوْمَ عَلَيْكَ حَسِيْبًا“ آج تو خود ہی اپنا حساب جانچنے کے لئے کافی ہے) فرمایا: اور دوسری جگہ کفی بنا حاسبین“ (ہم کافی ہیں حساب لینے والے) فرمایا؟

جواب: قیامت کے مواقف مختلف ہیں۔ بعض مقامات میں ان کے حساب کو خود ان کے حوالہ فرمائیں گے۔ اللہ کو اس سب کا علم ہے اور بعض مواقف میں اللہ تعالیٰ خود حساب لیں گے جبکہ بعض نے اس کا جواب یہ دیا ہے کہ احتساب تو اللہ تعالیٰ خود کریں گے کوئی اور نہیں کریگا۔ اور ”كَفٰى بِنَفْسِكَ الْيَوْمَ عَلَيْكَ حَسِيْبًا“۔ کا مطلب یہ ہوگا کہ اے انسان تو اپنے نفس کے گناہوں کا خود شاہد عدل ہے گویا یہ آیت توبیخ و تقریع کے لئے ہے نہ کہ تفویض احتساب کے لئے۔

سوال: ”وَلَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰى“ اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ قیامت کے دن کوئی کسی کے گناہ کا بوجھ نہیں اٹھائے گا۔ اور حدیث شریف میں آیا ہے۔ کہ قیامت کے دن غیبت کرنے والے مدیون کی نیکیاں قرض دینے والے کو اور جس کی غیبت کی گئی اس کو دی جائیں گی اور اگر ان کے پاس نیکیاں نہ ہوئیں تو ان کے گناہ ان پر ڈال دیئے جائیں گے۔

جواب: آیت کا مطلب ہے کہ کوئی شخص کسی کا بوجھ اپنے اختیار سے نہیں اٹھا سکتا۔ اصل میں یہ آیت کفار کے قول کے رد میں نازل ہوئی۔ کفار مومنین سے کہتے تھے: ”اتَّبِعُوْا سَبِيْلَنَا وَلْنَحْمِلْ خَطٰيٰكُمْ“ (تم ہماری راہ چلو (اگر یہ راہ غلط ہو) تو تمہارے گناہ ہمارے اوپر) تو اس قول کو رد کرنے کے لئے فرمایا گیا: ”لَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰى“ اور حدیث کا مطلب یہ ہے کہ ان پر اصحاب

حقوق کے گناہ زبردستی ڈال دیئے جائیں گے۔ یہی سوال مع جواب سورۃ انعام میں بھی گزرا ہے۔

سوال: اللہ تعالیٰ نے کیسے فرمایا: ''اَمَرْنَا مُتْرَفِيْهَا فَفَسَقُوْا فِيْهَا'' (ہم نے حکم بھیج دیا اس کے عیش کرنے والوں کو پھر انہوں نے نافرمانی کی) حالانکہ دوسری جگہ فرماتے ہیں: ''قُلْ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَاْمُرُ بِالْفَحْشَاءِ'' (آپ کہہ دیجئے کہ اللہ برائی کا حکم نہیں دیتے)۔

جوابِ اوّل: اس میں عبارت مقدر ہے۔ تقدیر عبارت یوں ہے ''اَمَرْنَا مُتْرَفِيْهَا بِالطَّاعَةِ فَفَسَقُوْا'' یعنی ہم نے ان کو اطاعت گذاری کا حکم دیا اور انہوں نے نافرمانی کی۔ امام زجاج کہتے ہیں کہ اہلِ عرب کا مقولہ: امرته فعصانی و امرته فخالفنی۔ بھی اس آیت کی طرح ہے' ان قولوں سے نافرمانی کا حکم دینا مفہوم نہیں ہو رہا ہے۔

جوابِ ثانی: ''اَمَرْنَا'' یہاں ''كَثَّرْنَا'' کے معنی میں ہے ''یعنی ہم نے زیادہ کیا'' کلامِ عرب میں لفظ ''اَمَرْتُ'' ''كَثَّرْتُ'' کے معنی میں استعمال ہوا ہے' اور ایک قراءت ''كَثَّرْتُ'' بھی ہے' اور مندرجہ ذیل حدیث میں مامورۃ بھی اس معنی میں ہے۔ حدیث مبارک ہے: ''خير المال مهرة مامورة وسكة مابورة'' یعنی زیادہ نتیجہ و نسل دینے والا ہے۔

جوابِ ثالث: ''امرنا'' یہاں اَمّرنا (بالتشدید) کے معنی میں ہے۔ کہا جاتا ہے اَمَّرْتُ فُلَانًا میں نے فلاں کو امیر بنایا۔ تو آیت کا مطلب یہ ہوگا کہ ہم نے ان کو حکمرانی دی تو انہوں نے سرکشی و نافرمانی کی۔ اس جواب کی تائید تشدید والی قراءت ''اَمَّرْنَا'' سے بھی ہوتی ہے۔ امام زمخشری کہتے ہیں: ''امرنا'' کے بعد بالطاعۃ مقدر ماننا' درست نہیں ہے۔ اس لئے کہ جب لفظ کو دلیل و قرینہ کے بغیر حذف کرنا جائز نہیں ہے تو اس کے خلاف دلیل و قرینے کی' رجودگی میں حذف کرنا کیسے درست ہوگا؟ وہ طور یہ ہے کہ لفظ ''ففسقوا'' دلالت کر رہا ہے کہ مامور بہ محذوف فسق ہے اور یہ عام کلام ہے۔ جیسے کہا جاتا ہے ''امرته فقعد'' میں نے اس کو حکم دیا وہ بیٹھ گیا۔ ''امرته فقرء'' (میں نے اس کو حکم دیا۔ اس نے پڑھا) ''امرته فقام'' میں نے اس کو حکم دیا وہ کھڑا ہوا۔

ان تینوں مثالوں سے قعود' قراءت' قیام ہی کا مامور بہ ہونا مفہوم ہو رہا ہے۔ بخلاف امرته فعصانی اور امرته فخالفنی کے۔ اس میں نا مور بہ معصیت اور مخالفت نہیں ہو سکتا۔ اس لئے کہ یہ امر کے مناقض و منافی ہے۔ اور امر کے مناقض و منافی مامور بہ نہیں ہو سکتا۔ تو اس کلام (امرتہ فعصانی) میں مامور بہ غیر مدلول علیہ ہے۔ یعنی اس پر کوئی متعین منوی نہیں ہے۔ اس قسم کے کلام سے متکلم کوئی خاص مامور بہ مراد نہیں لیتا۔ بلکہ گویا یوں کہہ رہا ہوتا ہے کہ میری طرف سے حکم تھا اس نے بجا آوری نہیں کی۔ یا اس کی طرف سے مخالفت تھی۔ جیسے اگر تم یوں کہو: ''مُرْ زيد

ایطعک" زید کو حکم دو تیری تابعداری کریگا۔ یا یوں کہو: فلان یا مر وینھی' یعطی و یمنع 'یصل ویقطع ویضر وینفع' ان میں کوئی مخصوص مفعول نیت میں نہیں ہوتا۔

اگر کوئی یوں کہہ دے کہ اس تشریح سے تو صریح فسق کا حکم دینا معلوم ہوتا ہے اور یہ اللہ کی طرف سے ممکن نہیں ہے۔ لہٰذا یہ نہیں ہو سکتا کہ اس آیت میں فسق مقدر ہو اور نہ یہ ممکن ہے کہ فسق مامور بہ ہو۔ تو ہم جواب میں کہیں گے۔

اور اگر کوئی یہ کہہ دے کہ اللہ تعالیٰ کا برائی کا حکم نہ دینے کا یقین ہونا اور طاعت' عدل اور خیر کا حکم دینا لفظ "لطاعة" کے محذوف و مقدر ہونے پر دلیل ہو سکتا ہے لہٰذا یوں کہا جا سکتا ہے کہ: "امرنٰھم بِالطَّاعَةِ فَفَسَقُوْا" کہہ سکتے ہیں تو جواب یہ دیا جائے گا کہ اس صورت میں تو لازم آئیگا کہ متکلم اپنے مخاطب سے علم غیب کا ارادہ کرتا ہے۔ اس لئے اس نے ایسی چیز کو محذوف کیا جس پر کلام میں لفظی لحاظ سے اس پر کوئی دلیل وقرینہ نہ صرف نہیں ہے بلکہ اس کے خلاف قرینہ ہے۔ گویا اس نے ایک چیز کو ذکر کیا اور اس کے نقیض کو محذوف کیا۔ لہٰذا لفظ "امرنا" کو مجاز ماننا ہی بہتر ہے۔ یہ سارا کلام امام زمخشریؒ کا ہے۔ کسی اور مفسر کا اس قول کو اختیار کرنا میرے علم میں نہیں ہے۔

سوال: جوابِ اوّل پر اشکال ہے۔ وہ یہ کہ اگر امرنا کے بعد "الطاعة" کو مقدر مانیں تو امر بالطاعۃ صرف مترفین کے ساتھ خاص نہیں ہے' بلکہ مترفین اور غیر مترفین سبھی کو عام ہے۔

جواب: ٹھیک ہے امر بالطاعۃ عام ہے۔ مگر امراء ورؤساء کا صلاح وفساد رعیت کے صلاح وفساد کو مستلزم ہے۔ اس لئے خصوصیت کے ساتھ ان کا تذکرہ کیا گیا۔ اور اس حدیث سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے "فساد الوالی فساد الرعیة وصلاح الوالی صلاح الرعیة" ہے۔ حکمران کی خرابی رعیت کی خرابی ہے اور حکمران کی درستگی رعیت کی درستگی ہے۔

سوال: "مَنْ کَانَ یُرِیْدُ الْعَاجِلَةَ عَجَّلْنَا لَهٗ فِیْهَا مَا نَشَاءُ لِمَنْ نُّرِیْدُ ثُمَّ جَعَلْنَا لَهٗ جَهَنَّمَ" (جو شخص دنیا کی نیت رکھے گا ہم ایسے شخص کو دنیا ہی میں جتنا چاہیں گے اور جس کے واسطے چاہیں گے فی الحال ہی دیدیں گے۔ پھر ہم اس کے لئے جہنم تجویز کریں گے) آیت سے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ جو شخص زہد اختیار نہیں کریگا اور دنیا کو ترک نہیں کریگا وہ جہنمی ہے حالانکہ معاملہ ایسا نہیں ہے۔

جواب: آیت کا مطلب یہ ہے کہ جو شخص اپنے اسلام' اپنی عبادت وطاعت کو دنیا کمانے کا ذریعہ بنائے گا۔ یعنی اسلام ہی دنیاوی غرض سے لائے' اور عبادت سے صرف دنیا مقصود ہو یہ صفت کافر یا منافق کی ہے۔ اس کے متعلق حضرت ابن جریرؒ فرماتے ہیں: یہ آیت آخرت پر ایمان نہ رکھنے

والوں کے متعلق ہے البتہ اتنی دنیا طلب کرنا کہ جس کے ذریعے سے آخرت کے لئے توشہ ہو مذموم نہیں ہوسکتا ہے ویسے بھی دنیا سے مکمل طور پر بے تعلق ہونا کسی کے لئے بھی ممکن نہیں۔ حتیٰ کہ انبیاء کرام کیلئے بھی: لہٰذا معلوم ہوا آیت کا مطلب وہی ہے جو ہم نے بیان کیا۔

سوال: اللہ تعالیٰ نے کیسے فرمایا: ''وَمَا كَانَ عَطَاءُ رَبِّكَ مَحْظُوْرًا'' (اور آپ کے رب کی عطاء بند نہیں)۔ حالانکہ ہم دیکھتے ہیں کہ دنیا کے بعض لوگوں کو دولتوں کے انبار عطاء کئے اور بعض ایک ایک دانے کو ترستے ہیں؟۔

جواب: یہاں عطاء سے مراد رزق ہے۔ اور اللہ تعالیٰ نے نیک و فاجر اور مطیع و عاصی سبھی کو برابر رزق پہنچانے کا ذمہ لیا ہے۔ کسی گناہگار سے اس کے گناہ کی وجہ سے رزق نہیں روکتے۔ تو اصل رزق میں تفاوت نہیں فرماتے' تفاوت تو املاک کی مقدار میں ہے۔

سوال: اللہ تعالیٰ نے کفار سے توفیق و ہدایت کو روکا مگر رزق کو نہیں روکا اس کی کیا وجہ ہے؟

جواب اوّل: رزق کو اس لئے نہیں روکا گیا کہ اگر رزق کو روکتے تو وہ ہلاک ہوجاتے اور قیامت کے دن اس کو حجت بنا کر کہتے: یا اللہ! اگر آپ ہمیں رزق دیتے تو ہم زندہ رہتے اور آپ پر ایمان لے آتے مگر ہمیں موقع ہی نہیں ملا۔

جوابِ ثانی: اگر ان کے گناہوں کی پاداش میں رزق بند کر کے ان کو ہلاک کرتے تو سزا میں جلدی ہوتی جو اللہ کے اسم گرامی ''الحلیم'' کے خلاف ہوتا۔ اس لئے کہ حلیم اسے کہتے ہیں اپنے نافرمان کو سزا دینے میں جلدی نہیں کرتا۔

جواب ثالث: کھانے پینے سے منع کرنا خسیس قسم کے لوگوں اور بخیلوں کا کام ہوتا ہے اور اللہ تعالیٰ بخل سے منزہ ہے اور پاک ہے' اور بعض نے یہ بھی کہا ہے تمام بندوں کو رزق دینا عدل ہے' اور اللہ تعالیٰ کا عدل عام ہے۔ اور توفیق و ہدایت عطاء فضل ہے' وہ اللہ تعالیٰ جس کو چاہے عطاء فرمادے۔

سوال: آیت: ''اِمَّا يَبْلُغَنَّ عِنْدَكَ الْكِبَرَ اَحَدُهُمَا اَوْ كِلَاهُمَا'' (اگر پہنچ جائے تیرے سامنے بڑھاپے کو ایک ان میں سے یا دونوں)۔ میں لفظ ''عِنْدَكَ'' لانے کا کیا فائدہ ہے؟۔

جواب: اس کا فائدہ یہ ہے کہ یہ دونوں بڑھاپے میں اس کے گھر میں ہوتے ہیں اور اس پر ان کے نان ونفقہ کا بوجھ پڑتا ہے۔ اس کے علاوہ ان کا کوئی کفالت کرنے والا نہیں ہوتا۔ اور بسا اوقات انتہائی بڑھاپے کی وجہ سے اس کو مشقت میں بھی ڈالتے ہیں۔ اور یہ ان کی مشقت برداشت کرتا ہے۔

سوال: اللہ تعالیٰ "لَا تَقْرَبُوا الزِّنٰی" (زنا کے قریب مت جاؤ) فرمایا: اور لا تزنوا (زنا مت کرو) نہیں فرمایا؟۔

جواب: اگر صرف "لا تزنوا" فرماتا تو صرف زنا منع ہوتا۔ دواعی زنا اور اسباب زنا یعنی ہاتھ لگانے چومنے اور معانقہ وغیرہ کرنے سے نہی نہیں ہوتی اور جب "لَا تَقْرَبُو الزِّنٰی" فرمایا تو زنا اور مقدمات زنا دونوں سے نہی ہوگئی۔ اس لئے کہ مقدمات کا ارتکاب کرنا زنا کے قریب ہوتا ہے۔

سوال: "كُلُّ ذٰلِكَ كَانَ سَيِّئُهٗ عِنْدَ رَبِّكَ مَكْرُوْهًا" (یہ سارے کام تیرے رب کے نزدیک (بالکل) ناپسند ہیں) میں "ذٰلِكَ" کا مشار الیہ کیا ہے؟۔

جواب: "وَقَضٰى رَبُّكَ اَنْ لَّا تَعْبُدُوْا اِلَّا اِيَّاهُ" سے لیکر اس آیت تک جتنے بھی منہیات بیان ہوئے ہیں وہ سب اس کا مشار الیہ ہیں۔ کل مذکور مشار الیہ نہیں ہیں۔ اس لئے کہ اس میں حسنات کا بھی تذکرہ ہے۔ امام ابو علی نے فرمایا: "ذٰلِكَ" سے "لَا تَقْفُ" اور اس کے مابعد کی طرف اشارہ ہے۔ اس لئے کہ اس میں کوئی بہتری نہیں ہے۔

سوال: اللہ تعالیٰ نے کیسے فرمایا: "تُسَبِّحُ لَهُ السَّمٰوٰتُ السَّبْعُ وَالْاَرْضُ وَمَنْ فِيْهِنَّ" (پاکی بیان کرتے ہیں اللہ تعالیٰ کی ساتوں آسمان اور زمین اور جو کچھ اس میں ہے)۔ لفظ "مَنْ" عام ہے جو تمام اہل زمین کو شامل ہے۔ اور اہلِ زمین میں کفار بھی شامل ہیں۔ اور تسبیح کہتے ہیں ہر اس چیز سے اللہ تعالیٰ کی پاکی بیان کرنا۔ جو اللہ تعالیٰ کی صفت جلال و کمال کے شایان شان نہیں جبکہ کافر لوگ اللہ تعالیٰ کی طرف بیوی، اولاد اور شریک وغیرہ منسوب کرتے ہیں تو (من فی الارض) کی تسبیح کہاں ہوئی؟۔

جوابِ اوّل: "مَنْ فِيْهِنَّ" میں "هُنَّ" کی ضمیر صرف سموات کی طرف لوٹ رہی ہے۔

جوابِ ثانی: "هُنَّ" کی ضمیر "السموات" اور "الارض" دونوں کی طرف لوٹ رہی ہے اور آیت کا مطلب ہے "مَنْ فِيْهِنَّ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ" (یعنی زمین و آسمان میں جو مومنین ہیں وہ تسبیح و تقدیس بیان کرتے ہیں) تو یہ عام بولکر خاص مراد لینے کی قبیل سے ہوگا۔ اس صورت میں تسبیح سے مراد زبانی پاکی بیان کرنا ہوگی۔

جوابِ ثالث: اس تسبیح سے تسبیح قالی نہیں بلکہ تسبیح حالی مراد ہے۔ یعنی وہ تسبیح جو زبان حال سے ہو۔ تسبیح کہتے ہیں جو صانع کے وجود اس کی عظیم قدرت اور حکمت پر دلالت کرتی ہے گویا انسان زبانِ حال سے کہہ کر اس کا اظہار کرتا کہ اللہ تعالیٰ ہر اس شی سے منزہ اور پاک ہے جو آپ کے شایانِ شان نہیں۔ اس جواب کی تائید اس آیت سے بھی ہوتی ہے: "وَاِنْ مِّنْ شَيْءٍ اِلَّا يُسَبِّحُ

بِحَمْدِہٖ "(ہر چیز اللہ کی پاکی بیان کرتی ہے) چنانچہ تمام موجودات کو شامل تسبیح، تسبیح حالی ہی ہے۔

سوال: اگر تسبیح سے مراد زبانِ حال کی تسبیح ہے تو: "وَلٰكِنْ لَّا تَفْقَهُوْنَ تَسْبِيْحَهُمْ" (مگر تم ان کی تسبیح کو نہیں سمجھتے ہو) کیوں فرمایا؟ کیوں کہ زبانِ حال کی تسبیح ہمیں معلوم ہے اور ہم اس کو سمجھتے ہیں؟۔

جواب: "وَلٰكِنْ لَّا تَفْقَهُوْنَ تَسْبِيْحَهُمْ" سے خطاب کفار کو ہے۔ وہ زبانِ حال سے تسبیح کرنے کے باوجود موجودات کی تسبیح کرنے کو نہیں سمجھتے ہیں۔ اس لئے کہ جب انہوں نے اللہ تعالیٰ کے ساتھ شریک ٹھہرائے اور اللہ تعالیٰ کے بیوی بچے مان لئے تو معلوم ہوا کہ وہ موجودات کی تسبیح کو نہیں سمجھتے ہیں اور دلائل وحدانیت کو نہیں سمجھے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کے دلوں پر مہر لگادی ہے۔

سوال: "مَنْ فِيْهِنَّ" ملائکہ، جنات اور انسانوں اور جمادات، حیوانات سبھی کو شامل ہے۔ چنانچہ ملائکہ، جنات وانسان کی تسبیح زبانی حقیقی اور جمادات کی حالی ومجازی ہے۔ تو ایک لفظ "تُسَبِّحُ" سے معنی حقیقی ومجازی ایک وقت میں مراد لینا کیسے درست ہوا؟۔

جواب: تسبیح مجازی یعنی زبانِ حال سے تسبیح سبھی کو حاصل ہے لہٰذا اسی پر محمول کیا جائیگا۔

سوال: اللہ تعالیٰ نے کیسے فرمایا: "يَوْمَ يَدْعُوْكُمْ فَتَسْتَجِيْبُوْنَ بِحَمْدِهٖ" حالانکہ کلام عرب میں شائع زائع یہ ہے "دَعَا فَاستجاب لامره" یا کہتے فاستجاب بامره فاستجاب بحمده نہیں کہتے؟۔

جواب: حضرت عبداللہ بن عباسؓ فرماتے ہیں۔ "بحمده" سے بامره مراد ہے۔ حضرت سعید بن جبیرؓ فرماتے ہیں: جس وقت اللہ تعالیٰ اپنی مخلوق کو دوبارہ اٹھا کے بلائیں گے تو وہ مٹی جھاڑتے ہوئے اپنی قبور سے اٹھیں گے اور کہیں گے "سبحانک اللھم وبحمدک" اور بعض حضرات کے بقول "اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ صَدَقَنَا وَعْدَهٗ" کہتے ہوئے اٹھیں گے اس صورت میں "بحمده" میں "ب" "مع" کے معنی میں ہوگا۔ جیسا کہ آیت: "تَنْبُتُ بِالدُّهْنِ" اور آیت: "وَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ" میں دونوں جگہ "با" "مع" کے معنی میں ہے۔

سوال: "وَلَقَدْ فَضَّلْنَا بَعْضَ النَّبِيِّيْنَ عَلٰى بَعْضٍ" (تحقیق ہم نے بعض نبیوں کو بعض پر فضیلت دی) میں انبیاء کرام کا اجمالی تذکرہ کیا۔ پھر "وَاٰتَيْنَا دَاوٗدَ زَبُوْرًا" کہہ کر خاص طور حضرت داؤد علیہ السلام کا ذکر فرمایا؟۔

جوابِ اوّل: اس لئے کہ ان کے لئے جو چیزیں مجتمع فرمائی تھی کسی اور نبی کے لئے نہیں

فرمائیں۔ مثلاً رسالت' کتابت' خطابت' خلافت' بادشاہت' قضا' وغیرہ۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ''وَشَدَدْنَا مُلْكَهٗ وَاٰتَيْنٰهُ الْحِكْمَةَ وَفَصْلَ الْخِطَابِ'' (ہم نے ان کی حکومت کو مضبوط کیا اور عطاء کی ان کو حکمت اور فصل خطاب)۔

جوابِ ثانی: ''وَلَقَدْ فَضَّلْنَا بَعْضَ النَّبِيّٖنَ عَلٰى بَعْضٍ'' سے تمام انبیاء کرام پر حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کی افضلیت کی طرف اشارہ ہے۔ اور: ''وَاٰتَيْنَا دَاوٗدَ زَبُوْرًا'' سے اس وجہ تفضیل کی طرف اشارہ ہے۔ وہ اس طرح کہ آپ ﷺ خاتم الانبیاء ہیں۔ آپ کی امت خیر الامم ہے۔ اور یہ بات حضرت داؤد علیہ السلام کی زبور میں لکھی ہوئی ہے۔ اور فرمان الٰہی: ''وَلَقَدْ كَتَبْنَا فِي الزَّبُوْرِ مِنْ بَعْدِ الذِّكْرِ اَنَّ الْاَرْضَ يَرِثُهَا عِبَادِيَ الصّٰلِحُوْنَ'' عبادی الصالحون سے مراد محمد ﷺ اور ان کی امت ہے۔

سوال: ''وَلَقَدْ اٰتَيْنَا دَاوٗدَ زَبُوْرًا'' میں زبور کو نکرہ اور آیت: ''وَلَقَدْ كَتَبْنَا فِي الزَّبُوْرِ مِنْ م بَعْدِ الذِّكْرِ'' ''الزبور'' کو معرفہ لایا گیا کیوں؟۔

جوابِ اوّل: ممکن ہے زبور ان اعلام میں سے ہو جو الف لام اور غیر الف لام دونوں طرح استعمال ہوتے ہیں: جیسے العباس' الفضل' الحسن' الحسین وغیرہ۔

جوابِ ثانی: یہاں نکرہ لانے کی وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ اس سے مراد بعض الزبور یعنی بعض الکتب ہو۔

جوابِ ثالث: یہاں ''زبور'' سے کل زبور مراد نہیں ہے۔ بلکہ زبور کا وہ حصہ مراد ہے جس میں آپ ﷺ کا ذکر مبارک آیا ہو اور اس حصے کو زبور کہنا تسمیۃ الجزء باسم الکل کے قبیل سے ہے یعنی جزو کو کل کا نام دیا گیا ہے۔ جیسا کہ بعض قرآن کو قرآن کہا گیا ہے اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ''وَقُرْاٰنًا فَرَقْنٰهُ'' اور ارشاد گرامی ہے۔: ''بِمَآ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ هٰذَا الْقُرْاٰنَ'' میں القرآن سے سورۂ یوسف مراد ہے اسی طرح: ''وَقُرْاٰنَ الْفَجْرِ'' سے قرآن کا وہ حصہ مراد ہے جو فجر کی نماز میں پڑھا جائے۔

سوال: ''فَلَا يَمْلِكُوْنَ كَشْفَ الضُّرِّ عَنْكُمْ وَلَا تَحْوِيْلًا'' (وہ (بت) نہ تم سے تکلیف کو دور کرنے کا اختیار رکھتے ہیں اور نہ اس کے بدل ڈالنے کا)۔

''فَلَا يَمْلِكُوْنَ'' کے بعد ''وَلَا تَحْوِيْلًا'' کی ضرورت نہیں اس لئے کہ جب نقصان و تکلیف کو دور کرنے پر قادر نہیں ہیں تو تحویل پر بھی قادر نہ ہوں گے۔ اس لئے کہ تحویل کہتے ہیں۔ ایک چیز اس کی جگہ سے ہٹا کر دوسری جگہ فٹ کرنے کو۔ اور کشف الضر کسی چیز کے صرف ہٹانے کو کہتے ہیں۔ لہٰذا جب محض ہٹانے پر قادر نہیں ہیں۔ تو ہٹا کر دوسری جگہ رکھنے پر بطریقہ اولیٰ قادر نہیں ہوں گے' اور آیت میں کشف الضر سے مراد مرض' قحط وغیرہ تکالیف کو ہٹانا ہے؟۔

جواب: اصل میں لفظ تحویل کے دو معانی ہیں۔ ایک وہ جو اوپر سوال میں ذکر ہوا۔ دوسرا معنی تبدیل ہے۔ چنانچہ اہلِ عرب کہتے ہیں "حولتُ القمیص قباء" میں نے قمیص کو جبہ بنایا۔ "والفضة خاتما" چاندی کو انگوٹھی بنالیا۔ یہاں دوسرا معنی تبدیل کے معنی میں ہے۔ تبدیل سے یہاں مراد ہٹانا اور دور کرنا ہے۔ اور آیت میں جس (کشف) دورکرنے کا ذکر ہے اس سے مراد تبدیل ہے اس لئے کہ جب مرض دور ہوگا تو اس کی جگہ صحت آئے گی۔ اور محتاجی دور ہوگی اس کے بدل خوشحالی ہوگی۔ اسی طرح تمام اضداد میں یہی ہوگا لہٰذا تحویل بولکر کشف (دور کرنا) مراد لیا گیا۔ البتہ اس سے کشف الضر مراد نہیں۔ بلکہ مطلق کشف (ہٹانا، دور کرنا) مراد ہے' آیت کا مطلب یہ ہے کہ وہ نہ تکلیف کو دور کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں اور نہ ہی کسی اور چیز کو۔ اسی وجہ سے وَلَا تَحۡوِيۡلًا نہیں فرمایا گیا۔ اس جواب کو میں نے کسی کتاب سے حاصل نہیں کیا بلکہ اللہ تعالیٰ نے اپنے خزائن غیب سے میرے دل میں ڈالدیا۔

سوال: "وَمَا مَنَعَنَآ اَنۡ نُّرۡسِلَ بِالۡاٰيٰتِ اِلَّاۤ اَنۡ كَذَّبَ بِهَا الۡاَوَّلُوۡنَ وَاٰتَيۡنَا ثَمُوۡدَ النَّاقَةَ مُبۡصِرَةً فَظَلَمُوۡا بِهَا" (اور ہم کو خاص فرمائشی معجزات کے بھیجنے سے صرف یہی بات مانع ہے کہ پہلے لوگ ان کی تکذیب کر چکے ہیں) اس میں نو سوالات ہیں۔

پہلا سوال: اللہ تعالیٰ کسی چیز کا ارادہ فرمالیں تو کوئی اس کو روک نہیں سکتا۔ چنانچہ اگر اللہ تعالیٰ ارسال آیات کا ارادہ فرمادیں تو گذشتہ امتوں کی تکذیب اس کو کیسے روک سکتی ہے؟ اور اگر معجزات بھیجنے کا ارادہ نہ فرمائیں تو تکذیب و عدم تکذیب برابر ہے۔ تو عدم ارسال معجزات عدم ارادے کی وجہ سے ہوگا نہ کہ تکذیب امم سابقہ کی وجہ سے؟

دوسرا سوال: لفظ "ارسال" مفعول کی طرف بنفسہٖ متعدی ہوتا ہے۔ کسی حرف جر کے واسطے نہیں جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ: "اِنَّاۤ اَرۡسَلۡنَا نُوۡحًا اِلٰى قَوۡمِهٖۤ" میں "نوحًا" کی طرف بغیر واسطہ حرف جر کے متعدی ہے۔ تو آیت مذکورہ بالا میں "بالآيات" میں باء کے ذریعے کیوں متعدی بنایا گیا؟

تیسرا سوال: یہاں آیت میں آیات (معجزات) سے مراد وہ تجاویز ہیں جو اہل مکہ نے آپ کے سامنے پیش کئے تھے یعنی صفا پہاڑ کو سونا بنادینا۔ اور مکہ کے پہاڑوں کو ختم کر کے زراعت کے لئے قابل بنانا اور آسمان سے لکھی ہوئی کتاب نازل ہونا وغیرہ۔ اور یہ معجزات پہلی امتوں میں رونما نہیں ہوئے تھے اور نہ انہوں نے دیکھے تھے۔ تو جھٹلائے کیسے؟

چوتھا سوال: پہلوں کا معجزات کو جھٹلانا، بعد والوں کے لئے معجزات اتارنے میں مانع

نہیں ہے۔ ممکن ہے بعد والے انکار نہ کریں اور مان لیں؟۔
**پانچواں سوال:** شروع آیت کا آخر آیت: ''وَاٰتَیْنَا ثَمُوْدَ النَّاقَةَ مُبْصِرَةً'' کے ساتھ کیا ربط و مناسبت ہے؟۔
**چھٹا سوال:** ناقہ کو وصف مبصرۃ کے ساتھ موصوف کرنے کا کیا مطلب ہے؟۔
**ساتواں سوال:** اور لفظ ظلم بھی بغیر حروف جر کے واسطے کے بنفسہ متعدی ہوتا ہے ارشادِ گرامی: ''وَمَنْ یَّعْمَلْ سُوْءً ا اَوْ یَظْلِمْ نَفْسَهٗ'' میں ''یَظْلِمْ'' ''نَفْسَهٗ'' کی طرف بغیر حرف جر کے متعدی ہوا ہے۔ آیت مذکورہ میں ''فَظَلَمُوْا بِهَا'' میں ''با'' کے ساتھ کیوں متعدی کر دیا گیا؟ یوں کیوں نہیں کہا گیا ''فظلموها''؟
**آٹھواں سوال:** فرمانِ الٰہی: ''وَمَا نُرْسِلُ بِالْاٰیٰتِ اِلَّا تَخْوِیْفًا'' تو ارسال المعجزات پر دلالت کر رہا ہے اور ارشادِ گرامی: ''وَمَا مَنَعَنَآ اَنْ نُّرْسِلَ بِالْاٰیٰتِ'' عدم ارسال الایات پر دلالت کر رہا ہے تو بظاہر تعارض ہے؟

<u>جوابات:</u>
**جواب ۱:** آیت میں منع ترک ارسال آیات کے معنی میں ہے۔ یعنی کہ معجزات کے اظہار کو ترک کرنے کے معنی میں ہے تو آیت کا مطلب یہ ہوگا کہ اس کو اس لئے ترک کیا گیا کہ اس سے پہلی امتیں معجزات آنے کے باوجود بھی رسولوں کی تکذیب کرتی رہیں۔
**جواب ۲:** ''باء'' لفظ ارسال کو مرسل بہ کی طرف متعدی کرنے کے لئے آیا ہے نہ کہ مرسل کی طرف۔ اس لئے کہ مرسل یہاں محذوف ہے۔ تقدیر عبارت یوں ہے: ''ومنعنا ان نُرسل الرسل بالاٰیٰت'' ارسال مُرسل کی طرف بنفسہ اور مرسل بہ کی طرف ''باء'' کے ذریعہ متعدی ہے کیونکہ یہ مرسل بہ کی طرف باء کے ساتھ اور مرسل الیہ کی طرف ''الی'' کے ذریعے متعدی ہوتا ہے۔
قرآن کریم کی آیت میں اس طرح آیا ہے جیسے: ''وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا مُوْسٰی بِاٰیٰتِنَا وَسُلْطٰنٍ مُّبِیْنٍ اِلٰی فِرْعَوْنَ وَمَلَا۟ئِهٖ ترجمہ (ہم نے موسیٰ کو اپنی آیات (معجزات) اور واضح دلائل دے کر فرعون کے پاس بھیجا) دیکھئے اس آیت میں موسیٰ مرسل اور فرعون مرسل بہ اٰیاتِنَا مُرْسِلٌ اِلَیْهِ'' ہے تو موسیٰ کی طرف بنفسہ ایاتنا کی طرف بذریعہ باء اور فرعون کی طرف بذریعہ الی متعدی ہوا ہے۔
**جواب ۳:** ''کَذَّبَ بِهَا'' میں ''ھا'' ضمیر مجرور جنس آیاتِ مقترحہ کی طرف راجع ہے نہ کہ ان کی تجویز کردہ آیات (معجزات) کی طرف، گویا اللہ تعالیٰ یوں فرما رہے ہیں۔ ان کے طلب کردہ معجزات کو ہم نے اس لئے کہ روکا کہ ان سے پہلی امتوں نے بھی معجزات کا مطالبہ کیا مگر آنے پر

انکار کیا لہٰذا یہ بھی انکار کردیں گے) چنانچہ پہلی امتوں نے نزول مائدہ (دستر خوان) اور اخراج ناقہ وغیرہ کا مطالبہ کیا۔ اور جب مطالبہ پورا ہوا تو انکار کرنے لگے۔

جواب ٤: اللہ تعالیٰ کی سنت یہ رہی ہے کہ حضرات انبیاء سے معجزات کا مطالبہ کرنے والوں کے مطالبے اور رائے کے مطابق معجزات کا ظہور ہوا۔ نہ ماننے پر فوراً ان کو عذاب میں مبتلا کردیا' اور سب منکرین کو ہلاک کر ڈالا۔ مگر اللہ تعالیٰ مشرکین مکہ کو فوراً ہلاک کرنا نہیں چاہتا تھا اس لئے کہ اللہ تعالیٰ جانتا تھا کہ ان کی اولاد اسلام کی دولت اور ایمان کی نعمت سے سرفراز ہوں گے۔ یا عدم ارسال معجزات کی وجہ یہ ہوسکتی ہے کہ جن کی طرف محمد ﷺ مبعوث ہوئے وہ قیامت تک برقرار رہیں۔ اگر ان کے طلب کردہ معجزے کا ظہور ہوتا اور وہ ایمان نہ لاتے تو ہلاک کردئے جاتے۔ تو حکمت الٰہی کا تقاضا عدم اہلاک کا ہوا' لہٰذا معجزہ بھی ظاہر نہ کرایا گیا۔ تو اس صورت میں آیت کا مطلب یہ ہوگا کہ آپ پر کفار کے طلب کردہ معجزے اس لئے ظاہر نہیں کئے گئے کہ پہلی امتوں نے مطالبہ کیا پھر معجزہ آنے پر انکار کیا اور ایمان نہیں لائے جس کے نتیجہ میں وہ ہلاک کردئے گئے۔ اور اگر آپ کی قوم بھی انکار کرتی تو وہ بھی ہلاک کردی جاتی۔

جواب ٥: آیت کے دونوں حصے آپس میں مربوط ہیں۔ اس لئے کہ ان سے پہلے قومِ صالح نے حضرت صالح علیہ السلام سے خاص قسم کی اونٹنی خاص جگہ سے برآمد کرنے کا مطالبہ کیا تھا چونکہ یہ مقام ان کے قریب ہے' ان کے آنے جانے کے راستے پر واقع ہے اور آتے جاتے دیکھتے ہیں لہٰذا اس سے عبرت پکڑنی چاہئے۔

جواب ٦: "مُبْصِرَةً" دلالۃ کے معنی میں ہے۔ بعض علماء نے کہا: مبصرۃ کا معنی مبصر بہا ہے۔ یعنی ناقہ کے ذریعہ بصیرت حاصل کی جائے۔

بقول بعض مبصرۃ کا معنی آلہ بصیرت ہے یعنی یہ ناقہ حضرت صالح علیہ السلام کی نبوت کے صحیح ہونے کو دکھاتی ہے۔ اس قول کی تائید "مبصرۃ" "بفتح المیم والصاد" کی قراءت سے بھی ہوتی ہے۔

بعض نے کہا: مبصرۃ موصوف محذوف کی صفت ہے' ناقۃ کی نہیں ہے۔ تقدیر عبارت یوں ہوگی "آیۃ مبصرۃ" یعنی واضح نشانی یا واضح معجزہ۔

جواب ۷: "فَظَلَمُوا بِهَا" میں "باء" ظلم کو ناقہ کی طرف متعدی کرنے کے لئے نہیں بلکہ آیت کا معنی یوں ہے۔ "فظلموا انفسھم بقتل الناقہ" ہے لہٰذا ظلم مفعول کی طرف بنفسہٖ متعدی ہے۔

بعض نے کہا یہاں ظلم کفر کے معنی میں ہے "فظلموا بھا" کا معنی ہے کفروا بھا' جب ظلم کفر

کے معنی کو متضمن ہوا۔ تو باء کے ذریعے اس کو متعدی کرنا درست ہوا۔ اس لئے کہ کفر کے صلہ میں باء آتا ہے۔

**جواب ۸:** "وما نرسل بالاٰیٰت الا تخویفًا" میں "آیات" سے مراد کفار کے طلب کردہ معجزات نہیں ہیں بلکہ اس سے عبرت اور دلالت مراد ہیں۔

**سوال:** اللہ تعالیٰ نے کیسے فرمایا: "وَالشَّجَرَةَ الْمَلْعُوْنَةَ فِی الْقُرْاٰنِ" (اور جس درخت کی قرآن میں لعنت کی گئی ہے) حالانکہ قرآن کریم میں کسی درخت پر لعنت نہیں کی گئی ہے۔

**جوابِ اوّل:** یہاں عبارت مقدر ہے۔ تقدیر عبارت یوں ہے: "وَالشَّجَرَةَ الْمَلْعُوْنَةَ الْمَذْکُوْرَةِ فِی الْقُرْاٰنِ"

**جوابِ ثانی:** اس درخت سے کھانے والے ملعون ہیں اور وہ کافر لوگ ہیں۔

**جوابِ ثالث:** ملعونہ کا معنی مذمومہ ہے۔ یعنی وہ درخت جس کی مذمت کی گئی ہے یہی حضرت عبداللہ بن عباسؓ فرماتے ہیں: وہ فرماتے ہیں کہ اس سے مراد وہ درخت ہے جس کی مذمت قرآن میں ان الفاظ سے کی گئی ہے: "اِنَّ شَجَرَةَ الزَّقُّوْمِ طَعَامُ الْاَثِیْمِ" (زقوم کا درخت گناہگاروں کا کھانا ہے) اور "طَلْعُهَا كَاَنَّهٗ رُءُوْسُ الشَّیٰطِیْنِ" سے مذمت کی گئی ہے۔

**جوابِ رابع:** اہل عرب ہر نقصان دہ اور ناپسندیدہ کھانے کو ملعون کہتے ہیں۔ قرآن میں اس درخت کے ضرر اور کراہت کا تذکرہ ہے۔

**جوابِ خامس:** لعنت کا لغوی معنی دور کرنے اور دھتکار دینے کے ہیں اور ملعون اس چیز کو کہتے جس کو اللہ کی رحمت سے دور کیا گیا ہو۔ اور جس شجر کو ملعون کہا گیا ہے وہ اللہ تعالیٰ کی رحمت کے اترنے کی جگہ یعنی جنت سے کوسوں دور ہے یعنی وہ قعر جہنم میں ہے۔ قرآن کریم میں آیا ہے۔ فرمانِ باری تعالیٰ ہے: "اِنَّهَا شَجَرَةٌ تَخْرُجُ فِیْۤ اَصْلِ الْجَحِیْمِ" (وہ ایسا درخت ہے جو جہنم کے اندر نکلتا ہے) علامہ ابن الانباری نے فرمایا ہے: اس کو ملعون اس لئے کہا گیا کہ وہ اہلِ فضل کے مقام سے دور ہے۔

**سوال:** "فَمَنْ اُوْتِیَ كِتٰبَهٗ بِیَمِیْنِهٖ فَاُولٰٓئِكَ یَقْرَءُوْنَ كِتٰبَهُمْ وَ لَا یُظْلَمُوْنَ فَتِیْلًا" (پھر جس کا اعمال نامہ اس کے داہنے ہاتھ میں دیا جائے گا۔ تو ایسے لوگ اپنا نامہ اعمال پڑھیں گے اور ان پر ذرا ظلم نہ کیا جاوے گا) صرف اصحاب یمین کو اپنا نامہ اعمال پڑھنے ان کے ساتھ ذرا برابر ظلم نہ کئے جانے کے ساتھ مخصوص کیوں کیا گیا۔ حالانکہ اصحاب الشمال بھی اپنے نامہ اعمال پڑھیں گے اور ان کے ساتھ بھی ذرا برابر ظلم نہیں کیا جائیگا؟۔

جواب اوّل: اعمال نامہ پڑھنے کو صرف اصحاب الیمین (اہل جنت) کے ساتھ خاص اس لئے کیا گیا کہ اصحاب الشمال (جہنمی) جب اپنا نامہ اعمال دیکھیں گے تو اس میں موجود اپنی بداعمالیوں کو دیکھ کر شرمندہ اور خوف زدہ ہوں گے اور زبان بولنے سے قاصر ہوگی گویا ان کا پڑھنا نہ پڑھنے کی طرح ہے۔ جبکہ اہل جنت کا معاملہ اس کے برعکس ہوگا۔ یقینی طور پر وہ اپنی اپنی نیکیاں انتہائی حسن وخوبی کے ساتھ پڑھیں گے۔ بلکہ صرف اپنے پڑھنے پر ہی اکتفا نہ کریں گے بلکہ دوسروں سے کہیں گے آؤ میرا نامہ اعمال پڑھ لو اور آیت: "لَا يُظْلَمُوْنَ فَتِيْلًا" کا تعلق صرف اصحاب الیمین کے ساتھ نہیں ہے بلکہ یہ تمام لوگوں کے بارے میں ہے۔

جواب ثانی: یہ آیت "لَا يُظْلَمُوْنَ فَتِيْلًا" خاص اصحاب الیمین (اہل جنت) کے ساتھ متعلق ہے۔ ان کے ساتھ خاص اس لئے کیا گیا کہ وہ اس بات کا یقین کرتے ہیں کہ ان کے ساتھ ہرگز ظلم نہیں کیا جائیگا بخلاف جہنمیوں کے کیونکہ وہ بزعم خود یہ اعتقاد رکھتے ہیں کہ ان کے ساتھ ظلم ہوگا۔ اس جواب کی تائید اس آیت سے بھی ہوتی ہے: "وَمَنْ يَّعْمَلْ مِنَ الصّٰلِحٰتِ وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَلَا يَخَافُ ظُلْمًا وَّلَا هَضْمًا" (جو شخص نیک عمل کرے اور وہ مؤمن ہو تو وہ ظلم اور ذلت کا خوف نہیں کریگا)

سوال: حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرعون سے کیسے فرمایا: "قَالَ لَقَدْ عَلِمْتَ مَا اَنْزَلَ هٰٓؤُلَآءِ اِلَّا رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ بَصَآئِرَ" (موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا: تو خوب جانتا ہے کہ یہ عجائبات خاص آسمان اور زمین کے پروردگار ہی نے بھیجے ہیں جو کہ بصیرت کے لئے (کافی) ذرائع ہیں)

حالانکہ فرعون ان کو نہیں سمجھ سکا تھا۔ اس لئے اگر وہ جان چکا ہوتا تو حضرت موسیٰ پر ایمان لے آتا اور یوں نہ کہتا: "اِنِّیْ لَاَظُنُّکَ یٰمُوْسٰی مَسْحُوْرًا" (اے موسیٰ میں تجھے مسحور سمجھتا ہوں) یا ساحر سمجھتا ہوں علیٰ اختلاف الاقوال۔ اور وہ سمجھ بھی کیسے سکتا تھا؟ کیوں کہ اللہ تعالیٰ نے اس کے دل پر مہر لگادی تھی۔ اور اس کو گمراہ کیا تھا۔ اور وہ رشد وہدایت سے کوسوں دور کیا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ حضرت علی کرم اللہ تعالیٰ علیہ اسکو "عَلِمْتُ" تا کے ضمہ کے ساتھ پڑھا کرتے تھے۔ اور فرمایا کرتے تھے "واللہ ما علم عدو اللہ" اللہ کی قسم دشمن خدا نہیں پہچان پایا تھا۔ موسیٰ ہی نے پہچان لیا تھا۔ چنانچہ امام کسائی اور ثعلب نے حضرت علیؓ کی قرءات کو اختیار کیا ہے؟

جواب: آیت کا مطلب یہ ہے کہ اے فرعون! اگر تو صحیح طرح اللہ تعالیٰ کی قدرت کے کمالات پر غور کرتا اور دلائل و براہین کی طرف درست نظر کرتا تو یقیناً جان لیتا لیکن تو معاند ہے۔ اور میری

تصدیق کی صورت میں تمہارا خدائی دعوی بھی ختم ہو جائیگا۔ اس لئے تو انکار کر رہا ہے۔ فرعون کو علم ہونے کے باوجود اللہ نے ان کو گمراہ کیا۔ یہی وجہ ہے کہ حضرت عبداللہ بن عباسؓ کو حضرت علیؓ کی قراءت یعنی "علمت" "ت" کے ضمہ کے ساتھ پڑھنے) کی اطلاع ہوئی تو انہوں نے اس آیت کو بطور استدلال پیش کیا۔ "وَجَحَدُوْا بِهَا وَاسْتَيْقَنَتْهَا اَنْفُسُهُمْ ظُلْمًا وَّعُلُوًّا" ترجمہ: اس کا انکار کیا ان کے نفسوں نے ظلم اور تکبر کے ساتھ یقین کر لیا۔

سوال: حضرت موسیٰ نے کیسے فرمایا: "وَاِنِّیْ لَاَظُنُّکَ یٰفِرْعَوْنُ مَثْبُوْرًا" (اور میرے خیال میں اے فرعون! ضرور تیری کمبختی کے دن آگئے ہیں) جبکہ حضرت موسیٰ یقین کے ساتھ جانتے تھے کہ فرعون ہلاک ہوگا نہ صرف یہ کہ خیال وشک کے ساتھ۔

جواب: اکثر مفسرین کی رائے کے مطابق "ظن" یہاں یقین کے معنی میں ہے۔ جیسا کہ اس فرمان باری تعالیٰ میں یقین کے معنی میں ہے: "اَلَّذِیْنَ یَظُنُّوْنَ اَنَّهُمْ مُّلٰقُوْا رَبِّهِمْ" (ان لوگوں کو یقین ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ سے ملاقات کریں گے) پھر سوال پیدا ہوتا کہ جب یہاں یقین مراد ہے تو یقین کا لفظ استعمال کرنا چاہئے تھا "ظن" کا لفظ کیوں استعمال کیا گیا؟ اس کا جواب یہ ہے حضرت موسیٰ نے ظن کا لفظ اس لئے لایا تا کہ فرعون کے "ظن" کے ساتھ معارضہ ہو جائے۔ گویا یوں فرمایا "ان ظننتنی مسحورا فانا ظننتک مثبورا" یعنی اگر تم مجھ کو مسحور خیال کرتا ہے میں تجھے ہلاک ہونے والا سمجھتا ہوں۔

سوال: "یَخِرُّوْنَ لِلْاَذْقَانِ سُجَّدًا" اور "یَخِرُّوْنَ لِلْاَذْقَانِ یَبْکُوْنَ" میں لفظ یخرّون کو مکرر کیوں لایا گیا؟۔

جوابِ اوّل: اس لئے مکرر لایا گیا تا کہ فعل کے تکرار پر دلالت کرے۔

جوابِ ثانی: اس لئے مکرر لایا گیا تا کہ دونوں حالتوں حالت سجود اور حالت بکاء پر دلالت کرے۔

جوابِ ثالث: پہلے یخرّون (سجدے میں گرنا) سماع قرآن وتلاوت کی حالت اور دوسرا یخرّون عام حالات کے متعلق ہے۔

سوال: "وَقُلِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ لَمْ یَتَّخِذْ وَلَدًا" (اور کہہ سب تعریفیں اللہ کے لئے ہیں جو نہیں رکھتا اولاد) تحمید کی جاتی ہے اللہ تعالیٰ کی طرف سے اپنے بندے پر انعام کی بنا پر جیسا کہ آیت "اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ اَذْهَبَ عَنَّا الْحَزَنَ" اور آیت: "اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ هَدٰنَا لِهٰذَا" اور آیت "اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ" میں تحمید کی گئی ہے۔ کہ ان میں ہمارے لئے بے شمار اور ان گنت منافع ہیں۔ لیکن اللہ کے لئے نہ ہونے میں ہمارے لئے کیا

نعمتیں مضمر ہیں؟
جواب: اس میں بھی انسان کے لئے نعمت ہے۔ اس لئے کہ اگر اللہ تعالیٰ کی اولاد ہوتی تو اپنے بندوں پر نعمت اس وقت نازل فرماتے ہیں جب وہ نعمتیں اولاد سے بچ جائیں جب اہل وعیال نہیں تو ان کی تمام مہربانیاں اور ان کی عطاء وانعامات سب کی سب ان کے غلاموں کے لئے ہے۔

# سورة الکہف

سوال: ''اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ اَنْزَلَ عَلٰی عَبْدِهِ الْكِتٰبَ وَلَمْ یَجْعَلْ لَّهٗ عِوَجًا قَیِّمًا'' (تمام خوبیاں اس اللہ کے لئے ہیں جس نے اپنے بندے پر یہ کتاب نازل فرمائی اور اس میں ذرا بھی کجی نہیں رکھی۔ بالکل استقامت کے ساتھ موصوف بنایا)۔
سوال یہ ہے کہ ''لَمْ یَجْعَلْ لَّهٗ عِوَجًا'' (اس میں ذرا بھی کجی نہیں رکھی) کے بعد قَیِّمًا (مستقیم) لانے کی کیا ضرورت ہے؟ اس لئے کہ جس میں کجی نہیں ہوگی وہ یقیناً سیدھا اور مستقیم ہوگا۔ ''قَیِّمًا'' لانے کا کیا فائدہ ہے؟ یہاں عدم عوج سے مراد مضامین میں عدم اختلاف اور معانی میں عدم تعارض ہے اور قیما کا بھی یہی معنی ہے؟
جوابِ ثانی: امام فراء فرماتے ہیں: یہاں قَیِّمًا سے مراد قائما علی الکتب السماویہ کلھا ہے یعنی سابقہ تمام کتب سماویہ کے مضامین پر مشتمل۔ ان کی تصدیق کرنے والی اور ان کے صحیح ہونے کی تصدیق کرنے والی ہے۔ نیز ان کے بعض احکامات کو منسوخ کرنے والی ہے۔ اس صورت میں کوئی تکرار نہیں ہوگا۔ اور مشہور قول کے مطابق اس کو تاکید پر محمول کیا جائیگا۔
سوال: ''قَالُوا اتَّخَذَ اللّٰهُ وَلَدًا مَالَهُمْ بِهٖ مِنْ عِلْمٍ وَّلَا لِاٰبَآئِهِمْ'' (وہ کفار کہتے ہیں اللہ رکھتا ہے اولاد کچھ خبر نہیں ان کو اس بات کی نہ ان کے باپ دادوں کو)۔
کیسے فرمایا اللہ تعالیٰ نے کہ (ان کو کچھ خبر نہیں) یہ جب کہا جاتا ہے کہ جب شی موجود ہو۔ اور اس کے بارے کسی کو علم نہ ہو تو کہا جاتا ہے اس کو کچھ خبر نہیں جبکہ اللہ تعالیٰ کے لئے اولاد کا ہونا محال ہے ناممکن ہے اللہ تعالیٰ اس سے بلندو بالا اور پاک ومنزہ ہے۔
جواب: آیت کا مطلب یہ ہے کہ ان کو کسی چیز کا علم نہیں ہے۔ اس لئے اس کے محال ہونے کی وجہ سے جاننا ممکن ہی نہیں ہے۔ اس لئے کہ بسا اوقات علم کی نسبت موصل الیہ کے طریق پر جہل کیطرف ہوتی ہے۔ اور کبھی اس تک رسائی کے محال ہونے کو بھی عدم علم سے تعبیر کرتے ہیں یعنی کوئی چیز فی نفسہ محال ہو۔ اس کی طرف علم کو منسوب کرنا درست نہ ہو اس کی طرف بھی جہل کی

نسبت یعنی عدم علم کی اضافت ہوتی ہے۔

سوال: اللہ تعالیٰ نے کیسے فرمایا: "ثُمَّ بَعَثْنٰهُمْ لِنَعْلَمَ اَیُّ الْحِزْبَیْنِ اَحْصٰی لِمَا لَبِثُوْٓا اَمَدًا" (پھر ہم نے ان کو اٹھایا تا کہ ہم معلوم کرلیں کہ کونسا گروہ ان کے رہنے کی مدت سے زیادہ واقف تھا) اللہ تعالیٰ کو تو پہلے سے معلوم تھا۔

جواب: مطلب یہ ہے جیسا کہ ہم اس کو علم غیب کے ذریعے سے جانتے ہیں تو اسی طرح مشاہدۃً بھی جان لیں۔

سوال: "فَابْعَثُوْٓا اَحَدَكُمْ بِوَرِقِكُمْ هٰذِهٖٓ اِلَى الْمَدِيْنَةِ" (اب بھیجو اپنے میں سے ایک کو یہ روپیہ دے کر اپنے اس شہر میں) فرمایا "واحد کم" نہیں فرمایا: وجہ؟۔

جواب: اس لئے کہ انہوں نے کسی ایک کو متعین کر کے نہیں فرمایا بلکہ ان میں سے کسی ایک کو بھیجنے کا کہا۔ اگر "واحدکُم" کہتے تو اشارہ ہوتا کہ اپنے رئیس اور بڑے کو بھیجو۔ اس لئے کہ اہل عرب کسی قوم میں سے کسی فرد کو دیکھ کر کہتے ہیں "رایت احد القوم" میں نے قوم کا ایک فرد دیکھا۔ قوم کے رئیس یا کسی بڑے معظم رومی کو دیکھ کر کہتے ہیں۔ "رایت واحد القوم"۔

سوال: اس مضمون میں "یقولون" تین دفعہ استعمال ہوا ہے مگر شروع فعل میں "سیقولون ثلاثة" میں سین استقبال کے ساتھ اور باقی دو میں بغیر سین کے استعمال ہوا ہے کیوں؟۔

جواب: آخر کے دو فعلوں کو بمقتضاءِ عطف پہلے کے حکم میں مانا گیا ہے اختصار کے لئے پہلے فعل کے سین پر اکتفاء کیا گیا جیسا کہ کہا جاتا ہے۔ زید قد یخرج ویرکب۔

جواب: "وَيَقُوْلُوْنَ سَبْعَةٌ وَّثَامِنُهُمْ كَلْبُهُمْ" (اور بعض کہیں گے کہ وہ سات ہیں آٹھواں ان کا کتا ہے) سوال یہ ہے اس سے پہلے جملوں میں "ثلاثة رابعهم خمسة سادسهم" میں "واو" نہیں ہے اور بسابعة کے بعد وثامنهم میں واو بھی ہے۔ پہلوں جملوں میں کیوں نہیں؟

جواب: یہ واوِ ثمانیہ ہے جس کا تذکرہ آپ نے سورۃ توبہ کے آخر میں پڑھا ہے۔ اور علامہ زجاجؒ کہتے ہیں: نکرہ کی صفت میں اس واو کا آنا نہ آنا برابر ہے۔ قرآنِ کریم میں دونوں طرح آیا ہے۔ ان کے علاوہ باقی علماء تفسیر فرماتے ہیں: پہلے جملوں میں بھی واو موجود ہے مگر محذوف ہے تخفیف کے لئے اور تیسرے جملے میں اس کو ظاہر کیا تا کہ شروع کے جملوں میں محذوف واو پر دلالت کرے۔ مگر اس قول پر یہ اشکال وارد ہوگا کہ اگر یہی بات ہے تو جملہ اولیٰ میں مذکور اور باقی جملوں میں محذوف ہونا چاہئے۔ تا کہ اول میں ذکر ثانی اور ثالث کے حذف پر دلالت کرے جیسے کہ پہلے سین استقبال میں گذرا۔

علامہ زمخشری اور بعض علماء فرماتے ہیں: یہ وہ واو ہے جو نکرہ کی صفت واقع ہونے والے جملے پر داخل ہوتا ہے۔ اور معرفہ سے حال واقع ہونے والی صفت پر آتا ہے جیسا کہ "جاء نی رجل ومعه آخر "اور" مررت بزيد وفي يده سيف "اور فرمانِ الٰہی: "وَمَآ اَهْلَكْنَا مِنْ قَرْيَةٍ اِلَّا وَلَهَا كِتَابٌ مَّعْلُوْمٌ" میں "ولها" کا واو بھی اسی قسم کا ہے۔ اس کا فائدہ یہ ہے کہ صفت کے موصوف کے ساتھ اتصال کی تاکید کا فائدہ دیتا ہے۔ اور یہ بتاتا ہے موصوف کا اس صفت کے ساتھ متصف ہونا امر واقع اور امر ثابت ہے۔ اور آیت مذکورہ میں یہی واو بتاتا ہے کہ جن لوگوں نے "سَبْعَةٌ وَّثَامِنُهُمْ كَلْبُهُمْ" کہا وہ ثبات علم اور طمانیت نفس کے ساتھ کہا ہے۔ محض انکل نہیں ہانکا ہے جیسا کہ دوسروں نے گمان اور انکل سے کام لیا ہے ان کے قول کے انکل اور ظن ہونے کی دلیل اللہ کا یہ ارشاد ہے جو ان کے قول بعد مذکور ہے یعنی رَجْمًا ؒ بِالْغَيْبِ اور تیسرے قول کے بعد: "وَمَا يَعْلَمُهُمْ اِلَّا قَلِيْلٌ "لایا گیا۔ حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں: واو قطع عدد کے لئے واقع ہوا ہے۔ یعنی اس عدد کے بعد اور کوئی عدد مذکور نہیں جو پہلے بیان کردہ عدد کی نفی کرتا ہو۔ اس سے ثابت ہوا۔ کہ یہ اصحابِ کہف کل سات تھے آٹھواں ان کا کتا تھا۔ یہ قول درست اور قطعی ہے۔ اور امام ثعلبی فرماتے ہیں۔ یہ واو واوِ حکم اور واوِ تحقیق ہے۔ گویا اصحاب کہف کی تعداد کے متعلق لوگوں کے اختلاف کو بیان کیا۔ اور سبعة میں کلام مکمل ہوا۔ پھر نئے کلام سے بیان فرمایا آٹھواں ان کا کتا تھا۔ تو آخری عدد کا ثبوت متحقق ہو گیا اس لئے کہ آٹھواں ساتویں کے بعد ہی ہوتا ہے۔ اس تشریح کی رو سے: "وَثَامِنُهُمْ كَلْبُهُمْ "حقیقۃ یا تقدیراً اللہ کا کلام ہو سکتا ہے۔

اس واو کے بعد: "قُلْ رَّبِّيْٓ اَعْلَمُ بِعِدَّتِهِمْ "اور فرمان باری تعالیٰ: "مَا يَعْلَمُهُمْ اِلَّا قَلِيْلٌ" بقاءِ ابہام اور التباس کے ختم نہ ہونے پر دلالت کرتے ہیں۔

سوال: اللہ تعالیٰ نے فرمایا: "لَا مُبَدِّلَ لِكَلِمٰتِهٖ" (کوئی بدلنے والا نہیں اس کی باتیں) جبکہ دوسری جگہ ارشاد ہے: "وَاِذَا بَدَّلْنَآ اٰيَةً مَّكَانَ اٰيَةٍ" تبدیل آیت بالا یت تبدیل کلمات کو مستلزم ہے۔ تو بظاہر تعارض ہے؟۔

جوابِ اوّل: پہلی آیت کا مطلب ہے قرآن کریم میں کوئی بشر تغیر و تبدل نہیں کر سکتا۔ یہ قول نبی کریم ﷺ سے کفار کے اس مطالبے کے جواب میں فرمایا گیا۔ "اِئْتِ بِقُرْاٰنٍ غَيْرِ هٰذَآ اَوْ بَدِّلْهُ" اور دوسری آیت کا مطلب ہے نسخ اور تبدیلی اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہوگی۔ لہٰذا دونوں آیتوں میں کوئی منافات اور تعارض نہیں ہے۔

سوال: "فَمَنْ شَآءَ فَلْيُؤْمِنْ وَّمَنْ شَآءَ فَلْيَكْفُرْ" (سو جس کا جی چاہے ایمان لاوے اور جس

کا جی چاہے کافر رہے) اس آیت سے تو کفر کی اباحت ثابت ہوتی ہے؟۔
جوابِ اوّل: حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں: شاء کا فاعل محذوف ہے' تقدیر عبارت یوں ہے"فَمَنْ شَاءَ رَبُّكُمْ فَلْيُؤْمِنْ وَّمَنْ شَاءَ رَبُّكُمْ فَلْيَكْفُرْ" یعنی ایمان یا کفر اللہ کی مشیت سے ہے۔
جوابِ ثانی: یہ تہدید اور وعید کے طور پر ہے۔
جوابِ ثالث: آیت مطلب ہے کہ تم اپنے ایمان سے اللہ تعالیٰ کو کوئی نفع اور کفر سے کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتے ہو۔ تو یہ اظہار غنٰی ہے نہ کہ اباحتِ کفر۔
سوال: دنیا میں مردوں کے لئے کنگن پہننا عیب ہے۔ یہی وجہ ہے سونا چاندی لینے والے مرد بھی کنگن نہیں پہنا کرتے ہیں تو اللہ تعالیٰ نے مؤمنین کے لئے ان الفاظ سے کنگن پہننے کا وعدہ کیسے فرمایا"يُحَلَّوْنَ فِيهَا مِنْ اَسَاوِرَ مِنْ ذَهَبٍ" (انہیں جنت میں سونے کے کنگن پہنائے جائیں گے)؟
جواب: روم اور فارس کے بادشاہوں کی عادت تھی کہ وہ دوسروں سے خود کو ممتاز کرنے کے لئے کنگن اور تاج پہنا کرتے تھے۔ اس لئے اللہ تعالیٰ نے اہل جنت کے لئے اس کا وعدہ فرمایا: کہ یہ بھی آخرت کے بادشاہ ہیں۔
سوال: "وَدَخَلَ جَنَّتَهٗ وَهُوَ ظَالِمٌ لِّنَفْسِهٖ" پہلے جنت کو تثنیہ پھر اس آیت میں مفرد کیوں ذکر کیا گیا؟۔
جواب: مفرد اس لئے لایا گیا تا کہ حصر پر دلالت کرے۔ مطلب یہ ہے۔ اپنی اس جنت (باغ) میں داخل ہو جس کے علاوہ اس کی کوئی جنت نہیں ہے۔ بس یہی دنیاوی جنت ہے۔ اس جنت میں اس کا کوئی حصہ نہیں جس کا متعلقین کے ساتھ وعدہ کیا گیا ہے۔ بس صرف وہی اس کی جنت ہے جس کا دنیا میں مالک بنا ہے۔ اور سابقہ ذکر کردہ جنتین سے کوئی معین جنت مرد نہیں بلکہ جنس جنت مراد ہے۔
سوال: دو بھائیوں کے تذکرے میں مومن بھائی نے دوسرے کافر بھائی سے کہا:"لٰكِنَّا هُوَ اللّٰهُ رَبِّيْ وَلَا اُشْرِكُ بِرَبِّيْ اَحَدًا" (لیکن میں کہتا ہوں اللہ ہی میرا رب ہے اور میں اپنے رب کے ساتھ کسی کو شریک نہیں ٹھہراتا) اس کلام میں اس بات کی تعریض ہے کہ اس کا بھائی شرک میں مبتلا ہوا۔ حالانکہ اس کے کلام سے شرک مترشح نہیں ہوتا البتہ محض کفر ثابت ہوتا ہے جو کہتا ہے:"وَمَا اَظُنُّ السَّاعَةَ قَائِمَةً" (میرا خیال نہیں کہ قیامت قائم ہو جائے)

جواب: الفاظ میں تو شرک نہیں البتہ اعتقاد کے لحاظ سے شرک کیا تھا۔ وہ اس طرح کہ وہ یہ سمجھتا تھا کہ اس کے باغ کا پھلنا پھولنا بڑھنا محض اس کی محنت وقوت کا ثمرہ ہے۔ کسی اور طاقت کا اسمیں کوئی عمل دخل نہیں ہے یہی وجہ ہے اس کے بھائی نے اس سے کہا: ''وَلَوْلَآ اِذْ دَخَلْتَ جَنَّتَکَ قُلْتَ مَاشَآءَ اللّٰہُ لَا قُوَّۃَ اِلَّا بِاللّٰہِ'' (تم نے اپنے باغ میں داخل ہوتے وقت ماشاء اللہ لاقوۃ الا باللہ کیوں نہیں کہا) خود اس نے اپنے باغ کو دیکھ کر ہاتھ ملتے ہوئے کہا۔ ''یٰلَیْتَنِیْ لَمْ اُشْرِکْ بِرَبِّیْٓ اَحَدًا'' (اے کاش کہ میں اپنے رب کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہراتا) گویا اس نے شرک کا خود اعتراف کیا۔

سوال: ''اِنْ تَرَنِ اَنَا اَقَلَّ مِنْکَ مَالًا وَّوَلَدًا'' (اگر تو دیکھتا ہے مجھ کو کہ میں کم ہوں تجھ سے مال اور اولاد میں)۔ سوال یہ ہے کہ ترنی انا میں یاء متکلم کے بعد ''انا'' لانے کا کیا فائدہ ہے؟۔

جواب: اس مقام پر ''اَنَا'' خبر کو مخبر عنہ میں محصور کرنے کا فائدہ دیتا ہے۔ جیسا کہ فرمانِ باری تعالیٰ: ''اِنِّیْٓ اَنَا رَبُّکَ'' اور ''اِنِّیْٓ اَنَا اللّٰہُ'' میں ہے اس کی مثالیں قرآنِ کریم میں بہت زیادہ ہیں۔

سوال: مندرجہ ذیل آیات میں لفظ ''دُوْنَ'' کا کیا معنی ہے؟ ''وَلَمْ تَکُنْ لَّہٗ فِئَۃٌ یَّنْصُرُوْنَہٗ مِنْ دُوْنِ اللّٰہِ'' اور ''وَاتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰہِ اٰلِہَۃً لِّیَکُوْنُوْا لَہُمْ عِزًّا'' اور: ''وَالَّذِیْنَ اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰہِ اَوْلِیَآءَ'' ''وَمَالَکُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰہِ مِنْ وَّلِیٍّ وَّلَا نَصِیْرٍ''۔

جواب: لفظ ''دون'' کلام عرب میں غیر (علاوہ) کے معنی میں استعمال ہوتا ہے اہل عرب کہتے ہیں ''مال دون ہذا'' اور ''من دون ہذا'' یعنی غیر ہذا۔ جیسے آیت ''وَلَہُمْ اَعْمَالٌ مِّنْ دُوْنِ ذٰلِکَ'' (وہ اس کے علاوہ عمل کرتے ہیں) اور لفظ ''دون'' قبل (آگے) کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ جیسا کہ کہتے ہیں ''المدینۃ دون مکہ'' یعنی مدینہ مکہ سے آگے ہے۔

اور کہتے ہیں ''لا اقوم من مجلسی دون ان تجیء'' آپ کے آنے سے پہلے نہیں اٹھوں گا۔

''ولا افادقک دون ان تعطینی حقی'' اپنا حق لینے سے پہلے میں آپ سے جدا نہیں ہوں گا۔

البتہ لفظِ دون قبل (پہلے) کے معنی میں قرآنِ کریم میں استعمال نہیں ہوا' بلکہ صرف غیر (علاوہ) کے معنی میں استعمال ہوا۔

سوال: ''ہُنَالِکَ الْوَلَایَۃُ لِلّٰہِ الْحَقِّ'' یعنی قیامت کے دن ولایت اللہ ہی کے لئے ہوگی ''ولایۃ'' واو کے کسرہ کے ساتھ' بادشاہت کے معنی میں ہے۔ اور ''ولایۃ'' واو کے فتحہ کے ساتھ تولی ونصرت کے معنی میں ہے تو تولی ونصرت اللہ تعالیٰ ہی کے لئے ہے دنیا وآخرت دونوں میں جس کو چاہے عزت دے جسے چاہے ذلیل کردے۔ جس کی چاہے مدد کرے جس کی چاہے مدد نہ

کرے۔ تو یوم القیامۃ کی ولایت ونصرت کو خاص کرنے کا کیا فائدہ؟

جواب: دنیا میں اس کے دعوے دار بہت سارے ہیں۔ قیامت کے دن یہ سب دعوے دار بھی ختم ہو جائیں گے۔ اس وقت بادشاہت صرف اللہ ہی کے لئے ہوگی کوئی مجازی بادشاہ نہیں ہوگا۔ اس سوال کی نظیر سورۃ انعام میں اس آیت کے تحت گذری ہے: "قَوْلُهُ الْحَقُّ وَلَهُ الْمُلْكُ يَوْمَ يُنْفَخُ فِي الصُّوْرِ"

سوال: "هُوَ خَيْرٌ ثَوَابًا وَّخَيْرٌ عُقْبًا" (اسی کا ثواب سب سے اچھا ہے اور اسی کا نتیجہ سب سے اچھا ہے) اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی ثواب دینے والا ہے ہی نہیں، پھر اللہ تعالیٰ کا ثواب سب سے اچھا ہونے کا کیا مطلب؟

جواب: یہ علی سبیل الفرض والتقدیر ہے۔ مطلب یہ ہے: کہ بالفرض والمحال اگر اللہ کے علاوہ کوئی ثواب دے سکتا تب بھی اللہ تعالیٰ کا جزاوثواب دینا اس سے اچھا ہوتا۔ اور اگر اس کے علاوہ کسی اور کی اطاعت جائز ہو جاتی تب بھی اللہ تعالیٰ کی اطاعت نتیجہ اور انجام کے لحاظ سے اس سے کئی گنا بہتر ہوتی۔

سوال: "وَيَوْمَ نُسَيِّرُ الْجِبَالَ وَتَرَى الْأَرْضَ بَارِزَةً وَّحَشَرْنٰهُمْ" (اس دن کو یاد کرنا چاہئے جس دن ہم پہاڑ کو ہٹا دیں گے اور آپ زمین دیکھیں گے کہ ایک کھلا میدان پڑا ہے۔ اور ہم ان سب کو جمع کر دیں گے)۔

سوال: نُسَيِّرُ اور تَرَى کو صیغہ مضارع اور "حَشَرْنٰهُمْ" کو ماضی کے صیغے کے ساتھ کیوں تعبیر کیا گیا؟۔

جواب: "حَشَرْنٰهُمْ" (ہم ان کو جمع کریں گے) کو ماضی لانے کی وجہ یہ ہے حشر پہاڑوں کے چلانے اور زمین کے میدان ہونے سے پہلے ہوگا۔ تا کہ سب لوگ اس منظر کو اپنی آنکھوں سے دیکھیں۔

سوال: کیسے فرمایا اللہ تعالیٰ نے: "مَالِ هٰذَا الْكِتٰبِ لَا يُغَادِرُ صَغِيْرَةً وَّلَا كَبِيْرَةً اِلَّآ اَحْصٰهَا"۔

جب کہ اللہ ہی نے بتایا ہے کہ کبائر سے اجتناب پر صغائر معاف ہونگے اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

"اِنْ تَجْتَنِبُوْا كَبٰٓئِرَ مَا تُنْهَوْنَ عَنْهُ نُكَفِّرْ عَنْكُمْ سَيِّاٰتِكُمْ"

جواب اوّل: پہلی آیت کفار کے متعلق ہے بدلیل آیت "فَتَرَى الْمُجْرِمِيْنَ"

حضرت امام مجاہد بھی یہی فرماتے ہیں۔ ان کے علاوہ دوسرے مفسرین فرماتے ہیں۔ قرآن کریم

میں مجرمین سے مراد کفار ہیں۔ اور دوسری آیت سے مراد مؤمنین ہیں۔ اس لئے کہ کبائر سے اجتناب کفر کے ہوتے ہوئے نہیں ہوسکتا۔

جوابِ ثانی: مجرمین سے مراد اگر مطلق گناہگار (مسلمان' کافر) ہوں تب بھی کوئی تعارض واقع نہیں ہوگا۔ کیوں کہ یہ ممکن ہے کہ انسان کے تمام گناہ کبیرہ ہوں یا صغیرہ لکھے جاتے ہوں۔ اور حشر میں اس کے سامنے پیش کر کے پھر معاف کر دئے جائیں تا کہ اللہ تعالیٰ کے عفو وکرم کی نعمت کا مشاہدہ ہو۔ اس لئے کہ انسان اپنے اکثر گناہ کو بھول جاتا ہے۔

سوال: "وَاِذْ قُلْنَا لِلْمَلٰٓئِکَۃِ اسْجُدُوْا لِاٰدَمَ فَسَجَدُوْٓا اِلَّآ اِبْلِیْسَ کَانَ مِنَ الْجِنِّ" (جبکہ ہم نے ملائکہ کو حکم دیا کہ آدم کے سامنے سجدہ کرو تو سب نے سجدہ کیا بجز ابلیس کے کہ وہ جنات میں سے تھا)۔

یہ آیت تو دلالت کر رہی ہے ابلیس کے جنات کی نسل سے ہونے پر اور دوسری آیت یعنی: "وَاِذْ قُلْنَا لِلْمَلٰٓئِکَۃِ اسْجُدُوْا لِاٰدَمَ فَسَجَدُوْٓا اِلَّا اِبْلِیْسَ" (اور یاد کرو اس وقت کو کہ ہم نے فرشتوں سے کہا۔ آدم کو سجدہ کرو تو ابلیس کے علاوہ سب فرشتوں نے سجدہ کیا) سے معلوم ہوتا ہے ابلیس فرشتہ تھا۔ بظاہر دونوں آیات میں تعارض واقع ہوا؟۔

جواب: اس میں دو قول ہیں۔ پہلا قول: یہ ہے کہ آیت کے ظاہر سے معلوم ہوتا ہے ابلیس حقیقۃً جنات میں سے تھا۔ اس لئے کہ ابلیس کی ذریت واولاد موجود ہیں جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشادِ گرامی ہے: "اَفَتَتَّخِذُوْنَہٗ وَذُرِّیَّتَہٗٓ اَوْلِیَآءَ مِنْ دُوْنِیْ" کیا تم مجھے چھوڑ کر ابلیس اور اسکی ذریت کو دوست بناتے ہو؟۔ اور ملائکہ کی ذریت واولاد نہیں ہے لہٰذا معلوم ہوا کہ ابلیس جن تھا۔ جن ہونے کی دوسری دلیل یہ ہے کہ ابلیس دنیا کا سب سے بڑا کافر اور سب سے بڑا فاسق ہے۔ جبکہ فرشتے گناہوں سے معصوم ہوتے ہیں۔ کہ وہ اللہ تعالیٰ کے پیغام رساں ہوتے ہیں۔ ان میں معصیت ونافرمانی کا مادہ ہی نہیں ہے۔ اس لئے کہ وہ عقول مجردہ ہیں' خواہشات وشہوات سے خالی ہیں اور گناہ شہوات ہی کی وجہ سے سرزد ہوتے ہیں۔ اس کی تائید اس آیت سے بھی ہوتی ہے: "لَا یَعْصُوْنَ اللّٰہَ مَآ اَمَرَھُمْ وَیَفْعَلُوْنَ مَا یُؤْمَرُوْنَ" (وہ اللہ کے حکم کی خلاف ورزی نہیں کرتے۔ ان کو جو حکم دیا جاتا ہے اس کو کر گذرتے ہیں)

ایک اور جگہ ارشادِ گرامی ہے: "وَمَنْ عِنْدَہٗ لَا یَسْتَکْبِرُوْنَ عَنْ عِبَادَتِہٖ وَلَا یَسْتَحْسِرُوْنَ یُسَبِّحُوْنَ الَّیْلَ وَالنَّھَارَ لَا یَفْتُرُوْنَ"

تو ابلیس اس پاکیزہ مخلوق میں سے کیسے ہوسکتا ہے کہ سجدے کا حکم دیا جائے اور انکار کرے لہٰذا

معلوم ہوا کہ ابلیس فرشتوں کے قبیل سے نہیں تھا۔ یعنی مستثنیٰ، مستثنیٰ منہ کی جنس میں سے نہیں ہوگا اگر متصل ہو تو کہا جائے گا کہ جنس ماموریں بالسجود سے ہے نہ کہ جنس ملائکہ سے" تو اس صورت تقدیر عبارت یوں ہوگی: "وَاِذْ قُلْنَا لِلْمَلٰٓئِكَةِ وَاِبْلِيْسَ اسْجُدُوْا لِاٰدَمَ فَسَجَدُوْٓا اِلَّآ اِبْلِيْسَ" جیسا کہ یوں کہا جائے کہ "امرت اخوتی وعبیدی ھکذا فاطاعونی الا عبیدی" میں نے اپنے بھائیوں اور غلاموں کو حکم دیا۔ انہوں نے میری بات مانی مگر غلاموں نے نہیں مانی' چنانچہ غلام بھائیوں میں داخل نہیں ہیں ہاں البتہ کام کرنے کے حکم میں شامل ہیں۔

دوسرا قول یہ ہے: ابلیس نافرمانی کرنے سے پہلے فرشتہ تھا۔ جب نافرمانی کا ارتکاب کیا تو مسخ ہو کر شیطان بن گیا۔ لہٰذا حضرت عبداللہ بن عباسؓ کے قول "وَكَانَ مِنَ الْجِنِّ" لمخالفته میں کان صار کے معنی میں ہوگا۔ یعنی ابلیس اللہ تعالیٰ کے حکم کی نافرمانی کی پاداش میں 'جن' بن گیا اس قول کے مطابق ابلیس نافرمانی سے پہلے فرشتہ تھا۔ اور حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے یہ بھی روایت کی گئی ہے۔ کہ ابلیس پہلے جنت کے خازنوں میں سے تھا۔ فرشتوں کی اس جماعت کو "جن" کہا جاتا تھا تو اس تفسیر کے مطابق "كَانَ مِنَ الْجِنِّ" کا مطلب ہوگا کہ ابلیس فرشتوں کی "جن" نامی جماعت کا فرد تھا۔ اللہ تعالیٰ کے حکم کی خلاف ورزی کر کے فسق کیا۔ تو اس صورت مین مستثنیٰ متصل ہوگا۔

علامہ زمخشری سورۃ بقرۃ کی آیت "فَسَجَدُوْٓا اِلَّآ اِبْلِيْسَ" کی تفسیر میں فرماتے ہیں: یہ مستثنیٰ متصل ہے۔ اس لئے کہ ہزاروں فرشتوں کے درمیان یہی ایک جن تھا ان میں گھرا ہوا تھا اور کثرت کا اعتبار کر کے اس کو بھی فرشتہ شمار کیا گیا۔ پھر فرمایا۔ یہ تعلیل محلِ نظر ہے۔ اس کے بعد فرمایا ممکن ہے یہ مستثنیٰ منقطع ہو۔

سوال: اللہ تعالیٰ نے کیسے فرمایا: "اَفَتَتَّخِذُوْنَهٗ وَذُرِّيَّتَهٗٓ اَوْلِيَآءَ مِنْ دُوْنِيْ" اولیاء ولی کی جمع ہے اور ولی کہتے ہیں دوست احباب کو جو عدو کی ضد ہے' اور لوگوں میں سے کوئی بھی ابلیس کی ذریت کے ساتھ محبت نہیں کرتا' نہ وہی ان کے ساتھ دوستی کرتا ہے؟

جواب: یہاں موالاۃ (دوستی) سے مراد شیطان کی اطاعت کرنا ہے' وہ برائی اور فحش کاموں کا حکم دیتا ہے۔ لوگ اس کی باتوں میں آ کر اس کی اطاعت کرتے ہیں گو اطاعت لازم دوستی ہے۔ یعنی جس سے دوستی ہو اس کی نافرمانی نہیں کی جاتی لہٰذا اطاعت کو مجازاً موالاۃ (دوستی) سے تعبیر کیا گیا۔

سوال: فرمانِ الٰہی ہے: "وَيَوْمَ يَقُوْلُ نَادُوْا شُرَكَآءِيَ الَّذِيْنَ زَعَمْتُمْ فَدَعَوْهُمْ فَلَمْ

یَسْتَجِیْبُوْا لَهُمْ'' (اور یاد کرو اس دن کو کہ اللہ تعالیٰ فرمائیں گے کہ اپنے جن شرکاء کا دعویٰ کرتے تھے ان کو بلاؤ لیکن انہیں جواب نہیں دیا جائے گا)۔

جبکہ سورۃ نحل میں فرماتے ہیں: ''وَاِذَا رَاَی الَّذِیْنَ اَشْرَکُوْا شُرَکَآءَ هُمْ قَالُوْا رَبَّنَا هٰٓؤُلَآءِ شُرَکَآؤُ نَا الَّذِیْنَ کُنَّا نَدْعُوْا مِنْ دُوْنِکَ فَاَلْقَوْا اِلَیْهِمُ الْقَوْلَ اِنَّکُمْ لَکٰذِبُوْنَ'' پہلی آیت میں بتوں سے کلام کی نفی کی گئی ہے۔ اور دوسری آیت میں ان کے لئے کلام ثابت کیا گیا ہے۔ تو ان میں تعارض معلوم ہوتا ہے؟۔

جواب: اول الذکر آیت میں: ''نَادُوْا شُرَکَآءِ یَ الَّذِیْنَ زَعَمْتُمْ'' سے مراد ہے شرکاء کو سفارش اور عذاب کو ہٹانے کے لئے پکارو اور وہ (کفار) پکاریں گے اور شرکاء اس کا جواب نہیں دیں گے۔ لہٰذا اس آیت میں ان سے کلام کو نفی کرنا اس اعتبار سے ہے۔ یعنی نہ عذاب ہٹا سکیں گے اور نہ سفارش کر سکیں گے۔ اور نہ جواب دیں گے۔ اور سورۃ نحل والی آیت میں ان کے لئے جو کلام ثابت کیا گیا ہے وہ مشرکین کو دعویٰ عبادت میں جھٹلانے کے لئے ہے۔ لہٰذا کوئی تعارض نہیں۔

سوال: یہاں سورۃ کہف میں فرمایا شر کاء ی جبکہ سورۃ نحل میں شر کاء ھم (ان کے شرکاء) مذکور ہے؟

جواب: ''شر کاء ی فی زعمکم واعتقاد کم'' یعنی تمہارے زعم وگمان اور اعتقاد کے مطابق میرے شرکاء ہیں۔ حقیقت میں نہیں، یہ بطور تہکم فرمایا گیا اور ''شر کاءہم'' سے ان کے وہ معبود مراد ہیں جن کی یہ لوگ عبادت کرتے ہیں اور جنہیں اللہ تعالیٰ کے ساتھ شریک ٹھہراتے ہیں۔

سوال: ''نَسِیَا حُوْتَهُمَا'' (وہ دونوں اپنی مچھلی کو بھول گئے) نسیان کو حضرت موسیٰؑ اور حضرت یوشعؑ کی طرف کیوں منسوب کیا گیا حالانکہ مچھلی کو حضرت یوشع علیہ السلام نے بھولا تھا۔ وہ خود فرماتے ہیں: ''فَاِنِّیْ نَسِیْتُ الْحُوْتَ'' یعنی میں مچھلی کے قصے کو بھول گیا۔: ''وَمَآ اَنْسَانِیْهُ اِلَّا الشَّیْطٰنُ اَنْ اَذْکُرَه'' ''اس کی یاد کو شیطان ہی نے بھلا دیا؟۔

جوابِ اوّل: دونوں کی طرف نسیان کی نسبت مجازی ہے۔ مراد اس سے حضرت یوشع علیہ السلام ہی ہیں۔ امام فراء فرماتے ہیں۔ اس کی نظیر قرآن کریم کی یہ آیت ہے: ''یَخْرُجُ مِنْهُمَا اللُّؤْلُؤُ وَالْمَرْجَانُ'' ''ان دو دریاؤں (کھارے اور میٹھے) سے لؤلؤ اور مرجان نکلتے ہیں، حالانکہ یہ کھارے دریاء سے نکلتے۔ میٹھے سے نہیں نکلتے ہیں مگر منسوب دونوں کی طرف کیا گیا۔

جوابِ ثانی: حضرت موسیٰؑ مچھلی کے متعلق پوچھنا بھول گئے۔ اور حضرت یوشعؑ مچھلی کے واقعے کو بتانا بھول گئے۔ لہٰذا نسیان کی اضافت دونوں کی طرف کرنا صحیح ہے۔ واقعہ اس طرح ہے کہ

انہوں نے ایک مچھلی تل کر ایک تھیلے میں رکھ کر بطور زادِ سفر ساتھ لی جب آبِ حیات کے پاس پہنچے' وہاں تھوڑی دیر کے لئے ٹھہر گئے حضرت موسیٰ کسی ضرورت کے لئے تھوڑا دور گئے۔ ادھر یوشعؑ نے اس پانی سے وضوء کیا۔ اس کے چھینٹے تلی ہوئی مچھلی پر پڑے' جس سے وہ زندہ ہو کر وہاں سے کھسک کر سمندر کے اندر چلی گئی۔ یوشعؑ یہ واقعہ بتانا اور موسیٰؑ اس مچھلی کے متعلق پوچھنا بھول گئے۔

سوال: مذکورہ تفسیر سے معلوم ہوتا ہے۔ حضرت موسیٰؑ اور یوشعؑ سے یا صرف یوشعؑ سے نسیان کا صدور مچھلی کے زندہ ہو کر دریا میں جانے کے بعد ہوا ہے۔ اور آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ مچھلی کے زندہ ہونے سے قبل مجمع البحرین پہنچ کر وقوع نسیان ہوا تھا۔ چنانچہ فرمان باری ہے: ''فَلَمَّا بَلَغَا مَجْمَعَ بَيْنِهِمَا نَسِيَا حُوتَهُمَا فَاتَّخَذَ سَبِيلَهُ فِي الْبَحْرِ سَرَبًا''

جواب: آیت میں تقدیم و تاخیر ہے۔ تقدیر عبارت اس طرح ہے: ''فَلَمَّا بَلَغَا مَجْمَعَ بَيْنِهِمَا اتَّخَذَ الْحُوتَ سَبِيلَهُ فِي الْبَحْرِ سَرَبًا فَنَسِيَا حُوتَهُمَا'' یعنی جب وہ مجمع البحرین پر پہنچ گئے تو مچھلی دریا کو چیرتی ہوئی چلی گئی' ان کو یاد نہ رہا)۔

سوال: حضرت یوشعؑ اس عجیب واقعے کو کیسے بھول گئے' حالانکہ یہ واقعہ یعنی مچھلی کا گم ہونا ہی حضرت خضر علیہ السلام کو پانے کی علامت قرار دیا گیا تھا اس جیسے واقعات کو نہیں بھولا جا سکتا۔ اگرچہ زمانہ دراز ہی کیوں نہ گذر جائے' پھر ان سے کیسے نسیان واقع ہوا ہے؟۔

جواب: اس بھولنے کی وجہ یہ ہے کہ حضرت یوشع علیہ السلام نے حضرت موسیٰؑ کے ساتھ رہ کر بہت سے عجیب و غریب واقعات خوارق عادت دیکھے تھے۔ اس وجہ سے اس واقعے کو سابقہ کی طرح ایک واقعہ سمجھا۔ اس لئے اس کی طرف کوئی توجہ نہ دی۔

سوال: ''حَتَّى إِذَا رَكِبَا فِي السَّفِينَةِ خَرَقَهَا'' (یہاں تک کہ جب چڑھے کشتی میں اس کو پھاڑ ڈالا) میں جزا ''خرقہا'' کو ''بغیر فاء'' کے اور ''حَتَّى إِذَا لَقِيَا غُلَامًا فَقَتَلَهُ'' (یہاں تک کہ جب ملے ایک لڑکے سے تو اسے مار ڈالا) میں ''قتله'' کو فاء کے ساتھ کیوں لایا گیا؟۔

جواب: ''خرقها'' مکمل جزاء شرط ہے۔ لہٰذا اس میں ''فاء'' لانے کی ضرورت نہیں ہے۔ اور قتلہ جزاء نہیں۔ بلکہ شرط کا جز ہے۔ لہٰذا پہلے جز پر عطف کرنے کے لئے فاء عاطفہ لایا گیا۔ اور شرط کی جزاء ''قَالَ اقتلت الخ'' ہے۔

سوال: لڑکے کو قتل کرنے کے واقعے میں حضرت موسیٰؑ نے حضرت خضر علیہ السلام سے فرمایا: ''لَقَدْ جِئْتَ شَيْئًا نُكْرًا'' (بیشک تو نے کی ایک نامعقول چیز) اور کشتی توڑنے پر فرمایا: ''لَقَدْ جِئْتَ شَيْئًا إِمْرًا'' (البتہ تو نے کی ایک چیز بھاری) ایک جگہ ''نکرا'' اور ایک جگہ

''امرا'' کیوں فرمایا؟۔
جواب: بعض علماء نے کہا ہے کہ ''امرا'' ''نکرا'' کا ہم معنی ہے۔لہٰذا دونوں میں کوئی فرق نہیں ہے۔دونوں کا معنی ایک ہے۔
اور بعض نے کہا ''الامر'' عجیب اور خوفناک کام کو کہتے ہیں۔کشتی کو توڑنا قتل غلام سے بڑھ کر قتل ہے۔اس لئے کہ قتل غلام میں ایک فرد کا قتل اور تخریب سفینہ میں بہت سوں کا قتل ہے۔اس لئے ''امرا'' استعمال کیا۔لیکن کچھ علماء کی رائے اس کے برخلاف ہے۔یعنی وہ کہتے ہیں ''الامر'' کے مقابلے میں ''النکر'' زیادہ عظمت کو بیان کرنے کے لئے استعمال ہوتا ہے۔لہٰذا قتل غلام کے لئے ''نکرا'' اور تخریب سفینہ کے لئے ''امرا'' استعمال کیا' اس لئے کہ قتل غلام کا کوئی تدارک نہیں ہوسکتا۔اور کشتی کے خرق (سوراخ) کو بند کرنا ممکن تھا۔
سوال: کشتی کے واقعے میں: ''اَلَمۡ اَقُلۡ اِنَّکَ'' (بولا میں نے نہ کہا تھا تو نہ ٹھہر سکے گا) فرمایا' اور لڑکے قتل کے متعلق: ''اَلَمۡ اَقُلۡ لَّکَ'' (میں نے تجھ کو نہ کہا تھا) فرمایا کیوں؟
جواب: دوسری مرتبہ وصیت پر عمل نہ کرنے کی وجہ سے متنبہ کرنے کے لئے ''اِنَّ'' تاکید کا کلمہ اختیار کیا گیا۔اور بار بار بے صبری سے پوچھنے پر تنبیہ کے لئے ایسا کیا گیا۔
سوال: ''اِسۡتَطۡعَمَا اَهۡلَهَا'' ''بستی والوں سے کھانا طلب کیا''
ماقبل آیت میں اھل کا ذکر آیا ہے تو اس کو دوبارہ ذکر کرنے کے بجائے ضمیر لائی جاتی جیسا کہ عام اصول ہے۔تو ضمیر کی جگہ اسم ظاہر کیوں لایا گیا؟ کہا جاتا ''اِسۡتَطۡعَمَاهُمۡ''۔
جواب: اھل کو دوبارہ ذکر کرنا محض تاکید کے لئے ہے۔
سوال: فرمانِ الٰہی ہے: ''یُرِیۡدُ اَنۡ یَّنۡقَضَّ'' ''دیوار گرنا چاہ رہی تھی'' میں چاہنے کو دیوار کی طرف کیوں منسوب کیا گیا' چاہنا' ارادہ کرنا ذی روح کا فعل ہے نہ کہ جماد کا؟۔
جواب: دیوار کی طرف ارادے کی نسبت مجازاً ہے' جب کہ بالکل آخری حالت میں دیکھا گویا آپ گر رہی ہے تو گویا وہ گرنا چاہتی ہے۔اہلِ عرب عقلاء کے افعال کو مالا یعقل کی طرف بطور مجاز منسوب کیا کرتے ہیں۔جیسا کہ کسی شاعر کا قول ہے۔شعر:

یرید الرمح صدر ابی براء ☆ ویعدل عن دماء بنی عقیل

(نیزہ براء کے سینے میں لگنا چاہتا ہے اور بنو عقیل کے خون سے عدول کرتا ہے)

حضرت حسن بن ثابت فرماتے ہیں۔

ان دھراً یلف شملی بحمل ☆ لزمانٍ یھمّ بالاحسان

قرآن کریم میں اس کی مثال: ''لَمَّا سَكَتَ عَنْ مُّوسَى الْغَضَبُ''
جب موسیٰ کا جوشِ غضب ٹھنڈا ہوا (دوسری مثال) ''قَالَتَا اَتَيْنَا طَائِعِيْنَ''
سوال: حضرت خضر علیہ السلام نے پہلے اور دوسرے سوال پر حضرت موسیٰ سے جدائی اختیار کیوں نہیں کی۔ تیسرے سوال پر کیوں جدا ہوئے؟۔
جواب: اس کی دو وجہیں ہیں: پہلی وجہ یہ ہے: کہ حضرت موسیٰ نے حضرت خضر علیہ السلام کے ساتھ معاہدہ کیا تھا کہ تین اعتراضات تک ساتھ رکھیں اس کے بعد جدائی کا وعدہ کیا تھا۔ لہٰذا اس پر حضرت موسیٰ علیہ السلام راضی تھے۔ دوسری وجہ یہ ہے: کہ پہلا اور دوسرا اعتراض تورع اور دینی صلاحیت کی بنا پر تھا۔ جبکہ تیسرا اعتراض اپنی خواہش یعنی کھانا طلب کرنے اور پیٹ کی خواہش کو پورا کرنے کے لئے تھا اس لئے اس کے بعد جدائی اختیار کی۔
سوال: ''وَجَدَهَا تَغْرُبُ فِىْ عَيْنٍ حَمِئَةٍ'' (ذوالقرنین کو سورج ایک سیاہ پانی میں ڈوبتا ہوا دکھائی دیا)۔ سورج زمین سے ایک سو ساٹھ گنا' ایک قول کے مطابق ایک سو پچاس گنا اور تیسرے قول کے مطابق ایک سو بیس گنا بڑا ہے' تو زمین کے ایک چشمے میں ایسی وسعت کہاں کہ سورج اس میں غروب ہو جائے؟
جواب: اللہ تعالیٰ کا قول: ''وجدھا'' (سورج کو پایا) کا مطلب ہے: ''وَجَدَهَا فِى زَعْمِهٖ وَظَنِّهٖ'' یعنی اپنے گمان وزعم کے مطابق غروب ہوتا ہوا پایا' یعنی درحقیقت سورج اس میں غروب نہیں ہو رہا تھا۔ بلکہ ذولقرنین کی نظر اور دانست میں ایسا لگ رہا تھا۔ جیسا کہ سمندر میں سفر کرنے والا اگر سمندر کے وسط میں جائے' اور آس پاس کے ساحل نظروں سے اوجھل ہو جائیں تو سورج کو سمندر سے طلوع اور سمندر ہی میں غروب ہوتا دیکھے گا۔ اسی طرح ذوالقرنین چلتے چلتے مغرب تک پہنچ گئے وہاں ایک عظیم چشمہ پایا۔ اور دیکھا گویا سورج اس میں غروب ہو رہا ہے۔
سوال: ذوالقرنین علی اختلاف الاقوال' نبی' مردِ صالح یا حکیم ہیں۔ ایسے عظیم آدمی پر سورج کے غروب ہونے کا معاملہ کیسے مشتبہ ہوا۔ حتیٰ کہ عقلاً ایک محال و مستحیل چیز (سورج کا زمین کے چشمے میں غروب ہونے) کا گمان کرنے لگے۔
جوابِ اوّل: انبیاء' اولیاء اور دانا لوگوں کے گمان بھی کبھی غلط ہوتے ہیں۔ اگرچہ انبیاء گناہوں سے معصوم ہوتے ہیں۔ دیکھئے حضرت موسیٰ نے تینوں واقعات میں حضرت خضرؑ پر نکیر فرمائی۔
جوابِ ثانی: اللہ تعالیٰ قادر مطلق ہیں بڑے سے بڑے جسم کو چھوٹا کر سکتے ہیں۔ اور سورج کے عظیم جسم کو چھوٹا کر کے زمین کو وسعت دینے پر قادر ہیں۔ یہ ممکن ہے کہ اللہ تعالیٰ سورج کو سکیڑ کر

زمین میں غروب کردیں۔ اور ہمیں اس کا ادراک نہ ہو۔

سوال: ''قُلْنَا یٰذَا الْقَرْنَیْنِ اِمَّا اَنْ تُعَذِّبَ وَاِمَّا اَنْ تَتَّخِذَ فِیْهِمْ حُسْنًا'' (ہم نے کہا اے ذوالقرنین یا تو تو لوگوں کو تکلیف دے اور یا رکھ ان میں خوبی) یہ آیت ذوالقرنین کے نبی ہونے پر دلالت کر رہی ہے۔ اس لئے کہ اللہ تعالیٰ نے ان سے خطاب کیا۔

جواب: جو لوگ ان کی نبوت کے قائل نہیں ہیں وہ کہتے ہیں۔ یہ خطاب اس وقت کے نبی کے واسطے سے کیا۔ جیسا کہ فرمانِ الٰہی ہے ''یا بنی اسرائیل'' وغیرہ بنی اسرائیل کو یہ خطاب وقت کے نبی کی وساطت سے ہے۔

سوال: کفار کے متعلق اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: ''فَلَا نُقِیْمُ لَهُمْ یَوْمَ الْقِیَامَةِ وَزْنًا'' (قیامت کے دن ہم ان کے لئے ترازو مقرر نہیں کریں گے) یعنی ہم کفار کے اعمال کو تولنے کے لئے ترازو مقرر نہیں کریں گے۔ اس لئے کہ ترازو اعمال کو وزن کرنے کے لئے ہوتا ہے اور کافروں کے افعال کا کوئی وزن نہیں ہوگا۔ مگر دوسری آیت میں فرماتے ہیں: ''وَاَمَّا مَنْ خَفَّتْ مَوَازِیْنُهٗ فَاُمُّهٗ هَاوِیَةٌ''۔

اس آیت سے تو معلوم ہوتا ہے کہ کفار کے اعمال وزن کئے جائیں گے۔ لہٰذا دونوں آیتوں میں بظاہر تعارض واقع ہوا تطبیق کیسے ہوگی؟۔

جواب: پہلی آیت کفار کے متعلق ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ ان کے اعمال کی ہمارے یہاں کچھ قدر و منزلت نہ ہوگی۔ جبکہ دوسری آیت ان مؤمنین کے متعلق ہے جن کی سیئات (برائیاں) ان کی حسنات (نیکیوں) سے زیادہ ہوں۔ ان سیئات کی پاداش میں وہ جہنم میں داخل ہوں گے مگر ہمیشہ اس میں نہیں رہیں گے۔ سزا بھگتنے کے بعد اس سے خلاصی پا کر جنت میں داخل ہوں گے۔ لہٰذ کچھ تعارض نہ رہا۔

## سورۃ مریم

سوال: ''اِذْ نَادٰی رَبَّهٗ نِدَآءً خَفِیًّا'' (جس وقت کہ انہوں نے اپنے پروردگار کو آہستہ آواز میں پکارا)۔ ''نداء'' کہتے ہیں آوازِ بلند کو چیخ کر بلانے کو۔ تو اس کی صفت ''خفیا'' آہستہ کیسے آسکتی ہے؟

جواب: نداء یہاں دعاء کے معنی میں ہے اور دعا کو آہستہ اس لئے کیا۔ تاکہ اخلاص کے قریب تر ہو جائے۔ یا اس لئے آہستہ دعاء کی کہ لوگ انہیں ملامت نہ کریں کہ اتنے بوڑھے ہو کر اولاد کی دعا کرتے ہیں یا اس لئے دھیمی آواز میں دعاء کی کہ ان کے بنوالاعمام نہ سن سکیں۔ اور ان کے ساتھ

دشمنی کرنے لگیں کہ یہ اس لئے بیٹے کی دعا کر رہے ہیں کہ کہیں ان کے بعد ہم ان کے قائم مقام یعنی نائب نہ بن جائیں۔

سوال: کیسے فرمایا: "یَرِثُنِیْ وَیَرِثُ مِنْ اٰلِ یَعْقُوْبَ" جو میرا بھی وارث ہو اور اولاد یعقوب کا بھی وارث ہو جب کہ نبی وراثت نہیں چھوڑتا۔ فرمان رسول ﷺ ہے۔ "نحن معاشر الانبیاء لا نورث 'ماتر کناہ صدقۃ" "ہم انبیاء کی جماعت مال نہیں چھوڑتی' جو کچھ ہم چھوڑیں گے وہ صدقہ ہے"؟

جواب: یہاں "وراثت" سے مراد وراثت مال نہیں۔ بلکہ وراثت علم و نبوت مراد ہے' اور "یرث من ال یعقوب" سے مراد ملک ہے' بعض نے کہا اخلاق فاضلہ مراد ہیں اور آپ ﷺ کا قول مبارک "لا نورث" کا مطلب ہم مال بطور میراث نہیں چھوڑتے اگلا جملہ "ماتر کناہ صدقۃ" سے یہی معلوم ہوتا ہے۔ اور "یعقوب" سے حضرت یعقوب علیہ السلام مراد ہیں۔ بعض نے کہا: یعقوب سے حضرت یوسف علیہ السلام کے والد مراد نہیں بلکہ اس سے مراد حضرت ذکریاؑ کے برادر ہیں۔

سوال: "یَرِثُنِیْ وَیَرِثُ مِنْ اٰلِ یَعْقُوْبَ" (میرا وارث بنے اور یعقوب کے خاندان کا وارث بنے) یَرِثُنِیْ کو مفعول کی طرف بلا واسطہ حرف جر کے اور دوسرے یرث کو "من" کے ساتھ متعدی کیا گیا۔ حالانکہ دونوں ایک ہی ہیں دونوں کو بنفسہٖ متعدی ہونا چاہئے۔ یا دونوں متعدی بواسطہ حرف جر کو ہونا چاہئے؟

جواب: "وَرِثَ" میں دونوں لغت ہیں۔ دونوں لغتوں کو جمع کیا گیا۔ بعض نے کہا: "من" یہاں تعدیہ کے لئے نہیں بلکہ تبعیض کے لئے ہے اس لئے کہ اولاد یعقوبؑ سب کے سب انبیاء نہیں تھے۔

سوال: حضرت زکریا علیہ السلام نے: "فَھَبْ لِیْ مِنْ لَّدُنْکَ وَلِیًّا" سے ولدِ صالح کی دعاء کی۔ جب اللہ تعالیٰ نے بچے کی خوشخبری ان الفاظ میں دی: "یٰزَکَرِیَّا اِنَّا نُبَشِّرُکَ بِغُلَامِ نِ اسْمُہٗ یَحْیٰی" (اے زکریا ہم تمہیں ایک لڑکے جسکا نام یحییٰ ہے کی خوشخبری دیتے ہیں) تو اس کو مستبعد سمجھا اور تعجب کر کے کہا: "اَنّٰی یَکُوْنُ لِیْ غُلٰمٌ" میرے لئے بچہ کیسے ہوگا؟ ایسا کیوں ہے۔

جوابِ اوّل: حضرت زکریا علیہ السلام کا یہ پوچھنا: بطور انکار و استبعاد کے نہیں بلکہ مزید اطمینان وایقان کے لئے تھا۔ ورنہ حضرت زکریا علیہ السلام کا عقیدہ یہ تھا کہ اللہ تعالیٰ اسباب سے مستغنی ہے۔ یعنی اسباب کے بغیر پیدا کرنے پر قادر ہے۔ سوال بچے کی پیدائش کی کیفیت کے بارے میں پوچھا کہ پیدائش کی صورت کیا ہوگی۔ بچہ پیدا ہونے نہ ہونے میں تردد نہیں تھا۔

جوابِ ثانی: یہ سوال تعجب سرور وفرحت کی بنا پر تھا۔ نہ کہ تعجب استبعاد وانکار کے طریقے پر۔
سوال: ''رَبِّ اجۡعَلۡ لِّيۡ اٰيَةً'' (اے اللہ میرے لئے کوئی نشانی وعلامت بنادے) اللہ تعالیٰ کی طرف سے بچے کی خوشخبری ملنے کے بعد علامت کو طلب کیا' کیا اس میں شک تھا؟۔
جواب: حمل کی علامت اس لئے طلب کی تاکہ اللہ تعالیٰ کا شکر بجالانے کی طرف جلدی کریں' اور جلدی خوشی نصیب ہو۔ اس لئے کہ ابتدائی مراحل میں حمل کا پتہ نہیں چلتا۔ کافی مدت گزرنے کے بعد حمل کا ظہور ہوتا ہے۔ اس لئے حمل ٹھہرنے کی علامت معلوم کرنا چاہا تاکہ خوشی کا ادراک جلدی ہوجائے۔
تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا اس کی علامت یہ ہے کہ تم تین دن بات چیت نہ کرسکو گے۔
سوال: ''اِنِّيۡۤ اَعُوۡذُ بِالرَّحۡمٰنِ مِنۡكَ اِنۡ كُنۡتَ تَقِيًّا'' (کہ میں تجھ سے اللہ کی پناہ مانگتی ہوں اگر تو مرد متقی ہے) حضرت مریمؑ نے یہ کیوں کہا۔ میں تجھ سے پناہ مانگتی ہوں پناہ تو فاسق سے مانگی جاتی ہے نہ کہ متقی سے؟۔
جوابِ اوّل: مطلب یہ ہے کہ اگر تو ان لوگوں میں سے ہے جو اللہ تعالیٰ سے ڈرتے ہیں تو میرے قریب آنے سے باز رہ' حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے مروی ہے وہ فرماتے ہیں حضرت مریمؑ کے زمانے میں ایک آدمی تھا۔ اس کا نام تقی تھا۔ مگر وہ متقی نہ تھا۔ بلکہ فاجر تھا۔ جبرائیل کو دیکھ حضرت مریمؑ یہ سمجھیں کہ یہ وہ شخص ''تقی'' ہے اس لئے اس سے پناہ مانگی۔ مگر محققین کے نزدیک پہلا قول ہی درست ہے۔
جوابِ ثانی: بعضوں نے کہا: یہ مبالغہ کے طور پر ہے' مطلب یہ ہے۔ اگر تو متقی ہے تو تجھ سے پناہ مانگتی ہوں۔ اگر تو متقی نہیں ہے تو قریب ہونا کیسے ممکن ہے۔ اس کی نظیر وہ حدیث ہے' جس میں فرمایا گیا: ''نعم العبد صهيب' لولم يخف الله لم يعصه'' صہیب بہت اچھا بندہ ہے۔ اگر اللہ تعالیٰ سے نہ بھی ڈرتا تو بھی اللہ کی نافرمانی نہ کرتا۔ یعنی اگر اللہ تعالیٰ کے عذاب سے ڈر نہ بھی ہوتا تب بھی نافرمانی نہ کرتا۔ تو اللہ تعالیٰ سے ڈرنے کی صورت میں کیا حال ہوگا۔ کیسے نافرمانی ہوگی۔ اور ''ابورجاء'' اور ابن مسعودؓ کی قراءت میں: ''الا اَنۡ تَكُوۡنَ تَقِيًّا'' ہے۔
سوال: تمام علماء کرام کا اس پر اتفاق ہے۔ کہ کسی عورت پر وحی نازل نہیں ہوئی' اور نہ کسی عورت کے پاس حضرت جبریلؑ کو رسالت دیکر بھیجا گیا ہے۔ اسی وجہ سے آیت: '' وَاَوۡحَيۡنَاۤ اِلٰۤى اُمِّ مُوۡسٰٓى اَنۡ اَرۡضِعِيۡهِ '' میں وحی کو وحی الہام پر محمول کیا ہے۔ بعض نے وحی منام کہا ہے۔ تو اللہ تعالیٰ نے کیسے فرمایا: ''فَاَرۡسَلۡنَاۤ اِلَيۡهَا رُوۡحَنَا وَقَالَ اِنَّمَاۤ اَنَا رَسُوۡلُ رَبِّكِ'' (ہم نے جبریلؑ کو ان

(مریمؑ) کے پاس بھیجا۔ اور اس نے کہا: میں تیرے رب کا رسول ہوں)۔
**جواب:** ہم کبھی بھی یہ تسلیم نہیں کریں گے کہ کسی عورت کے پاس کوئی وحی آئی ہی نہیں ہے حضرت مقاتلؒ نے فرمان الٰہی: ''وَاَوۡحَیۡنَاۤ اِلٰۤی اُمِّ مُوۡسٰۤی اَنۡ اَرۡضِعِیۡهِ'' کے متعلق فرمایا ہے۔ یہ وحی حضرت جبریل علیہ السلام کے واسطے سے تھی۔ علماء کرام کے درمیان متفق علیہ یہ ہے کہ حضرت جبریل علیہ السلام کسی عورت کے پاس پیغمبری کی وحی لیکر نہیں آئے۔ مطلق وحی کی نفی نہیں ہے۔
یہاں جبرئیلؑ حضرت مریم علیہا السلام کے پاس رسالت کی وحی لیکر نہیں بلکہ بیٹے کی بشارت کی وحی لیکر آئے ہیں یہی وجہ ہے کہ وہ انسانی صورت میں تشریف لائے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے: ''فَتَمَثَّلَ لَهَا بَشَرًا سَوِیًّا'' (پس وہ پورا ابن کر مریم کے سامنے نمودار ہوا)۔
**سوال:** ''لِاَهَبَ لَکِ غُلٰمًا زَکِیًّا'' (تاکہ تجھ کو پاک اور پاکیزہ لڑکا عطا کروں)۔ حضرت جبریلؑ نے کیسے فرمایا کہ میں تجھ کو پاکیزہ لڑکا عطا کروں۔ حالانکہ عطاء اور ہبہ کرنے والے اللہ تعالیٰ ہی ہیں جبریلؑ نے عطاء کو اپنی طرف کیوں منسوب کیا۔
**جوابِ اوّل:** ابن الانباریؒ نے کہا: آیت کا مطلب یہ ہے کہ میں تیرے رب کا یہ پیغام لیکر آیا ہوں۔ کہ میں تجھ کو ایک بچہ عطاء کرنے والا ہوں۔ چنانچہ اس صورت میں عطاء کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف بھی ہوتی ہے۔ جبریلؑ محض اللہ تعالیٰ کے اس پیغام کو لانے والے ہیں۔
**جوابِ ثانی:** حضرت جبریلؑ کی طرف عطاء کی نسبت بطور سبب کے مجازاً ہے۔ یعنی تیرے گریبان میں پھونک کر اس بچے کی پیدائش کا سبب بنوں)۔
**سوال:** ''قَالَتۡ اَنّٰی یَکُوۡنُ لِیۡ غُلٰمٌ وَّ لَمۡ یَمۡسَسۡنِیۡ بَشَرٌ وَّلَمۡ اَکُ بَغِیًّا'' (مریمؑ نے کہا: میرے لڑکا کہاں سے ہوگا اور مجھ کو تو کسی آدمی نے ہاتھ بھی نہیں لگایا۔ اور نہ تھی میں بھی بدکار) حضرت مریم علیہا السلام نے اپنے لئے مذکر کا صیغہ بغیًا کیوں استعمال کیا۔ قاعدے کی رو سے ''بَغِیَّةً'' ہونا چاہے۔
**جواب:** ابن الانباریؒ کہتے ہیں: یہ وصف عورتوں کے لئے اکثر استعمال ہوتا ہے اہلِ عرب رجل بغی بہت کم کہتے ہیں۔ تانیث کی علامت اس کے ساتھ نہیں لگاتے۔ جیسے لفظ حامل، حائض، عاقر وغیرہ الفاظ عورتوں ہی کے لئے استعمال ہوتے ہیں اور ان کے ساتھ علامت تانیث نہیں لگائی جاتی۔
امام الازہریؒ نے تو یہاں تک کہا ہے۔ کہ یہ لفظ ''بغیا'' مؤنث کے ساتھ مختص ہے اور اس کا لام کلمہ ''ی'' ہے۔ کہا جاتا ہے ''بَغَتۡ تَبۡغِیۡ'' امام مبردؒ کے نزدیک یہ فعول کے وزن پر ہے۔ اصل

میں بغوِی تھا۔ واو کو یاء میں تبدیل کر دیا گیا ہے۔ اور یاء کو یاء میں مدغم کیا ہے۔ اور ی کی وجہ سے غین کو کسرہ دیا گیا ہے۔ اور فعول کے صیغے کے ساتھ تانیث نہیں آتا۔ یہ صیغہ مذکر مؤنث دونوں کے لئے استعمال ہوتا ہے۔ جیسے لفظ صبور اور شکور ہے۔ اور ''ابن جنیؒ'' اپنی کتاب 'التمام' میں اس کے بارے میں لکھتے ہیں: فعیل کے وزن پر ہے۔ اگر فعول کے وزن پر ہوتا۔ تو بغو ہوتا اور اسم فاعل کے معنی میں ہے۔ جیسا کہ ارشادِ ربانی: ''اِنَّ رَحْمَةَ اللّٰهِ قَرِيْبٌ مِّنَ الْمُحْسِنِيْنَ'' میں ''قریب'' اسم فاعل کے معنی میں ہے۔ اور بعض نے کہا۔ بغیۃ اس لئے نہیں ہی لایا گیا تاکہ دوسری آیات کے اواخر کی رعایت ہو۔

سوال: ''يٰلَيْتَنِيْ مِتُّ قَبْلَ هٰذَا وَكُنْتُ نَسْيًا مَّنْسِيًّا'' (کاش کہ میں اس حالت سے پہلے مرجاتی اور بھولی بھلائی ہوجاتی) سوال یہ ہے کہ حضرت مریم علیہا السلام کا یہ غم وحزن کس وجہ سے تھا؟ کیا بے سروسامانی اور عدم دستیابی اشیاء ضرورت کی وجہ سے تھا یا بدنامی اور تہمت لگائے جانے کے ڈر سے تھا؟۔

جواب: ان کی پریشانی دونوں وجوہ سے تھی۔ ایک تو تہمت کا خوف۔ دوسرا وہ مقام ایسا تھا' کہ وہاں نہ کھانے پینے کی اشیاء تھی اور نہ پینے اور پاکی حاصل کرنے کیلئے کوئی پانی کا نام ونشان۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ کا اس خشک زمین میں جہاں پانی کا تصور ہی نہ تھا۔ نہر جاری کرنا اور خشک درخت سے تازی کھجوریں لانا دونوں غموں کو دور کرنے کا باعث بنا۔ دونوں پریشانیوں کو ختم کردیا۔ خوراک اور پانی کے غم کا دور ہونا تو واضح ہے' البتہ تہمت کا خوف اس طرح دور ہوا۔ کہ دونوں معجزے ہیں خشک وادی سے چشمہ کا جاری ہونا۔ اور خشک درخت پر تازی کھجوریں لگنا دونوں حیرت انگیز معجزے ہیں۔ جو حضرت مریم علیہا السلام کی عصمت وعفت و پاکبازی پر دلالت کررہے ہیں جو خشک درخت سے تازہ پھل' خشک وادی سے پانی جاری کرسکتا ہے۔ وہ بغیر مرد کے بچہ بھی دے سکتا ہے۔ اللہ تعالیٰ سب پر قادر ہے۔

سوال: ''فَاِمَّا تَرَيِنَّ مِنَ الْبَشَرِ اَحَدًا فَقُوْلِيْٓ اِنِّيْ نَذَرْتُ لِلرَّحْمٰنِ صَوْمًا فَلَنْ اُكَلِّمَ الْيَوْمَ اِنْسِيًّا'' (پس اے مریم! اگر تو اس کے بعد کسی آدمی کو دیکھے تو کچھ نہ بولنا (بلکہ) یہ کہہ دینا۔ کہ میں نے رحمٰن کے واسطے روزہ کی نذر کی ہے۔ سو اس وجہ سے میں آج کسی آدمی سے بات نہیں کروں گی)۔

حضرت جبریل علیہ السلام نے حضرت مریم علیہا السلام کو نہ بولنے کی نذر کی حالت میں ''فَقُوْلِيْٓ'' (کہہ دو) کہہ کر بولنے کا حکم کیوں دیا؟۔

جواب: جبریلؑ نے اس قول کا حکم اس لئے دیا۔ کہ یہ ان کی نذر تمام نذر ہے اس لئے کہ حضرت مریمؑ کو مطلق سکوت کی نذر ماننے کا حکم نہیں دیا گیا تھا کہ جسمیں زبان ہلے ہی نہ۔ حتی کہ ذکر، تسبیح، دعاء وغیرہ تک نہ ہو۔ بلکہ صرف کسی انسان سے بات چیت نہ کرنے کی نذر تھی۔ جب نذر کی تکمیل سے اس قول "فَلَنْ اُكَلِّمَ الْيَوْمَ اِنْسِيًّا" سے ہوئی تو اس کے بعد کسی انسان سے بات نہ کرنے کی نذر شروع ہوئی۔

سوال: "قَالُوْا كَيْفَ نُكَلِّمُ مَنْ كَانَ فِي الْمَهْدِ صَبِيًّا" (وہ لوگ بولے کہ ہم اس بچہ سے کیسے بات کریں جو ابھی ماں کی گود میں بچہ ہے) اللہ تعالیٰ نے کیسے فرمایا "ماں کی گود میں بچہ ہے" ہر ایک گود میں بچہ ہی ہوتا ہے؟۔

جواب: لفظ "کان" یہاں زائد ہے۔ اور "صبیا" حال ہونے کی وجہ سے حال واقع ہے، خبر ہونے کی وجہ سے نہیں۔ تقدیر عبارت اس طرح ہے۔ "کیف نکلم من فی المھد فی حال صباہ" اور بعض نے کہا: یہاں "كَانَ" وَقَعَ اور وَجَدَ کے معنی میں ہے اور "صَبِيًّا" حال ہے۔

سوال: خطاب تکلیف (مامورات کا حکم، منہیات سے منع) تمام شرائع میں بالغ ہونے کے بعد یا کم از کم مامورات کی بجا آوری پر قدرت اور سمجھ بوجھ کے بعد ہوتا ہے جبکہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام گود میں دودھ پیتے ہیں ان کو نماز اور زکوۃ کا حکم کیسے دیا گیا جس کا تذکرہ فرماتے ہیں: "وَاَوْصٰنِيْ بِالصَّلٰوةِ وَالزَّكٰوةِ مَا دُمْتُ حَيًّا" (اور تاکید کی گئی مجھ کو نماز کی اور زکوۃ کی جب تک میں جیتا رہوں)۔

جواب: بلوغ تک خطاب کو مؤخر کرنا حصولِ عقل کے بعد حکم دینے کے لئے ہے جبکہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام پہلے ہی اس صفت سے متصف ہیں۔ تو ان کو حکم ہوا کہ ان افعال پر اگر قادر ہیں تو ان کو بجالائیں۔ بعض لوگوں نے کہا: یہی وجہ ہے کہ ان کو نبوت بچپن میں ملی۔

سوال: زکوۃ تو اغنیاء پر واجب ہے۔ جب کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام جب تک زمین میں رہے ہیں فقیر (بے مال) رہے ہیں۔ اور ان کی یہ حالت اللہ تعالیٰ کو معلوم تھی۔ اس کے باوجود زکوۃ دینے کا حکم انہیں کیوں دیا گیا؟۔

جواب: یہاں زکوۃ سے مراد زکوۃ مال نہیں ہے۔ بلکہ تزکیۂ نفس مراد ہے۔

سوال: "وَالسَّلٰمُ عَلَيَّ يَوْمَ وُلِدْتُّ وَيَوْمَ اَمُوْتُ وَيَوْمَ اُبْعَثُ حَيًّا" (سلامتی ہے مجھ پر جس دن میں پیدا ہوا اور جس دن میں مروں گا اور جس دن میں قبر سے زندہ اٹھایا جاؤں گا)۔ کیا وجہ ہے لفظ "سلام" حضرت یحییٰ علیہ السلام کے قصے میں نکرہ اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے قصے میں

معرفہ لایا گیا ہے؟۔

جوابِ اوّل: بقول بعض ان جیسے الفاظ میں معرفہ اور نکرہ برابر ہوتے ہیں ان میں کوئی فرق نہیں ہوتا۔

جوابِ ثانی: حضرت یحییٰ علیہ السلام کے قصے میں چونکہ پہلے لفظ ''سلام'' کا تذکرہ آیا بطور نکرہ کے تھا۔ اس لئے دوبارہ معرفہ لایا گیا۔ جو اصول اور قاعدہ ہے۔ جیسا کہ اس آیت میں ہے:''کَمَآ اَرۡسَلۡنَآ اِلٰی فِرۡعَوۡنَ رَسُوۡلًا فَعَصٰی فِرۡعَوۡنُ الرَّسُوۡلَ'' دیکھیئے اس آیت میں بھی دوسرا ''لفظ رسول معرفہ آیا ہے۔

سوال: لفظ اسلام میں الف لام عہدی کیسے ہے حالانکہ پہلا سلام یحییٰ پر ہے اللہ تعالیٰ کی طرف سے اور دوسرا سلام عیسیٰ پر ہے خود انکی اپنی طرف سے؟۔

جواب: لفظ ''اَلسَّلٰمُ'' کا معرفہ ہونا ماہیت سلام کے اعتبار سے ہے۔ نہ کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے وارد ہونے کے اعتبار سے۔

سوال: ''وَاذۡکُرۡ فِی الۡکِتٰبِ اِبۡرٰهِیۡمَ'' (اور یاد کرو ابراہیم کو کتاب میں) اور اس جیسی دوسری آیات جیسے ''وَاذۡکُرۡ فِی الۡکِتٰبِ اِدۡرِیۡسَ'' (اور یاد کرو ادریس کو کتاب میں) وغیرہ کا کیا مطلب ہے یہ لفظ اس وقت استعمال ہوسکتا ہے کہ جس وقت ''مامور'' جس کو حکم دیا جاتا ہے) ذکر کرنے اور نہ کرنے میں مختار ہو جیسے کسی کا ساتھی وغیرہ خط یا کتاب لکھ رہا ہو تو اس کو کہا جاتا ہے۔ کتاب میں میرا بھی تذکرہ کرو یا فلان کا تذکرہ کرو۔ جبکہ رسول اللہ ﷺ اس میں کمی زیادتی کرنے میں مختار نہیں۔ تو پھر ان کو ''وَاذۡکُرۡ فِی الۡکِتٰبِ اِبۡرٰهِیۡمَ'' کیسے فرمایا گیا؟۔

جواب: امر کو پہنچانے میں تاکید کے لئے فرمایا گیا ہے۔

سوال: ''سَاَسۡتَغۡفِرُ لَکَ رَبِّیۡ'' (میں عنقریب آپ کے لئے اپنے رب سے مغفرت طلب کروں گا)۔ حضرت ابراہیمؑ نے اپنے والد سے کیسے وعدہ فرمایا کہ میں آپ کے لئے مغفرت طلب کروں گا؟ جب کہ کافر کے لئے استغفار جائز نہیں ہے۔

جوابِ اوّل: اس کا مطلب یہ ہے کہ میں اللہ تعالیٰ سے آپ کے لئے توبہ کرنے کی توفیق طلب کروں گا اور توبہ سے تجھے مغفرت ملے گی۔ اور اس طرح استغفار کافر کے لئے جائز ہے۔ مثلاً یہ دعا کرنا ''اے اللہ اس کو مسلمان ہونے کی توفیق عطا فرما۔ یا اس کی توبہ قبول فرما۔ یا اے اللہ اس کو ہدایت نصیب فرما وغیرہ۔

جوابِ ثانی: حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنے والد سے مغفرت کی دعا شرطِ اسلام پر کی۔

یعنی وہ جب اسلام لائے گا تو اس کے لئے اللہ تعالیٰ سے طلب مغفرت فرمائیں گے۔

جوابِ ثالث: حضرت ابراہیم علیہ السلام نے یہ وعدہ کافر کے لئے استغفار کے ناجائز ہونے سے پہلے کیا تھا۔ نفس استغفار عقلاً ناجائز نہیں ہے۔ البتہ شریعت کے رُو سے ناجائز ہے۔

سوال: ''وَنَادَيْنٰهُ مِنْ جَانِبِ الطُّوْرِ الْاَيْمَنِ'' (اور پکارا ہم نے اس کو دائیں طرف طور پہاڑ کے) ''طور'' ایک پہاڑ ہے۔ اس کا دایاں ہاتھ اور بایاں ہاتھ نہیں ہوتا تو اللہ تعالیٰ نے ''من جانب الطور الایمن'' کیسے فرمایا؟۔

جواب: اہلِ عرب کے استعمال کے مطابق خطاب کیا۔ اہلِ عرب کہتے ہیں ''عن يمين القبلة عن شمال القبلة'' حالانکہ قبلے کے بھی دایاں یا بایاں ہاتھ نہیں ہوتا۔ اگر کلام میں التباس واقع نہ ہو رہا ہو تو ایسا کہتے ہیں۔ اور یہاں دایاں سے مراد حضرت موسیٰ علیہ السلام کا دایاں پہلو ہے۔ یعنی حضرت موسیٰ کے دائیں پہلو کے جانب والا کوہِ طور کا حصہ۔ اس لئے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے اسی جانب سے آواز آئی تھی مذکورہ اشکال ''ایمن'' کو یمین کے معنی میں لینے کی صورت میں وارد ہوتا ہے۔ اگر ایمن'' یمن (برکت) سے ہو تو کوئی اشکال نہیں۔ کیونکہ اس وقت معنی ہوگا ''طور مبارک کی جانب''۔

سوال: ''وَوَهَبْنَا لَهٗ مِنْ رَّحْمَتِنَاۤ اَخَاهُ هٰرُوْنَ نَبِيًّا'' (اور ہم نے اپنی رحمت اور مہربانی سے انہیں ان کے بھائی ہارون کو نبی بنا کر عطا کیا)۔ حضرت ہارون علیہ السلام حضرت موسیٰ علیہ السلام سے بڑے تھے۔ تو ہم نے موسیٰؑ کو ہارونؑ عطا کیا کا کیا مطلب ہے؟۔

جواب: مطلب یہ ہے: کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی یہ دعاء: ''وَاجْعَلْ لِّيْ وَزِيْرًا مِّنْ اَهْلِيْ هٰرُوْنَ اَخِي'' (اور میرے واسطے میرے کنبے میں سے ایک معاون مقرر کر دیجئے یعنی ہارون کو) قبول فرما کر انعام فرمایا: ''سَنَشُدُّ عَضُدَكَ بِاَخِيْكَ'' (ہم تیرے بھائی کے ذریعے تیرے بازو مضبوط کریں گے)۔ اسی کو ہبہ سے تعبیر فرمایا۔

سوال: ''اِذَا تُتْلٰى عَلَيْهِمْ اٰيٰتُ الرَّحْمٰنِ خَرُّوْا سُجَّدًا وَّبُكِيًّا'' (جب ان پر رحمٰن کی ایتیں پڑھی جاتی تھیں تو اور وہ روتے ہوئے زمین پر گر جاتے تھے) یہ آیت انبیاء کرام علیہم السلام کے متعلق ہے اور اٰيٰتُ الرَّحْمٰنِ سے مراد قرآن ہے۔ اور انبیاء سابقین علیہم السلام پر قرآن کی آیات تو نہیں پڑھی جاتی تھیں؟۔

جواب: اٰيٰتُ الرَّحْمٰنِ قرآن کے ساتھ مخصوص نہیں ہیں بلکہ ہر وہ کتاب جس کو اللہ تعالیٰ نے نازل فرمایا۔ اس میں آیات ہیں۔

سوال: ''فَخَلَفَ مِنْ م بَعْدِهِمْ خَلْفٌ اَضَاعُوا الصَّلٰوۃَ وَاتَّبَعُوا الشَّهَوَاتِ فَسَوْفَ يَلْقَوْنَ غَيًّا اِلَّا مَنْ تَابَ وَاٰمَنَ '' (پھران (اہل سعادت) کے بعد بعض کچھ ایسے ناخلف پیدا ہوئے جنہوں نے نماز کو ضائع کر دیا اور نفسی خواہشوں کے پیچھے لگ گئے سو یہ لوگ عنقریب بدی اور خسارے میں مبتلا ہوں گے مگر جس نے توبہ کر لی اور ایمان لے آیا)۔

یہ آیت نماز کو ترک کرنے اور ضائع کرنے والے کے کافر ہونے پر دلالت کرتی ہے۔ کیوں کہ اس سے توبہ کے لئے ایمان کو شرط قرار دیا گیا ہے؟

جواب: حضرت عبداللہ بن عباسؓ فرماتے ہیں یہاں ان ناخلف سے مراد یہود ہیں جنہوں نے فرض نماز کو ترک کر دیا اور شراب پینے کے لئے اور علاتی بہن کے ساتھ نکاح کو حلال سمجھا۔

سوال: اللہ تعالیٰ نے: ''اِنَّهٗ كَانَ وَعْدُهٗ مَاْتِيًّا'' (بے شک ہے اس کے وعدہ پر پہنچنا) کیسے فرمایا؟ ''وعدا اتیا'' ''وَلَاتٍ'' نہیں فرمایا کیوں؟

جوابِ اوّل: یہاں وعدہ سے مراد جنت ہے۔ یہ آنے کی جگہ ہے۔ جہاں اللہ تعالیٰ کے اولیاء آئیں گے۔

جوابِ ثانی: یہاں ''ماتیا'' اسم مفعول ''اتیا'' کے معنی میں ہے۔ جیسا کہ آیت ''حِجَابًا مَّسْتُوْرًا'' میں مستورا ساترا کے معنی میں ہے۔

سوال: ''تِلْكَ الْجَنَّةُ الَّتِيْ نُوْرِثُ مِنْ عِبَادِنَا مَنْ كَانَ تَقِيًّا'' (وہ بہشت ہے جو میراث دیں گے ہم اپنے بندوں میں جو کوئی ہوگا پرہیزگار) اور آیت ''وَجَنَّةٍ عَرْضُهَا السَّمٰوٰتُ وَالْاَرْضُ اُعِدَّتْ لِلْمُتَّقِيْنَ'' (اور وہ جنت جس کی چوڑائی آسمان و زمین ہیں تیار کی گئی ہے متقین کے لئے) وغیرہ آیات اپنے مفہوم کے اعتبار سے اس بات پر دلالت کر رہی ہیں کہ غیر متقین جنت میں داخل نہیں ہوں گے؟

جواب: یہاں تقوی سے مراد شرک سے اجتناب ہے۔ اور شرک سے اجتناب میں تمام مؤمنین' متقین ہوں یا غیر متقین سبھی برابر ہیں۔

سوال: ''تَكَادُ السَّمٰوٰتُ يَتَفَطَّرْنَ مِنْهُ وَتَنْشَقُّ الْاَرْضُ وَتَخِرُّ الْجِبَالُ هَدًّا اَنْ دَعَوْا لِلرَّحْمٰنِ وَلَدًا'' (قریب ہے آسمان پھٹ پڑے۔ اور زمین پھٹ جائے۔ پہاڑ ریزہ ریزہ ہو کر گر پڑیں۔ اس لئے کہ ان لوگوں نے رحمٰن کے لئے اولاد ٹھہرائی ہے)۔

کفار کے اللہ تعالیٰ کے لئے اولاد ٹھہرانے میں آسمان کے پھٹنے' زمین کے شق ہونے اور پہاڑوں کے گرنے کا کیا مطلب۔ یہ تو جمادات ہیں۔ اور ان پر اس کلمے کا اثر کیسے ہوگا؟

جواب اوّل: مطلب اس کا یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں۔ کہ ان لوگوں نے ایسی غلط بات کہی ہے کہ اگر میرا حلم اور میرا ان کو مہلت دینا نہ ہوتا تو قریب تھا کہ میں سزا کے طور پر آسمان اور پہاڑوں کو ان پر گراتا۔ زمین شق ہوتی اور یہ اس میں دھنس جاتے۔ جیسا کہ ایک دوسری آیت میں ہے: ''اِنَّ اللّٰہَ یُمسِکُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ اَنْ تَزُوْلَا''۔

سوال: شرک کے بارے اللہ تعالیٰ نے کیسے فرمایا کہ: ''تَکَادُ السموٰتُ یَتَفَطَّرْنَ مِنْهُ وَتَنْشَقُّ الْاَرْضُ وَتَخِرُّ الْجِبَالُ هَدًّا'' یہ تو کلمہ کفر کی قوت اور اس کی شدت پر دلالت کرتا ہے۔ اور سورۃ ابراہیم میں شرک کے متعلق یوں فرمایا ہے: ''وَمَثَلُ کَلِمَةٍ خَبِیْثَةٍ کَشَجَرَةٍ خَبِیْثَةِ نِ اجْتُثَّتْ مِنْ فَوْقِ الْاَرْضِ مَا لَهَا مِنْ قَرَارٍ'' (کلمہ خبیثہ کی مثال شجر خبیثہ کی طرح ہے جو زمین کے اوپر سے اکھاڑ دیا گیا ہو اس کے لئے کوئی قرار نہیں ہے)

کلمۂ خبیثہ سے مراد کلمہ شرک ہے حضرت ابن عباسؓ بھی یہی فرماتے ہیں۔ اور شجرہ خبیثہ سے مراد درخت حنظل ہے۔ یہ آپ ﷺ نے فرمایا: یہ آیت کلمۂ شرک کے ضعیف اور کمزور ہونے پر دلالت کرتی ہے۔ لہٰذا ان دو آیتوں میں تعارض واقع ہوا؟

جواب: سورۃ ابراہیم میں کلمۂ شرک کے ضعف کو اور یہاں اس کے قبح اور برائی کو بیان کیا گیا۔ کہ یہ انتہائی کمزور اور انتہائی قبیح ہے۔ یہاں اس کے قبیح وشناعت کی انتہا کو بیان کیا گیا ہے۔ لہٰذا کوئی تعارض نہیں ہے۔

سوال: اللہ تعالیٰ نے کیسے فرمایا: ''لَقَدْ اَحْصَاهُمْ وَعَدَّهُمْ عَدًّا''۔ (ان نے سب کو احاطہ کر رکھا ہے اور سب کو شمار کر رکھا ہے) حالانکہ الاحصا اور العد دونوں شمار کرنے کے معنی میں۔ مترادف ہیں تکرار لازم آئے گا۔ اور بقول بعض مفسرین لفظ ''العد'' حصر کے معنی میں ہے جیسا کہ آیت: ''وان تَعُدُّوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ لَا تُحْصُوْهَا'' (اگر تم اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کو شمار کرنا چاہو تو شمار کر کے ختم نہیں کر سکتے) سے واضح ہے۔ لہٰذا اگر ''عد'' کا معنی احصاء (شمار کرنا) ہے تو تکرار لازم آتا ہے۔ اور اگر حصر کے معنی میں لیں تو ''احصاء'' کے بعد اس کو ذکر کرنے کی ضرورت ہی نہیں ہے؟

جواب: لفظ ''احصاء'' علم کے معنی میں بھی استعمال ہوا ہے۔ جیسا کہ آیت: ''وَاَحْصٰی کُلَّ شَیْءٍ عَدَدًا'' میں علم ہی کے معنی میں استعمال ہوا ہے کسی شاعر کا شعر ہے:

وکن للذی لم تحصه متعلّما ☆ واما الذی احصیت منه فعلِمْ''

(جس چیز کا علم تجھے نہیں ہے اس کا علم حاصل کر اور جو علم حاصل کیا ہے اس کو آگے پڑھا)۔ تو یہاں اوپر آیت ''لقد احصاهم'' میں احصاء علم کے معنی میں ہے۔

تو "احصاھم" کا معنی عَلِمَھُمْ ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ ان کے افعال واقوال اور ان کی ذات صفات وعدد کے متعلق جانتے ہیں۔ لہٰذا کوئی تکرار یا بے ضرورت کلام واقع نہیں ہوا۔

# سورۃ طٰہٰ

سوال: "هَلْ اَتٰکَ حَدِیْثُ مُوْسٰی اِذْ رَاٰی نَارًا" اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے کوہ طور میں آگ دیکھنے کا واقعہ سورۃ "طٰہٰ" سورۃ "النمل" اور سورۃ "قصص" میں ذکر فرمایا ہے مگر تینوں جگہ مختلف الفاظ وعنوان سے بیان فرمایا۔ حالانکہ واقعہ ایک ہی ہے؟۔

جواب: سورۃ اعراف میں حضرت موسیٰؑ کے قصے کے تحت یہ سوال اور اس کا جواب مذکور ہے وہاں دیکھا جائے۔

سوال: "فَلَا یَصُدَّنَّکَ عَنْهَا مَنْ لَّا یُؤْمِنُ بِهَا" (مبادا تم کو (قیامت کی تصدیق سے یا اس کے فکر سے) وہ شخص باز نہ رکھے جو آخرت پر ایمان نہیں رکھتا) ظاہر آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ قیامت پر ایمان نہ لانے والے شخص کو موسیٰؑ کے ایمان میں رکاوٹ بننے سے روکا جا رہا ہے۔ حالانکہ آیت کا مقصود ہے موسیٰ علیہ السلام کو تکذیب سے روکنا؟

جواب: آیت کا مطلب یہ ہے کہ دین میں ایسے مضبوط اور پختہ ہو جایئے کہ کسی بے ایمان کو آپ کے ایمان بالقیامت کے متعلق کمزوری کا تصور تک نہ ہو۔ چہ جائیکہ آپ کو ایمان سے ہٹائے۔

سوال: "مَا تِلْکَ بِیَمِیْنِکَ یٰمُوْسٰی" (موسیٰ) تمہارے داہنے ہاتھ میں کیا ہے؟) اللہ تعالیٰ کو معلوم تھا کہ ان کے ہاتھ میں کیا ہے۔ پھر پوچھنے کا کیا فائدہ؟

جوابِ اوّل: اس سوال کا فائدہ ہے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو تسلی دینا۔ اور اللہ تعالیٰ کے ساتھ ہم کلام ہوتے وقت اللہ تعالیٰ کی ہیبت اور دہشت' جو ان پر طاری ہوئی تھی اس میں کمی کرنا۔ جیسا کہ ہم میں سے کوئی اگر کسی بچے کو ہیبت زدہ دیکھے اور بچے کے ہاتھ میں پھل یا اور کوئی چیز موجود ہو تو اس کے ساتھ ملاطفت اور موانست کے۔ لئے پوچھتا ہے کہ تیرے ہاتھ میں یہ کیا ہے؟ اسی طرح اللہ تعالیٰ نے بھی ملاطفت اور موانست کے لئے پوچھا۔

جوابِ ثانی: اللہ تعالیٰ نے چاہا کہ موسیٰؑ اپنی زبان سے اقرار کریں کہ یہ لکڑی سے بنی ہوئی بے جان چھڑی ہے اور اس کا بے جان ہونا ان کے دل میں پختہ ہو جائے۔ تاکہ جب یہ اژدھے کی صورت اختیار کرے تو قدرت الٰہی کے کمال کا مشاہدہ ہو۔ اور دل میں یہ وسوسہ تک نہ آئے کہ کہیں یہ پہلے سے جاندار تو نہیں تھی۔

سوال: اللہ تعالیٰ نے صرف یہ پوچھا تھا: "وَمَا تِلْکَ بِیَمِیْنِکَ یٰمُوْسٰی" اس کا جواب تھا صرف (ھِیَ عَصَایَ) مگر موسیٰ نے مزید فرمایا: "اَتَوَکَّؤُا عَلَیْھَا وَاَھُشُّ بِھَا عَلٰی غَنَمِیْ وَلِیَ فِیْھَا مَاٰرِبُ اُخْرٰی" (اس پر سہارا لگاتا ہوں اور اس سے اپنی بکریوں پر پتے جھاڑتا ہوں اور اس میں میرے اور بھی کام ہیں) اصل جواب پر زیادتی بلغاء کا کام نہیں۔ خصوصا ملک الاعلیٰ۔ بادشاہوں کے بادشاہ کے ساتھ ہمکلامی میں زائد بات تو بالکل نہیں کی جاتی۔ تو حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ایسا کیوں کیا؟۔

جوابِ اوّل: حضرت عبداللہ بن عباسؓ فرماتے ہیں: جب موسیٰ علیہ السلام نے "ھی عصای" (یہ میری چھڑی ہے) فرمایا تو سوال کیا گیا "ماتصنع بھا" (آپ اس سے کیا کرتے ہیں) تو جواب میں وہ باقی الفاظ بیان کیے۔

جوابِ ثانی: اس کے مزید فوائد اس لئے گنے کہ کہیں اس کو پھینک دینے کا حکم نہ دیا جائے جیسا کہ "فَاخْلَعْ نَعْلَیْکَ" فرما کر جوتے اتارنے کا حکم ہوا۔

جوابِ ثالث: اس لئے بھی لاٹھی کے مزید فوائد شمار کیے کہ ان کو فضول لاٹھی اٹھانے کی طرف منسوب نہ کیا جائے۔

سوال: اس لاٹھی کے بارے میں یہ بھی آیا ہے کہ وہ رات کے وقت روشن ہوتی تھی کیڑے مکوڑوں اور نقصان دہ چیزوں کو ھٹاتی اور دور کرتی تھی اگر پھل کھانے کی خواہش ہوتی تو اس کو زمین میں گاڑ دیتے تو اسی وقت ان کی خواہش کے مطابق پھل دیتی۔ اور پانی کی ضرورت پر زمین سے پانی نکالتی۔ اور کنویں سے پانی نکالنے کا بھی کام دیتی۔ کنواں اگر گہرا ہوتو اس کی گہرائی کے مطابق طویل ہوتی۔ مگر موسیٰ علیہ السلام نے یہ تمام فوائد نہیں گنے کیوں؟

جوابِ اوّل: اوّل کلام کو طویل کر کے کلام اللہ میں حائل نہیں ہونا چاہتے تھے۔ چنانچہ بعض کو بیان کر کے بعض فوائد کو: "وَلِیَ فِیْھَا مَاٰرِبُ اُخْرٰی" فرما کر اجمال سے کام لیا۔

جوابِ ثانی: جن منافع کو ذکر کیا ان کی ضرورت زیادہ تھی۔ اس لئے بیان کیا۔

سوال: اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی لاٹھی کے متعلق الحیۃ الثعبان اور الجان فرمایا ہے۔ حالانکہ ثعبان اور جان میں فرق ہے۔ اس لئے کہ جان چھوٹے سانپ کو اور ثعبان بہت بڑے سانپ کو کہتے ہیں۔

جوابِ اوّل: صورۃً وہ بڑے سانپ کیطرح اور حرکت اور تیزی میں چھوٹے سانپ کی طرح سریع الحرکت تھی۔ اس لئے کسی جگہ ثعبان اور کسی جگہ جان سے تعبیر فرمایا۔ اور "فَلَمَّا رَاٰھَا کَاَنَّھَا

ثعبان'' سے بھی اس جواب کی تائید ہوتی ہے۔
جوابِ ثانی: لاٹھی سانپ میں تبدیل ہو کر چھوٹے سانپ کی صورت اختیار کرتی تھی پھر بڑھتے بڑھتے بڑے سانپ کی صورت میں ہو جاتی تھی۔ آیت میں جان کہہ کر پہلی حالت اور ثعبان کہہ کر دوسری حالت کو بیان کیا گیا۔
سوال: ''اِذْ اَوْحَیْنَآ اِلٰی اُمِّکَ مَا یُوْحٰی'' (جبکہ ہم نے تیری ماں کی طرف وحی بھیجی تھی) اس آیت میں جو وحی آئی اس کا بیان نہیں ہے تو پھر ''مَا یُوْحٰی'' کہنے کا کیا فائدہ؟۔
جوابِ اوّل: مایوحیٰ سے یہ بتانا مقصود ہے۔ کہ عورتوں کے پاس تمام امور کی وحی نہیں آتی۔ بلکہ بعض باتوں کی وحی آتی ہے۔
جوابِ ثانی: ''مَا یُوْحٰی'' تاکید کے لئے ہے جس طرح ''فَغَشِیَهَا مَا غَشٰی'' میں ما غشیٰ تاکید کے لئے ہے۔ گویا وہاں فرمایا گیا ''اِذْ اَوْحَیْنَآ اِلٰی اُمِّکَ ایحاء''۔
جوابِ ثالث: تفخیم و تعظیم کی غرض سے پہلے اس کو مبہم رکھا پھر اس کی توضیح و تبیین: ''اَنِ اقْذِفِیْهِ الخ'' سے کی۔
سوال: ''فَاُلْقِیَ السَّحَرَةُ سُجَّدًا قَالُوْٓا اٰمَنَّا بِرَبِّ هٰرُوْنَ وَ مُوْسٰی'' (پھر گر پڑے جادوگر سجدہ میں بولے ہم یقین لائے رب پر ہارون اور موسیٰ کے) میں ہارون علیہ السلام کا ذکر موسیٰ علیہ السلام سے پہلے کیوں کیا گیا جب کہ حضرت ہارون علیہ السلام حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ وزیر و معاون کے طور پر تھے اور ان کے تابع تھے۔ جیسا کہ ارشادِ باری ہے: ''وَجَعَلْنَا مَعَهٗ اَخَاهُ هٰرُوْنَ وَزِیْرًا''۔
جواب: ہارونؑ کو مقدم اس لئے بیان کیا تا کہ موسیٰؑ آیت کے آخر میں آئیں۔ اور آیات کے اواخر ہم وزن ہوں۔ آیات کے فواصل کے تناسب کو برقرار رکھنے کے لئے موسیٰؑ کو مؤخر کیا گیا۔
سوال: اللہ تعالیٰ نے ''لَا یَمُوْتُ فِیْهَا وَلَا یَحْیٰی'' (وہاں نہ مریگا نہ زندہ ہوگا) موت وحیات انسان کی صفات میں سے ہیں اور یہ دونوں ایک دوسرے کی نقیض ہیں پھر انسان سے دونوں کیسے مرتفع ہو سکتی ہیں؟
جوابِ اوّل: مطلب یہ ہے کہ ایسی موت واقع نہیں ہوگی جس سے عذاب سے چھٹکارہ ملے۔ اور نہ ایسی حیات ہوگی جو باعث تلذذ اور نفع مند ہو۔
جوابِ ثانی: مطلب یہ ہے کہ ایسی موت نہیں آئے گی جو مسلسل رہے۔ بلکہ عذاب کی شدت سے مرتے ہی پھر زندہ ہوگا۔ پھر مریگا پھر زندہ ہوگا نہ مکمل مریگا نہ مکمل زندگی گذاریگا۔ دنیاوی روز

کے مطابق روزانہ ستر مرتبہ مریگا اور ستر مرتبہ زندہ ہوگا۔
سوال: خوف وخشیت ہم معنی ہیں تو اللہ تعالیٰ نے کیسے فرمایا: ''لَا تَخَافُ دَرَكًا وَّلَا تَخْشٰى ''
جواب: لَا تَخَافُ دَرَكًا کا معنی ہے کہ فرعون کے قبضے میں آنے کا خوف نہ ہو اور لَا تَخْشٰى کا معنی ہے دریا میں غرق ہونے کی خشیت نہ ہو۔
سوال: ''وَاَضَلَّ فِرْعَوْنُ قَوْمَهٗ وَمَا هَدٰى'' (اور فرعون نے اپنی قوم کو بے راہ کیا) کے بعد ''وما ہدٰی'' لانے کا کیا فائدہ۔ گمراہ کرنا' راہ راست پر نہ لگانا دونوں ایک ہی ہیں؟۔
جوابِ اوّل: یعنی گمراہ کرنے کے بعد دوبارہ راہ راست پر نہیں لگایا۔ اس لئے کہ بعض دفع راہِ راست سے ہٹانے والا بھی دوبارہ سیدھے راستے لگا دیتا ہے۔
جوابِ ثانی: اپنی قوم کو گمراہ تو کیا مگر خود بھی راہِ راست پر نہ چلا۔
جوابِ ثالث: فرعون نے اپنی قوم کو دین حق قبول کرنے سے ہٹا کر غرق کیا۔ دریا میں راستہ دیکر انہیں نکال نہ سکا۔
سوال: بنی اسرائیل کو اللہ تعالیٰ نے کیسے فرمایا: ''يٰبَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ قَدْ اَنْجَيْنٰكُمْ مِّنْ عَدُوِّكُمْ وَوٰعَدْنٰكُمْ جَانِبَ الطُّوْرِ الْاَيْمَنَ'' (اے بنی اسرائیل ہم نے تم کو تمہارے دشمن سے نجات دی اور ہم نے تم سے کوہ طور کی داہنی جانب آنے کا وعدہ کیا) حالانکہ بنی اسرائیل سے کوئی وعدہ نہیں کیا گیا تھا وعدہ تو حضرت موسیٰ علیہ السلام سے کیا گیا تھا کہ آپ کو تورات ملے گی' تو آیت میں ''واعدنا کُم'' کہہ کر بنی اسرائیل کو کیوں خطاب کیا گیا؟۔
جواب: ٹھیک ہے خطاب تو حضرت موسیٰ علیہ السلام کو تھا۔ لیکن اس کتاب (توراۃ) میں بنی اسرائیل کے لئے احکامات' ان کی شریعت اور معاش کی درستگی وغیرہ کے احکامات تھے۔ اس وجہ سے مواعدہ (وعدہ کرنے کو) ان کی طرف منسوب کیا گیا۔
سوال: ''وَمَآ اَعْجَلَكَ عَنْ قَوْمِكَ يٰمُوْسٰى قَالَ هُمْ اُولَآءِ عَلٰٓى اَثَرِيْ'' (اور کیوں جلدی کی تو نے اپنی قوم سے اے موسیٰ کہا وہ یہ ہیں میرے پیچھے)۔
یہ سوال کا سبب دریافت کرنے کے لئے ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ نے جب حضرت موسیٰ علیہ السلام پر طور کی جانب توراۃ نازل کرنے کا وعدہ فرمایا اور موسیٰ علیہ السلام نے وقت مقررہ پر جانے کا ارادہ فرمایا' اور اپنے ساتھ اپنی قوم کے ستر افراد کو لیکر اس مقام کی طرف چل پڑے۔ تو حضرت موسیٰ علیہ السلام قوم سے پہلے وہاں پہنچ گئے۔ تو قوم کو پیچھے چھوڑ کر جلدی آنے پر انہیں عتاب کیا گیا۔ اور جلدی میں آنے کا سبب پوچھا گیا تو جواب میں فرمایا ''هُمْ اُولَآءِ علی اثری'' (وہ میرے

پیچھے آرہے ہیں) موافق سوال یہ جواب نہیں تھا سوال کے موافق جواب یہ تھا۔ یا اللہ تیری رضا کی زیادہ طلب اور تیسری لقاء کے شوق اور تیرے وعدہ میں جلدی آیا ہوں لیکن موسی علیہ السلام نے اس جواب کو بعد میں اور ''ھم اولاء علی اثری'' کو پہلے کیوں بیان کیا؟۔

جواب: اس سوال میں دو باتیں تھیں۔ ایک قوم کو پیچھے چھوڑ کر جلدی آنے کو ناپسند کرنا دوسرا اس کا سبب حضرت موسی علیہ السلام نے پہلے جلدی آنے میں عذر خواہی کرتے ہوئے فرمایا: وہ مجھ سے کوئی زیادہ دور نہیں ہیں۔ بلکہ میرے پیچھے ہی آرہے ہیں پھر جلدی آنے کی وجہ یوں بیان فرمائی ''وَعَجِلْتُ اِلَیْکَ رَبِّ لِتَرْضٰی'' (میں جلدی اس لئے آیا کہ تا کہ تو راضی ہو۔

سوال: ''لَا تَرٰی فِیْهَا عِوَجًا وَّلَا اَمْتًا'' (اے دیکھنے والے تو ان پہاڑوں میں نہ کوئی کجی دیکھے گا اور نہ کوئی اونچائی) سوال یہ ہے کہ لفظ ''عِوَج'' (عین کے کسرہ کے ساتھ) باتوں یا عمل وغیرہ میں کجی کے لئے استعمال ہوتا ہے۔ کسی ٹھوس چیز اور لاٹھی وغیرہ کی کجی کو بیان کرنے کے لئے ''عوج'' (عین کے فتح کے ساتھ) ہوتا ہے۔ یعنی پہاڑ' زمین وغیرہ کی کجی کو بیان کرنے کے لئے عوج (عین کے زبر کے ساتھ) استعمال ہوتا۔ مگر قرآن میں پہاڑ کے لئے عین عوج (عین کے کسرہ کے ساتھ) استعمال ہوا ہے کیوں؟۔

جوابِ اوّل: ابن سکیتؒ نے کہا کھڑی کی جانے والی چیز میں کجی کو عَوج (بالفتح العین) اور زمین میں پڑی ہوئی چیز یا دینی اور عملی چیز میں کجی کے لئے عِوج (بکسر العین) استعمال ہوتا ہے۔

جوابِ ثانی: اس سے الاعوجاج (ٹیڑھے پن) کی نفی کی گئی ہے کہ ماہر انجینئرؔ ہی اس کا ادراک کر سکتا ہے۔ یعنی ذرہ برابر بھی ٹیڑھا پن نہیں ہے اور اس اعوجاج کے لئے عِوَج استعمال ہوتا ہے یہ ہو سکتا ہے کہ مثلاً ایک آدمی نے صاحب بصیرت لوگوں کو لیکر ایک زمین کو اپنے اندازے کے مطابق برابر کیا۔ اور سب نے دیکھ کر اس کے برابر ہونے کا کہا۔ پھر انجینئرؔ کو حکم دیا گیا کہ وہ زمین ناپنے کے آلہ کے ذریعے اسے ناپے۔ اس نے ناپا اور بعض جگہ ٹیڑھی نکلی۔ مگر بظاہر کوئی کجی نہیں تھی۔ تو آیت میں ''لا عوج'' کہہ کر اس غیر مرئی کجی کی نفی کی گئی۔ اور وہ کجی انتہائی قلیل ہونے کی وجہ سے غیر محسوس ہے۔ اور غیر محسوس کے لئے عِوَج استعمال ہوتا ہے۔

سوال: اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام کے متعلق فرمایا: کہ ''وَلَقَدْ عَهِدْنَآ اِلٰٓی اٰدَمَ مِنْ قَبْلُ فَنَسِیَ'' ہم نے پہلے آدم سے عہد لیا۔ سو وہ بھول گئے) سوال یہ ہے کہ بھولنا عذر ہے۔ اور بھولنے کو اللہ تعالیٰ نے ''وَعَصٰٓی اٰدَمُ رَبَّهٗ فَغَوٰی'' کہہ کر عصیان سے کیوں تعبیر فرمایا اور جنت سے نکال کر بڑی سزا کیوں دی؟

جواب: یہاں "فَنَسِیَ" میں نسیان سے مراد بھولنا نہیں بلکہ ترک کرنا ہے۔ جیسا کہ آیت "اِنَّا نَسِیْنٰکُمْ" (ترکناکم) کے معنی میں ہے یہاں نسیان بھول کے معنی میں کیسے ہوسکتا ہے؟ کیوں کہ حضرت آدم علیہ السلام اور ابلیس کے درمیان اس درخت سے کھانے کے متعلق مجادلہ ومناظرہ رہا ہے۔ لہٰذا یہاں نسیان بھول کے معنی میں نہیں ہے۔

سوال: "فَلَا یُخْرِجَنَّکُمَا مِنَ الْجَنَّةِ فَتَشْقٰی" (سو نہ نکلوادے تم کو جنت سے پھر تو تکلیف میں پڑیگا) سوال یہ ہے۔ "یخرجنکما" کو تثنیہ اور "تشقٰی" کو مفرد کیوں لایا گیا؟ حالانکہ خطاب دونوں کو ہے اس رو سے "فَتَشْقَیَانِ" ہونا چاہیئے تھا؟۔

جوابِ اوّل: "فتشقی" کو تثنیہ نہ لانے کی کئی وجوہات ہوسکتی ہیں۔ ایک وجہ یہ ہوسکتی ہے کہ مرد اپنے اہل وعیال کا ذمہ دار اور قیم ہوتا ہے۔ تو اس کی مشقت تمام کی مشقت کو شامل ہے۔ جیسا کہ کسی گھر کے سربراہ سے دشمنی سارے گھر والوں سے دشمنی ہوتی ہے۔ تو یہاں کلام کو مختصر کرکے مشقت کو حضرت آدم علیہ السلام کی طرف منسوب کیا گیا جس میں حضرت حواء علیہا السلام خود بخود داخل ہوگئیں۔

جوابِ ثانی: اس مشقت سے طلب معاش کی مشقت مراد ہے جو مرد کی ذمہ داری ہے عورت کی نہیں چنانچہ حضرت سعید بن جبیرؒ فرماتے ہیں کہ حضرت آدم علیہ السلام کو آسمان سے سرخ رنگ کا ایک بیل عطاء کیا گیا تھا۔ جس سے وہ زمین پر کھیتی باڑی کرتے تھے۔ جب پیشانی پر پسینہ آتا تو ہاتھ سے صاف کرتے۔ اسی کو شقاوت سے تعبیر کیا۔

سوال: "وَمَنْ اَعْرَضَ عَنْ ذِکْرِیْ فَاِنَّ لَهٗ مَعِیْشَةً ضَنْکًا" (جس نے میری نصیحت سے منہ موڑا پس تحقیق اس کی زندگی تنگ ہوگی) یعنی جس نے میری نصیحت سے یا قرآن سے منہ موڑا اس پر ایمان لایا نہ اس کی اتباع کی تو اس کی زندگی تنگ ہوگی۔ جبکہ ہم دیکھتے ہیں ایمان اور قرآن سے اعراض کرنے والے لوگ مالی لحاظ سے مستحکم اور خوش عیشی کی زندگی گذارتے ہیں؟۔

جوابِ اوّل: حضرت عبداللہ بن عباسؓ فرماتے ہیں! "تنگ زندگی" سے مراد گناہ کی زندگی ہے اگرچہ مالی اعتبار سے مستحکم ہو اور نبی کریم ﷺ سے مروی ہے اس سے مراد عذابِ قبر ہے۔

جوابِ ثانی: اس سے مراد آخرت میں جہنم کی زندگی ہے۔

جوابِ ثالث: "مَعِیْشَةً ضَنْکًا" سے مراد دنیا اور اسبابِ دنیا پر شدید حریص ہونا ہے۔ یہ آیت سورۃ نحل کی آیت "مَنْ عَمِلَ صَالِحًا مِنْ ذَکَرٍ اَوْ اُنْثٰی وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَلَنُحْیِیَنَّهٗ حَیٰوةً طَیِّبَةً" کے مقابل ہے۔ چنانچہ وہاں سورۃ نحل کی اس آیت میں "حیاۃ طیبۃ" کی جو فضیلتیں ہم نے بیان

کی ہیں تو اُن کی ''مَعِیْشَۃً ضَنْکًا'' کی تفسیر ہے۔

سوال: ''وَلَوْلَا کَلِمَۃٌ سَبَقَتْ مِنْ رَّبِّکَ لَکَانَ لِزَامًا'' (اگر تیرے پروردگار کی طرف سے ایک بات پہلے طے نہ ہو چکی ہوتی تو عذاب الٰہی ان کو چمٹ جاتا) سوال یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے وہ کونسے کلمات گذرے ہیں جو لزوم عذاب کی راہ میں رکاوٹ نہیں؟

جواب: بعض علماء کے بقول اس سے مراد اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان ہے: ''سَبَقَتْ رَحْمَتِیْ غَضَبِیْ'' مگر اس پر اشکال ہوگا وہ یہ کہ ''کلمۃ'' اس کے ساتھ خاص نہیں ہے۔

بعض نے کہا: ''کلمۃ سبقت'' سے مراد نبی کریم ﷺ کو اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان ہے: ''وَمَا کَانَ اللّٰہُ لِیُعَذِّبَھُمْ وَاَنْتَ فِیْھِمْ'' (آپ کے ان کے درمیان موجودگی میں اللہ تعالیٰ ان کو عذاب نہیں دیں گے)۔

بعض نے کہا: اس سے مراد یہ فرمانِ الٰہی ہے: ''وَمَآ اَرْسَلْنٰکَ اِلَّا رَحْمَۃً لِّلْعَالَمِیْنَ'' اور بعض نے کہا: آیت میں تقدیم وتاخیر ہے۔ تقدیرِ آیت یوں ہے۔ ''وَلَوْلَا کَلِمَۃٌ سَبَقَتْ مِنْ رَّبِّکَ وَاَجَلٌ مُّسَمًّی'' اس سے مراد وہ وقت مقرر ہے جس کے پورے ہونے تک عالم کی بقاء ہے۔

سوال: ''فَسَتَعْلَمُوْنَ مَنْ اَصْحٰبُ الصِّرَاطِ السَّوِیِّ وَمَنِ اھْتَدٰی'' (آگے جان لوگے کون ہیں سیدھی راہ والے اور کون سوجھے ہیں)۔

سیدھی راہ والے اور ہدایت یافتہ دونوں ہم معنی ہیں لہٰذا ''الصراط السوی'' لانے کے بعد ''مَنِ اھْتَدٰی'' لانا تکرار ہے۔ اس تکرار کا فائدہ کیا ہے؟

جواب: سیدھی راہ والوں سے مراد صراطِ مستقیم پر منزل کی طرف چلنے اور آگے بڑھنے والے لوگ ہیں۔ اور من اھتدی ہدایت یافتہ سے مراد منزل پر پہنچے ہوئے لوگ مراد ہیں۔ بعض علماء کا کہنا ہے۔ اَصْحَابُ الصِّرَاطِ السَّوِیِّ سے مراد مسلسل صراط مستقیم پر چلنے والے لوگ اور ''مَنِ اھْتَدٰی'' سے وہ لوگ مراد ہیں جو پہلے سیدھے راستے پر نہیں تھے بعد میں اس راہ کو اختیار کئے ہوئے ہیں۔ اور بعض علماء کی رائے یہ ہے۔ اَصْحَابُ الصِّرَاطِ السَّوِیِّ سے مراد دنیا میں راہ حق پر گامزن لوگ ہیں اور مَنِ اھْتَدٰی سے منزل مقصود جنت کی طرف قیامت میں پہنچنے والے لوگ ہیں گویا آیت میں یوں فرمایا گیا۔ تم جان لوگے دنیا میں حق پر اور آخرت میں فائز وکامیاب کون لوگ ہیں۔

## سورۃ الانبیاء

سوال: ''اِقْتَرَبَ لِلنَّاسِ حِسَابُھُمْ'' (لوگوں کے لئے حساب کا وقت بہت قریب آلگا ہے)

سوال یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ فرمار ہے ہیں حساب بہت قریب آ گیا ہے جب کہ اس فرمان کے نزول کے بعد سے اب تک چودہ سو سال گذر گئے ہیں مگر اب تک یوم حساب (یوم القیامۃ) کا کوئی وجود نہیں ہے؟

جوابِ اوّل: اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک قریب ہے اگرچہ لوگوں کے اعتبار سے بعید ہے۔ جیسا کہ فرمایا گیا: "اِنَّهُ یَرَوْنَهٗ بَعِیْدًا وَّنَرٰاهُ قَرِیْبًا" اور دوسری جگہ ارشاد ہے: "وَیَسْتَعْجِلُوْنَکَ بِالْعَذَابِ......... کَاَلْفِ سَنَةٍ مِّمَّا تَعُدُّوْنَ"

جوابِ ثانی: قریب ہونے کا مطلب یہ ہے کہ دنیا کی گذری ہوئی مدت کے مقابلے میں آنے والا وقتِ قیامت قریب ہے جیسا کہ فرمانِ نبوی ﷺ بھی ہے: "ان مثل مابقی من الدنیا فی جنب ما مضی کمثل خیط فی ثواب"

جوابِ ثالث: آیت کا مطلب یہ ہے ہر ایک کا حساب کا وقت قریب ہے یعنی اس کی قبر جب وہ مرجائے۔ اس جواب کی تائید آپ ﷺ کے اس قول مبارک سے ہوتی ہے۔ "من مات فقد قامت قیامۃ" (جو مر گیا سو اس کی قیامت قائم ہوگئی)

جوابِ رابع: یہ ہے کہ ہر آنے والا قریب ہے۔

سوال: "مَا یَاْتِیْهِمْ مِّنْ ذِکْرٍ مِّنْ رَّبِّهِمْ مُّحْدَثٍ" (نہیں پہنچتی ان کو کوئی نصیحت ان کے رب کی طرف سے نئی) اللہ تعالیٰ کی طرف سے آنے والا ذکر قرآنِ کریم ہے اور قرآنِ کریم قدیم ہے حادث نہیں ہے؟۔

جواب اوّل: مطلب یہ ہے کہ اس کا اُتارنا محدّث ہے۔

جوابِ ثانی: اس سے مراد قرآن نہیں ہے بلکہ قرآن کے علاوہ مواعظ رسول ﷺ ہیں اور ان کو اللہ تعالیٰ کی طرف اس لئے منسوب کیا گیا کہ ہر واعظ کی موعظت اللہ تعالیٰ کے الہام اور ہدایت پر ہے اور حدیث بھی تو وحی خفی ہے۔

جوابِ ثالث: ذکر سے مراد ذکر رسول اللہ ﷺ ہیں اور سیاق آیت بھی اس پر دلالت کر رہا ہے۔ یعنی "هَلْ هٰذَا اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُکُمْ" ہے۔

سوال: "وَاَسَرُّوا النَّجْوٰی" اسرّ وا اور النجوی دونوں ہم معنی ہیں یعنی خفیہ سرگوشی کرنے کے معنی میں تو اسروا کے بعد "النجوی" لانا تکرار ہے اس کا کیا فائدہ ہے؟۔

جواب: مطلب ہے کہ بات کو چھپانے میں انتہائی احتیاط سے کام لیا۔ اتنا چھپایا کہ کسی کو ان کے بات کرنے اور سرگوشی کرنے تک علم نہ ہوا اجمالاً نہ تفصیلاً۔

سوال: ''فَاسْئَلُوْا اَهلَ الذِّکْرِ'' (اے مشرکین عرب اہل کتاب سے پوچھو) یعنی انبیاء سابقین کے متعلق تم اہل کتاب سے پوچھو کہ کیا وہ بشر تھے یا فرشتے؟ حالانکہ مشرکین نے کہا تھا: ''لَنْ نُّؤمِنَ بِهٰذَا الْقُرْاٰنِ وَلَا بِالَّذِیْ بَیْنَ یَدَیْهِ''

جواب: مشرکین اگرچہ اہلِ کتاب کی کتاب پر ایمان تو نہیں لائے تھے لیکن عقلی معاملے میں اہلِ کتاب کا مسلسل نقل، مفید علم ہے ایمان لانے اور نہ لانے والے دونوں کے لئے۔

سوال: فرشتوں کی صفات میں اللہ تعالیٰ کا فرمان: ''بَلْ عِبَادٌ مُّکْرَمُوْنَ'' (لیکن وہ بندے ہیں عزت دیئے ہوئے) سے ''مُشْفِقُوْنَ'' تک اس بات پر دلالت کررہا ہے کہ فرشتے کسی قیمت میں بھی اللہ تعالیٰ کی نافرمانی نہیں کرتے تو سوال یہ ہے۔اگر وہ نافرمانی نہیں کرتے ہیں تو ڈرتے کیوں ہیں۔حتیٰ کہ ان کے متعلق فرمایا گیا: ''وَهُمْ مِّنْ خَشْیَتِهٖ مُشْفِقُوْنَ'' (اور وہ اس اللہ کی ہیبت سے ڈرتے ہیں)؟۔

جوابِ اوّل: چونکہ ابلیس بھی بڑا عبادت گذار تھا لیکن اس کے ساتھ کیا معاملہ ہوا اور ہاروت اور ماروت بھی تو فرشتے تھے قضاء قدر سے ان کی حالت کیسی تبدیل ہوئی ان حالات کو پیش نظر رکھ کر وہ خوف وخشیت میں مبتلا ہوتے ہیں۔

جوابِ ثانی: اللہ تعالیٰ کی زیادہ معرفت مزید خوف کا موجب ہے جیسا کہ اہل تحقیق کا قول ہے۔ ''ومن کان باللّٰه اعرف کان من اللّٰه اخوف'' جس کو معرفت الٰہی حاصل ہو وہی خوف الٰہی رکھے گا۔اور جس کو جتنا قرب حاصل ہوگا اتنا خشیت الٰہی سے سرشار ہوگا۔

سوال: کیسے فرمایا اللہ تعالیٰ نے: ''اَوَ لَمْ یَرَ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا اَنَّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ کَانَتَا رَتْقًا فَفَتَقْنٰهُمَا'' (اور کیا نہیں دیکھا ان منکروں نے؟ کہ آسمان اور زمین کے منہ بند تھے پھر ہم نے ان کو کھولا)۔حالانکہ کفار نے ان حالات کو دیکھا نہیں تھا؟۔

جواب: یہاں رویت جاننے کے معنی میں ہے۔تو آیت کا مطلب یہ ہوگا۔کہ یہ لوگ سابقہ اطلاعات پر غور کر کے جانتے نہیں ہیں۔

سوال: ''وَجَعَلْنَا مِنَ الْمَآءِ کُلَّ شَیْءٍ حَیٍّ'' (ہم نے پانی سے ہر زندہ شیء کو پیدا کیا) اللہ تعالیٰ فرماتا ہے ہم نے ہر زندہ چیز کو پانی سے پیدا کیا۔حالانکہ فرشتے اور جنات زندہ شیء ہیں اور پانی سے پیدا نہیں ہیں۔بلکہ ان کی پیدائش نور اور نار سے ہے۔جیسا کہ فرمان الٰہی ہے: ''وَخَلَقَ الْجَآنَّ مِنْ مَّارِجٍ مِّنْ نَّارٍ'' اس طرح انسان مٹی سے اور حضرت صالح علیہ السلام کی اونٹنی پتھر سے پیدا ہے۔

جوابِ اوّل: کُلُّ شَیْءٍ سے بعض شئی مراد ہے جیسا کہ آیت: ''وَاُوْتِیَتْ مِنْ کُلِّ شَیْءٍ'' اور ''جَآءَ هُمُ الْمَوْجُ مِنْ کُلِّ مَکَانٍ'' اور اسی جیسی بہت ساری آیات میں کل سے بعض مراد ہے۔
جوابِ ثانی: پیدا تو ابتداءً تمام مخلوق پانی سے ہیں۔ البتہ بعض بالواسطہ اور بعض بلاواسطہ ہیں۔ اسی بنا پر بعض علماء نے کہا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فرشتوں کو ہوا سے پیدا فرمایا ہے۔ اور ہوا کو پانی سے پیدا کیا ہے اور جنات کو آگ نے اور آگ کو پانی سے تخلیق فرمایا ہے۔ اور انسان کو مٹی سے اور مٹی کو پانی سے تخلیق دی ہے۔

سوال: ''خُلِقَ الْاِنْسَانُ مِنْ عَجَلٍ'' (انسان عجلت سے پیدا شدہ ہے) کے بعد ''فَلَا تَسْتَعْجِلُوْنَ'' لایا گویا یہ تکلیف مالایطاق ہے؟

جواب: یہ ایسا ہے گویا انسان کو شہوت دیکر اس کو شہوت پر قابو پانے کا حکم دیا گیا ہے۔ اس لئے کہ انسان کو اس شہوت اور عجلت پر قابو پانے کی قدرت وطاقت بھی دی گئی ہے۔

سوال: کیسے فرمایا اللہ پاک نے: ''وَلَا یَسْمَعُ الصُّمُّ الدُّعَآءَ اِذَا مَا یُنْذَرُوْنَ'' (اور نہیں سنتے بہرے پکارنے کو جب ان کو کوئی پکارے) حالانکہ بہرہ تو ڈر کیا خوشخبری کو بھی نہیں سن سکتا ہے؟۔

جواب: ''اَلصُّمُّ'' میں الف لام لامِ جنس نہیں ہے بلکہ لامِ عہد ہے۔ ماقبل: ''قُلْ اِنَّمَآ اُنْذِرُکُمْ بِالْوَحْیِ'' (آپ کہہ دیجئے کہ میں آپ کو ڈراتا ہوں حکم کے موافق) میں منذرین کی طرف اشارہ ہے۔

سوال: ''بَلْ فَعَلَهٗ کَبِیْرُهُمْ هٰذَا'' بلکہ اس بڑے (بت) نے توڑا ہے۔
حضرت ابراہیم علیہ السلام نے بتوں کو خود توڑ کر یہ کیوں فرمایا کہ اس بڑے نے یہ عمل کیا ہے؟۔

جوابِ اوّل: ان پر استہزاء اور تہکم کے طور پر فرمایا بطور حقیقت کے نہیں فرمایا۔

جوابِ ثانی: توڑنے کی نسبت بڑے بت کی طرف ایک شرط کے ساتھ مشروط کیا جو مقتضی ہے۔ مطلقاً اس کو منسوب نہیں کیا' تقدیر عبارت یوں ہے: ''فَعَلَهٗ کَبِیْرُهُمْ هٰذَا اِنْ کَانُوْا یَنْطِقُوْنَ فَاسْئَلُوْهُمْ'' اس بڑے نے یہ سب کچھ کیا ہے۔ اگر بولتا ہے تو اس سے پوچھ کے دیکھ لو)

سوال: ''یٰنَارُ کُوْنِیْ بَرْدًا وَّسَلٰمًا عَلٰٓی اِبْرٰهِیْمَ'' (اے آگ ابراہیم کے لئے ٹھنڈی اور سلامتی کا ذریعہ بن جا)۔ سوال یہ ہے آگ کو کیسے خطاب کیا گیا حالانکہ خطاب عقلاء کو ہوتا ہے جبکہ آگ غیر عاقل ہے؟

جواب: یہ خطاب' خطاب تکوین ہے اور خطاب تکوین عقلاء کے ساتھ مختص نہیں ہے۔ بلکہ غیر عقلاء کو بھی مخاطب بنایا جا سکتا ہے۔ جیسا کہ پہاڑوں' زمین اور آسمان کو قرآن کریم میں خطاب کیا

گیا ہے۔ جیسا کہ فرمایا گیا: ''یٰجِبَالُ اَوِّبِیْ مَعَهٗ' فَقَالَ لَهَا وَلِلْاَرْضِ ائْتِیَا طَوْعًا اَوْ كَرْهًا اور آیت ''قِیْلَ یٰاَرْضُ ابْلَعِیْ مَآءَكِ وَیٰسَمَآءُ اَقْلِعِیْ''۔

سوال: یہاں فرمایا گیا: ''وَالَّتِیْٓ اَحْصَنَتْ فَرْجَهَا فَنَفَخْنَا فِیْهَا مِنْ رُّوْحِنَا میں ھا ضمیر مؤنث ''وَمَرْیَمَ ابْنَتَ عِمْرٰنَ الَّتِیْٓ اَحْصَنَتْ فَرْجَهَا فَنَفَخْنَا فِیْهِ مِنْ رُّوْحِنَا '' میں ''فیہ'' ضمیر مذکر کے ساتھ لایا گیا کیوں؟۔

جواب: جہاں تانیث کی ضمیر ہے وہاں ان کی ذات میں نفخ مراد ہے اگر نفخ (پھوکنے) کی جگہ گریبان یا شرم گاہ ہے مگر نسبت ان کی ذات کی طرف کی گئی ہے۔ جہاں مذکر کی ضمیر لائی گئی وہاں ضمیر فرج کی طرف لوٹ رہی ہے جو مذکر ہے۔

سوال: فرمانِ باری تعالیٰ ہے: ''وَحَرٰمٌ عَلٰی قَرْیَةٍ اَهْلَكْنٰهَآ اَنَّهُمْ لَا یَرْجِعُوْنَ '' (اور حرام ہے اس بستی پر جس کو ہم نے ہلاک کیا کہ وہ لوٹ کر نہیں آئیں گے) اس بستی والوں کے واپس لوٹ کر آنے پر دلالت کرتا ہے' اس لئے کہ جس کے نہ پایا جانے کو حرام کر دیا جائے تو وہ موجود ہوگا۔ یعنی نہ پایا جانا حرام ہے تو پایا جانا ضروری ہوگا۔؟

جوابِ اوّل: یہاں حرام واجب کے معنی میں ہے' کہ ہم نے اس بستی والوں پر واجب کر دیا کہ وہ کفر سے اسلام کی طرف لوٹ کر نہیں آئیں اور حضرت ابن عباسؓ نے بھی یہاں حرام کو واجب کے معنی میں لیا ہے۔

شاعر کا یہ شعر بھی اس پر دال ہے:

فان حراما لاارى الدهر باكيا ☆ على شجوة الابكيت على عمرو

جوابِ ثانی: حرام یہاں اپنے اصل معنی میں ہے اور ''لا یرجعون'' میں ''لا'' زائدہ ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ ''حرمنا'' ''منعنا'' کے معنی میں ہے جیسا کہ آیت ''حَرَّمْنَا عَلَیْهِ الْمَرَاضِعَ اور اِنَّ اللّٰهَ حَرَّمَهُمَا عَلَی الْكٰفِرِیْنَ '' میں دونوں جگہ ''حرّم'' ''مَنَعَ کے معنی ہیں۔

سوال: ''اِنَّ الَّذِیْنَ سَبَقَتْ لَهُمْ مِّنَّا الْحُسْنٰٓی اُولٰٓئِكَ عَنْهَا مُبْعَدُوْنَ '' (سو وہ لوگ جن کے لئے ٹھہری ہماری طرف سے پہلے سے نیکی وہ اس سے دور رہیں گے) اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ نیکوکار جہنم سے دور ہوں گے۔ جبکہ اس آیت: ''وَاِنْ مِّنْكُمْ اِلَّا وَارِدُهَا'' سے معلوم ہوتا ہے کہ نیک لوگ اس سے دور نہیں ہوں گے بلکہ اس کے قریب ہوں گے تو تطبیق کس طرح ہوگی؟۔

جواب: مطلب یہ ہے کہ اس کی تکلیف والم سے دور ہوں گے اگرچہ اس سے گذریں گے۔ یا

مطلب یہ ہے کہ اس سے وارد ہونے کے بعد اللہ تعالیٰ کی طرف سے نجات ملنے پر ہمیشہ کے لئے اس سے دور ہوں گے۔

سوال: اللہ تعالیٰ نے نبی کریم ﷺ کے متعلق فرمایا: "وَمَا أَرْسَلْنٰكَ إِلَّا رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ" (ہم نے آپ کو تمام جہانوں کے لئے رحمت بنا کر بھیجا ہے) حالانکہ جن لوگوں کی وفات حالت کفر میں ہوئی ان کے لئے رحمت تو نہیں ہیں، بلکہ ان کے لئے باعث تکلیف ہیں۔ اس لئے کہ آپ ﷺ مبعوث نہ ہوتے تو یہ لوگ عذاب میں مبتلا نہ ہوتے۔ کیوں کہ فرمانِ الٰہی ہے۔ "وَمَا كُنَّا مُعَذِّبِيْنَ حَتّٰى نَبْعَثَ رَسُوْلًا"

جوابِ اوّل: بلکہ آپ ﷺ کفار کے لئے بھی رحمت ہیں۔ اس لئے کہ آپ ﷺ کی وجہ سے عمل ختم ہونے کا عذاب ان سے مؤخر ہو گیا۔

جوابِ ثانی: آپ ﷺ سب کے لئے رحمت بنا کر مبعوث ہوئے ہیں۔ آپ ﷺ مبعوث اس لئے ہوئے کہ جو لوگ آپ ﷺ کی تابعداری کریں گے وہ نیک بخت ہوں گے، اور جو ان کی تابعداری نہیں کرتے یہ ان کی اپنی کمزوری اور سستی ہے اور اپنے عظیم حصے کو ضائع کرنا ہے۔ آپ ﷺ کی مثال چشمے کے شیرین پانی کی سی ہے، جس کو اللہ تعالیٰ نے جاری فرمایا کچھ لوگ نے اس سے اپنی فصلوں اور مال مویشیوں کو سیراب کرنے کے ساتھ ساتھ خود بھی اس سے خوب فیض یاب ہوئے اور سیراب ہوئے اور کچھ لوگوں نے اس کی طرف التفات نہیں کیا اور اس سے کچھ بھی حاصل نہیں کیا۔ اپنے حصے کو ضائع کیا اور چشمہ اپنی جگہ پر دونوں جماعتوں کے لئے نعمت اور رحمت ہے اگرچہ دوسری جماعت نے اس سے فائدہ حاصل نہیں کیا۔

**جوابِ ثالث:** "رحمة" سے مراد رحم کرنے والے ہیں۔ چنانچہ آپ ﷺ دونوں فریقوں کے لئے مہربان ہیں۔ ذرا غور کیجئے غزوہ احد میں کفار نے آپ کو زخمی کر دیا۔ آپ ﷺ کے دندان مبارک شہید کر دیے۔ آپ ﷺ بے ہوش ہو گئے۔ جب افاقہ ہوا تو فرمایا: "اللّٰھمّ اھد قومی فانھم لا یعلمون" (اے اللہ! میری قوم کو ہدایت دے۔ کیوں کہ یہ لوگ جانتے نہیں)۔

سوال: "اَتٰى اَمْرُ اللّٰهِ" (اللہ کا امر آچکا) "اِقْتَرَبَتِ السَّاعَةُ" (قیامت قریب آ گئی) کے ہوتے ہوئے: "وَاِنْ اَدْرِيْ اَقَرِيْبٌ اَمْ بَعِيْدٌ مَّا تُوْعَدُوْنَ" (مجھے نہیں معلوم کہ جو کچھ تم سے وعدہ کیا جاتا ہے قریب ہے یا بعید) کہنے کا کیا مطلب؟

جواب: آیت کا مطلب ہے: کہ جس عذاب کا تم سے وعدہ کیا گیا۔ اور اس سے تم کو ڈرایا جاتا ہے۔ وہ جلدی آئے گا یا تاخیر سے مجھے اس کا علم نہیں ہے۔ اس سے قیامِ قیامت مراد نہیں ہے۔

سوال: جب مؤمنین کا اعتقاد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ حق ہی فیصلہ کرتے ہیں باطل فیصلہ نہیں کرتے تو " رَبِّ احْکُمْ بِالْحَقِّ " (اے اللہ حق کے ساتھ فیصلہ فرما) کہنے کا کیا مطلب؟۔
جواب: یہاں "حق" باطل کے مقابل نہیں ہے۔ بلکہ حق سے مراد یہاں مسلمانوں کی مدد اور کفار کو ذلیل کرنے کا وعدہ ہے اور اللہ تعالیٰ کا وعدہ حق ہی ہوتا ہے۔ گویا آیت کا مطلب یہ ہے کہ یا اللہ! اپنے وعدے کو جلدی عملی جامہ پہنا دیجئے۔

# سورۃ الحج

سوال: "اِنَّ زَلْزَلَةَ السَّاعَةِ شَیْءٌ عَظِیْمٌ " (یقیناً قیامت کا زلزلہ بھاری چیز ہوگی) یہ آیتِ مبارکہ معدوم کے شئی ہونے پر دلالت کرتی ہے؟۔
جواب: ہم اس کو تسلیم نہیں کرتے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ جب قیامت کا زلزلہ پایا جائے گا تو شئی کہلائے گا فی الحال شئی نہیں ہے۔ اس قول کی تائید لفظِ "عظیم " سے ہوتی ہے۔ اس لئے کہ معدوم عظمت سے متصف نہیں ہوسکتا۔
سوال: "یَوْمَ تَرَوْنَهَا " (جس دن اس کو دیکھیں گے) میں "تَرَوْنَ " کو جمع اور "تَرَی النَّاسَ " (تو دیکھے گا لوگوں کو) میں "تریٰ " کو واحد کے صیغے کے ساتھ کیوں لایا گیا؟۔
جواب: پہلی آیت کو زلزلہ کے ساتھ معلق کیا جس کو سارے لوگ دیکھیں گے اور دوسری آیت کو لوگوں کی بے ہوشی کی کیفیت کے ساتھ معلق کیا۔ کیونکہ ہر ایک ان میں سے دوسروں کو دیکھنے والا ہوگا۔
سوال: "وَمِنَ النَّاسِ مَنْ یُّجَادِلُ فِی اللّٰهِ بِغَیْرِ عِلْمٍ وَّلَا هُدًی وَّلَا کِتَابٍ مُّنِیْرٍ ثَانِیَ عِطْفِهٖ لِیُضِلَّ عَنْ سَبِیْلِ اللّٰهِ " (بعض آدمی ایسے ہوتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے بارے میں بدوں واقفیت اور بدوں دلیل اور بدوں کسی روشن کتاب کے تکبر کرتے ہوئے جھگڑا کرتے ہیں تا کہ اللہ کی راہ سے بے راہ کردیں)۔
نضر بن حارث کے بارے یہ کیسے فرمایا گیا کہ وہ گمراہ کرنے کے لئے جدال کرتا ہے حالانکہ وہ مباحثہ دوسروں کو گمراہ کرنے کے لئے نہیں کیا کرتا تھا۔ اور نہ ہی وہ ہدایت پر تھا کہ جدال کی وجہ سے ہدایت سے نکل کر گمراہ ہو جائے۔ بلکہ پہلے سے ہی وہ راہ ہدایت پر نہیں تھا؟۔
جواب: "لِیُضِلَّ " میں "لام" لام عاقبت ہے۔ کئی مرتبہ پہلے بھی اس کا تذکرہ آچکا ہے۔ جب اُس ہدایت اور راہِ راست کی طرف آنے سے انکار کیا۔ اور راہِ راست کی طرف آنے کو چھوڑا اور

اس سے اعراض کیا اور باطل کے حق میں مناظرہ وجدال پر اتر آیا تو گویا وہ راہِ حق سے نکل گیا۔ اس لئے اس طرح تعبیر کی گئی۔

سوال: ''یَدْعُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰہِ مَالَا یَضُرُّہٗ وَمَا لَا یَنْفَعُہٗ ذٰلِکَ ھُوَالضَّلٰلُ الْبَعِیْدُ یَدْعُوْا لَمَنْ ضَرُّہٗ اَقْرَبُ مِنْ نَّفْعِہٖ'' (خدا کو چھوڑ کر ایسی چیز کی عبادت کرنے لگا جو نہ اس کو نقصان پہنچا سکتی ہے نہ نفع پہنچا سکتی ہے یہ انتہا درجہ کی گمراہی ہے) وہ ایسے کی عبادت کر رہا ہے کہ اس کا ضرر اس کے نفع سے زیادہ قریب ہے)۔

پہلی آیت میں بتوں سے نفع وضرر کی نفی اور دوسری آیت میں ان کے لئے نفع وضرر کو ثابت کیا گیا ہے۔ دونوں میں تطبیق کیسے ہوگی؟۔

جواب: مطلب یہ ہے کہ ایسی چیز کی عبادت کرتا ہے کہ اگر اس کی عبادت نہ کرے تو وہ اس کو کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتی۔ اور اگر عبادت کرے تو کوئی فائدہ نہیں پہنچا سکتی ہے۔ پھر فرمایا۔ اس چیز کی عبادت کرتا ہے جس کی عبادت کی وجہ سے اللہ اس کو ضرر پہنچا دے گا۔ مگر آیت میں ضرر کو بت کی طرف منسوب اس لئے کیا کہ وہ ضرر پہنچنے کا سبب بنا۔

سوال: ''ضَرُّہٗ اَقْرَبُ مِنْ نَّفْعِہٖ'' (اس کا نقصان فائدہ سے زیادہ قریب ہے)۔ اس بات پر دلالت کر رہا ہے کہ بتوں کے اندر نفع ہے۔ حالانکہ ایسا نہیں ہے؟۔

جواب: یعنی ان کے اعتقاد کے مطابق جو نفع ہے (حالانکہ نفع کوئی نہیں ہے) اس نفع کے مقابلے میں اس کا ضرر و نقصان زیادہ ہے۔

سوال: ''اُذِنَ لِلَّذِیْنَ یُقٰتَلُوْنَ بِاَنَّھُمْ ظُلِمُوْا'' (ان کو اجازت دیدی گئی جن سے لڑائی کی جاتی ہے۔ اس وجہ سے کہ ان پر ظلم کیا گیا)۔ ان کو کس چیز کی اجازت دی گئی اس کا تذکرہ آیت میں نہیں ہے کیوں؟۔

جواب: آیت میں اس کا تذکرہ موجود ہے مگر مقدر رہے۔ تقدیر عبارت یوں ہے: ''اُذِنَ لِلَّذِیْنَ یُقٰتَلُوْنَ فِی الْقِتَالِ'' مگر لفظ ''یقتلون'' کے اس پر دلالت کی وجہ سے اسے حذف کیا گیا اور دلالت حال کی وجہ سے بھی' کیوں کہ کفارِ مکہ مسلمانوں کو طرح طرح کی تکالیف سے دوچار کرتے تھے۔ اور مسلمان نبی کریم ﷺ سے کفار سے لڑنے کی اجازت طلب کرتے تھے۔ اور رسول اللہ ﷺ فرمایا کرتے۔ ابھی اس کی اجازت نہیں ملی ہے۔ یہ سلسلہ چلتا رہا' یہاں تک کہ آپ ﷺ ہجرت کر کے مدینہ منورہ چلے آئے۔ قتال کے متعلق نازل ہونے والی یہ پہلی آیت ہے۔ لہٰذا ماذون فیہ (جس کی اجازت دیدی گئی) ظاہر ہے' اس لئے اس کو حذف کیا گیا۔

سوال: "اَلَّذِیْنَ اُخْرِجُوْا مِنْ دِیَارِھِمْ بِغَیْرِ حَقٍّ اِلَّآ اَنْ یَّقُوْلُوْا رَبُّنَا اللّٰہُ "(وہ لوگ جن کو نکالا ان کے گھروں سے اور دعویٰ کچھ نہیں سوائے اس کے کہ وہ کہتے ہیں کہ ہمارا رب اللہ ہے) میں استثناء کس طرح صحیح ہوگا۔

جواب: یہ استثناء منقطع ہے۔ تقدیر عبارت یوں ہے "لٰکِنْ اُخْرِجُوْا بقولھم ربُّنَا اللّٰہُ "یعنی ان کو اپنے گھروں سے اللہ ہمارا رب ہے کہنے کی بناء پر لایا گیا۔

سوال: یہود کے عبادت خانوں اور نصاریٰ کے عبادت خانوں کی حفاظت میں مسلمانوں پر کیا احسان ہے۔ حتیٰ کہ آیت میں یہ کہہ کر احسان جتلایا جا رہا ہے: "وَلَوْلَا دَفْعُ اللّٰہِ النَّاسِ بَعْضَھُمْ بِبَعْضٍ لَّھُدِّمَتْ صَوَامِعُ وَّبِیَعٌ "(اور اگر نہ ہٹایا کرتا اللہ لوگوں کو ایک کو دوسرے سے تو ڈھائے جاتے تکئے اور مدرسے)

جواب: صرف مسلمانوں کے ساتھ احسان کا ذکر نہیں بلکہ اہل ادیان ثلثہ پر احسان جتلایا جا رہا ہے۔

سوال: "وَکُذِّبَ مُوْسٰی "(اور موسیٰ کو جھٹلایا گیا) اس کے ماقبل بتایا کہ قوم نوحؑ نے نوحؑ کو اور ثمود نے صالحؑ کو اور قوم ابراہیمؑ نے ابراہیمؑ اور قومِ لوطؑ نے لوطؑ کو جھٹلایا قوم موسیٰ نہیں فرمایا؟۔

جواب: اس لئے کہ موسیٰؑ کی قوم بنی اسرائیل نے موسیٰؑ کی تکذیب نہیں کی۔ بلکہ ان کو جھٹلانے والی قوم قوم قبط ہے۔

سوال: "وَلٰکِنْ تَعْمَی الْقُلُوْبُ الَّتِیْ فِی الصُّدُوْرِ "(پر اندھے ہو جاتے ہیں دل جو سینوں میں ہیں) قلب (دل) ہوتا ہی سینے میں ہے "فِی الصُّدُوْرِ "لانے کا کیا فائدہ؟

جوابِ اوّل: تاکید میں مبالغہ کرنے کے لئے اس لفظ کو بڑھایا گیا۔ جیسا کہ آیت "وَلَا طَائِرٍ یَّطِیْرُ بِجَنَاحَیْہِ " ہے پرندہ اڑتا ہی پروں سے ہے اس کے باوجود تاکید کے لئے "بِجَنَاحَیْہِ "کا اضافہ کیا گیا ہے۔ اسی طرح دوسری آیت "وَیَقُوْلُ بِاَلْسِنَتِھِمْ "اپنی زبانوں سے کہتے ہیں) میں "بِاَلْسِنَتِھِمْ "مزید تاکید کے لئے ہے۔

جوابِ ثانی: یہاں "قلب" عقل کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔ اس سے مقصود یہ بتانا ہے۔ کہ عقل کا مستقر سر نہیں بلکہ دل ہے۔

سوال: مغفرت (گناہوں کی معافی) ہوتی ہے گناہ کے ارتکاب سے نہ کہ نیک اعمال کرنے پر جبکہ اللہ پاک فرماتے ہیں "فَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَھُمْ مَّغْفِرَۃٌ وَّرِزْقٌ کَرِیْمٌ "

(جو لوگ ایمان لے آئے اور اچھے کام کرنے لگے ان کے لئے مغفرت اور عزت کی روزی ہے)؟۔

جواب: یہاں عمل صالح سے اخلاص فی الایمان مراد ہے امام کلبیؒ فرماتے ہیں: قرآن کریم میں جہاں بھی ''اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ'' آیا ہے اس سے اخلاص فی الایمان مراد ہے۔ تو آیت کا معنی یہ ہوا: جو لوگ اخلاص کے ساتھ ایمان لائیں گے۔ یعنی اپنے ایمان کو شرک سے پاک کریں گے ان کے سابقہ گناہ معاف کئے جائیں گے۔

سوال: ''وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رَّسُوْلٍ وَّلَا نَبِيٍّ'' (اور کوئی نبی اور رسول ہم نے نہیں بھیجا آپ سے پہلے) اس آیت سے معلوم ہوتا ہے نبی اور رسول دونوں مرسل ہیں۔ کیا ان کے درمیان کوئی فرق بھی ہے؟۔

جواب: ان کے درمیان فرق یہ ہے۔ کہ رسول اس پیغامبر کو کہتے ہیں کہ جن کو معجزہ اور کتاب دونوں دیئے گئے ہوں۔ اور نبی اس پیغمبر کو کہتے ہیں جنہیں کوئی نئی کتاب و شریعت نہ دی گئی ہو بلکہ اپنے سے پہلے پیغمبر کی شریعت کی طرف لوگوں کو بلانے کا کام سونپ دیا گیا ہو بعض علماء کے نزدیک رسول انہیں کہتے ہیں جن کو معجزہ دیا گیا۔ اور جن کو معجزہ سے نہ نوازا گیا ہو ان کو نبی کہتے ہیں۔

سوال: ''يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ ضُرِبَ مَثَلٌ فَاسْتَمِعُوْا لَهٗ ط اِنَّ الَّذِيْنَ تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ لَنْ يَّخْلُقُوْا ذُبَابًا وَّلَوِاجْتَمَعُوْا لَهٗ ط وَاِنْ يَّسْلُبْهُمُ الذُّبَابُ شَيْئًا لَّا يَسْتَنْقِذُوْهُ مِنْهُ ط ضَعُفَ الطَّالِبُ وَالْمَطْلُوْبُ'' (اے لوگو! ایک عجیب مثال بیان کی جاتی ہے۔ اس کو کان لگا کر سنو۔ اس میں کوئی شبہ نہیں ہے کہ جن کی تم لوگ خدا کو چھوڑ کر عبادت کرتے ہو وہ مکھی کو پیدا کر ہی نہیں سکتے گو سب کے سب جمع ہو جائیں۔ اور اگر ان سے مکھی کچھ چھین کر لے جائے تو وہ اسے چھڑا بھی نہیں سکتے۔ ایسا عابد بھی لچر ایسا معبود بھی لچر)۔

مذکورہ آیت میں فرمایا گیا ایک مثال بیان کی گئی اس کو غور سے سنو۔ وہ مثال کہاں ہے؟ یہ تو مستقل علیحدہ کلام ہے، مثل نہیں ہے۔

جواب: عجیب و غریب قصہ یا اچھی صفت و اچھا واقعہ کو ''مَثَل'' کہتے ہیں۔ جیسا کہ فرمان الٰہی ہے: ''مَثَلُهُمْ كَمَثَلِ الَّذِي اسْتَوْقَدَ نَارًا'' تو یہاں اس واقعے سے ایک بات سامنے آتی ہے وہ ہے ان کے معبودوں کی انتہائی بے بسی و بے کسی کہ ایک ادنیٰ مخلوق مکھی تو کیا پیدا کر سکتے؟ اگر مکھی ان کی کوئی چیز چھین کر لئے جائے تو اس کو اس سے چھڑا نہیں سکتے۔ ایسی عاجز و مجبور چیز کو خالق ارض و سماء کے برابر ٹھہرا کر عبادت کرنا انتہائی عجیب ہی نہیں عجیب ترین بھی ہے۔

سوال: کیسے فرمایا اللہ تعالیٰ نے: ''وَمَا جَعَلَ عَلَيْكُمْ فِي الدِّيْنِ مِنْ حَرَجٍ '' (اور تم پر دین میں کسی قسم کی تنگی نہیں کی) حالانکہ تھوڑے سی رقم چوری کرنے سے قیمتی ہاتھ کاٹنے کا حکم ہے۔ شادی شدہ مرد عورت کے لئے صرف ایک مرتبہ زنا سرزد ہونے پر سنگ باری کر کے مار ڈالنے کا امر ہے رمضان کے ایک دن کا روزہ بلا عذر افطار کرنے پر دو مہینے روزے رکھنے کا مشکل حکم ہے۔ اسی طرح حج وعمرہ کے لئے مال کثیر خرچ کرنے کا حکم ہے؟۔

جوابِ اوّل: آیت میں ''دین '' سے مراد کلمہ توحید ہے۔ کلمہ توحید وہ عظیم کلمہ ہے کہ ستر سال کا کافر اخلاص کے ساتھ اس کو پڑھیگا' تو شرک سے پاک ہوگا۔ ستر سال کے شرک کے لئے کفارہ ہوگا۔ ستر سال کے شرک کو دھونے کے لئے ستر سال اعمال کرنے پر موقوف نہیں ہوتا' اور نہ ہی کسی خاص جگہ اور خاص زمانے کے ساتھ مختص ہے۔ بلکہ جس جگہ اور جس وقت بھی اقرار کریگا۔ کلمہ اپنی تاثیر دکھائے گا۔

جوابِ ثانی: اس کا مطلب یہ ہے۔ کہ انسان سے جس طرح کا گناہ سرزد ہو جائے اور جس گناہ میں مبتلا ہو جائے اس گناہ سے نکلنے اور اس سے پاک ہونے کا طریقہ بھی کفارہ یا توبہ کی صورت میں موجود ہے۔ چنانچہ گناہگاروں کے لئے توبہ کا دروازہ کھلا ہے۔ اور معذوروں کے لئے رخصت کی سہولت موجود ہے۔ اور جرم کے ارتکاب کرنے والوں کے لئے کفارہ کی رعایت ہے۔

جواب ثالث: نفی حرج کا مطلب ہے کہ بنی اسرائیل پر لاگو مشکل ترین احکامات کی طرح تم پر کوئی مشکل حکم فرض نہیں کیا گیا ہے۔

سوال: اللہ تعالیٰ نے: ''مِلَّةَ أَبِيكُمْ إِبْرَاهِيمَ '' (تمہارے جد امجد ابراہیم علیہ السلام کی ملت ہے) کیسے فرمایا جبکہ ابراہیم علیہ السلام تمام امتوں کے جد نہیں ہیں؟۔

جواب: ابراہیم علیہ السلام حضور ﷺ کے جد امجد ہیں اور آپ ﷺ کے واسطے سے آپ ﷺ کی امت کے جد ہوئے اس لئے کہ رسول کی امت رسول کے لئے اولاد کی حیثیت رکھتی ہے۔ مذکورہ سوال جب پیدا ہوگا اگر ''ابیکم '' کا خطاب تمام مسلمانوں کو ہے۔ اگر اس کے مخاطب صرف اہل عرب ہوں۔ تو کوئی سوال نہیں ہے۔ اس لئے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام تمام عرب کے جد ہیں۔

سوال: ''هُوَ سَمّٰكُمُ الْمُسْلِمِيْنَ '' اسی نے نام رکھا تمہارا اسلام لانے والے) سوال یہ ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے کس وقت ہمیں مسلمان کے نام سے موسوم کیا۔

جواب: کعبہ کی تعمیر کے موقع پر ان الفاظ سے دعا کرتے ہوئے فرمایا تھا: '' رَبَّنَا وَاجْعَلْنَا مُسْلِمَيْنِ لَكَ وَمِنْ ذُرِّيَّتِنَا أُمَّةً مُّسْلِمَةً لَّكَ ''

چنانچہ اس امت میں جو بھی اسلام کی دولت سے مشرف ہوا وہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دعا کا اثر ہے اور اسی کی برکت ہے۔(علامہ رازیؒ فرماتے ہیں کہ یہ سوال خواب میں مجھ سے پوچھا گیا تھا۔ اور میں نے خواب ہی میں اس کا جواب دیا تھا)۔

## سورۃ المؤمنون

**سوال:** ''وَالَّذِيْنَ هُمْ لِفُرُوْجِهِمْ حٰفِظُوْنَ اِلَّا عَلٰى اَزْوَاجِهِمْ'' حفظ فرج کے صلے میں ''عن'' آتا ہے نہ کہ ''علیٰ'' اہل عرب کہتے ہیں: ''فلان یحفظ فرجه عن الحرام'' علی الحرام نہیں کہتے؟۔

**جوابِ اوّل:** یہاں ''علیٰ'' ''عن'' کے معنی میں ہے جیسا کہ شاعر کے اس شعر کے اندر ''علیٰ'' ''عن'' کے معنی میں ہے۔

اِذَا رَضِيَتْ عَلَيَّ بَنُوْ قُشَيْرٍ ☆ لَعَمْرُ اللّٰهِ اَعْجَبَنِيْ رِضَاهَا

ترجمہ: جب بنو قشیر مجھ سے خوش ہوتا ہے تو بخدا مجھے بڑی خوشی ہوتی ہے

**جوابِ ثانی:** ''عَلٰى'' ''حٰفِظُوْنَ'' کا صلہ نہیں ہے بلکہ اس کا متعلق محذوف ہے۔ تقدیر عبارت یوں ہے۔ ''فلا یرسلونها الا علی ازواجهم''

**سوال:** ''اَوْ مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُهُمْ'' (یا اپنی باندیوں پر) لفظ ''ما'' غیر عاقل کے لئے استعمال ہوتا ہے باندیوں کے لئے کیسے استعمال ہوا۔ جبکہ باندیاں عاقل ہیں؟۔

**جواب:** ان عقلاء کو غیر عقلاء کے درجے میں رکھا گیا من جملہ ان میں مؤنث ہونے کی وجہ سے کم عقلی ہے۔

**سوال:** ''وَشَجَرَةً تَخْرُجُ مِنْ طُوْرِ سَيْنَاءَ'' (اور وہ درخت جو نکلتا ہے سینا پہاڑ سے) اس درخت سے مراد درختِ زیتون ہے۔ یہ صرف طورِ سینا سے ہی نہیں نکلتا بلکہ دوسری جگہوں میں بھی پایا جاتا ہے۔

**جواب:** اصل اس کا مقام اور اُگنے کی جگہ طورِ سینا تھا۔ اس کے بعد وہاں سے دوسری جگہوں میں پھیل گیا۔

**سوال:** ''اَمْ يَقُوْلُوْنَ بِهٖ جِنَّةٌ ط بَلْ جَآءَهُمْ بِالْحَقِّ وَاَكْثَرُهُمْ لِلْحَقِّ كٰرِهُوْنَ'' (یہ لوگ آپ کی نسبت جنون کے قائل ہیں؟ بلکہ یہ رسول ان کے پاس حق بات لیکر آئے ہیں ان میں سے اکثر لوگ حق بات سے نفرت کرتے ہیں)۔

"اَمْ یَقُوْلُوْنَ بِهٖ جِنَّةٌ" کفار کا قول نقل فرمایا پھر فرمایا ان میں اکثر حق بات کو ناپسند کرتے ہیں۔ حالانکہ تمام کفار ناپسند کرتے تھے "فهذا کُلُّهُم للحق کارهون" ہونا چاہیے؟۔

جواب: کفار میں بعض لوگ ایسے بھی تھے جو اسلام کو صحیح مذہب سمجھتے تھے مگر برادری قوم، قبیلے کے طعن و تشنیع کے ڈر سے ایمان نہیں لاتے تھے۔ کہ لوگ کیا کہیں گے کہ اپنے آباء واجداد کا دین چھوڑ کر اجنبی دین اختیار کر لیا، جیسا کہ ابوطالب وغیرہ کے بارے میں منقول ہے۔

سوال: "فَقَالَ رَبِّ ارْجِعُوْنَ" (کہے گا اے رب! مجھ پھر بھیج دو) اللہ تعالیٰ کو مخاطب کر کے کہے اور اللہ تعالیٰ واحد ہے اس کے لئے جمع کا صیغہ کیوں استعمال کیا گیا؟۔

جواب: یہ جمع، جمع تفخیم و تعظیم ہے۔ جیسا کہ آیت "اِنَّا نَحْنُ نُحْیِ الْمَوْتٰی" میں جمع تعظیم کے لئے ہے۔

سوال: "فَلَآ اَنْسَابَ بَیْنَهُمْ یَوْمَئِذٍ وَّلَا یَتَسَآءَلُوْنَ" (اس روز نہ ہی رہیں گے اور نہ کوئی کسی کو پوچھے گا) اور دوسری جگہ ارشاد ہے: "وَاَقْبَلَ بَعْضُهُمْ عَلٰی بَعْضٍ یَتَسَآءَلُوْنَ" ایک جگہ فرماتے ہیں "لا یتساء لون" اور دوسری جگہ ارشاد ہے "یتساء لون" دونوں میں تطبیق کیسے ہوگی؟۔

جواب: قیامت کا دن پچاس ہزار سالوں کے برابر ہے۔ چنانچہ مختلف مقامات اور مختلف احوال سے گذرنا ہوگا۔ بعض احوال میں آپس میں ایک دوسرے سے پوچھیں گے، بات چیت کر سکیں گے۔ اور بعض احوال ایسے درپیش ہوں گے کہ جن میں شدت خوف و ڈر کی وجہ کچھ بول نہیں سکیں گے۔

# سورة النور

سوال: "اَلزَّانِیَةُ وَالزَّانِیْ فَاجْلِدُوْا" میں عورت کو اور "اَلسَّارِقُ وَالسَّارِقَةُ فَاقْطَعُوْا" میں مرد کو پہلے لایا گیا، وجہ؟۔

جواب: زنا کا سبب شہوت ہے۔ عورت میں مرد کے مقابلے میں شہوت زیادہ ہے اس وجہ سے زنا کی سزا میں عورت کو پہلے ذکر کیا۔ چوری میں چونکہ جرأت اور جسارت درکار ہوتی ہے۔ وہ مرد میں عورت کی نسبت زیادہ ہے، تو سرقہ کی سزا میں مرد کو پہلے ذکر کیا گیا۔

سوال: "اَلزَّانِیْ لَا یَنْکِحُ اِلَّا زَانِیَةً اَوْ مُشْرِکَةً وَّالزَّانِیَةُ لَا یَنْکِحُهَآ اِلَّا زَانٍ اَوْ مُشْرِکٌ" (زانی نہیں نکاح کر سکتا مگر زانیہ یا مشرکہ سے اور زانیہ نہیں نکاح کر سکتی مگر زانی یا مشرک سے) اس آیت میں مرد کو پہلے بیان کیا گیا جبکہ پہلی آیت میں عورت کا ذکر مقدم ہے؟۔

جواب: پہلی آیت دونوں کی جنایت کی سزا کے متعلق ہے جسمیں عورت اصل ہے اور دوسری

آیت نکاح کے متعلق ہے جس میں مرد اصل ہے' کیوں کہ پیغام نکاح مرد دیتا ہے۔ نکاح کا اظہار بھی مرد کی طرف سے ہوتا ہے۔ بخلاف زنا کے۔

سوال: ''اَلزَّانِیْ لَا یَنْکِحُ اِلَّا زَانِیَةً اَوْمُشْرِکَةً وَّالزَّانِیَةُ لَا یَنْکِحُهَآ اِلَّا زَانٍ اَوْ مُشْرِکٌ'' (بدکار مرد نہیں نکاح کرتا مگر عورت بدکار سے یا شرک والی سے اور بدکار عورت سے نکاح نہیں کرتا مگر بدکار مرد یا مشرک)۔ حالانکہ ہم دیکھتے ہیں کبھی زانی مرد کسی عفیفہ اور مسلمہ سے۔ جبکہ زانیہ کے ساتھ عفیف مرد اور مسلمان مرد نکاح کرتا ہے؟۔

جواب: حضرت عکرمہؓ فرماتے ہیں: یہ آیت مکہ کی اُن زانیہ عورتوں کے بارے میں نازل ہوئی جو خاص جگہوں میں ہوتی تھیں۔ ان جگہوں کو زمانہ جاہلیت میں ''المرضیہ'' کہا جاتا تھا' تو وہاں ان کے پاس زانی لوگ ہی جایا کرتے تھے۔ کچھ مہاجرین فقراء نے ان عورتوں سے نکاح کرنے کا ارادہ کیا۔ تو یہ آیت ان لوگوں پر زجر کے لئے اُتری۔

سوال: ''قُلْ لِّلْمُؤْمِنِیْنَ یَغُضُّوْا مِنْ اَبْصَارِهِمْ وَیَحْفَظُوْا فُرُوْجَهُمْ'' (آپ مسلمان مردوں سے کہہ دیجئے کہ اپنی نگاہیں نیچی رکھیں اور اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کریں) ابصار پر ''من'' داخل ہے۔ ''فروجھم'' پر نہیں۔ کیوں؟۔

جواب: شرمگاہ کے مقابلے میں نظر کا معاملہ زیادہ وسیع ہے۔ کیوں کہ اپنی محارم کے چہروں کی طرف اور ہاتھ پیروں کی طرف دیکھنا جائز ہے۔ جبکہ ان میں سے کسی کی شرمگاہ کی طرف دیکھنا ہرگز جائز نہیں ہے۔ اس لئے ''ابصار'' پر ''من'' تبعیضیہ داخل کیا گیا۔

سوال: جن لوگوں کے سامنے اپنی زینت کے مواقع کو ظاہر کرنا عورت کے لئے جائز ہے' ان میں ماموں اور چچا بھی شامل ہیں۔ مگر آیت میں ان دونوں کا ذکر نہیں ہے کیا وجہ ہے؟۔

جواب: ستر میں نہایت احتیاط سے کام لینے کی طرف اشارہ کرنے سے ان کا تذکرہ نہیں کیا گیا۔ تاکہ ماموں اور چچا اس کی صفت اپنے بیٹے کے سامنے نہ کریں۔ اور فتنہ کا اندیشہ نہ ہو۔ اس لئے کہ چچازاد اور ماموں زاد محرم نہیں ہوتے۔

سوال: اللہ تعالیٰ نے کیسے فرمایا: ''وَلَا تُکْرِهُوْا فَتَیٰتِکُمْ عَلَی الْبِغَآءِ اِنْ اَرَدْنَ تَحَصُّنًا'' (اپنی لونڈیوں کو زنا کرنے پر مجبور نہ کرو جب وہ پاکدامن رہنا چاہیں) جبکہ زنا پر مجبور کرنا ہر حال میں حرام وممنوع ہے؟۔

جوابِ اوّل: اصل میں کفار اپنی لونڈیوں کو ان کے پاکدامن رہنے کی خواہش کے باوجود زنا پر مجبور کرتے تھے' آیت ان کے متعلق اتری ہے۔ تو یہ شرط نہیں ہے۔

جوابِ ثانی: اللہ تعالیٰ نے ''اِنْ اَرَدْنَ تَحَصُّنًا'' کی شرط اس لئے لگائی کہ ''اکراہ'' (مجبور کرنا) جب ہوتا ہے کہ جب کے زنا نہ کرنے کا قصد ہو۔اگر پاکدامن نہ رہنا چاہتی ہو۔تو وہ طبعاً زنا کرے گی۔اس لئے کہ طبعا ہر وقت زنا کی خواہش میں رہتی ہے۔

جوابِ ثالث: یہاں لفظ ''ان'' ''اذ'' کے معنی میں ہے۔جیسا کہ آیت ''وَذَرُوْا مَابَقِیَ مِنَ الرِّبٰوا اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ '' میں لفظ ''ان'' اور ارشادِ باری: ''وَاَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ'' میں ''ان'' ''اذ'' کے معنی میں ہے۔

سوال: ''مَثَلُ نُوْرِهٖ كَمِشْكٰوةٍ فِيْهَا مِصْبَاحٌ'' (اس کے نور کی مثال ایک طاق کی طرح ہے (اور) اس میں ایک چراغ ہے) اللہ تعالیٰ نے مؤمنین کے دل میں اپنے نور (معرفت وہدایت) کی مثال چراغ سے دی ہے۔چاند سورج سے نہیں دی ہے۔حالانکہ چاند سورج کی روشنی چراغ کی روشنی سے بڑھ کر ہے؟

جوابِ اوّل: مقصود مومن کے دل کے نور کی مثال دینا ہے۔چونکہ نور دل میں اور دل سینے میں اور سینہ بدن میں ہے۔اسی طرح چراغ شیشہ میں اور شیشہ طاق میں ہوتا ہے اور نور کی یہ تمثیل صرف چراغ ہی کے ساتھ ہوتی ہے۔جبکہ چاند و سورج اس طرح نہیں ہوتے۔

جوابِ ثانی: نور معرفت کے کچھ ذرائع ہیں جن کا پایا جانا ضروری ہے جیسے ذہن، فہم، عقل، بیدار مغزی اور انشراح قلب وغیرہ اسی طرح چراغ کے لئے بھی قندیل، تیل، فتیلہ وغیرہ کی ضرورت ہوتی ہے۔تو تمثیل چراغ ہی کے ساتھ دینا مناسب ہوا۔

جوابِ ثالث: سورج کی روشنی عالم سفلی کی طرف متوجہ ہے عالم علوی کی طرف متوجہ نہیں ہے۔ جبکہ نورِ معرفت نور چراغ کی طرح عالم علوی کی طرف متوجہ ہے۔

جوابِ رابع: سورج کی روشنی تمام مخلوق کو عام ہے۔جبکہ نور معرفت سب کو عام نہیں چراغ کی روشنی بھی ایسی ہی ہے۔

سوال: مذکورہ وجوہ کی بنا پر سورج کی روشنی کے ساتھ تو تشبیہ نہ دی گئی۔مگر شمع کی روشنی کے ساتھ بھی تمثیل نہیں دی حالانکہ مصباح کے مقابلے میں شمع کی روشنی زیادہ ہوتی ہے؟۔

جواب: شمع کی روشنی کے ساتھ اس لئے تشبیہ نہ دی کہ یہ اغنیاء کے ساتھ مخصوص ہے بخلاف نورِ معرفت کے۔وہ اغنیا کے مقابلے میں فقراء میں زیادہ ہے۔

سوال: ''رِجَالٌ لَّا تُلْهِيْهِمْ تِجَارَةٌ وَّلَا بَيْعٌ عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ'' (وہ مرد کہ جو غافل نہیں ہوتے سودا کرنے میں اور نہ بیچنے میں اللہ کے ذکر سے) تجارت بیع وشراء دونوں کو شامل ہے۔تجارت

کے بعد بیع لانے کا کیا فائدہ؟۔

جوابِ اوّل: تجارت جوخرید وفروخت کوشامل ہے وہ انسان کا پیشہ ہے جس سے مقصود منافع کمانا ہے۔ بیع اس سے عام ہے۔

جوابِ ثانی: بعض علماء نے کہا: یہاں بیع سے مراد آخرت کے بدلے دنیا لینا ہے یعنی دین کے بدلے دنیا کوترجیح دینا ہے۔ جیسا کہ آیت: ''فَاسْعَوْا اِلٰی ذِکْرِ اللّٰہِ وَذَرُو الْبَیْعَ''

سوال: کیسے فرمایا اللہ تعالیٰ نے: ''وَاللّٰہُ خَلَقَ کُلَّ دَآبَّۃٍ مِّنْ مَّآءٍ'' (اللہ تعالیٰ نے ہر دابہ کو پانی سے پیدا فرمایا) حالانکہ بعض دابہ (چلنے والی مخلوق) پانی سے پیدا نہیں ہوئی ہیں۔ جیسا کہ آدم علیہ السلام اور حضرت صالح علیہ السلام کی اونٹنی وغیرہ؟

جواب: یہاں آیت میں ''ماء'' (پانی) سے مراد وہ پانی ہے جو تمام مخلوق کا اصل ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ نے انسان کو پیدا کرنے سے پہلے ایک جوہر پیدا فرمایا۔ پھر اس کی طرف بنظر ہیبت دیکھا۔ تو وہ پانی میں تبدیل ہوا اس پانی سے تمام مخلوقات کی تخلیق فرمائی۔ یہ سوال مع جواب فرمانِ باری تعالیٰ: ''وَجَعَلْنَا مِنَ الْمَاءِ کُلَّ شَیْءٍ حَیٍّ'' کے تحت گذرا ہے۔

سوال: اگر یہ بات ہے تو خاص کر دابہ یا حی ذکر کرنے کا کیا فائدہ ہے؟

جواب: دابہ کو بطور خاص ذکر اس لئے کیا کہ اس میں اللہ تعالیٰ کی قدرت کا کمال جمادات کے مقابلے میں زیادہ ظاہر ہے۔

سوال: فَمِنْهُمْ مَّنْ یَّمْشِیْ عَلٰی بَطْنِهٖ ج وَمِنْهُمْ مَّنْ یَّمْشِیْ عَلٰی رِجْلَیْنِ وَمِنْهُمْ مَّنْ یَّمْشِیْ عَلٰی اَرْبَعٍ'' (ان میں بعضے تو وہ ہیں جو اپنے پیٹ کے بل چلتے ہیں اور بعضے ان میں وہ ہیں جو دو پیروں پر چلتے ہیں۔ اور بعض ان میں وہ ہیں جو چار پر چلتے ہیں)۔ عربی قاعدے کے رو سے لفظ ''من'' عاقل کے لئے اور ''ما'' غیر عاقل کے لئے استعمال ہوتا ہے جبکہ آیت میں: ''مَنْ یَّمْشِیْ عَلٰی بَطْنِهٖ'' اور ''مَنْ یَّمْشِیْ عَلٰی اَرْبَعٍ'' میں ''من'' غیر عاقل کے لئے استعمال ہوا ہے؟

جواب: لفظ ''دابہ'' چونکہ عاقل اور غیر عاقل دونوں کو شامل ہے تو عاقل کو غیر عاقل پر غلبہ دیکر غیر عاقل کے لئے ''من'' استعمال کیا گیا۔

سوال: ''مَنْ یَّمْشِیْ عَلٰی بَطْنِهٖ'' (جو پیٹ کے بل چلتے ہیں) پیٹ کے چلنے کو مشی کے ساتھ تعبیر کیا۔ حالانکہ پیٹ کے چلنے کو زحف کہتے ہیں؟ مشی پیروں کے چلنے کو کہا جاتا ہے۔

جواب: مجازاً مشی فرمایا۔

سوال: اللہ تعالیٰ نے نابالغ لڑکوں کو اس آیت میں اجازت لینے کا کیسے حکم دیا؟ کیسے فرمایا"وَالَّذِينَ لَمْ يَبْلُغُوا الْحُلُمَ مِنكُمْ" (اور وہ لوگ جو کہ نہیں پہنچتے تم میں عقل کی حد کو) حالانکہ وہ غیر مکلف ہیں؟۔

جواب: یہ والدین کو حکم ہے کہ وہ اپنے بچوں کو ادب وتہذیب سکھادیں۔

سوال: اللہ تعالیٰ نے"وَالْقَوَاعِدُ مِنَ النِّسَاءِ" (اور جو بیٹھ رہی ہیں گھروں میں تمہاری عورتیں) فرما کر بوڑھی عورتوں کو گھر کے مردوں کے سامنے کپڑے اتارنے کا حکم کیسے دیدیا؟۔

جواب: یہاں آیت میں"ثیاب" سے مراد دوپٹے کے اوپر پہننے والی بڑی چادر ہے۔ تمام کپڑے مراد نہیں ہیں۔

سوال: "وَلَا عَلَىٰ أَنفُسِكُمْ أَن تَأْكُلُوا مِن بُيُوتِكُمْ" (اور نہیں ہے کوئی حرج تم لوگوں پر کہ کھاؤ اپنے گھروں سے) اپنے گھر میں کھانے میں حرج نہ ہونا ظاہر وواضح ہے۔ اس میں کوئی شک وشبہ نہیں ہے۔ پھر ایسا کیوں فرمایا؟

جواب: "مِن بُيُوتِكُمْ" سے"من بیوت اولادکم" مراد ہے یعنی اپنی اولاد کے گھروں میں کھانے میں کوئی حرج نہیں ہے۔ اس لئے کہ انسان کا بچہ اس کا جز اور اس کا بعض ہے۔ اور بعض شئی پر شئی کا اطلاق ہوتا ہے۔ اس لئے حدیث شریف میں اس پر اسکا اطلاق فرمایا۔ فرمانِ رسول ﷺ ہے:"ان اطیب ما یاکل الرجل من کسبه وان ولده من کسبه" (انسان کی پاکیزہ غذا اُس کی کمائی کی غذا ہے۔ اور اس کا بچہ اس کی کمائی ہے)۔

دلیل اس کی یہ ہے کہ آیت میں تمام اقرباء کے گھروں کا تذکرہ کیا گیا۔ مگر اولاد کے گھروں کا تذکرہ نہیں ہوا۔ تو"من بیوتکم" سے مراد"مِن بُيُوتِ أَوْلَادِكُمْ" ہے بعض نے کہا:"أَن تَأْكُلُوا مِن بُيُوتِكُمْ" سے مراد"من مال اولادکم وازواجکم الذین هم فی بیوتکم" ہے۔

سوال: السلام کا معنی سلامتی اور امن ہے۔ جب انسان دوسرے کو السلام علیکم کہتا ہے تو اس کا مطلب ہے تم مجھ سے امن وسلامتی میں ہو۔ تو آیت:"فَإِذَا دَخَلْتُم بُيُوتًا فَسَلِّمُوا عَلَىٰ أَنفُسِكُمْ" (جب تم گھروں میں جانے لگو تو اپنے اوپر سلام کرو)۔ کا کیا معنی ہوگا۔ اپنے آپ کو امن وسلامتی دینے کا کیا مطلب ہے؟

جواب: آیت کا مطلب یہ ہے کہ"جب اپنے گھروں میں داخل ہو جاؤ تو اہل خانہ کو سلام کرو۔ بعض علماء نے کہا ہے: کہ اس کا معنی ہے کہ جب تم مسجد یا کسی گھر میں داخل ہو اور وہاں کوئی موجود نہ ہو تو یوں کہو:"اَلسَّلَامُ عَلَيْنَا وَعَلَىٰ عِبَادِ اللّٰهِ الصَّالِحِينَ" سوال:"فَلْيَحْذَرِ الَّذِينَ

یُخَالِفُوْنَ عَنْ اَمْرِہٖ'' یہاں خالف کے صلے میں ''عن'' لایا گیا' حالانکہ یہ بغیر حرف جر کے متعدی ہوتا ہے۔ کہا جاتا ہے ''خالف امرہ'' خالف عن امرہ نہیں کہا جاتا۔

جوابِ اوّل: لفظ ''عن'' زائدہ ہے۔ امام اخفش بھی یہی فرماتے ہیں۔

جوابِ ثانی: یہاں فعل محذوف ہے۔ عن اس کے صلے میں آیا ہے۔ تقدیر عبارت یوں ہے۔ ''فَلْیَحْذَرِ الَّذِیْنَ یُخَالِفُوْنَ اللّٰہَ تَعَالٰی وَیُعْرِضُوْنَ عَنْ اَمْرِہٖ'' یا یہ کہا جائے کہ اس میں تضمین ہے۔ یعنی یخالفون کے ضمن میں معنی اعراض ہے تو اس کے صلے میں عن اس وجہ سے لایا گیا۔

# سورۃ الفرقان

سوال: جنت کی صفت میں اللہ تعالیٰ نے کیسے فرمایا: ''وَالْمُتَّقِیْنَ کَانَتْ لَھُمْ جَزَآءً وَّمَصِیْرًا'' جب لفظ ''کَانَ'' گذشتہ (ماضی) کے لئے استعمال ہوتا ہے جبکہ متقین ابھی تک جنت میں نہیں گئے ہیں۔ یہ جزاء وانعام بعد میں ہوگا۔ آیت میں کانت کیسے لایا گیا؟۔

جواب: اس کو ماضی کے صیغے کے ساتھ اس لئے استعمال کیا گیا کہ اس کا ہونا یقینی ہے۔ چونکہ یہ اللہ تعالیٰ کا وعدہ ہے۔ اور اللہ تعالیٰ کے وعدے کا وقوع ایسا یقینی ہے جیسا وقوع میں آیا ہوا ہے' اس لئے ماضی کا صیغہ استعمال ہوا' یا اس کا مطلب یہ بھی ہوسکتا ہے۔ ان کو جنت کی صورت میں یہ اجر عظیم ملنا اللہ تعالیٰ کے علم میں پہلے سے ہے۔

سوال: کیسے فرمایا اللہ پاک نے: ''اَمْ تَحْسَبُ اَنَّ اَکْثَرَھُمْ یَسْمَعُوْنَ اَوْ یَعْقِلُوْنَ'' کیا آپ خیال کرتے ہیں! کہ ان میں سے اکثر سنتے ہیں یا سمجھتے ہیں؟۔

جواب: یہ سوال مع الجواب آیت: ''بَلْ جَآءَھُمْ بِالْحَقِّ وَاَکْثَرُھُمْ لِلْحَقِّ کٰرِھُوْنَ'' کے تحت گذر چکا ہے' وہاں دیکھ لیا جائے۔

سوال: ''اِنْ ھُمْ اِلَّا کَالْاَنْعَامِ'' یہ (کفار) چوپایوں کی طرح ہیں) اللہ تعالیٰ نے اپنے نہ ماننے والوں کی تشبیہ چوپایوں کے ساتھ کیسے دی حالانکہ آیت سے ثابت ہے کہ چوپائے بھی اللہ تعالیٰ کی تسبیح وتحمید بیان کرتے ہیں۔ چنانچہ فرمان باری ہے: ''وَاِنْ مِّنْ شَیْءٍ اِلَّا یُسَبِّحُ بِحَمْدِہٖ وَلٰکِنْ لَّا تَفْقَھُوْنَ تَسْبِیْحَھُمْ'' (اور ہر چیز اللہ ہی کی حمد بیان کرتی ہے اور لیکن تم سمجھتے نہیں ہو ان کی تسبیح کو) دوسری جگہ ارشاد ہے: ''یُسَبِّحُ لِلّٰہِ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الْاَرْضِ ''؟ (تسبیح بیان کرتی ہے اللہ کی ہر وہ چیز جو آسمانوں میں ہے اور زمینوں میں)

جوابِ اوّل: انعام (چوپایوں) کے ساتھ ان کی تشبیہ رسول کے ذریعے اللہ تعالیٰ کی عدم معرفت

میں ہے۔
جوابِ ثانی: دین کے معاملے میں کورے پن اور اندھا پن میں جانوروں کے ساتھ تشبیہ دی گئی ہے۔
سوال: ''اِنْ هُمْ اِلَّا کَالْاَنْعَامِ بَلْ هُمْ اَضَلُّ سَبِیْلًا'' (اور کچھ نہیں وہ برابر ہیں چوپایوں کے بلکہ وہ زیادہ بہکے ہوئے ہیں راہ سے)۔
سوال یہ ہے کہ پہلے جملے میں کفار گمراہی میں چوپایوں کے برابر جبکہ دوسرے جملے میں چوپایوں سے بھی گئے گذرے قرار دیئے جارہے ہیں۔ دونوں میں تطبیق کیسے ہوگی؟۔
جوابِ اوّل: پہلے جملے ''اِنْ هُمْ اِلَّا کَالْاَنْعَامِ'' میں چوپایوں کے ساتھ کفار کی تشبیہ اصل گمراہی میں تشبیہ ہے۔ مقدار گمراہی میں نہیں، جبکہ جملہ ثانیہ ''بَلْ هُمْ اَضَلُّ سَبِیْلًا'' میں مقدار گمراہی بیان کرنا مقصود ہے۔
جوابِ ثانی: بعض علماء نے کہا ہے: کہ پہلے جملے میں بھی جانوروں کے ساتھ تشبیہ مقدار گمراہی میں ہے۔ مگر پہلے جملہ سے ایک طائفہ اور دوسرے جملے سے اس کے علاوہ دوسرا گروہ مراد ہے۔ کفار کے گمراہی میں جانوروں سے بھی بدتر ہونے کی وجہ یہ ہے کہ جانور اپنے مالک کے فرماں بردار ہوتے ہیں۔ اور اپنے ساتھ بھلائی کرنے والوں کو جانتے ہیں اور ایذاء پہنچانے والوں کو بھی۔ اپنے فائدے کی چیز کو طلب کرتے ہیں اور نقصان دہ چیز سے خود کو بچاتے ہیں۔ جبکہ یہ کفار اپنے مالک حقیقی کے تابعدار نہیں ہیں اور اللہ تعالیٰ کے احسانات کو نہیں پہچانتے۔ اور اپنے عظیم فائدے کی چیز عظیم ثواب کے طالب نہیں ہوتے۔ اور اللہ تعالیٰ کے عذاب شدید سے خود کو نہیں بچاتے۔
سوال: ''وَاَنْزَلْنَا مِنَ السَّمَاءِ مَاءً طَهُوْرًا لِنُحْیِیَ بِهٖ بَلْدَةً مَّیْتًا'' (اور ہم نے اتارا آسمان سے پانی پاکی حاصل کرنے کے لئے تاکہ ہم زندہ کر دیں مرے ہوئے دیس کو) میں بلدة موصوف 'میتا اس کی صفت ہے' مگر موصوف صفت میں تذکیر و تانیث میں مطابقت نہیں ہے موصوف مؤنث جبکہ صفت مذکر ہے۔
جواب: بلدة کو مکان اور بلد کے معنی میں لیکر صفت مذکر ہے لفظ کا اعتبار نہیں۔
سوال: مذکورہ آیت میں ''ماء'' کو ''طهورا'' کے ساتھ موصوف کیا گیا۔ اور ''لنحی بہ'' سے اس کی علت بیان کی گئی۔ تو مطلب یہ ہوگا۔ بے آباد زمین کو آباد کرنے کے لئے ''ماء طهور'' (پاک پانی) کا ہونا ضروری ہے۔ حالانکہ واقعہ ایسا نہیں ہے؟۔
جواب: ''وَنُسْقِیَهٗ مِمَّا خَلَقْنَا اَنْعَامًا وَّاَنَاسِیَّ کَثِیْرًا'' (اور پلائیں اس کو اپنے پیدا کئے

ہوئے چوپایوں اور آدمیوں کو) انسان چونکہ اس پانی سے پیتا ہے اس لئے انسان کے اکرام کے طور پر "ماء" کو طہوریت کے وصف کے ساتھ متصف کیا گیا' ورنہ آبادئ زمین کے لئے پانی کا صاف وشفاف اور طاہر ہونا ضروری نہیں۔

سوال: "وَنُسۡقِيَهٗ مِمَّا خَلَقۡنَاۤ اَنۡعَامًا" (ہم اس سے چوپایوں کو پلاتے ہیں)۔ "انعام" کو بطور خاص ذکر فرمایا۔ حالانکہ پانی سے چوپایوں کے علاوہ دوسری مخلوقات بھی بہرہ ور ہوتی ہیں ان کو بطور خاص ذکر کرنے کی کیا وجہ ہے؟۔

جوابِ اوّل: اس لئے کہ پرندے اور وحشی جانور' عام چوپایوں کے مقابلے میں پانی سے دور رہتے ہیں۔ دوسری وجہ ذکر کی یہ ہے کہ چوپائے انسانوں کے استعمال اور منافع میں آتے ہیں۔ تو انسانوں پر مزید احسان جتلانے کے لئے فرمایا کہ تم اور تمہارے جانور ہمارے اتارے ہوئے پانی سے مسلسل مستفیض ہوتے رہتے ہیں۔

سوال: اس آیت میں پانی سے زمین کی آبادی اور جانوروں کے پینے کو انسانوں سے پہلے بیان فرمایا گیا ہے۔ کیا اس میں کوئی خاص حکمت ہے؟۔

جواب: اس لئے کہ انسان کا زندہ رہنا زمین کی آبادی اور چوپاؤں کی زندگی سے مشروط ہے' ذکر کیا گیا۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ بارش کا پانی انسانی استعمال سے پہلے زمین پر پڑتا ہے' اس لئے اس کا تذکرہ پہلے کر دیا۔

سوال: آیت "قُلۡ مَاۤ اَسۡـَٔلُكُمۡ عَلَيۡهِ مِنۡ اَجۡرٍ اِلَّا مَنۡ شَآءَ اَنۡ يَّتَّخِذَ اِلٰى رَبِّهٖ سَبِيۡلًا" (آپ کہہ دیجئے کہ میں نہیں مانگتا تم سے اس پر کچھ مزدوری مگر جو کوئی چاہے وہ پکڑ لے اپنے رب کی طرف راستہ) میں من شاء کا ماقبل سے استثنیٰ کیسے صحیح ہے؟۔

جواب: یہ مستثنیٰ متصل نہیں ہے' بلکہ مستثنیٰ منقطع ہے' تقدیر عبارت یوں ہے: "لٰكِنۡ مَّنۡ شَآءَ اَنۡ يَّتَّخِذَ اِلٰى رَبِّهٖ سَبِيۡلًا فانا ادله على ذلك واهديه اليه"

سوال: یہاں آیت میں فرمایا جا رہا ہے: "قُلۡ مَاۤ اَسۡـَٔلُكُمۡ عَلَيۡهِ مِنۡ اَجۡرٍ" (آپ کہہ دیجئے میں تم سے (تبلیغ دین کے بدلے) کوئی بدلہ نہیں لیتا) دوسری جگہ ارشاد ہے: "قُلۡ لَّاۤ اَسۡـَٔلُكُمۡ عَلَيۡهِ اَجۡرًا اِلَّا الۡمَوَدَّةَ فِى الۡقُرۡبٰى" (کہہ دیجئے میں تم سے سوائے رشتے کی محبت کے اور کوئی اجر طلب نہیں کرتا) پہلی آیت میں ہر قسم کے بدل کی نفی ہے جبکہ دوسری آیت میں "مودت فی القربیٰ" کو بطور اجر لینے کو کہا ہے دونوں میں تطبیق کیسے "قُلۡ لَّاۤ اَسۡـَٔلُكُمۡ الخ" کا جواب مذکور

نہیں ہوگی؟۔

سوال: "وَاجْعَلْنَا لِلْمُتَّقِيْنَ اِمَامًا" (اے اللہ ہمیں متقیوں کا پیشوا بنادے) قاعدے کی رو سے "امامًا" کے بجائے "ائمة" ہونا چاہیے۔ اس لئے کہ "اجعلنا" جمع ہے تو "امامًا" "ائمة" جمع آنا چاہیے؟۔

جواب: فواصلِ آیات کی رعایت کے لئے مفرد لایا گیا۔ بعض علماء نے کہا ہے کہ تقدیرِ آیت اس طرح ہے: "وَاجعل کل واحد منا اماما"

سوال: "وَيُلَقَّوْنَ فِيْهَا تَحِيَّةً وَّسَلٰمًا" (اور وہ لینے آئیں ان کو دعا اور سلام کہتے ہوئے) تحیہ پر سلام کا عطف ہے جو تغایر پر دلالت کرتا ہے۔ حالانکہ قرآن وحدیث کے رو سے تحیہ اور سلام مراد ف اور ہم معنی ہیں؟

جواب: امام مقاتلؒ فرماتے ہیں: کہ تحیہ سے مراد اہل جنت کا ایک دوسرے کو سلام کرنا یا فرشتوں کا سلام کرنا ہے اور "سلام" سے مراد اللہ تعالیٰ کی طرف سلام ہے۔ جیسا کہ فرمایا گیا: "سَلٰمٌ قَوْلًا مِّنْ رَّبٍّ رَّحِيْمٍ" بعض اہل علم کا کہنا ہے "التحیہ" سے مراد اللہ تعالیٰ کی طرف سے تحفے اور ہدایا ہیں اور "سلاما" سے مراد قولاً سلام کہہ دینا ہے۔

# سورۃ الشعراء

سوال: ایک جگہ: "فَقُوْلَآ اِنَّا رَسُوْلُ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ" (پس آپ کہہ دیجئے کہ بیشک ہم رب العالمین کی طرف سے رسول بنا کر بھیجا گیا ہوں) میں لفظ رسول کو مفرد اور "انا رسولا ربک" میں لفظِ رسول کو تثنیہ لے آئے ہیں۔ کیا وجہ ہے؟

جوابِ اوّل: رسول مرسل کے معنی میں بھی کبھی استعمال ہوتا ہے اور بمعنی مصدر بھی استعمال ہوتا ہے دوسری آیت میں بمعنی مرسل ہے جو تثنیہ استعمال کیا گیا ہے اور پہلی آیت میں رسول بمعنی مصدر ہے جو واحد، تثنیہ، جمع، سبھی کے لئے بولا جاتا ہے۔ شاعر کا یہ شعر بھی اس پر دال ہے کہ رسول مصدر کے معنی میں استعمال ہوسکتا ہے۔ شعر:

لقد کذب الواشون ما بحث عنهم ☆ بسرٍّ ولا ارسلتهم برسول

اس شعر میں "برسول" برسالۃ (جو مصدر ہے) کے معنی میں ہے۔

جوابِ ثانی: چونکہ موسیٰ وہارون علیہما السلام۔ دونوں بھائی ہونے میں اور شریعت ورسالت میں

متحد ہیں تو گویا وہ نفس واحد کے حکم میں ہیں۔اس لئے رسول کو مفرد ذکر کیا گیا۔

**جوابِ ثالث:** اس میں عبارت مقدر ہے۔تقدیر عبارت یوں ہے:''ان کل واحد منا رسول رب العالمین''

**جوابِ رابع:** حضرت موسیٰ علیہ السلام چونکہ اصل تھے اور ہارون علیہ السلام تابع۔تو اس نکتے کی طرف اشارہ کرنے کے بعد رسول کو مفرد ذکر کیا گیا۔

**سوال:** حضرت موسیٰ علیہ السلام نے قبطی کے قتل کے متعلق عذر کرتے ہوئے:''فَعَلْتُهَآ اِذًا وَّاَنَا مِنَ الضَّآلِّيْنَ''(اس وقت میں کر بیٹھا تھا اور مجھ سے غلطی ہوگئی تھی) فرمایا۔حالانکہ نبی ضال نہیں ہوتا؟

**جواب:** یہاں''من الضالین'' سے مراد''من الجاہلین'' ہے۔حضرت ابن مسعودؓ کی قرأت بھی انا من الضالین کے بجائے''من الجاہلین'' ہے۔بعض نے کہا''انا من الخطئین'' ہے اس لئے کہ حضرت موسیٰ نے قبطی کو قتل کے ارادے سے نہیں مارا۔''ضل'' خطا کے معنی میں استعمال ہوتا ہے اور بعض علماء نے کہا ہے:ضل نسیان (بھولنے) کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے۔قرآن کریم میں''نسی'' کے معنی میں استعمال ہوا ہے'فرمانِ باری ہے:''اَنْ تَضِلَّ اِحْدٰهُمَا فَتُذَكِّرَ اِحْدٰهُمَا الْاُخْرٰى''میں''اَن تضل''''ان تنسی'' کے معنی میں ہے۔

**سوال:** کیسے کہا فرعون نے''وَمَا رَبُّ الْعَالَمِيْنَ''(رب العالمین کیا ہوتا ہے) لفظ''ما''تو غیر عاقل کے لئے استعمال ہوتا ہے؟۔

**جوابِ اوّل:** وہ تو دل کا کورا اور اندھا تھا۔اللہ کی معرفت سے عاری اور اس کے وجود کا منکر تھا۔ تو وہ کچھ بھی کہہ سکتا ہے'لہٰذا اس سے درست بولنے کی کیا توقع کی جاسکتی ہے۔

**جوابِ ثانی:** لفظ''ما'' غیر عاقل کے ساتھ خاص نہیں ہے' بلکہ عاقل کے لئے بھی استعمال ہوتا ہے۔قرآنِ کریم میں عاقل کے لئے جگہ جگہ لفظ ما استعمال ہوا ہے'فرمانِ باری تعالیٰ ہے:''فَانْكِحُوْا مَا طَابَ لَكُمْ مِّنَ النِّسَآءِ''میں لفظ''ما'' عاقل کے لئے استعمال ہوا ہے۔اسی طرح دوسری آیت''وَلَآ اَنْتُمْ عَابِدُوْنَ مَآ اَعْبُدُ''میں لفظ''ما'' سے مراد اللہ تعالیٰ ہیں۔

**سوال:**''رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا اِنْ كُنْتُمْ مُّوْقِنِيْنَ''(آسمانوں اور زمینوں اور جو زمین و آسمان کے درمیان ہے اس کا رب (اللہ) ہے اگر تم یقین کرنے والے ہو)۔ اللہ تعالیٰ کے زمین و آسمان کے رب ہونے کو ان کے یقین کرنے سے معلق کیا گیا؟اس کا مطلب یہ ہے اگر وہ یقین نہیں کریں گے تو وہ زمین و آسمان کا رب نہیں ہوگا۔حالانکہ ایسا نہیں ہے؟۔

جواب: ''ان کنتم ''میں ''ان'' نافیہ ہے شرطیہ نہیں۔
سوال: اوپر والی آیت میں زمین وآسمان کا رب اور جو کچھ زمین وآسمان کے درمیان ہے یعنی تمام مخلوقات کا رب فرمایا۔ اس میں تمام لوگ آ گئے' پھر آگے ''رَبُّکُمۡ وَرَبُّ اٰبَآئِکُمُ الۡاَوَّلِیۡنَ'' (تمہارا پروردگار اور تمہارے پہلے باپ دادوں کا پروردگار) اور ''رَبُّ الۡمَشۡرِقِ وَالۡمَغۡرِبِ وَمَا بَیۡنَهُمَا'' (مشرق کا رب اور مغرب کا رب اور جو کچھ اس کے درمیان میں ہے) لانے کا کیا فائدہ؟
جواب: امتیازی خصوصیت کی بنا پر ان کو دوبارہ ذکر کیا۔ تاکہ اس سے مزید استدلال کر سکیں۔ چونکہ انسان جو سب سے قریب تر چیز دیکھتا ہے وہ اس کا اپنا نفس ہے۔ اور پھر اس کی ولادت۔ ان کے احوال کی تبدیلی۔ ایک حالت سے دوسری حالت کی طرف منتقل ہونا یہ سب کچھ انسان کو اس کے صانع کی معرفت کی طرف دعوت فکر دیتے ہیں۔ پھر مشرق و مغرب کو بطور خاص ذکر کیا کہ یہ اللہ تعالیٰ کی عظیم مخلوق ہے آفتاب کے طلوع و غروب کے مقامات میں مختلف موسموں کے اعتبار سے ان میں تبدیلی ہوتی رہتی ہے۔ اس لئے حضرت ابراہیم خلیل اللہ نے اللہ کے وجود پر واضح اور ٹھوس دلیل دی۔ جس پر کافر (فرعون) کی بولتی بند ہو گئی۔
سوال: ''لَاَجۡعَلَنَّکَ مِنَ الۡمَسۡجُوۡنِیۡنَ'' (تم کو قیدیوں میں سے بنا دوں گا) کی بجائے ''لا سجننک'' (میں تمہیں قید کر ڈالوں گا) زیادہ مختصر تھا۔ مختصر کو چھوڑ کر طویل کلام کیوں اختیار کیا؟۔
جواب: یہ الفاظ مزید ڈرانے کے لئے کہے۔ گویا اس نے کہا میرے جو قیدی ہیں ان کی حالت تمہارے سامنے ہے۔ تم کو بھی انہیں کی طرح سزا دوں گا اس کے قید کرنے کا طریقہ یہ تھا۔ کہ قیدی کو انتہائی گہری اور اندھیری کھائی میں ڈال دیتا کہ جس میں انسانی صورت دیکھنا تو درکنار کچھ سنا بھی نہیں جا سکتا تھا۔ یہ سزا قتل اور مار ڈالنے سے زیادہ باعث تکلیف تھی۔ اس لئے کہا کہ تمہیں اپنے خاص قیدیوں کے ساتھ رکھوں گا۔
سوال: حضرت موسیٰ علیہ السلام کے فرعون اور ساحروں کے ساتھ ہونے والے واقعے کو سورۃ 'اعراف' میں پھر سورۃ ''طٰہٰ' میں اور پھر یہاں ذکر فرمایا ہے تو ان قصوں کو مکرر ذکر کرنے کا کیا فائدہ ہے؟۔
جوابِ اوّل: اس تکرار کا فائدہ یہ ہے کہ اس سے کافروں کو چیلنج اور ان کے عجز کا بار بار اظہار ہے۔ جیسا کہ برسرِ میدان لڑنے والا میدانِ کارزار میں آکر اپنے مدِ مقابل کو ''نزال نزال هل من مبارز هل من مبارز'' (آؤ میرے مقابلے میں' آؤ میرے مقابلے میں' ہے کوئی مقابلہ کرنے والا؟ ہے کوئی مقابلہ کرنے والا؟)۔ کے الفاظ مکرر کہہ کر دعوت مقابلہ دیتا ہے۔ قرآنِ کریم میں

چونکہ اس قسم کے قصے بار بار ذکر کئے گئے ہیں اسی وجہ سے قرآن کریم کو اللہ تعالیٰ نے "مثانی" (مکرر) نام دیا۔

جوابِ ثانی: حضرات صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم بعض آپ کے پاس حاضر رہتے، اور بعض غزوات وغیرہ کی غرض سے مدینہ سے غائب رہتے۔ چنانچہ ان غائبین کی آمد پر ان کے اکرام کے طور پر سابقہ آیات جو ان کی غیر موجودگی میں نازل ہوئی تھیں دوبارہ نازل ہوتیں۔ کیوں کہ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم نزولِ وحی کے وقت آپؐ کے پاس حاضری کو پسند فرماتے تھے۔

سوال: اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے قصے کو دوسرے انبیاءِ کرام علیہم السلام کے قصوں کے مقابلے میں زیادہ تکرار کے ساتھ ذکر فرمایا ہے۔ کیوں؟۔

جواب: اس لئے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے احوال حضرت نبی کریم ﷺ کے احوال کے زیادہ مشابہ ہیں۔ بنسبت دوسرے انبیاءِ کرام علیہم السلام کے یعنی دلائل قائم کرنے معجزات کو ظاہر کرنے، اور اہل مکہ کی طرح اہل مصر کے بار بار انکار کرنے میں۔

سوال: "فَلَمَّا تَرَآءَ الْجَمْعٰنِ" (اور پھر جب مقابل ہوئیں دونوں فوجیں) "تراءی" رؤیت سے تفاعل کا صیغہ ہے جو ایک دوسرے کو دیکھنے کے معنی میں ہے، مطلب یہ ہے کہ دونوں گروہوں نے ایک دوسرے کو دیکھا، حالانکہ منقول یہ ہے کہ دونوں گروہ ایک دوسرے کو نہ دیکھ سکے تھے اس لئے کہ اللہ تعالیٰ نے ایک سفید بادل ان کے درمیان حائل کیا تھا جس کی وجہ سے ایک دوسرے کو نہیں دیکھ سکتے تھے؟۔

جواب: "التراءی" جس طرح ایک دوسرے کو دیکھنے کے معنی میں استعمال ہوتا ہے اسی طرح سامنے اور قریب ہونے کے معنی میں بھی مستعمل ہے۔

جیسا کہ ارشادِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم ہے: "المؤمن والکافر لا یتراء یان" یعنی مومن اور کافر ایک دوسرے کے قریب نہیں ہو سکتے۔ اہلِ عرب کہتے ہیں "دورنا تتراءی" ہمارے گھر آمنے سامنے ہیں۔

سوال: "وَاِذَا مَرِضْتُ فَهُوَ يَشْفِيْنِ" (جب میں بیمار ہوتا ہوں تو وہ مجھے تندرستی دیتے ہیں)۔ مرض دینے والے اللہ تعالیٰ ہیں تو "مَرِضْتُ" کے بجائے "اَمْرَضَنِیْ" (جب وہ مجھے بیمار کرتے) ہونا چاہئے تھا؟۔

جواب: "اَمْرَضَنِیْ" اس لئے نہیں فرمایا کہ یہ مقام اللہ تعالیٰ کی تعریف کا ہے اور اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کے تذکرے کا ہے۔ تو ادب کا لحاظ کرتے ہوئے خیر محض کی نسبت تو اللہ تعالیٰ کی طرف کی

اور مرض کی نسبت اپنی طرف۔ اگرچہ تمام امور کے خالق اللہ تعالیٰ ہی ہیں، جیسا کہ حضرت خضر علیہ السلام نے کشتی کو عیب دار بنانے کی نسبت ''فَاَرَدْتُّ اَنْ اَعِیْبَهَا'' کہہ کر اپنی طرف کی۔

سوال: مگر ''وَالَّذِیْ یُمِیْتُنِیْ'' (اور وہ مجھے مار دیتا ہے) میں موت بیمار سے بھی سخت ہے اس کو اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب کیا۔ اس میں ادب کا لحاظ نہیں رکھا؟۔

جواب: موت کو اللہ تعالیٰ کی طرف اس لئے منسوب کیا کہ موت اللہ تعالیٰ سے ملنے اور دار مشقت سے کوچ کر کے دار کرامت میں جانے کا ذریعہ ہے۔ گویا ایک نعمت ہوئی۔

سوال: کیسے فرمایا اللہ تعالیٰ نے: ''یَوْمَ لَا یَنْفَعُ مَالٌ وَّلَا بَنُوْنَ'' (جس روز مال فائدہ دیگا نہ اولاد) حالانکہ وہ مال جو اللہ تعالیٰ کی طاعت میں اور اللہ کی راہ میں خرچ ہو اور وہ اولاد جو صالح ہوں نفع ہی نفع ہے اور وہ بچہ جو بلوغ سے قبل مر گیا ہو قیامت کے دن اس کی سفارش کریگا۔ قرآن وحدیث میں اس کے شواہد موجود ہیں خصوصاً ''اذا مات ابن آدم ینقطع عملہ الا من ثلاث'' والی حدیث بطورِ خاص اس پر دال ہے کہ مال واولاد نفع دیں گے؟۔

جواب: آیت کا مطلب یہ ہے غیر مؤمن کو فائدہ نہیں دیں گے۔ اور یہ بھی مراد ہوسکتی ہے کہ مال سے مراد وہ ہے جو راہِ الٰہی اور طاعت خداوندی میں خرچ نہ ہو اور ولد سے مراد ولدِ بالغ غیر صالح ہے۔

سوال: کیسے فرمایا اللہ پاک نے: ''وَاُزْلِفَتِ الْجَنَّةُ لِلْمُتَّقِیْنَ'' (جنت قریب کردی گئی مؤمنین کے) جبکہ جنت ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل ہونے والی چیز نہیں ہے؟۔

جواب: یہاں قلب ہے۔ یعنی عبارت یوں ہے: ''وَاُزْلِفَتِ الْمُتَّقُوْنَ اِلَی الْجَنَّةِ'' (پرہیزگاروں کو جنت کے قریب کردیا گیا) جیسا کہ حجاج کرام مکہ مکرمہ کے قریب پہنچ کر کہتے ہیں) ''قرب مکۃ منا'' (مکہ ہمارے قریب آگیا) یا عام مسافر کسی شہر جاتے وقت اس کے قریب آنے سے اس کا نام لیکر کہتا ہے مثلاً کراچی آگیا۔ اور بعض علماء نے کہا ہے: کہ جنت محجوب ہے۔ جب ان کے اور جنت کے درمیان حجابات رفع ہوگئے تو گویا وہ قریب ہوگئی۔

سوال: ''فَمَا لَنَا مِنْ شَافِعِیْنَ وَلَا صَدِیْقٍ حَمِیْمٍ'' (نہیں ہے ہمارے لئے کوئی سفارش کرنے والا اور نہ ہی کوئی گہرا دوست) شافعین کو جمع اور صدیق کو مفرد کیوں ذکر کیا گیا؟۔

جواب: عام طور پر سفارش کرنے والے زیادہ اور دوست کم ہوتے ہیں۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ لفظ صدیق جمع کے معنی میں ہو جیسا کہ لفظِ عدو جمع کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔

سوال: ''اَمَدَّكُمْ بِاَنْعَامٍ وَّبَنِیْنَ'' (اس نے پہنچائے تم کو چوپائے اور بیٹے) آیت مذکور میں

''انعام'' (چوپایوں) کو ''بنین'' (بیٹوں) کے مقارن کر کے کیوں بیان کیا گیا؟۔
جواب: چونکہ اہلِ عرب کے ہاں ''انعام'' قیمتی ترین اموال میں شمار ہوتے تھے۔ اوران کے بیٹے ان چوپایوں کی حفاظت کیا کرتے تھے اوران کی مدد کرتے تھے۔ اس لئے دونوں کو ملا کر بیان کیا گیا۔
سوال: ''فَعَقَرُوْهَا فَاَصْبَحُوْا نَادِمِيْنَ فَاَخَذَهُمُ الْعَذَابُ'' (اس (اونٹنی) کو ذبح کیا۔ پس اس سے نادم ہوئے تو عذاب نے ان کو پکڑ لیا)
نادم اور پشیمان ہونے کے باوجود عذاب کیسے آیا۔ جبکہ فرمانِ رسولؐ ہے ''الندم توبۃ'' (پشیمان ہونا ہی توبہ ہے) توبہ کے بعد تو عذاب نہیں آتا بلکہ گناہ معاف ہوجاتا ہے؟
جواب: حضرت عبداللہ بن عباسؓ فرماتے ہیں: کہ یہ لوگ عذاب دیکھ کر نادم ہوئے اور وہ توبہ کا وقت نہیں ہے' یعنی وہ توبہ قبول نہیں ہوتی۔ جیسا کہ فرمانِ الٰہی ہے: ''وَلَيْسَتِ التَّوْبَةُ لِلَّذِيْنَ يَعْمَلُوْنَ السَّيِّئَاتِ''
سوال: حضراتِ انبیاءِ کرام علیہم السلام کبائر سے معصوم ہوتے ہیں۔ ان سے گناہ کبیرہ سرزد نہیں ہوتا جب ایسا ہے تو حضرت لوط علیہ السلام نے یہ دعا کیوں کی: ''رَبِّ نَجِّنِيْ وَاَهْلِيْ مِمَّا يَعْمَلُوْنَ'' (اے میرے رب مجھ کو اور میرے اہل کو قوم کے عمل (بدکاری) سے نجات دیجئے)۔
سوال: اس کا مطلب یہ ہے کہ مجھے اور میرے اہل کو قوم کے عمل کی سزاء سے بچایئے۔
سوال: یہاں ''اِذْ قَالَ لَهُمْ شُعَيْبٌ'' فرمایا ''اِذْ قَالَ لَهُمْ اَخُوْهُمْ شُعَيْبٌ'' نہیں فرمایا۔ جیسا کہ دوسرے انبیاء کرام علیہم السلام کے تذکرے میں ''اخوہم'' فرمایا۔ خود حضرت شعیبؑ کے متعلق دوسری آیت میں ''اخوہم'' فرمایا ہے۔ یہاں ''اخوہم'' کیوں نہیں فرمایا؟
جواب: چونکہ یہاں اصحاب مدین کے ساتھ اصحاب الایکۃ کا بھی ذکر ہے ان کی طرف بھی آپؑ مبعوث تھے مگر وہ لوگ آپؑ کی قوم کے نہیں تھے۔ چنانچہ حدیث شریف میں آیا ہے کہ حضرت شعیب علیہ السلام اہل مدین میں سے تھے۔ اور اہل مدین اور اصحاب الایکۃ کی طرف رسول بنا کر بھیجے گئے تھے۔ لیکن ابن جریر طبریؒ نے کہا: اصحاب مدین ہی اصحاب ایکۃ ہیں۔ اگر یہ قول درست ہو تو ''اخوہم'' کو چھوڑنا تخفیف کے لئے ہوگا۔
سوال: اللہ تعالیٰ نے کاہنوں اور نبوت کے جھوٹے دعویداروں کے لئے: ''اَفَّاكٍ اَثِيْمٍ'' (جھوٹے گنہگار) کہا۔ پھر ان کے متعلق فرمایا: ''وَاَكْثَرُهُمْ كٰذِبُوْنَ'' (اور ان میں سے اکثر جھوٹے ہیں) حالانکہ ''افاک'' بھی جھوٹے کو کہتے ہیں۔ دونوں جملوں میں بظاہر تعارض ہے۔ تطبیق کی کیا

صورت ہے؟

جواب: ''وَاَکْثَرُھُمْ'' میں ''ہم'' ضمیر شیاطین کی طرف لوٹ رہی ہے ''کل افاک'' کی طرف نہیں۔

# سورۃ النمل

سوال: ''وَکِتَابٍ مُّبِیْنٍ'' (اور واضح کتاب) میں ''کتاب'' کو نکرہ لانے کا کیا فائدہ ہے؟

جواب: اس کا فائدہ تفخیم و تعظیم ہے۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ کے قول ''فِیْ مَقْعَدِ صِدْقٍ عِنْدَ مَلِیْکٍ مُّقْتَدِرٍ'' میں۔

سوال: ''تِلْکَ اٰیٰتُ الْقُرْاٰنِ وَکِتَابٍ مُّبِیْنٍ'' (یہ آیتیں ہیں قرآن کی اور واضح کتاب کی) 'کتاب' کا عطف ''القرآن'' پر ہے۔ اور عطف مغایرت پر دلالت کرتا ہے حالانکہ کتاب سے مراد بھی قرآن ہے؟۔

جواب: بقول بعض علماء کے اگر ''کتاب مبین'' سے مراد قرآن ہی ہو تو یہ کہا جائے گا کہ مغایرت کی دو قسمیں لفظی اور معنوی' یہاں معنوی مغایرت تو نہیں ہے البتہ لفظ قرآن اور لفظ کتاب میں بہر حال مغایرت ہے۔ جیسا کہ کسی شاعر کا شعر ہے۔ ''فالفی قولها كذبا ومينا'' ''کذب'' پر ''مینا'' کا عطف ہے۔ حالانکہ معنوی لحاظ سے کذب اور مینا ہم معنی ہیں کوئی مغایرت نہیں۔ البتہ لفظی مغایرت ہے۔

سوال: ایک آیت میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ''اِنَّ الَّذِیْنَ لَا یُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ زَیَّنَّا لَھُمْ اَعْمَالَھُمْ'' (جو لوگ آخرت پر ایمان نہیں لاتے ہم ان کے اعمال کو ان کے لئے مزین کرتے ہیں)۔ جبکہ دوسری آیت میں فرماتے ہیں: ''وَزَیَّنَ لَھُمُ الشَّیْطٰنُ اَعْمَالَھُمْ'' (شیطان ان کے اعمال کو ان کے لئے مزین کرتا ہے) دونوں میں کیا تطبیق ہوگی؟۔

جواب: اللہ تعالیٰ کا ان کے اعمال کو مزین کر دینا یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کے اندر خواہشات اور شہوت کو پیدا کیا۔ شیطان کی تزیین وسوسہ ڈالنا' برائی کی طرف لیے جانا ہے۔ لہٰذا تزیین کی نسبت دونوں کی طرف درست ہے۔

سوال: ''اِذْ قَالَ مُوْسٰی لِاَھْلِهٖٓ اِنِّیْٓ اٰنَسْتُ نَارًا ؕ سَاٰتِیْکُمْ مِّنْھَا بِخَبَرٍ'' (کہا موسیٰ نے اپنے گھر والوں کو میں نے دیکھی ہے ایک آگ اب لاتا ہوں تمہارے پاس وہاں سے کچھ خبر) یہاں حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا میں نے آگ دیکھی ہے۔ وہاں سے کوئی خبر یا روشنی لیکر آؤں گا۔ سورۃ طٰہٰ میں شک کے ساتھ فرمایا: ''لَعَلِّیْٓ اٰتِیْکُمْ'' شاید (کہ میں تمہارے پاس لے

آؤں)۔ایک جگہ قطعی اور ایک جگہ امید کے ساتھ بیان کیا' حالانکہ واقعہ ایک ہے؟۔
جواب: کبھی کسی کام کی امید رکھنے والا اپنی امید کے پوری ہونے کی قوی امید کرتا ہے اسی طرح یہاں پر حضرت موسیٰ علیہ السلام نے بھی "سَاٰتِیۡکُمۡ مِّنۡهَا بِخَبَرٍ" فرمایا۔
سوال: "فَلَمَّا جَآءَهَا نُوۡدِیَ اَنۡۢ بُوۡرِکَ مَنۡ فِی النَّارِ وَ مَنۡ حَوۡلَهَا" (سو جب اس آگ کے پاس پہنچے تو ان کو آواز دی گئی کہ جو اس آگ کے اندر ہے اس پر بھی برکت ہو اور جو اس کے پاس (یعنی موسیٰ) ہے اس پر بھی)۔
سوال یہ ہے کہ اس آگ کے اندر کوئی نہیں تھا۔ بقول جمہور وہ ایک نور تھا۔ بقول بعض وہ پہلے آگ تھی بعد میں نور میں تبدیل ہوئی پھر "اَنۡۢ بُوۡرِکَ مَنۡ فِی النَّارِ" کا کیا مطلب ہے؟۔
جوابِ اوّل: حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما اور حضرت حسن بصریؒ فرماتے ہیں: اس کا معنی ہے مقدس ہے وہ ذات جو اس آگ سے آواز دے رہی ہے۔ اس کا یہ معنی نہیں کہ اللہ تعالیٰ کسی شئی میں حلول کر جاتے ہیں بلکہ حضرت موسیٰ کو یہ محسوس ہوا کہ یہ آواز اس آگ سے آ رہی ہے۔
جوابِ ثانی: لفظ "مَنۡ" زائد ہے۔ تقدیر عبارت "بُوۡرِکَ فِی النَّارِ" ہے۔
جوابِ ثالث: اس کا مطلب ہے "اَنۡۢ بُوۡرِکَ مَنۡ فِی طَلَبِ النَّار" یعنی مضاف محذوف ہے۔
سوال: "اِنِّیۡ لَا یَخَافُ لَدَیَّ الۡمُرۡسَلُوۡنَ اِلَّا مَنۡ ظَلَمَ" (بیشک ہمارے حضور میں پیغمبر ڈرا نہیں کرتے مگر وہ جس سے کوئی قصور ہو جائے) میں "من ظلم" کا استثناء "المرسلون" سے کیسے درست ہوگا؟۔

جواب: اس میں کئی توجیہات ہیں۔
پہلی توجیہ: یہ ہے کہ یہ مستثنیٰ منقطع ہے یعنی "الا" لکن کے معنی میں ہے۔
دوسری توجیہ: یہ ہے کہ "الامن ظلم منهم بارتكاب الصغيرة" ہے جیسے حضرت آدم علیہ السلام' حضرت یونس علیہ السلام' حضرت سلیمان علیہ السلام' حضرت موسیٰ علیہ السلام وغیرہ کہ یہ لوگ اپنے کیے پر خوف زدہ ہیں۔ باوجود اس یقین کے اللہ تعالیٰ غفور و رحیم ہیں تو تقدیر کلام یوں ہوگی۔ "اِلَّا مَنۡ ظَلِمَ مِنۡهُمۡ فَاِنَّهٗ یَخَافُ' فَمَنۡ ظَلَمَ ثُمَّ بَدَّلَ حُسۡنًاۢ بَعۡدَ سُوۡٓءٍ فَاِنِّیۡ غَفُوۡرٌ رَّحِیۡمٌ" یہی وجہ ہے کہ بعض علماء نے کہا "الا من ظلم" پر وقف ہے۔ کلام ثانی جہاں وقف کے بعد ابتداء ہوگی محذوف ہے۔ جیسا کہ ہم نے بیان کیا۔
تیسری توجیہ: لفظ "الا" "لا" کے معنی میں ہے۔ جیسا کہ آیت: "لِئَلَّا یَکُوۡنَ لِلنَّاسِ عَلَیۡکُمۡ حُجَّةٌ اِلَّا الَّذِیۡنَ ظَلَمُوۡا مِنۡهُمۡ" میں "الا" "لا" کے معنی میں ہے۔

چوتھی توجیہ: تقدیر عبارت یوں ہے: "اِنِّیْ لَا يَخَافُ لَدَیَّ الْمُرْسَلُوْنَ ولا غير المرسلين الا من ظلم"۔

سوال: "عُلِّمْنَا مَنْطِقَ الطَّيْرِ وَاُوْتِيْنَا" (ہم کو سکھائی ہے بولی اڑتے جانوروں کی) حضرت سلیمان علیہ السلام نے خود کو تعظیمًا "نا" ضمیر جمع سے ذکر کیا۔ یہ طریقہ متکبرین کا ہے۔ ایسا کیوں کیا؟۔

جوابِ اوّل: یہ نون نونِ عظمت نہیں ہے۔ یعنی اس سے صرف خود کو مراد نہیں لیا بلکہ اپنے نفس اور اپنے والد کو مراد لیا۔

جوابِ ثانی: حضرت سلیمان علیہ السلام نبی ہونے کے ساتھ ساتھ بادشاہ بھی تھے اس لئے بادشاہ کی سیاست کی رعایت کرتے ہوئے شاہانہ کلام کیا۔

سوال: "لَاُعَذِّبَنَّهٗ عَذَابًا شَدِيْدًا" (میں اس (ہدہد) کو سخت سزا دوں گا) ہدہد کو عذاب دینا آپ کے لئے کیسے حلال ہو گیا؟۔

جواب: ان کی بادشاہت سب پر تھی اس لئے بادشاہ کے لئے سزا دینا جائز ہے۔

سوال: "وَلَهَا عَرْشٌ عَظِيْمٌ" (اور اس کے لئے عرش عظیم ہے) ہدہد نے حضرت سلیمان علیہ السلام کی عظیم مملکت اور عظیم قوت دیکھنے اور جاننے کے باوجود بلقیس کے تخت کو عظیم کیوں کہا؟۔

جوابِ اوّل: ممکن ہے ہدہد نے بلقیس کے حال کو حضرت سلیمان علیہ السلام کے حال سے کم تر سمجھ کر اس تخت کو اس کی حیثیت سے بڑا سمجھا ہو۔

جوابِ ثانی: یہ بھی ممکن ہے کہ حضرت سلیمان علیہ السلام کی مملکت کے عظیم الشان ہونے کے باوجود ان کا تخت بلقیس کے تخت کے برابر نہ ہو۔ بعض دفع ایسا ہوتا ہے ایک مملکت کی ایک چیز ہوتی ہے دوسری میں نہیں ہوتی۔

سوال: سلیمان علیہ السلام کے اس قول: "وَاُوْتِيْنَا مِنْ كُلِّ شَيْءٍ" (ہمیں ہر چیز دی گئی ہے) کے باوجود ہدہد نے بلقیس کے بارے میں "وَاُوْتِيَتْ مِنْ كُلِّ شَيْءٍ" (بلقیس کو ہر چیز دی گئی ہے) کیسے کہا؟۔

جواب: دونوں میں فرق ہے۔ ہدہد نے "وَاُوْتِيَتْ مِنْ كُلِّ شَيْءٍ" سے اسباب دنیا مراد لیئے ہیں۔ اور حضرت سلیمان علیہ السلام کے فرمان "وَاُوْتِيْنَا مِنْ كُلِّ شَيْءٍ" سے اسباب دین و دنیا دونوں مراد ہیں۔ "منطق الطير" پر عطف سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے۔

سوال: ہدہد نے بلقیس کے تخت کی صفت "لَهَا عَرْشٌ عَظِيْمٌ" کہہ کر اس کو اللہ کے عرش کے

برابر ٹھہرایا' اس لئے کہ عرش الٰہی کی صفت بھی عظیم آتی ہے؟۔
جواب: دونوں وصفوں میں فرق عظیم ہے۔ بلقیس کے تخت کی عظمت دنیاوی بادشاہوں کے تختوں کے مقابلے میں ہے۔ جبکہ اللہ کے عرش کی صفت عظیم سے کرنا اللہ تعالیٰ کی تمام مخلوقات اور زمین وآسمان کے مقابلے میں۔

سوال: ''فَاَلْقِهْ اِلَيْهِمْ ثُمَّ تَوَلَّ عَنْهُمْ فَانْظُرْ مَاذَا يَرْجِعُوْنَ'' (میرا خط لے جا اور اس کو ان کے پاس ڈال دینا پھر ہٹ جانا' پھر دیکھنا کہ آپس میں کیا سوال وجواب کرتے ہیں)۔
سوال یہ ہے کہ حضرت سلیمان علیہ السلام ہدہد سے فرمارہے ہیں کہ خط دیکر ایک طرف کو ہو جانا پھر خط کے متعلق ان کی گفت وشنید کے بارے مطلع کرنا۔ ھدھد ایک طرف کو ہو کر ان کی گفتگو کیسے سن سکے گا؟۔

جوابِ اوّل: اس کا مطلب یہ ہے کہ خط دیکر ایک طرف چھپ جا اور پھر ان کی باتیں سن۔
جوابِ ثانی: آیت میں تقدیم وتاخیر ہے: اصل میں ''فَانْظُرْ مَا ذَا يَرْجِعُوْنَ ثُمَّ تَوَلَّ عَنْهُمْ'' ہے۔

سوال: حضرت سلیمان علیہ السلام نے بلقیس کو خط لکھتے ہوئے اللہ تعالیٰ کے نام سے پہلے اپنے نام کا ذکر کرنا کیسے جائز سمجھا چنانچہ فرمایا: ''اِنَّهٗ مِنْ سُلَيْمَانَ وَاِنَّهٗ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ''؟ (وہ خط ہے سلیمان کی طرف سے اور وہ یہ شروع اللہ کے نام سے جو بڑا مہربان اور نہایت رحم کرنے والا ہے)
جواب: حضرت سلیمان علیہ السلام جانتے تھے کہ بلقیس اللہ تعالیٰ کو نہیں جانتی۔ اور سلیمان علیہ السلام کے نام سے واقف ہے۔ تو اندیشہ کیا کہ پہلی نظر پڑتے ہی اللہ تعالیٰ کے نام کی بے حرمتی نہ کر بیٹھے۔ تو اپنے نام کو نام الٰہی کے لئے وقایہ بنایا۔
بعض علماء نے کہا ہے کہ اوپر عنوان سلیمان علیہ السلام کے نام کا تھا۔ اور مضمون کی ابتداء اللہ تعالیٰ کے نام سے تھی۔

سوال: ''آصف'' سلیمان علیہ السلام کا کاتب اور ان کا وزیر تھا۔ نبی نہیں تھا کیا وجہ ہے کہ غیر نبی تو تختِ بلقیس کو چشم زدن میں حاضر کرنے پر قادر ہے اور نبی نہیں ہے؟
جواب: یہ ممکن ہے۔ کہ غیر نبی کو بعض دفع کوئی ایسی کرامت دی جائے۔ جس میں نبی شریک نہ ہو۔ جیسا کہ حضرت مریم علیہ السلام کو جنت کے پھل بے موسم دئے جاتے تھے اور حضرت زکریاؑ کو نہیں دیئے جاتے تھے اور جس طرح حضرت سلیمانؑ جب اپنی قوم کے ساتھ پانی کی تلاش میں

باہر نکلے تو ایک چیونٹی کو چت لیٹے پانی مانگتے ہوئے دیکھا تو اپنی قوم سے فرمایا: کہ واپس لوٹ جاؤ۔تمہارے غیر کی دعا سے تمہیں پانی ملیگا۔تو دیکھئے اس سے حضرت سلیمان علیہ اسلام پر چیونٹی کی فضیلت لازم نہیں آتی۔حدیث میں آتا ہے آپ ﷺ جب کسی غزوے کے لئے جانے کا ارادہ فرماتے۔تو فقراء مہاجرین وانصار سے فرماتے۔ہمارے لئے نصرت الٰہی کی دعا کرنا۔بے شک اللہ تعالیٰ تمہاری دعاء سے ہماری مدد فرمائیں گے۔تو اس سے فقراء کا آپ ﷺ سے افضل ہونا ثابت نہیں ہوتا۔تابع کی کرامت دراصل متبوع کی کرامت ہے۔حضرات علماء کرام نے فرمایا: وزیر سلیمان علیہ السلام ''آصف'' کے پاس اسم اعظم تھا۔اس کے ذریعے دعا فوراً قبول ہوئی۔اسم اعظم کیا ہے۔(البند لیچی فرماتے ہیں لفظ ''اللہ'' ہی اسم اعظم ہے۔بعض نے کہا: ''یاحیّ یا قیوم'' ہے بقول بعض ''یاذاالجلال والاکرام'' ہے بعض نے کہا: ''یااللہ یارحمٰن'' ہے بعض کا کہنا ہے کہ: ''یاالهنا اله کل شیء الها واحدا لااله الا انت'' ہے خلاصہ یہ کہ جو شخص نیت کو خالص کر کے شرائط دعا کی پابندی کرتے ہوئے ان اسماءِ گرامی کے توسط سے دعا کرے گا ضرور قبول ہوگی۔

سوال: بلقیس نے کیسے کہا کہ ''وَاَسْلَمْتُ مَعَ سُلَیْمَانَ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِیْن'' (میں سلیمان کے ساتھ اللہ جو رب العالمین ہے کے لئے مسلمان ہوئی) حالانکہ بلقیس حضرت سلیمان علیہ السلام کے ہاتھوں مسلمان ہوئی ان کے ساتھ مسلمان نہیں ہوئی تھی؟۔

جواب: وہ چونکہ بادشاہ تھی۔اس لئے اسنے ایسی تعبیر اختیار نہیں کی جس سے اسلام لانے کی وجہ سے حضرت سلیمان علیہ السلام کی غلامی میں آنے کی طرف اشارہ دیتی۔اگرچہ حقیقت ایسی ہی ہے۔

سوال: کیسے فرمایا اللہ پاک نے: ''قُلْ لَّا یَعْلَمُ مَنْ فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ الْغَیْبَ اِلَّا اللّٰهُ'' (آپ کہہ دیجئے نہیں جانتے وہ جو آسمانوں میں ہیں اور زمین میں غیب کو مگر اللہ تعالیٰ) حالانکہ ہم بھی جنت، جہنم، قیامت کے احوال کو جانتے ہیں؟

جواب: اس کا مطلب یہ ہے کہ بغیر سمجھانے والے (معلم) کے خود کوئی نہیں جانتا۔سوائے اللہ تعالیٰ کے۔یا مطلب یہ ہے کہ علم غیب کلی سوائے اللہ تعالیٰ کے اور کوئی نہیں جانتا۔

اور بعض نے کہا ہے کہ: زمین وآسمان کے پوشیدہ راز سوائے اللہ تعالیٰ کے اور کسی کو معلوم نہیں۔

سوال: ''بَلِ ادّٰرَکَ عِلْمُهُمْ فِی الْاٰخِرَةِ وقف بَلْ هُمْ فِیْ شَكٍّ مِّنْهَا بَلْ هُمْ مِّنْهَا عَمُوْنَ'' (بلکہ تھک گیا ان کا فکر آخرت کے بارے میں۔بلکہ ان کو شبہ ہے اس میں۔بلکہ وہ اس سے اندھے ہیں)۔سوال یہ ہے کیا ''علمھم'' میں ''ہم'' ضمیر اور ماقبل ''یشعرون'' اور ''یبعثون''

کی ضمیروں کا مرجع ایک ہی ہے۔ یا علیحدہ علیحدہ؟ اس کی ماقبل اور مابعد کے ساتھ کیا مطابقت ہے؟ پہلے ان سے شعور کی نفی کی پھر کمال علم کی پھر بتایا وہ شک میں ہیں پھر ان کو نابینا کہا؟۔

جواب: ''بَلِ ادّٰرَکَ عِلْمُهُمْ'' کی ضمیر کا مرجع صرف کفار ہیں۔ اور ماقبل کی ضمیروں کا مرجع'' جَمِیْعُ مَنْ فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ'' ہیں اور بل ادّارک کے معنی ''تلاحق واجتمع'' کے ہیں۔ جیسا کہ فرمانِ الٰہی: ''حَتّٰی اِذَا ادَّارَکُوْا فِیْهَا جَمِیْعًا'' میں ہے ''ادّارک'' کی اصل ''تدارک'' ہے تاء کو دال میں مدغم کر دیا گیا۔ حضرت عبداللہ بن عباسؓ فرماتے ہیں۔ اس کا مطلب ہے ''جس کے متعلق دنیا میں جاہل تھے آخرت میں یہ جہالت دور ہوگی' سب کچھ جان لیں گے۔ اسعدی فرماتے ہیں: اس سے اللہ تعالیٰ کی مراد یہ ہے (کہ قیامت کے دن ان کے علم مجتمع ہوں گے' نہ شک رہے گا نہ اختلاف میں پڑیں گے)۔

مقاتلؒ فرماتے ہیں: جس کے متعلق دنیا میں شکوک وشبہات میں مبتلا ہوئے تھے اور ان کی آنکھیں بند تھیں آخرت میں وہ سب کچھ جان لیں گے۔ تو فرمانِ تعالیٰ: ''بَلْ هُمْ فِیْ شَکٍّ مِّنْهَا الخ'' بلکہ وہ آخرت سے آنکھ بند کئے ہوئے ہیں۔

پہلے ان کو نفی شعور کے ساتھ پھر کمالِ علم پھر شک پھر اندھاپن کی صفت کے ساتھ متصف کرنے میں اختلاف زمانہ کی وجہ سے کوئی تناقض نہیں ہے۔ یا ان امورِ مذکورہ (شعور' علم' شک' عمی) کے متعلقات کے مختلف ہونے کی وجہ سے بھی تناقض کا امکان نہیں ہے۔

سوال: ''اِنَّ رَبَّکَ یَقْضِیْ بَیْنَهُمْ بِحُکْمِهٖ'' (تیرا رب ان میں فیصلہ کریگا اپنے حکم سے)۔ سوال یہ ہے۔ قضا اور حکم کا معنی ایک ہے ان میں کوئی فرق نہیں یہ گویا ایسا فرمایا گیا: ''اِنَّ رَبَّکَ یَقْضِیْ بَیْنَهُمْ بقضائه یا'' ان ربک یحکم بینهم بحکمه'' یعنی قضا کے ساتھ حکم کا کیا فائدہ۔

جواب: بحکمہ کا معنی ہے بعدلہ۔ محکوم بہ کو حکم سے تعبیر کیا گیا ہے۔ اور علماء نے کہا: ''بحکمه'' کا معنی ہے'' بحکمته'' ''بِحِکَمِهٖ'' کی قراءت سے اس معنی کی تائید ہو رہی ہے' جو حکمت کی جمع ہے۔

سوال: کیسے فرمایا اللہ پاک نے: ''اِنَّ فِیْ ذٰلِکَ لَاٰیٰتٍ لِّقَوْمٍ یُّؤْمِنُوْنَ'' (ایمان والوں کے لئے اس میں بہت ساری نشانیاں ہیں) حالانکہ اس میں تمام عقل والوں کے لئے نشانیاں ہیں۔ صرف مؤمنین کے لئے تو خاص نہیں ہیں؟۔

جواب: اصل میں ان عبرتوں اور نشانیوں سے مؤمنین ہی منتفع ہوتے ہیں اس لئے بطورِ خاص

ان نام لیکر تذکرہ کیا گیا۔
سوال: "وَيَوْمَ يُنْفَخُ فِي الصُّوْرِ فَفَزِعَ" (جس دن پھونکا جائیگا صور تو گھبرا جائیں گے) "فزع" کے بجائے "یفزع" ہونا چاہیئے۔ اس لئے کہ اس کا اب تک وقوع نہیں ہوا ہے۔ ماضی کا صیغہ نہیں بلکہ مضارع کا صیغہ استعمال ہونا چاہئے۔
جواب: اصل میں اس کا وقوع یقینی ہے۔ لامحالہ ہوکر رہیگا۔ اس لئے ماضی سے تعبیر فرمایا یعنی اس کا وقوع گویا ہو چکا ہے۔
سوال: "وَكُلٌّ اَتَوْهُ دَاخِرِيْنَ" (اور سب چلے آئیں گے اس کے آگے عاجزی سے) اس میں حضرات انبیاء کرام، صدیقین، شہداء بھی داخل ہیں۔ حالانکہ وہ معزز و مکرم ہوکر داخل ہوں گے؟۔
جواب: اس عاجزی سے عبودیت کی عاجزی مراد ہے۔ گناہوں اور معاصی کی وجہ سے عاجز ہونا مراد نہیں ہے عبودیت کی عاجزی عام ہے۔ جیسا کہ فرمانِ خداوندی ہے: "اِنْ كُلُّ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ اِلَّا اٰتِي الرَّحْمٰنِ عَبْدًا"

# سورۃ القصص

سوال: "وَاَوْحَيْنَا اِلٰى اُمِّ مُوْسٰى اَنْ اَرْضِعِيْهِ" (ہم نے حکم بھیجا موسیٰ کی ماں کو کہ اس کو دودھ پلاتی رہ) والدہ چونکہ خود بخود دودھ پلاتی ہے۔ کوئی کہے یا نہ کہے۔ تو دودھ پلانے کا حکم دینے کا کیا فائدہ؟۔
جواب: دودھ پلانے کا حکم اس لئے دیا تاکہ موسیٰ علیہ السلام ان کے دودھ کے ساتھ مالوف اور مانوس ہو جائیں۔ اور فرعون کے ہاتھ میں جانے کے بعد دوسری دودھ پلانے والیوں کے دودھ کو قبول نہ کریں۔ اگر دودھ پلانے کا حکم نہ ہوتا تو ہوسکتا تھا کہ وہ جلدی دودھ نہ پلاتیں۔ بعد میں کسی دوسری مرضعہ کے دودھ کو قبول کر لیتے۔
سوال: کیسے فرمایا گیا: "فَاِذَا خِفْتِ عَلَيْهِ فَاَلْقِيْهِ فِي الْيَمِّ وَلَا تَخَافِيْ وَلَا تَحْزَنِيْ" (پھر جب تم کو ان کی نسبت اندیشہ ہو تو ان کو دریا میں ڈالدینا نہ تو اندیشہ کرنا نہ غم کرنا) "اِذَا خِفْتِ" "وَلَا تَخَافِيْ" میں بظاہر تناقض معلوم ہو رہا ہے؟۔
جواب: تناقض کوئی نہیں ہے۔ اس لئے کہ آیت کا مطلب ہے۔ اگر فرعونیوں نے ان کے قتل کئے جانے کا اندیشہ ہو تو ان کو دریا میں ڈالنا۔ اور دریا میں ڈالکر ان کے ضائع ہونے کا خوف نہ کرنا۔

سوال: کیا خوف اور حزن میں فرق ہے کہ ان کو عطف کے ساتھ بیان کیا گیا ہے جو مغایرت پر دلالت کرتا ہے؟۔

جواب: ہاں ان کے درمیان فرق ہے' خوف کہتے ہیں مستقبل میں پہنچنے والی مصیبت پر غم کو۔ اور حزن کہتے ہیں گذشتہ مصیبت پر لاحق ہونے والے غم کو۔

سوال: حضرت موسیٰ نے کافر قبطی کے قتل کو عمل شیطان اور خود کو ظالم کیسے قرار دیا اور اس پر استغفار کیوں کیا؟۔

جواب: کافر کے قتل کو عمل شیطان اس لئے قرار دیا کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے قتل کی اجازت ملنے سے پہلے قتل کر دیا۔ یہ ایک خطاء ہے جس پر استغفار کیا جا سکتا ہے۔ ابن جریج فرماتے ہیں کہ کسی نبی کو اجازت ملنے سے قبل کسی کو مارنا مناسب نہیں ہے۔

سوال: ''اِنَّ اَبِیۡ یَدۡعُوۡکَ لِیَجۡزِیَکَ اَجۡرَ مَا سَقَیۡتَ لَنَا'' (میرا باپ تجھ کو بلاتا ہے کہ بدلہ میں دے تجھ کو حق اس کا کہ تو نے پانی پلا دیا ہمارے جانوروں کو)

حضرت موسیٰ نے ان کی دعوت کو کیسے قبول کیا جبکہ انہوں نے کسی اجرت لینے کے لئے پانی نہیں پلایا تھا؟۔

جواب: ہو سکتا ہے حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اس لڑکی اور ان کے والد کی دعوت کو محض بوجہ اللہ سمجھ کر قبول کیا ہو۔ اگر چہ وہ لڑکی اس کو اجرت کے عنوانات سے تعبیر کر رہی تھی۔ اس جواب کی تائید اس روایت سے بھی ہوتی ہے کہ جس میں یہ فرمایا گیا کہ جب موسیٰ علیہ السلام کے سامنے کھانا پیش کیا گیا تو آپ نے فرمایا۔ میرا تعلق ایسے گھرانے سے ہے کہ ہم دنیا کے بدلے دین کو نہیں بیچتے۔ اگر چہ زمین بھر سونا کیوں نہ دیا جائے۔ اور نہ ہی کسی نیکی پر کوئی دنیاوی اجرت لیتے ہیں تو حضرت شعیب علیہ السلام نے فرمایا: ہم صرف آپ کو نہیں کھلا رہے بلکہ یہ ہماری عادت ہے ہمارے ہاں جو بھی مہمان آتا ہے اس کے ساتھ ہمارا یہی معاملہ ہوتا ہے۔

سوال: ''وَاضۡمُمۡ اِلَیۡکَ جَنَاحَکَ مِنَ الرَّھۡبِ'' (اور ملا لے اپنی طرف اپنا بازو ڈر سے) یہاں ''جناح'' کو مضموم بنایا گیا اور سورۃ ''طٰہٰ'' میں ''جناح'' کو مضموم الیہ بنایا گیا۔ جبکہ قصہ و واقعہ ایک ہی ہے؟

جواب: یہاں ''جناح المضموم'' سے داہنا ہاتھ مراد ہے اور سورۃ طٰہٰ میں ''جناح المضموم الیہ'' سے مراد بائیں طرف کا پہلو یعنی کہنی سے بغل تک کی جگہ مراد ہے۔

سوال: ''وَاضۡمُمۡ اِلَیۡکَ جَنَاحَکَ مِنَ الرَّھۡبِ'' کا کیا معنیٰ ہے؟

جواب: حضرت موسیٰ علیہ السلام نے جب سانپ سے ڈر محسوس کیا تو اللہ تعالیٰ نے انہیں حکم دیا کہ اپنے ہاتھوں کو اپنے ساتھ لگالیں تاکہ خوف جاتا رہے۔ اس لئے کہ اللہ تعالیٰ نے جسم کے ساتھ بازو چمٹ لینے کو ڈر ختم ہونے کا سبب قرار دیا ہے۔ اس لئے امام مجاہدؒ فرماتے ہیں: جو شخص کسی سے خوف زدہ ہو اور وہ اپنے بازوؤں کو اپنے سے چمٹالے تو اس کا خوف جاتا رہے گا۔ جبکہ ابوعلی کہتے ہیں ضم جناح سے مراد بازوؤں کو ملانا نہیں ہے بلکہ عزم اور مطلوب میں خوب کوشش کرنا ہے اور بعض نے کہا اس میں تقدیم وتاخیر ہے۔ تقدیر عبارت یوں ہے: ''ولّٰی مدبرا من الرھب'' ہے۔

سوال: ''فَاَرۡسِلۡهُ مَعِیَ رِدۡاً یُّصَدِّقُنِیۡ'' (سو اس (ہارون) کو بھیج میرے ساتھ مدد کو کہ میری تصدیق کر) حضرت ہارون علیہ السلام کی حضرت موسیٰؑ کی تصدیق کا کیا فائدہ؟ جب کہ بڑے بڑے معجزوں سے فرعون کو کوئی فائدہ نہیں ہوا؟۔

جواب: ''رِدۡاً یُّصَدِّقُنِیۡ'' کا معنی یہ نہیں ہے کہ فرعون کے دربار میں حضرت موسیٰ علیہ السلام سے کہہ دے ''صدقت'' (تو سچ کہہ رہا ہے) بلکہ اس سے مراد ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے دلائل کو واضح طور پر بیان کرے۔ یہ ان کی تصدیق کا سبب بنے گا اور پچھلا جملہ ''ھُوَ اَفۡصَحُ مِنِّیۡ لِسَانًا'' بھی یہی بتا رہا ہے۔

سوال: ''وَمَا کُنۡتَ بِجَانِبِ الۡغَرۡبِیِّ اِذۡ قَضَیۡنَاۤ اِلٰی مُوۡسَی الۡاَمۡرَ'' (اور تو نہ تھا غرب کی جانب جب ہم نے بھیجا موسیٰ کو حکم) فرمانے کے بعد ''وَمَا کُنۡتَ مِنَ الشّٰھِدِیۡنَ'' لانے کی ضرورت نہ تھی؟

جواب: اس کا مطلب ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے حضرت شعیب کے ساتھ واقعہ میں آپ حاضر نہ تھے۔ دونوں قصے جدا جدا ہیں۔

سوال: اللہ تعالیٰ نے کیسے فرمایا: ''اِنَّ اللّٰهَ لَا یَھۡدِی الۡقَوۡمَ الظّٰلِمِیۡنَ'' (بیشک اللہ تعالیٰ ظالم قوم کو ہدایت نہیں دیتا) جبکہ ہم دیکھتے ہیں کہ بہت سارے ظالم جو کفر و شرک اور عصیان میں مبتلا ہوتے ہیں پھر اللہ تعالیٰ کی توفیق سے اسلام اور ہدایت کی دولت سے مالا مال ہوتے ہیں؟۔

جواب: یہ سوال مع جواب سورۃ مائدۃ میں گذر چکا ہے۔

سوال: اللہ پاک نے کیسے فرمایا: ''وَرَاَوُا الۡعَذَابَ لَوۡ اَنَّھُمۡ کَانُوۡا یَھۡتَدُوۡنَ'' عذاب کو تو گمراہ دیکھتا ہے نہ کہ ہدایت یافتہ؟۔

جواب: ''لَوۡ'' کا جواب محذوف ہے مطلب یہ ہے کہ اگر وہ ہدایت یافتہ ہوتے تو ان کی اتباع نہ کرتے اور عذاب نہ دیکھتے۔

# سورۃ العنکبوت

سوال: ایک جگہ قرآنِ مقدس میں فرمان باری تعالیٰ ہے: "وَمَاهُمْ بِحٰمِلِيْنَ مِنْ خَطٰيٰهُمْ مِّنْ شَيْءٍ" (حالانکہ یہ لوگ ان کے گناہوں میں سے ذرا بھی نہیں لے سکتے) جبکہ دوسری جگہ ارشاد ہے: "وَلَيَحْمِلُنَّ اَثْقَالَهُمْ وَاَثْقَالًا مَّعَ اَثْقَالِهِمْ" (اور یہ لوگ اپنے گناہ اوپر لادے ہوں گے ساتھ کچھ گناہ اور ہیں)۔

جواب: مطلب یہ ہے کہ کافر مسلمانوں کے گناہوں کا بوجھ نہیں اٹھائیں گے بلکہ اپنے گناہوں کا وزن مسلمانوں کو خود اٹھانا پڑے گا۔ تاہم کافر اپنے گناہوں کے بوجھ کے ساتھ ساتھ ان دیگر کافروں کے گناہوں کا بوجھ بھی اٹھائیں گے جو ان کے سبب گمراہ ہوئے۔ یہ مطلب نہیں کہ مسلمانوں کی غلطیوں کا بوجھ بھی کافروں پر لاد دیا جائیگا۔ جیسے کہ سورۃ انعام اور سورۃ بنی اسرائیل میں ارشادِ خداوندی ہے: "وَلَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰى" (اور کوئی شخص کسی کا بوجھ نہ اٹھاوے گا)۔

سوال: قرآن مقدس میں نوسو پچاس کے عدد کو "اَلْفَ سَنَةٍ اِلَّا خَمْسِيْنَ عَامًا" (رہے پچاس سال کم ایک ہزار برس) سے کیوں تعبیر کیا گیا ہے حالانکہ اہل حساب کی عادت یہی ہے کہ وہ اس عدد کے لئے نوسو پچاس کا لفظ ہی استعمال کرتے ہیں۔؟

جواب اوّل: حضرت نوحؑ کا یہ قصہ جس میں آپؑ کے امت کی جانب سے پیش آمدہ آزمائشوں پر صبر کا تذکرہ ہے آنحضرتؐ کی تسلی کے لئے ذکر کیا گیا ہے۔ یقیناً سب سے بڑا عدد ذکر کرنا جس سے بڑا کوئی عدد نہ ہو حصولِ مقصد کے لئے سب سے بہتر ہے۔ سامع جب ہزار کا لفظ سنتا ہے تو اسے مدتِ صبر بڑی طویل معلوم ہوتی ہے۔

جواب ثانی: اس کا ایک فائدہ یہ بھی ہے کہ اگر نوسو پچاس کا عدد استعمال کرتے تو ہوسکتا تھا کہ لوگ اس عدد کو مجازی طور پر کثرت کے لئے مستعمل سمجھتے۔ البتہ "ہزار مگر پچاس" کے استعمال سے یہ وہم ختم ہوجاتا ہے یا کم از کم عقلی طور پر بعید ہی معلوم ہوتا ہے۔

سوال: ایک ہی آیت میں ایک بار لفظ سَنَةٍ کو بطور تمیز ذکر کیا گیا جبکہ دوسری بار لفظ عام کو بطور تمیز ذکر کیا گیا۔؟

جواب: اس لئے کہ اگر تکرارِ لفظ سے تعظیم شان یا ڈرانا وغیرہ مقصود نہ ہو تو فصحاء بلغاء کے نزدیک اس سے اجتناب ضروری ہے۔

سوال: "اِنَّ الَّذِيْنَ تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ لَا يَمْلِكُوْنَ لَكُمْ رِزْقًا فَابْتَغُوْا عِنْدَ اللّٰهِ الرِّزْقَ"

(تم خدا کو چھوڑ کر جن کو پوج رہے ہو وہ تم کو کچھ بھی رزق دینے کا اختیار نہیں رکھتے سو تم لوگ رزق خدا کے پاس سے تلاش کرو) اللہ تبارک وتعالیٰ نے ایک بار لفظ رزق کو نکرہ اور دوبارہ معرفہ کیوں ذکر کیا؟۔

جواب: اس لئے کہ معبودانِ باطلہ تمہیں کسی قسم کے رزق کا کوئی فائدہ نہیں پہنچا سکتے، پس ہر قسم کا رزق اللہ تبارک وتعالیٰ کے پاس تلاش کرو۔ کیونکہ وہی اکیلا رزّاق ہے۔ جس کے علاوہ کوئی رزق نہیں دے سکتا۔

سوال: "قُلْ سِيْرُوْا فِي الْاَرْضِ فَانْظُرُوْا كَيْفَ بَدَاَ الْخَلْقَ" (آپ کہیئے کہ تم لوگ ملک میں چلو پھرو اور دیکھو کہ خدا تعالیٰ نے مخلوق کو کس طور اول پیدا کیا) اللہ تبارک وتعالیٰ کے اس فرمان میں اسم باری تعالیٰ کو بطور ضمیر ذکر کیا اور پھر "ثُمَّ اللّٰهُ يُنْشِئُ النَّشْاَةَ الْاٰخِرَةَ" (پھر اللہ پچھلی بار بھی پیدا کریگا) میں بطور اسمِ ظاہر کے۔ حالانکہ قیاس کا تقاضہ یہ تھا کہ یوں ارشاد ہوتا "کیف بدا اللّٰہ الخلق ثم یُنشیء النشاۃ الاٰخرۃ"؟۔

جواب: اس لئے کہ ضمیر سے اسم ظاہر کی طرف اعادہ خبر کی تاکید کا فائدہ دیتا ہے۔ پھر لفظ اللہ کو مبتداء بنانا اہتمامِ شان کی وجہ سے ہے۔

سوال: اللہ تبارک وتعالیٰ نے تعریف واحسان کے موقع پر یوں کیوں ارشاد فرمایا کہ "وَاٰتَيْنٰهُ اَجْرَهٗ فِي الدُّنْيَا" (اور ہم نے ان کو دنیا میں بھی خوبیاں دیں تھیں) حالانکہ دنیا کا اجر فانی ہے جبکہ آخرت کی نعمتیں دائمی اور ہمیشہ رہنے والی ہیں۔ پس آخرت کی نعمتوں کا ذکر زیادہ مناسب تھا؟۔

جواب: اس کا مطلب یہ ہے کہ انہیں دنیا کا وہ اجر دیا جائیگا جو آخرت کے اجر سے ملا ہوا ہوگا اور دنیاوی اجر کے سبب اخروی اجر میں کسی قسم کا نقص بھی وارد نہیں ہوگا۔ علامہ ابن جریرؒ فرماتے ہیں کہ "وَاِنَّهٗ فِي الْاٰخِرَةِ لَمِنَ الصّٰلِحِيْنَ" (اور وہ آخرت میں بھی اچھے لوگوں میں ہوں گے) میں اسی طرف اشارہ ہے کہ انہیں آخرت میں کامل جزاء دی جائیگی۔ اور دنیاوی اجر بعض لوگوں کے نزدیک لوگوں کی تعریفیں اور دینداروں کی محبت ہے۔ بعض حضرات فرماتے ہیں کہ اس سے مراد وہ برکت ہے جو اللہ تبارک وتعالیٰ اس کی ال اولاد میں رکھ دیتے ہیں۔

سوال: حضرت لوطؑ کی بستی کے بارہ میں فرشتوں نے یہ کیسے کہا "اِنَّا مُهْلِكُوْٓا اَهْلِ هٰذِهِ الْقَرْيَةِ" (ہم اس بستی والوں کو ہلاک کرنے والے ہیں) حالانکہ چاہئیے تھا کہ وہ تلک القریۃ (اس بستی کو) کہتے کیونکہ جب حضرت ابراہیمؑ سے یہ بات ہورہی تھی اس وقت حضرت لوطؑ کی بستی حضرت ابراہیمؑ سے دور تھی؟۔

جواب: اس لئے کہ وہ بستی فرشتوں کی نسبت سے قریب تھی اگرچہ حضرت ابراہیمؑ کی نسبت سے دور تھی۔

سوال: فرشتوں نے یہ کیسے کہا کہ "اس بستی والوں کو" حالانکہ کہنا چاہیے تھا "ان بستیوں والوں کو" کیونکہ حضرت لوطؑ کی قوم کی پانچ بستیاں تھیں جن میں چار ہلاک ہوئیں؟۔

جواب: فرشتوں نے سب سے بڑی اور سب سے قریب ایک ہی بستی کا ذکر کیا جو "سدوم" کے نام سے موسوم تھی جبکہ باقیوں کو اسی کے تابع سمجھ لیا گیا۔

سوال: اللہ تبارک وتعالیٰ نے یہ کیوں ارشاد فرمایا: "وَكَانُوْا مُسْتَبْصِرِيْنَ" (اور وہ لوگ ہوشیار رہتے) فلاں مستبصر اس وقت کہا جاتا ہے جب وہ شخص عقلمند اور صحیح النظر ہو۔ اگر وہ لوگ صحیح النظر اور عاقل ہوتے تو راہ ہدایت سے بھٹک کر گمراہی کا شکار نہ ہوتے؟۔

جواب: اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ دنیاوی امور میں صاحب نظر تھے۔ بعض حضرات فرماتے ہیں کہ وہ حق کو دلائل کی روشنی میں پہچانتے تو تھے لیکن خواہشاتِ نفسانی کے اتباع میں اس کا انکار کرتے تھے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے: "وَجَحَدُوْا بِهَا وَاسْتَيْقَنَتْهَآ اَنْفُسُهُمْ ظُلْمًا وَّ عُلُوًّا" (اور ظلم اور تکبر کی راہ سے ان کے منکر ہو گئے حالانکہ ان کے دلوں نے ان کا یقین کر لیا تھا) بعض حضرات فرماتے ہیں کہ اس کا مطلب یہ ہے اگر وہ تدبر اور تفکر سے کام لیتے تو صاحب بصیرت ہوتے۔

سوال: اللہ تبارک وتعالیٰ نے یہ کیوں فرمایا: "وَاِنَّ اَوْهَنَ الْبُيُوْتِ ......لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ" (اور کوئی شک نہیں کہ سب گھروں میں زیادہ بودا مکڑی کا گھر ہوتا ہے اگر وہ جانتے ایسا نہ کرتے) حالانکہ یہ تو ایسی بدیہی بات ہے جسے ہر شخص بہ خوبی جانتا ہے؟

جواب: اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر انہیں علم ہوتا کہ خدا تعالیٰ کے سوا اور معبود بنانا مکڑی کے گھر بنانے کی طرح ہے تو وہ ایسا نہ کرتے۔

سوال: اللہ تبارک وتعالیٰ نے یہ کیسے ارشاد فرمایا: "وَلَا تُجَادِلُوْا اَهْلَ الْكِتٰبِ اِلَّا بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ اِلَّا الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا مِنْهُمْ" (اور تم اہل کتاب کے ساتھ بجز مہذب طریقہ کے مباحثہ مت کرو ہاں جو ان میں زیادتی کریں)۔ حالانکہ ہر اہل کتاب کافر ہے اور کفر سے بڑھ کر کوئی ظلم نہیں جیسے کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے: "وَالْكٰفِرُوْنَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ" (اور کافر ہی لوگ ظلم کرتے ہیں)؟

جوابِ اوّل: یہاں "ظلم" سے مراد ذمی بننے اور اداءِ جزیہ سے انکار ہے یا اس سے مراد معاہدہ کرنے کے بعد اسے توڑنا ہے۔

جوابِ ثانی: یہ آیت اس آیت کے سبب منسوخ ہے: "قَاتِلُوا الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَلَا

بِالْيَوْمِ الْاٰخِرِ "(جولوگ جو نہ خدا پر ایمان رکھتے ہیں اور نہ قیامت کے دن پر ان سے قتال کرو)
سوال: "وَلَا تَخُطُّهٗ بِيَمِيْنِكَ" (اور نہ کوئی کتاب اپنے ہاتھ سے لکھ سکتے تھے) میں یمین
(۲)(ہاتھ) کے اضافہ کا کیا فائدہ ہے؟
جواب: اس سے نفی کی تاکید مقصود ہے جیسے کہ اثبات کی تاکید کے لئے کہا جاتا ہے' یہ وہ کتاب ہے جسے فلاں نے اپنے ہاتھ سے تحریر کیا ہے۔ میں نے فلاں کو اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے' یہ بات میں نے خود اپنے کانوں سے سنی ہے۔
سوال: اللہ تبارک وتعالیٰ نے تلاوت کو تاکیداً کیوں ذکر نہیں فرمایا کہ وَمَا كُنْتَ تَتْلُوْا مِنْ قَبْلِهٖ مِنْ كِتٰبٍ بِلِسَانِكَ "(آپ اس سے پہلے کتاب کی اپنی زبان سے تلاوت نہیں کیا کرتے تھے)
جواب: کلام میں اصل بات یہی ہے کہ اس میں زیادتی نہ ہو۔ جو کلام بھی مطابقِ اصل ہو اس میں دلیل کی ضرورت نہیں ہوتی البتہ جو خلافِ اصل ہو اس میں دلیل کی ضرورت ہوتی ہے۔
جواب: اللہ تبارک وتعالیٰ نے یہ کیوں ارشاد فرمایا: "وَالَّذِيْنَ جَاهَدُوْا فِيْنَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا" (اور جو لوگ ہماری راہ میں مشقتیں برداشت کرتے ہیں ہم ان کو ضرور اپنے راستے دکھائیں گے)
حالانکہ سبھی کو معلوم ہے کہ مجاہدہ دین خداوندی پر عمل پیرا ہونے کے لئے یا نفسِ امارہ یا شیطان یا دشمنانِ دین کے خلاف خدا تعالیٰ کی اطاعت کے لئے ہوتا ہے اور یہ سب کام خدا تعالیٰ کی ہدایت کے بعد ہوتے ہیں تو اللہ تبارک وتعالیٰ نے ہدایت کو مجاہدہ کا ثمرہ کیسے بنایا؟
جواب: اس کا مطلب یہ ہے کہ جو حصولِ علم کی کوشش کرتے ہیں ہم انہیں اپنے ان راستوں کی ہدایت عطا فرماتے ہیں جن پر چل کر احکام اور ان کے حقائق کا علم ہو جاتا ہے۔ بعض حضرات فرماتے ہیں کہ اس کا مطلب ہے ہم اسے جنت کے راستہ پر چلاتے ہیں۔ بعض حضرات کے نزدیک اس کا مطلب یہ ہے کہ جو ایک درجہ حاصل کرنے کی کوشش کرتا ہے ہم اکی رہنمائی اس کے اعلیٰ درجہ کی طرف کرتے ہیں جس کا مطلب یہ ہے کہ ہم اس کی ہدایت اور نیکیوں کی توفیق میں اضافہ کرتے رہتے ہیں جیسے کہ ارشادِ باری تعالیٰ ہے: "وَالَّذِيْنَ اهْتَدَوْا زَادَهُمْ هُدًى" (اور جو لوگ راہ پر ہیں اللہ تعالیٰ ان کو اور زیادہ ہدایت دیتا ہے) نیز "وَيَزِيْدُ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اهْتَدَوْا زَادَهُمْ هُدًى" (اور اللہ تعالیٰ ہدایت والوں کی ہدایت بڑھاتا ہے)
امام ابو سلیمان دارانیؒ ارشاد فرماتے ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ جو اپنے علم میں کوشش کرتا ہے ہم اس چیز کی اسے ہدایت دیتے ہیں جس کا اسے علم نہیں۔ جبکہ بعض حکماء فرماتے ہیں جو اپنے علم پر عمل کرتا ہے اسے اس چیز کی توفیق نصیب ہو جاتی ہے' جس کا اسے علم نہیں۔ بعض حضرات فرماتے

ہیں ہمیں جو لاعلمی کی جہالت نظر آرہی ہے وہ اپنے علم پر عمل نہ کرنے کی وجہ سے ہے۔

# سورۃ الروم

سوال: ارشادِ باری تعالیٰ ''وَهُوَ اَهْوَنُ عَلَيْهِ'' میں ضمیر مذکر کیوں ذکر کی حالانکہ اس کا مرجع اعادہ ہے جیسا کہ ماقبل ''وَهُوَ الَّذِیْ یَبْدَؤُا الْخَلْقَ ثُمَّ یُعِیْدُهٗ'' (اور وہی ہے جو اول بار پیدا کرتا ہے پھر وہی دوبارہ پیدا کریگا) سے ظاہر ہے۔

جواب: اس کا معنی ہے کہ رجوع اور رد زیادہ آسان ہے تو ضمیر باعتبار معنی ذکر فرمائی نہ کہ باعتبار لفظ کے جیسا کہ ارشادِ باری تعالیٰ ''لنحیی به بلدة میتا'' میں بلدۃ سے مراد بلد اور مکان ہے۔

سوال: '' وَهُوَ اَهْوَنُ عَلَيْهِ'' میں صلہ کو مؤخر کیوں کیا حالانکہ هو علیّ هیّن میں اسے مقدم کیا گیا ہے؟

جواب: وہاں اختصاص مراد ہے کہ اگرچہ ایک بانجھ عورت کے ہاں بچے کی پیدائش تمہارے نزدیک مشکل کام ہے لیکن میرے لئے آسان ہے لیکن یہاں چونکہ اختصاص کی ضرورت نہیں کیونکہ ہر انسان کو معلوم ہے کہ اعادہ ابتداء سے آسان ہوتا ہے اس لئے عام حالت کے مطابق صلہ کو مؤخر ذکر کیا۔ اگر اسے مقدم کر دیتے تو معنی یکسر تبدیل ہو جاتا۔

سوال: اللہ تبارک وتعالیٰ نے ''وَهُوَ اَهْوَنُ عَلَيْهِ'' (اور یہ اس کے نزدیک زیادہ آسان) کیوں فرمایا حالانکہ اللہ تعالیٰ کی طرف نسبت کریں تو تمام افعال سہولت میں برابر ہیں کیونکہ کسی کام کا آسان یا مشکل ہونا ہمارے اعتبار سے ہے نہ کہ اللہ تعالیٰ کے اعتبار سے؟

جوابِ اوّل: کبھی افعل کا وزن کلام عرب میں اسم فاعل بغیر تفضیل کے لئے بھی استعمال ہوتا ہے۔ جیسے کہ اَللّٰہُ اَکْبَرُ کا ترجمہ بعض حضرات اللہ کبیر والا کرتے ہیں۔

فرزدق کہتا ہے۔

ان الذی سمک السماء بنی لنا — بیتا دعائمه اعز واطول

یعنی جس ہستی نے آسمان کو رفعت بخشی اس نے ہمارے لئے ایسا گھر بنایا جس کے ستون باعزت اور لمبے ہیں۔ مذکورہ شعر میں اعزو اطول عزیزہ اور طویلہ کے معنی میں ہیں۔ اسی طرح معن بن اوس المزنی کا شعر ہے۔

لعمرک ما ادری وانی لاوجل — علی اینا تعدو المنیة اول

یعنی تیری زندگی کی قسم مجھے معلوم نہیں ہے اور میں اس بات سے خوفزدہ بھی ہوں کہ ہم میں سے کس

موت پہلے حملہ آور ہوتی ہے۔ اس شعر میں اوجل وجل کے معنی میں ہے۔ ایک اور شاعر کہتا ہے:

تمنی رجال ان اموت وان امت فتلک سبیل لست فیھا باوحد

لوگ میری موت کی تمنا کرتے ہیں۔ اگر میں مر بھی جاؤں تو میں اس راستہ میں تنہا نہیں ہوں۔ اس شعر میں بھی اوحد واحد کے معنی میں ہے۔

جواب ثانی: اس کا مطلب ہے کہ تمہارے حکم کے اعتبار سے آسان ہے۔ کیونکہ تم یہی سمجھتے ہو کہ اعادہ ابتداء سے آسان ہے کیونکہ ابتداء پانی سے اور اعادہ مٹی سے ہے اور مٹی سے کوئی صورت بنانا تمہارے نزدیک زیادہ آسان ہے۔

جواب ثالث: "وَهُوَ اَهْوَنُ عَلَيْهِ" میں ضمیر مخلوق کی طرف راجع ہے نہ کہ اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اس اعادہ میں مخلوق کو کسی قسم کی تکلیف نہیں ہوگی کیونکہ اللہ تعالیٰ اپنے ایک امر کن فیکون سے مخلوق کو دوبارہ پیدا فرمادیں گے۔ ابتداء پیدائش میں تو انسان پہلے نطفہ تھا' پھر لوتھڑا بنا۔ پھر ہڈیاں معرض وجود میں آئیں اور پھر آخر ان پر گوشت چڑھایا گیا۔

جواب رابع: تخلیق انسانی تو محض فضل خداوندی ہے لیکن اس کا اعادہ واجب ہے کیونکہ جزاء سزا بغیر اعادہ کے ممکن نہیں تو جب جزاء سزا ضروری ہے تو اعادۂ تخلیق بھی ضروری ہے۔

سوال: "وما اتیتم" بالمدو والقصر اختلاف قراءتین سے معنی میں کیا تبدیلی واقع ہوتی ہے؟

جواب: حضرت حسنؒ کا قول ہے کہ اس سے مراد سود ہے اور مخاطب سود دینے والے ہیں نہ کہ سود لینے والے۔ اس کا معنی ہوگا کہ جو تم سود دیتے ہو تو سود لینے والوں کا مال تمہارے سود دینے سے نہیں بڑھتا اور اس میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے کچھ برکت پیدا نہیں ہوتی۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے "يَمْحَقُ اللّٰهُ الرِّبٰوا وَيُرْبِي الصَّدَقٰتِ" (اللہ تعالیٰ سود کو مٹاتے ہیں اور صدقات کو بڑھاتے ہیں)۔ جبکہ حضرت ابن عباسؓ اور جمہور مفسرین کرام کی رائے یہ ہے کہ اس سے مراد یہ ہے کہ انسان کسی کو اس نیت سے ہدیہ دے کہ وہ اس سے زیادہ اسے واپس کرے گا۔ تو اس عمل میں نہ تو انسان کو ثواب ہوتا ہے اور نہ ہی عقاب۔ باقی اسے ربا اس لئے کہتے ہیں کہ اس میں ربا یعنی زیادتی پائی جاتی ہے۔ یہ تو تھا قراءت بالمد کا معنی' اور قراءت بالقصر کا معنی یہ ہے کہ جو سودی لین دین تم کرتے ہو' ارشادِ باری تعالیٰ "فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُضْعِفُوْنَ" میں خطاب سے غیبت کی طرف انتقال ہے مطلب یہ ہے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ نیکیوں کو کئی گنا بڑھادیتے ہیں۔

سوال: مِنْ قَبْلِ اَنْ يُّنَزَّلَ عَلَيْهِمْ" (اس سے قبل کہ ان پر نازل ہو) کہنے کے بعد من قبلہ کہنے

کی کیا ضرورت تھی؟
جوابِ اوّل: اللہ تبارک وتعالیٰ نے اسے تاکید کے لئے ذکر فرمایا۔
جوابِ ثانی: اگر ضمیر کا مرجع ارسالِ ریاح یا ارسالِ سحاب مابین تو اس سے تکرار لازم نہیں آتا۔
سوال: اللہ تبارک وتعالیٰ نے یوں کیوں ارشاد فرمایا "اَللّٰہُ الَّذِیْ خَلَقَکُمْ مِّنْ ضُعْفٍ" (اللہ ایسا ہے جس نے تم کو ناتوانی کی حالت میں بنایا)۔ حالانکہ ضعف ضعیف چیز کی صفت ہے انسان اس صفت سے کیسے پیدا ہوسکتا ہے؟ حالانکہ سبھی کو معلوم ہے کہ انسان پانی یا مٹی سے پیدا ہوا ہے نہ کہ کسی صفت سے۔

جوابِ اوّل: مذکورہ آیت میں ضعف سے مراد اسم فاعل ہے جیسے کہ عرب حضرات کا مقولہ ہے رجل عدل۔ اس کا مطلب بھی یہی ہے کہ رجل عادل۔ اس آیت میں بھی ضعف سے مراد ضعیف ہے یعنی نطفہ۔

جوابِ ثانی: من ضعف میں من علیٰ کے معنیٰ میں ہے جیسے کہ "وَنَصَرْنٰہُ مِنَ الْقَوْمِ الَّذِیْنَ کَذَّبُوْا بِاٰیٰتِنَا" (اور ہم نے اپنے لوگوں سے ان کا بدلہ میں جنہوں نے ہمارے حکموں کو جھوٹا بتایا ہے) میں من علیٰ کے معنیٰ میں ہے۔ تب اس کا معنی ہوگا کہ بچپن میں بچے کا کمزور جسم۔
سوال: ارشادِ باری تعالیٰ ہے: "لَقَدْ لَبِثْتُمْ فِیْ کِتٰبِ اللّٰہِ اِلٰی یَوْمِ الْبَعْثِ" (کہ تم تو نوشتہ خداوندی کے موافق قیامت کے دن تک رہے) حالانکہ وہ تو زمین میں اپنی قبروں میں موجود رہیں گے؟
جوابِ اوّل: یعنی کتاب اللہ کے علم اور اس کی خبر کے مطابق تم اپنی قبروں میں رہو گے۔
جوابِ ثانی: کتاب اللہ سے مراد قضاء اللہ ہے۔
جوابِ ثالث: اس آیت مبارکہ میں تقدیم وتاخیر ہے۔ اصل عبارت اس طرح ہے "وقال الذین اوتوا العلم فی کتاب اللّٰہ الذین عملوہ وفھموہ" جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے: "وَمِنْ وَّرَآئِھِمْ بَرْزَخٌ اِلٰی یَوْمِ یُبْعَثُوْنَ" (اور ان لوگوں کے آگے ایک آڑ ہے قیامت کے دن تک)

سوال: اللہ تبارک وتعالیٰ نے ایک جگہ ارشاد فرمایا: "وَلَا ھُمْ یُسْتَعْتَبُوْنَ" (اور ان سے خدا کی خفگی کا تدارک نہیں چاہا جاوے گا) جبکہ دوسری جگہ ارشاد ہے: "وَاِنْ یَّسْتَعْتِبُوْا فَمَا ھُمْ مِّنَ الْمُعْتَبِیْنَ" (اور اگر وہ عذر کرنا چاہیں گے تو بھی مقبول نہ ہوگا) ان میں تطبیق کیسے ہوگی؟
جواب: وَلَا ھُمْ یُسْتَعْتَبُوْنَ کا مطلب ہے کہ ان کی لغزشوں کو معاف کر کے انہیں دنیا میں نہیں

بھیجا جائیگا۔ اور "وَاِنْ یَّسْتَعْتِبُوْا فَمَا ھُمْ مِّنَ الْمُعْتَبِیْنَ" کا مطلب ہے کہ اگر وہ معذرت کریں گے تو ان کی معذرت قبول نہیں کی جائیگی۔

# سورۃ لقمان

سوال: ارشاد باری تعالیٰ "وَمِنَ النَّاسِ مَنْ یَّشْتَرِیْ لَھْوَ الْحَدِیْثِ" (اور بعض آدمی ایسا ہو جوان باتوں کا خریدار بنتا ہو) کی تفسیر میں نقل فرمایا ہے کہ اکثر مفسرین کے نزدیک لَھْوَ الْحَدِیْثِ سے مراد گانے ہیں۔ آنحضرتؐ سے روایت ہے کہ آپؐ نے فرمایا "اس ذات کی قسم جس کے قبضہ قدرت میں میری جان ہے جب بھی کوئی شخص اپنے گانے کی آواز بلند کرتا ہے تو اس پر دو شیطان مسلط ہوجاتے ہیں جو اپنی ٹانگیں اس کی پیٹھ اور سینے پر مارتے رہتے ہیں یہاں تک کہ وہ خاموش نہ ہوجائے۔ حضرت سعید بن جبیرؓ، حضرت مجاہدؓ اور حضرت ابن مسعودؓ فرماتے ہیں کہ لھوالحدیث سے گانے اور گویوں کو مال کے ذریعے خریدنا مراد ہے۔ آنحضرتؐ سے ایک اور حدیث بھی سند کے ساتھ مروی ہے کہ آپؐ نے اس آیۂ مبارکہ کے متعلق ارشاد فرمایا: اس سے مراد ہر وہ کھیل اور باطل کام ہے جس میں انسان کثیر مال خرچ کردے حالانکہ اس کا دل ایک درہم صدقہ کے لئے بھی نہیں چاہتا۔ آپؐ سے ایک اور روایت سند کے ساتھ مذکور ہے کہ آپؐ نے فرمایا جو اپنے کانوں کو گانوں کی آواز سے بھرتا رہا وہ قیامت کے دن روحانیوں کی آواز نہیں سنے گا' آپؐ سے پوچھا گیا کہ روحانی کون لوگ ہیں؟۔ آپؐ نے فرمایا قراءِ اہل جنت۔ اہل معانی حضرات فرماتے ہیں کہ اس میں ہر وہ شخص داخل ہے جو کھیل کود اور گانوں کے آلات کو قرآن پر ترجیح دیتا ہے اگرچہ قرآن کریم میں اشتراء (خریدنا) کا لفظ مذکور ہوا ہے۔ کیونکہ یہ لفظ اختیار اور ترجیح کے معنی کے لئے بہ کثرت مستعمل ہوتا ہے۔ حضرت قتادہؓ فرماتے ہیں "انسان کی گمراہی کے لئے یہ کافی ہے کہ وہ باطل بات کو حق بات کے مقابلہ میں اختیار کرے" یہ تمام تفصیل امام واحدیؒ کی نقل فرمودہ ہے جو علم و عمل دونوں اعتبار سے سلف اکابرین میں شمار ہوتے ہیں۔ ان کے علاوہ حضرت ابن عباسؓ ابن مسعودؓ، مجاہدؒ سعید بن جبیرؒ، عکرمہ اور حضرت قتادہؓ فرماتے ہیں کہ لھوالحدیث سے مراد گانے ہیں' حضرت حسنؓ فرماتے ہیں کہ اس سے مراد ہر وہ چیز ہے جو خدا تعالیٰ سے غافل کردے' یشتری کے معنی میں دو قول ہیں (۱) مال کے ساتھ خریدنا (۲) اختیار کرنا' کسی کا قول ہے کہ گانا مال کو ضائع دل کو فاسد اور رب کو ناراض کردیتا ہے۔

جواب: اس قسم کی آیات واحادیث کی یہ تاویل کی جاتی ہے کہ اگر یہ کام میلان شہوات اور اتباع

خواہشات کا سبب ہو تو بیشک اس کا یہی حکم ہے' اگر عقل کی آنکھ سے دیکھا جائے تو ہمارے زمانہ کے مروجہ سماع میں چونکہ یہ مفاسد موجود ہیں لہٰذا ان کے حرام ہونے میں مسلمانوں کا کچھ اختلاف نہیں۔ کتب مشائخ میں ارباب تصوف نے جن شروط کے ساتھ سماع کے مباح ہونے کا ذکر کیا ہے وہ شروط ہمارے زمانہ میں موجود نہیں ہیں۔ اگر ہم اس مسئلہ کی تفصیل شروع کر دیں تو ہم کتاب کے مقصد کو چھوڑ بیٹھیں گے لہٰذا اسی پر اکتفاء کرتے ہیں۔

سوال: حضرت لقمانؑ کی وصیت کے درمیان میں '' وَوَصَّيْنَا الْإِنْسَانَ بِوَالِدَيْهِ '' دو آیات کیوں ذکر فرمائیں؟

جواب: یہ حضرت لقمانؑ کی نہی عن الشرک کی تاکید کے لئے جملہ معترضہ ہے۔

سوال: '' وصينا '' کے مفعول '' اَنِ اشْكُرْ الخ '' کے درمیان '' حَمَلَتْهُ اُمُّهٗ وَهْنًا عَلٰى وَهْنٍ وَّفِصَالُهٗ فِیْ عَامَيْنِ '' (اس کی ماں نے ضعف اٹھا کر اس کو پیٹ میں رکھا اور دو برس میں اس کا دودھ چھوٹتا ہے) کیوں ذکر فرمایا۔؟

جواب: جب والدین کے ساتھ احسان کی وصیت فرمائی تو وصیت کی تاکید کے لئے والدہ کی مشقتوں کا تذکرہ کیا اور صرف والدہ کا ذکر فرما کر اس بات کی طرف متوجہ کیا کہ ان کا حق سب سے زیادہ ہے۔ اسی لئے جب آنحضرتؐ سے پوچھا گیا کہ سب سے زیادہ کس کے ساتھ حسن سلوک کا معاملہ کیا جائے تو آپؐ نے فرمایا اپنی والدہ کے ساتھ' پھر اپنی والدہ کے ساتھ پھر اپنی والدہ کے ساتھ۔ اس کے بعد فرمایا پھر اپنے والد کے ساتھ۔

سوال: '' اِنَّ اَنْكَرَ الْاَصْوَاتِ لَصَوْتُ الْحَمِيْرِ '' (بے شک آوازوں میں سے سب سے بری آواز گدھوں کی آواز ہے) میں اصوات کو جمع اور حمیر کو واحد کیوں ذکر کیا؟۔

جواب: اس سے اس جنس کے ہر ہر فرد کی آواز کا ذکر مراد نہیں ہے بلکہ مراد یہ ہے کہ حیوان ناطق وغیرہ ہر جنس کی ایک آواز ہے اور ان اجناس میں سے سب سے بری آواز گدھے کی جنس کی ہے' لہٰذا اسے مفرد ذکر کرنا ضروری تھا تاکہ یہ وہم نہ ہو کہ اس میں گدھوں کا اجتماع شرط ہے۔

سوال: ارشاد باری تعالیٰ '' وَالْبَحْرُ يَمُدُّهٗ مِنْۢ بَعْدِهٖ سَبْعَةُ اَبْحُرٍ '' (اور یہ جو سمندر ہے اس کے علاوہ سات سمندر اور اس میں شامل ہو جاویں) کیوں ذکر فرمایا؟۔

جواب: یمدہ کے ذکر کے بعد لفظ مداد (سیاہی) کے ذکر کی ضرورت ہی نہ رہی' اس لئے کہ مدالدواۃ اور امدالدواۃ کا ترجمہ ہوتا ہے سیاہی کا زیادہ کر دینا۔ یعنی بحر محیط کو دواۃ کے قائم مقام بنایا پھر سات سمندروں کی سیاہی کے متعلق بھی فرمایا کہ وہ بھی کلمات خداوندی کے لکھنے کے لئے

ناکافی ہیں۔اسی طرح ارشاد باری تعالیٰ ہے"قُلْ لَّوْ کَانَ الْبَحْرُ مِدَادًا لِّکَلِمَاتِ رَبِّیْ"

سوال: "مِنْ شَجَرَۃٍ" (جتنے درخت) کا لفظ کیوں استعمال فرمایا من شجر کا لفظ کیوں استعمال نہیں فرمایا؟۔

جواب: تاکہ اس پر دلالت ہو سکے کہ جنسِ شجر میں سے کوئی بھی شجرہ باقی نہ رہے جس کی اقلام نہ بنائی گئی ہوں۔

سوال: الکلمات جمع قلت ہے' جب اس سے مراد تعظیم ہے تو پھر جمع کثرت یعنی الکلم کا استعمال زیادہ مناسب تھا۔؟

جواب: جمع قلت کا استعمال مقصود کے زیادہ قریب ہے کہ جب لفظ جمع قلت بھی ان اقلام اور سیاہی سے ختم نہیں ہو سکتے تو جمع کثرت کیسے ختم ہو سکتے ہیں۔

سوال: "اِنَّ اللّٰہَ عِنْدَہٗ عِلْمُ السَّاعَۃِ" (بے شک اللہ ہی کو قیامت کی خبر ہے) میں اللہ تبارک و تعالیٰ نے پانچ غیب کی باتوں میں سے پہلی تین کی نسبت اپنی طرف فرمائی ہے جبکہ دو آخری باتوں کے متعلق فرمایا کہ انسانوں کو ان کا علم نہیں' حالانکہ پانچ کی پانچ چیزیں اللہ تبارک وتعالیٰ کے علم کے ساتھ خاص ہونے اور انسانوں کے عدمِ علم میں برابر ہیں۔؟

جواب: اللہ تبارک وتعالیٰ نے پہلی تین چیزوں کی نسبت اپنی طرف اس لئے فرمائی کہ ان میں عظمت وتفخیم زیادہ ہے اور آخری دو کی نفی بندوں کے علم سے اس لئے فرمائی کہ وہ بندوں کی صفات اور ان کے احوال سے متعلق ہیں تو جب انسان کو ان چیزوں کا علم نہیں تو ان کے علاوہ اور چیزوں کا علم تو بطریق اولیٰ نہیں ہوگا۔

سوال: اللہ تبارک وتعالیٰ نے "وَمَا تَدْرِیْ نَفْسٌ ، بِاَیِّ اَرْضٍ تَمُوْتُ" (اور کوئی شخص نہیں جانتا کہ وہ کس زمین میں مرے گا) کیوں فرمایا اور یہ کیوں نہیں فرمایا کہ بایِّ وقت تموت یعنی کس وقت مرے گا حالانکہ یہ دونوں چیزیں نامعلوم ہیں بلکہ علمِ وقت کی نفی زیادہ مناسب تھی کیونکہ بعض نجومی حضرات وقت کے علم کا دعویٰ کرتے ہیں بخلاف جگہ کے کہ اس کا دعویٰ کوئی بھی نہیں کرتا۔؟

جواب: جگہ کے علم کی نفی کی دو وجہیں ہیں (۱) ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل ہونا یہ انسان کی وسعت اور اس کے اختیار میں ہے' اسی لئے موت کی جگہ کے علم کا اعتقاد انسان کو موت کے وقت کی بہ نسبت زیادہ ہوتا ہے۔ (۲) مقام اور جگہ کی تاثیر صحت اور بیماری میں مسلم ہے بخلاف زمانہ کے اور اگر زمانہ میں تاثیر کو درست مان بھی لیا جائے تو بھی مقام اور جگہ کی تاثیر زیادہ ہوتی ہے۔

# سورۃ السجدہ

سوال: اللہ تبارک وتعالیٰ نے یہ کیوں ارشاد فرمایا: ''یُدَبِّرُ الْاَمْرَ مِنَ السَّمَآءِ اِلَى الْاَرْضِ ثُمَّ یَعْرُجُ اِلَیْهِ فِیْ یَوْمٍ كَانَ مِقْدَارُهٗۤ اَلْفَ سَنَةٍ مِّمَّا تَعُدُّوْنَ'' (وہ آسمان سے لیکر زمین تک ہر امر کی تدبیر کرتا ہے پھر ہر امر اسی کے حضور میں پہنچ جاوے گا ایک ایسے دن میں جس کی مقدار تمہاری شمار کے موافق ایک ہزار برس کی ہوگی)۔

حالانکہ سورۃ المعارج میں موجود ہے: ''تَعْرُجُ الْمَلٰٓىِٕكَةُ وَالرُّوْحُ اِلَیْهِ فِیْ یَوْمٍ كَانَ مِقْدَارُهٗ خَمْسِیْنَ اَلْفَ سَنَةٍ'' (فرشتے اور روحیں اس کے پاس چڑھ کر جاتی ہیں ایسے دن میں ہوگا جس کی مقدار پچاس ہزار سال ہے)؟۔

جوابِ اوّل: پہلی آیت سے مراد فرشتوں کے عروج کی وہ مسافت ہے جو زمین سے لے کر آسمان دنیا کی سطح اعلیٰ تک ہے' پانچ سو سال زمین وآسمان دنیا کے مابین مسافت ہے اور پانچ سو سال آسمان دنیا کی دبیز تہہ کی مسافت ہے۔ اور دوسری آیت سے فرشتوں کا زمین سے عرش تک عروج مراد ہے۔

جوابِ ثانی: ان دونوں آیات سے مراد قیامت کا دن ہے۔ اس کی مقدار اہل دنیا کے حساب کے مطابق تو ایک ہزار سال ہے اور اگر مخلوق کا حساب اللہ تبارک وتعالیٰ کے علاوہ کسی اور کے سپرد ہوتا تو یہ مقدار پچاس ہزار سال ہوتی۔

جوابِ ثالث: عام مؤمنین کے حق میں تو یہ ایک ہزار سال کے برابر ہوگا جبکہ کفار چونکہ رنج و تکلیف کی حالت میں ہونگے لہٰذا انہیں یہ پچاس ہزار سال کا معلوم ہوگا اور خواص مؤمنین کے حق میں دنیا کے ایک حصہ کی مانند ہوگا' اس کی تائید اس روایت سے بھی ہوتی ہے کہ آنحضرت ﷺ سے پوچھا گیا' قیامت کا دن جو پچاس ہزار سال کا ہے کس قدر طویل ہوگا؟ آپؐ نے فرمایا اس ذات کی قسم جس کی قبضۂ قدرت میں میری جان ہے کہ وہ مؤمن پر فرض نماز سے بھی زیادہ ہلکا ہوگا جسے وہ دنیا میں پڑھتا ہے۔ یہ بھی روایت ہے کہ حضرت ابن عباسؓ سے ان دونوں آیات کے متعلق پوچھا گیا تو آپؓ نے فرمایا یہ دو دن جن کا ذکر اللہ تبارک وتعالیٰ نے قرآن میں فرمایا ہے۔ میں پسند نہیں کرتا کہ کتاب اللہ کے بارہ میں ایسی بات کہوں جس کا مجھے علم نہیں۔

سوال: اللہ تبارک وتعالیٰ نے یہ کیسے ارشاد فرمایا: ''اَلَّذِیْۤ اَحْسَنَ كُلَّ شَیْءٍ خَلَقَهٗ'' (جس نے جو چیز بنائی خوب بنائی) علیٰ اختلاف القراءتین۔ اس آیت سے تو یہ ثابت ہوتا ہے کہ اللہ تبارک

وتعالی کی کوئی بھی مخلوق قبیح نہیں ہے حالانکہ یہ بات صحیح نہیں ہے کیونکہ شرور و معاصی جو اہل سنت و الجماعت کے نزدیک مخلوق ہیں یقیناً قبیح ہیں؟

جوابِ اوّل: احسن' احکم اور اتقن (مضبوط کرنا) کے معنی میں ہے۔

جوابِ ثانی: اس میں عبارت مقدر ہے مطلب ہے کہ ہر چیز کو پیدا فرما کر اس پر احسان کیا۔

جوابِ ثالث: احسن عَلِمَ کے معنی میں ہے جیسے کہ عرب حضرات کا مقولہ ہے "فلان لا یحسن شیئًا" فلاں کچھ نہیں جانتا۔ حضرت علیؓ کا ارشاد گرامی ہے" قیمة کل امری مایحسنه" ہر انسان اپنی قیمت کو جانتا ہے۔ تو آیت کا ترجمہ ہوگا کہ اللہ تبارک وتعالی کو ہر چیز پیدا کرنے کا خود بخود علم ہے کسی سے سیکھ کر علم حاصل نہیں ہوا۔ لیکن یہ مذکورہ بالا آخری دو جواب صرف قراءت بفتح اللام کے ساتھ خاص ہیں۔

سوال: اللہ تبارک وتعالی نے اس جگہ ارشاد فرمایا: "مِنْ سُلٰلَةٍ مِّنْ مَّآءٍ مَّهِيْنٍ" (یعنی ایک بے قدر پانی سے بنایا) جبکہ دوسری جگہ ارشاد ہے: "مِنْ سُلٰلَةٍ مِّنْ طِيْنٍ" (مٹی کے خلاصہ سے بنایا)؟۔

جواب: یہاں اولادِ آدم کے متعلق بتایا جارہا ہے جبکہ دوسری جگہ حضرت آدمؑ کے بارہ میں ارشاد ہے۔ لہٰذا دونوں آیات میں کوئی تعارض نہیں۔

سوال: ارشادِ باری تعالی ہے: "وَنَفَخَ فِيْهِ مِنْ رُّوْحِهٖ" (اور اس میں اپنی روح پھونکی)۔ حالانکہ اللہ تبارک وتعالی روح سے پاک ہیں۔؟

جواب: اس سے مراد وہ روح ہے جس کی نسبت اللہ تبارک وتعالی کی طرف ہے کہ اللہ تبارک و تعالی نے اسے پیدا فرمایا اور ایجاد فرمایا۔

سوال: اللہ تبارک وتعالی نے اس جگہ ارشاد فرمایا: "قُلْ يَتَوَفّٰىكُمْ مَّلَكُ الْمَوْتِ" (آپ فرمادیجئے تمہاری جان موت کا فرشتہ قبض کرتا ہے)۔

جبکہ دوسری جگہ ارشاد فرمایا: "تَوَفَّتْهُ رُسُلُنَا" (اس کی روح ہمارے بھیجے ہوئے قبض کر لیتے ہیں) نیز ایک اور جگہ ارشاد گرامی ہے: "اَللّٰهُ يَتَوَفَّى الْاَنْفُسَ حِيْنَ مَوْتِهَا" (اللہ ہی قبض کرتا ہے جانوں کو ان کی موت کے وقت) ان تمام آیات میں تعارض ہے؟

جواب: اصل موت دینے والی ذات اللہ تبارک وتعالی کی ہے کیونکہ موت اسی کی پیدا کردہ ہے' باقی اللہ تبارک وتعالی نے قبض روح کے لئے اپنے کارندے مقرر فرمائے ہوئے ہیں لہٰذا اللہ تبارک وتعالی کی طرف بھی توفی کی نسبت درست ہے' اور فرشتوں کی طرف اس لئے درست ہے کہ وہ ملک

الموت کے معاون ہیں جو روح کو ناخنوں سے کھینچ کر حلقوم تک لاتے ہیں اور حضرت ملک الموت حلقوم سے روح قبض فرمالیتے ہیں۔ لہٰذا ان کی طرف بھی توفی کی نسبت درست ہے۔

سوال: ارشادِ باری تعالیٰ ہے: ''اِنَّمَا یُؤمِنُ بِاٰیٰتِنَا الَّذِیْنَ اِذَا ذُکِّرُوْا بِهَا خَرُّوْا سُجَّدًا'' (پس ہماری آیتوں پر تو وہ لوگ ایمان لاتے ہیں کہ جب ان کو وہ آیتیں یاد دلائی جاتی ہیں تو وہ سجدہ میں گر پڑتے ہیں) حالانکہ مومن صرف وہی لوگ نہیں ہیں جو اس صفت سے متصف ہیں اور نہ ہی یہ صفت تحقق ایمان کے لئے شرط ہے؟

جوابِ اوّل: ارشادِ باری تعالیٰ ذُکِّرُوْا بِهَا کا مطلب ہے کہ جب انہیں نصیحت کی جائے اور ''سجد'' کا مطلب ہے خشوع وخضوع اور تواضع کے ساتھ نصیحت قبول کرنا۔ اور یہ صفت یقیناً تحقق ایمان کے لئے شرط ہے۔ اس کی نظیر میں خداوند عزوجل کا یہ فرمان پیش کیا جاسکتا ہے: ''اِنَّ الَّذِیْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ مِنْ قَبْلِهٖ اِذَا یُتْلٰی عَلَیْهِمْ یَخِرُّوْنَ لِلْاَذْقَانِ سُجَّدًا'' (جن لوگوں کو قرآن سے پہلے علم دیا گیا تھا یہ قرآن میں ان کے سامنے پڑھا جاتا ہے تو تھوڑیوں کے بل سجدے میں گر پڑتے ہیں)۔

جوابِ ثانی: یعنی جو ہماری آیات پر ایمان کامل رکھتے ہیں وہ اس صفت سے متصف ہیں۔

جوابِ ثالث: بعض حضرات فرماتے ہیں کہ آیات سے مراد پانچ فرض نمازیں ہیں اور تذکیر سے مراد اذان واقامت ہے۔

سوال: ''اَفَمَنْ کَانَ مُؤْمِنًا کَمَنْ کَانَ فَاسِقًا'' (تو جو شخص مومن ہوگیا وہ اس شخص جیسا ہوجائے گا جو بے حکم ہو) سے تو یہ ظاہر ہوتا ہے کہ فاسق مؤمن نہیں ہوتا؟

جواب: مذکورہ آیت میں فاسق' کافر کے معنی میں ہے' اس کی دلیل یہ ہے کہ اس کے بعد مذکور ہے: ''وَقِیْلَ لَهُمْ ذُوْقُوْا عَذَابَ النَّارِ الَّتِیْ کُنْتُمْ بِهٖ تُکَذِّبُوْنَ'' (اور ان کو کہا جائے گا کہ دوزخ کا وہ عذاب چکھو جس کو جھٹلایا کرتے تھے) تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ فاسق مذکور تو کافر ہے لیکن یہ ثابت نہیں ہوتا کہ ہر فاسق کافر ہو۔

جیسے کہ: ''اَفَنَجْعَلُ الْمُسْلِمِیْنَ کَالْمُجْرِمِیْنَ'' (کیا ہم فرمانبرداروں کو نافرمانوں کے برابر کردیں گے) اور ''اَمْ حَسِبَ الَّذِیْنَ اجْتَرَحُوا السَّیِّاٰتِ اَنْ نَّجْعَلَهُمْ کَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ'' (یہ لوگ جو برے برے کام کرتے ہیں کیا یہ خیال کرتے ہیں کہ ہم ان کو ان لوگوں کے برابر رکھیں گے جنہوں نے ایمان اور عملِ صالح اختیار کیا) سے ثابت نہیں ہوتا کہ ہر مجرم یا ہر خطاء کار کافر ہے۔

سوال: ''وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنْ ذُكِّرَ بِاٰیٰتِ رَبِّہٖ '' (اور اس شخص سے بڑا ظالم کون ہوگا جس کو اس کے رب کی آیتیں یاد دلائی جاویں) کے مناسب تو یہ تھا کہ فرماتے ''اِنَّا مِنْهُمْ مُنْتَقِمُوْنَ '' کہ ہم ان سے انتقام لینے والے ہیں لیکن ارشاد فرمایا: ''اِنَّا مِنَ الْمُجْرِمِیْنَ مُنْتَقِمُوْنَ '' (ہم ایسے مجرموں سے بدلہ لیں گے)۔

جواب: اللہ تبارک وتعالیٰ نے پہلے تو سب سے بڑے ظالم کا تذکرہ کیا اور پھر ہر مجرم کو انتقام سے ڈرایا تاکہ سب سے بڑے ظالم کو علم ہو جائے کہ اس سے شدید انتقام لیا جائیگا۔ اگر اللہ تبارک وتعالیٰ ضمیر ذکر فرما دیتے تو یہ فائدہ حاصل نہ ہوتا۔

سوال: ''وَیَقُوْلُوْنَ مَتٰی هٰذَا الْفَتْحُ '' (اور یہ لوگ کہتے ہیں فیصلہ کب ہوگا) سوال وجواب میں مطابقت نہیں ہے؟

جواب: چونکہ کفار کا سوال تکذیب واستہزاء پر مبنی تھا نہ کہ استفہام پر لہٰذا انہیں جواب بھی تہدید کے طور پر دیا گیا اور حقیقت وقت نہیں بتائی گئی۔

سوال: جن حضرات کے نزدیک الفتح سے مراد فتح مکہ یا فتح بدر ہے وہ: ''قُلْ یَوْمَ الْفَتْحِ لَا یَنْفَعُ الَّذِیْنَ كَفَرُوْٓا اِیْمَانُهُمْ '' (آپ فرما دیجئے کہ اس فیصلے کے دن کافروں کو ان کا ایمان لانا نافع نہ ہوگا) کا کیا مطلب بیان فرماتے ہیں۔ کیونکہ بعض کفار کو تو ان کے ایمان نے ان دونوں دنوں میں فائدہ پہنچایا تھا' اور وہ وہ لوگ تھے جنہیں آزاد کر دیا گیا تھا اور وہ ایمان لے آئے تھے؟

جواب: مطلب یہ ہے کہ مقتولین کو قتل کے وقت ان کا ایمان فائدہ نہیں پہنچاتا' جیسے کہ فرعون کو اس کے ایمان نے غرق کے وقت کچھ فائدہ نہیں پہنچایا۔

# سورۃ الاحزاب

سوال: اللہ تبارک وتعالیٰ نے ''یٰٓاَیُّهَا النَّبِیُّ '' فرمایا نہ کہ یا محمد جبکہ دیگر انبیاءِ کرامؑ کو ان کے اسماء کے ساتھ مخاطب کیا جیسے کہ ''یا موسٰی' یا عیسٰی' یا داؤد ''؟

جواب: آنحضرتؐ کو آپؐ کی جلالتِ شان کے سبب نام کی بجائے النبی اور الرسول کے الفاظ سے مخاطب بنایا گیا' دوسری جگہ ارشاد گرامی ہے: ''یٰٓاَیُّهَا النَّبِیُّ لِمَ تُحَرِّمُ یٰٓاَیُّهَا الرَّسُوْلُ بَلِّغْ ''۔

سوال: تو پھر خبریہ جملوں میں بھی آنحضرتؐ کا نام مبارک ذکر نہیں کرنا چاہیے تھا' حالانکہ آپ کا اسم گرامی موجود ہے' جیسے کہ ''مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ '' (محمد اللہ کے رسول ہیں) ''وَمَا مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُوْلٌ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ '' (اور محمد رسول ہی تو ہیں آپ سے پہلے بھی بہت سے رسول

گذر چکے ہیں)؟۔
جواب: ان دونوں جگہوں میں آنحضرتؐ کے نام مبارک کو اس لئے ذکر فرمایا تاکہ لوگوں کو آپ کا رسول ہونا معلوم ہو جائے اور انہیں اس بات کا بھی علم ہو جائے کہ آپ کو اسی نام سے پکارا جائے' اسی لئے ان دو جگہوں کے علاوہ جملہ خبریہ میں بھی آپ کے لئے رسول کا لفظ استعمال کیا گیا ہے جیسے کہ "لَقَدْ جَاءَكُمْ رَسُوْلٌ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ. وَقَالَ الرَّسُوْلُ يَارَبِّ. لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيْ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ. وَاللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ اَحَقُّ اَنْ يُّرْضُوْهُ. اَلنَّبِيُّ اَوْلٰى بِالْمُؤْمِنِيْنَ مِنْ اَنْفُسِهِمْ . اِنَّ اللّٰهَ وَمَلَائِكَتَهٗ يُصَلُّوْنَ عَلَى النَّبِيِّ. وَلَوْ كَانُوْا يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالنَّبِيِّ. وغیرہ
سوال: ارشادِ باری تعالیٰ: "مَا جَعَلَ اللّٰهُ لِرَجُلٍ مِّنْ قَلْبَيْنِ فِيْ جَوْفِهٖ" (اللہ تعالیٰ نے کسی شخص کے سینے میں دو دل نہیں بنائے) میں لفظ جوف ذکر کرنے کا کیا فائدہ ہے؟۔
جواب: اس قسم کا سوال جواب' سورۃ الحج میں: "وَلٰكِنْ تَعْمَى الْقُلُوْبُ الَّتِيْ فِي الصُّدُوْرِ" (بلکہ دل جو سینوں میں ہیں وہ اندھے ہو جایا کرتے ہیں) کے تحت گذر چکا ہے۔
سوال: "انت علیّ کظھر امی" (تو مجھ پر والدہ کی پیٹھ کی طرح حرام ہے) کا کیا مطلب ہے؟
جواب: اصل میں یہ کہنا چاہتے تھے: "انت علی حرام کبطن امی" (تو مجھ پر ماں کے پیٹ کی طرح حرام ہے) لیکن پھر پیٹ کی بجائے پیٹھ کو ذکر کر دیا تاکہ اس چیز کا ذکر نہ ہو جو شرمگاہ کے قریب ہے باقی پیٹھ کو دو وجہوں سے پیٹ کا کنایہ بنایا ہے۔
(۱) کیونکہ پیٹھ' پیٹ کا ستون ہے' اس کی تائید حضرت عمرؓ کے اس قول سے بھی ہوتی ہے کہ انہوں نے فرمایا: "یجیء احدھم علی عمود بطنه"
(۲) عرب حضرات پشت کی طرف سے بیوی پر آنے کو حرام سمجھتے تھے اور یہ گمان کرتے تھے کہ اس طرح اولاد بھینگی پیدا ہوتی ہے' اسی لئے زمانہ جاہلیت میں سخت طلاق کے لئے یہ لفظ استعمال کیا گیا "انت علی کظھر امی"
سوال: اللہ تبارک وتعالیٰ نے ازواج مطہرات کو حکماً مؤمنین کی مائیں بنا دیا ہے' ارشادِ گرامی ہے: "وَاَزْوَاجُهٗ اُمَّهَاتُهُمْ" (اور آپ کی بیبیاں ان کی مائیں ہیں) لیکن آنحضرتؐ کو مومنین کا باپ نہیں بنایا بلکہ ارشاد فرمایا: "مَا كَانَ مُحَمَّدٌ اَبَا اَحَدٍ مِّنْ رِّجَالِكُمْ" (محمد تمہارے مردوں میں سے کسی کے باپ نہیں) اس کی کیا وجہ ہے؟
جوابِ اوّل: چونکہ عورت کے لئے سب سے مبارک اور اشرف نام "ماں" ہے' اس لئے اللہ تبارک وتعالیٰ نے ازواج مطہرات کے لئے امہات المؤمنین ارشاد فرمایا جبکہ مرد یعنی آنحضرتؐ

کے لئے سب سے مبارک نام باپ نہیں بلکہ رسول اللہ ہے اس لئے آپؐ کے لئے رسول اللہ ارشاد فرمایا۔

جوابِ ثانی: اللہ تبارک وتعالیٰ نے ازواج مطہرات کو مومنین کی مائیں بنادیا تا کہ ان سے نکاح حرام ہو اور کوئی بھی آنحضرتؐ کے بعد ان کے ساتھ نکاح کی طمع نہ رکھ سکے اور یقیناً اس میں آنحضرتؐ کی تعظیم کا نمایاں پہلو موجود ہے اور اگر آنحضرت کو مؤمنین کا باپ بنادیتے تو آپؐ کے لئے مومنات سے نکاح ناجائز ہو جاتا جو آپؐ کی تعظیم کے منافی تھا اسی لئے آپ کو باپ نہیں بنایا بلکہ قرب اور حرمت میں باپ سے بڑا رتبہ عطاء فرمایا۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے: ''اَلنَّبِيُّ اَوْلٰى بِالْمُؤْمِنِيْنَ مِنْ اَنْفُسِهِمْ'' (نبی مؤمنین کے ساتھ خود ان کے نفس سے بھی زیادہ تعلق رکھتے ہیں) اللہ تعالیٰ نے تو آپ کو اپنی جانوں سے بھی زیادہ اولیٰ قرار دیا ہے بہت سے آباء اپنی اولاد سے اور بہت سی اولاد اپنے آباء سے تو بے پرواہ ہو سکتی ہے لیکن کوئی بھی شخص خود اپنی ذات سے بے پرواہ نہیں ہو سکتا۔

سوال: ارشادِ باری تعالیٰ: ''وَاِذْ اَخَذْنَا مِنَ النَّبِيِّيْنَ مِيْثَاقَهُمْ وَمِنْكَ وَمِنْ نُّوْحٍ وَّاِبْرٰهِيْمَ وَمُوْسٰى وَعِيْسَى ابْنِ مَرْيَمَ'' (اور جبکہ ہم نے تمام پیغمبروں سے ان کا اقرار لیا اور آپ سے بھی اور نوح اور ابراہیم اور موسیٰ اور عیسیٰ بن مریم سے بھی) میں آنحضرتؐ کو حضرت نوحؑ اور مابعد مذکور انبیاء کرامؑ پر مقدم کیوں فرمایا؟

جواب: یہ عطف الخاص علی العام کے قبیل سے ہے کہ پہلے تمام انبیاء کرام کا ذکر فرمایا اور پھر چند مشہور اور افضل ترین انبیاء کرام کا ذکر فرمایا اور چونکہ آنحضرتؐ ان تمام انبیاء کرام میں سب سے افضل ہیں لہٰذا آپ کو تمام انبیاء کرام پر مقدم فرمایا' باقی میثاق کے بارہ میں دو قول ہیں۔

(۱) اس بات کا عہد تھا کہ ایک دوسرے کی تصدیق کریں گے۔

(۲) اللہ تعالیٰ کی توحید کا اقرار کریں گے اور اس کی دعوت دیں گے نیز ایک دوسرے کی تصدیق کریں گے۔

سوال: آیت مذکورہ کے برخلاف: ''شَرَعَ لَكُمْ مِّنَ الدِّيْنِ مَا وَصّٰى بِهٖ نُوْحًا وَّالَّذِيْٓ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ'' (اللہ تعالیٰ نے تم لوگوں کے واسطے وہی دین مقرر کیا جس کا اس نے نوح کو حکم دیا تھا.....) میں حضرت نوح علیہ السلام کو آپؐ پر کیوں مقدم کیا؟

جواب: اس آیت کا سیاقِ کلام حضرت نوحؑ کے مقدم ہونے کا مقتضی ہے کیونکہ اس آیت میں دین اسلام کی اصل بنیاد کا تذکرہ ہے' ارشادِ باری تعالیٰ کا مطلب یہ ہے کہ تمہارے لئے وہ دین

اصلی شروع کیا۔ ہے جسے لے کر قدیم زمانہ میں حضرت نوحؑ مبعوث ہوئے اور موجودہ زمانہ میں آپ ﷺ مبعوث ہوئے جبکہ درمیاں میں دیگر چند مشاہیر انبیاءِ کرام کا تذکرہ بھی فرمادیا تو اس آیت میں سیاقِ کلام کی وجہ سے حضرت نوحؑ کو مقدم فرمایا۔

سوال: جب پہلے اخذِ میثاق کا ذکر ہو چکا تو پھر: ''وَاَخَذۡنَا مِنۡهُمۡ مِّيۡثَاقًا غَلِيۡظًا'' (اور ہم نے ان سب سے خوب پختہ عہد لیا) کے تکرار کی کیا ضرورت تھی؟۔

جواب: تاکید کیلئے اسے ذکر فرمایا' بعض حضرات فرماتے ہیں کہ میثاقِ غلیظ سے مراد اللہ کی قسم ہے لہٰذا تکرار بھی نہیں پایا گیا۔

سوال: اللہ تبارک وتعالیٰ نے مومنین پر احسان جتاتے ہوئے ان کے حالات کا نقشہ کھینچا: ''وَبَلَغَتِ الۡقُلُوۡبُ الۡحَنَاجِرَ'' (اور کلیجے منہ کو آنے لگے تھے) اگر دل حلقوم تک پہنچ جاتے تو ان کی موت واقع ہو جاتی اور اس احسان کی کوئی وجہ باقی نہ رہتی؟

جواب: ابن قتیبہؒ نے اس کا مطلب یہ ارشاد فرمایا ہے کہ قلبی اضطراب اور خوف کی وجہ سے دل حلقوم تک پہنچنے کے قریب ہوگئے تھے لیکن ابن الانباریؒ نے ان پر رد کرتے ہوئے فرمایا ہے کہ عرب بغیر کوئی لفظ استعمال کئے ''قریب'' کا معنی مراد نہیں لیتے' امام فراءؒ سے اس کا معنی یہ منقول ہے کہ انہیں شدید گھبراہٹ نے گھیرا' جب انسان بہت زیادہ گھبراہٹ کا شکار ہوتا ہے تو اس کے پھیپھڑے پھول جاتے ہیں اور اس کا دل بلند ہو کر اقصائے حلق (ابتداء حلق) تک پہنچ جاتا ہے' اور غم وغصہ کے وقت بھی انسان کی یہی حالت ہوتی ہے۔ یہی مطلب حضرت ابن عباسؓ سے بھی مروی ہے' اسی کے پیشِ نظر بزدل کے بارہ میں بھی یہی کہا جاتا ہے کہ اس کا حلقوم پھول گیا ہے۔

سوال: اللہ تبارک وتعالیٰ نے منافقین کے عذاب کو اپنی مشیت کے ساتھ کیوں معلق فرمایا: ''وَيُعَذِّبَ الۡمُنٰفِقِيۡنَ اِنۡ شَآءَ'' انہیں عذاب دینا تو قطعی اور یقینی ہے جیسا کہ: ''اِنَّ الۡمُنٰفِقِيۡنَ فِى الدَّرۡكِ الۡاَسۡفَلِ مِنَ النَّارِ'' (بلاشبہ منافقین دوزخ کے سب سے نیچے کے طبقے میں جاویں گے)؟

جواب: مطلب یہ ہے کہ اگر اللہ تبارک وتعالیٰ چاہیں گے تو اسی نفاق پر ان کی موت واقع ہو جائیگی اور انہیں عذاب بھگتنا ہوگا۔ بعض حضرات فرماتے ہیں بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر چاہیں گے تو عذاب میں مبتلاء کر دیں گے اور اللہ تبارک وتعالیٰ نے ایسا ہی چاہا ہے۔

سوال: ''لَقَدۡ كَانَ لَكُمۡ فِىۡ رَسُوۡلِ اللّٰهِ اُسۡوَةٌ حَسَنَةٌ'' (تم لوگوں کے لئے یعنی رسول اللہ کی ہستی مبارک میں عملی نمونہ ہے) کا کیا مطلب ہے؟

جواب: اس کے دو مطلب ہو سکتے ہیں:
(۱) آپ کی ذات گرامی ایک ایسا عمدہ نمونہ ہے جس کی ہر شخص کو پیروی کرنی چاہیئے۔
(۲) آپؐ میں ایسی ایسی عمدہ صفات موجود ہیں جنکے سبب آپ کی پیروی کرنی چاہیۓ' مثلاً خود پر صحابہ کرامؓ کو ترجیح دینا' جہاد میں ثابت قدمی دکھانا اور احد کی لڑائی میں جبکہ آپؐ کے دندان مبارک بھی شہید ہو گئے ثابت قدم رہنا۔
سوال: "وَلَمَّا رَاَی الْمُؤْمِنُوْنَ الْاَحْزَابَ قَالُوْا هٰذَا مَا وَعَدَنَا اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ وَصَدَقَ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ" (اور جب ایمانداروں نے ان لشکروں کو دیکھا تو کہنے لگے کہ یہ وہی ہے جس کی ہم کو اللہ اور رسول نے خبر دی تھی اور اللہ و رسول نے سچ فرمایا تھا) میں اللہ و رسول کو مکرر ذکر فرمایا' چاہیئے تو یہ تھا کہ دوبارہ اسم ظاہر کی بجائے اسم ضمیر ذکر فرما دیتے؟
جواب: تا کہ ایک ہی ضمیر اللہ تبارک وتعالیٰ اور غیر کی طرف نہ لوٹے۔
سوال: اللہ تبارک وتعالیٰ نے بنی قریظہ کے بارہ میں یہ کیوں ارشاد فرمایا: "وَاَوْرَثَكُمْ اَرْضَهُمْ وَدِيَارَهُمْ وَاَمْوَالَهُمْ وَاَرْضًا لَّمْ تَطَئُوْهَا" (اور ان کی زمین اور ان کے گھروں اور ان کے مالوں کا تم کو مالک بنادیا اور ایسی زمین کا بھی جس پر تم نے قدم نہیں رکھا) حالانکہ صحابہ کرامؓ کو اس سرزمین کی فتح کے بعد اس کا مالک بنایا۔
جوابِ اوّل: جب کسی چیز کا پختہ وعدہ ہو تو اسے ماضی کے صیغہ سے ادا کر دیتے ہیں' یہاں بھی ایسا ہی کیا گیا۔
جوابِ ثانی: اس میں عبارت مقدر ہے "وارضا لم تطؤھا سیورثکم ایاھا" جس سرزمین پر تم نے چڑھائی نہیں کی اللہ تمہیں اس کا بھی مالک بنادیں گے' یعنی سرزمین مکہ کا' بعض حضرات نے فارس و روم اور بعض نے خیبر کی سرزمین بھی مراد لی ہے' جبکہ بعض حضرات فرماتے ہیں کہ اس سے ہر وہ سرزمین مراد ہے جس پر مسلمان تا قیامت قبضہ کریں گے۔
جوابِ ثالث: اس کا مطلب یہ ہے کہ تمہیں اس سرزمین کا ازل سے لوح محفوظ میں لکھ کر مالک بنایا ہوا ہے۔
سوال: "يٰنِسَاءَ النَّبِيِّ مَنْ يَّاْتِ مِنْكُنَّ الخ" میں اللہ تبارک وتعالیٰ نے ازواج مطہرات کو دوگنے عذاب و ثواب کے لئے کیوں خاص فرمایا؟
جوابِ اوّل: انہیں اس لئے دگنا عذاب کے لئے خاص کیا کہ جس طرح وہ گناہ پر زواجر کا مشاہدہ کر سکتی ہیں کوئی اور نہیں کر سکتا۔

جوابِ ثانی: ان کے گناہوں سے آنحضرتؐ کو تکلیف ہوگی اور جس گناہ سے آنحضرتؐ کو صدمہ پہنچے وہ گناہ یقیناً دوسرے گناہوں سے بڑھ کر ہے' اور فاحشہ سے مراد جیسے کہ حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں' نافرمانی اور برے اخلاق ہیں' باقی ازواج مطہرات کو نیکیوں کا دگنا ثواب اس لئے دیا جاتا ہے کہ آنحضرتؐ کے قرب کے سبب جیسے ان کا گناہ بہت برا ہے اسی طرح ان سے نیکی کا ظہور بھی بہت ہی مستحسن ہے۔

سوال: "يٰنِسَآءَ النَّبِيِّ لَسْتُنَّ كَاَحَدٍ مِّنَ النِّسَآءِ" (اے نبی کی بیبیو تم معمولی عورتوں کی طرح نہیں) میں کواحدة من النساء کیوں نہیں فرمایا؟۔

جواب: اسی قسم کا سوال وجواب سورۃ البقرۃ میں "لا نفرق بين احد من رسله" کے تحت گذر چکا ہے۔

سوال: اللہ تبارک وتعالیٰ نے ازواج مطہرات کو ادائیگی زکوٰۃ کا کیوں حکم فرمایا: "وَاَقِمْنَ الصَّلٰوةَ وَاٰتِيْنَ الزَّكٰوةَ وَاَطِعْنَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ" (اور تم نماز کی پابندی رکھو اور زکوٰۃ دیا کرو اور اللہ اور اس کے رسول کا کہنا مانو) حالانکہ آپ کبھی بھی سال بھر نصاب کی مالکہ نہیں رہیں؟

جواب: یہاں زکوٰۃ سے مراد صدقہ نافلہ ہے اور امر استحباب کے لئے ہے۔

سوال: "مسلم" اور "مومن" میں کیا فرق ہے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے: "اِنَّ الْمُسْلِمِيْنَ وَالْمُسْلِمَاتِ وَالْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُؤْمِنَاتِ" (بے شک اسلام کے کام کرنے والے مرد اور اسلام کے کام کرنے والی عورتیں اور ایمان لانے والے مرد اور ایمان لانے والی عورتیں) میں ایک کا عطف دوسرے پر کیا ہے حالانکہ شرعاً دونوں کا ایک ہی معنیٰ ہے؟

جواب: "مسلم" سے مراد زبان سے اقرار کرنے والا اور "مؤمن" سے مراد دل سے تصدیق کرنے والا ہے۔

سوال: "مَا كَانَ مُحَمَّدٌ اَبَآ اَحَدٍ مِّنْ رِّجَالِكُمْ" (محمد تمہارے مردوں میں سے کسی کے باپ نہیں) کیوں فرمایا حالانکہ آپؐ حضرت طاہرؓ، طیبؓ، قاسمؓ اور حضرت ابراہیمؓ کے والد گرامی تھے؟

جواب: "من رجالكم" میں یہ حضرات داخل نہیں کیونکہ (۱) یہ حضرات بچپن ہی میں وفات پا گئے تھے حدِ رجولیت میں قدم نہیں رکھا (۲) رجال کی اضافت صحابہؓ کی طرف ہے اور یہ حضرات تو رجال نبیؐ ہیں نہ کہ رجال صحابہؓ۔

سوال: اللہ تبارک وتعالیٰ نے آپؐ کو: "وَخَاتَمَ النَّبِيّٖنَ" (اور سب نبیوں کے ختم پر ہیں) کیوں فرمایا حالانکہ آپؐ کے بعد حضرت عیسیٰؑ نازل ہونگے وہ بھی تو نبی اللہ ہیں؟

جواب: خاتم النبیین کا مطلب ہے کہ آپؐ کے بعد کوئی نبی نہیں بنے گا جبکہ حضرت عیسیٰ تو آپؐ سے پہلے تاج نبوت سے سرفراز ہوئے حضرت عیسیٰ جب نازل ہونگے تو آپ کی شریعت پر عمل پیرا ہونگے اور آپؐ کے ایک امتی کی مانند آپؐ کے قبلہ کی طرف نمازیں پڑھیں گے۔

سوال: ''هُوَالَّذِیْ یُصَلِّیْ عَلَیْکُمْ وَمَلٰٓئِکَتُهٗ'' (وہ ایسا ہے کہ وہ اور اس کے فرشتے تم پر رحمت بھیجتے رہتے ہیں) رحمت و مغفرت میں فرشتوں کو کیسے شامل فرمایا حالانکہ ان سے رحمت و مغفرت محال ہے؟

جواب: یعنی ان کی دعاؤں سے اللہ تبارک وتعالیٰ مغفرت و رحمت کا معاملہ فرمائیں گے جیسا کہ ہم کہتے ہیں حیا زید عمروا (زید نے عمرو کو زندگی بخشی) مطلب ہے کہ عمرو زید کی دعاؤں کی بدولت حیات نو سے مشرف ہوا۔

سوال: ''اِنَّآ اَرْسَلْنٰکَ شَاهِدًا وَّ مُبَشِّرًا وَّنَذِیْرًا وَّدَاعِیًا اِلَی اللّٰهِ'' (ہم نے بے شک آپ کو اس شان کا رسول بنا کر بھیجا کہ آپ بشارت دینے والے اور ڈرانے والے ہیں........) سے بہ خوبی معلوم ہو رہا ہے کہ دعوت الی اللہ میں آنحضرت کو اللہ تبارک وتعالیٰ کی جناب سے پروانہ اجازت حاصل ہے پھر باذنہ (اس کے حکم) فرمانے کی کیا ضرورت تھی؟۔

جواب: ''بِاِذْنِهٖ'' کا مطلب ہے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ کی تسہیل و آسانی کے ساتھ۔

بعض حضرات نے اذن کا معنی حکم بتایا ہے کہ آنحضرتؐ لوگوں کو از خود نہیں بلکہ اللہ تبارک وتعالیٰ کے حکم سے دعوت دیتے ہیں۔

سوال: ''وَسِرَاجًا مُّنِیْرًا'' (اور آپ ایک روشن چراغ ہیں) میں آنحضرتؐ کو چراغ کے ساتھ تشبیہ دی گئی حالانکہ سورج کے ساتھ تشبیہ دینا زیادہ مناسب تھا کیونکہ سورج کی چراغ پر فوقیت بدیہی بات ہے؟

جواب: بعض حضرات فرماتے ہیں کہ یہاں چراغ سے مراد سورج ہی ہے بدلیل: ''وَجَعَلْنَا الشَّمْسَ سِرَاجًا'' جبکہ بعض حضرات فرماتے ہیں کہ آنحضرت کو چراغ کے ساتھ اس لئے تشبیہ دی گئی کہ ایک چراغ سے دوسرا چراغ روشن ہوسکتا ہے لیکن ایک سورج سے دوسرا سورج روشن نہیں ہوسکتا، آنحضرتؐ کی امت کے علماء کرام وہ چراغ ہیں جو آنحضرتؐ کی تعلیمات کے روشن کردہ ہیں اور یہ چراغ سے چراغ جلنے کا سلسلہ تا قیامِ قیامت جاری و ساری رہے گا۔ بعض حضرات فرماتے ہیں کہ چراغ کے ساتھ اس لئے تشبیہ دی کیونکہ وہ زمانہ کفر و ضلالت کی تاریکیوں کے سبب رات کی مانند تھا اور رات کے مناسب چراغ ہوتا ہے نہ کہ سورج۔

سوال: چراغ ہی کے ساتھ کیوں تشبیہ دی' موم بتی کے ساتھ کیوں تشبیہ نہیں دی حالانکہ اس کی روشنی چراغ کی بہ نسبت زیادہ ہوتی ہے؟

جواب: اس کا جواب: "مَثَلُ نُوْرِهٖ كَمِشْكٰوةٍ فِيْهَا مِصْبَاحٌ" (اس کے نور کی حالت عجیبہ ایسی ہے جیسے ایک طاق ہے اس میں ایک چراغ ہے) کے تحت گزر چکا ہے۔

سوال: "يٰاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا اِذَا نَكَحْتُمُ الْمُؤْمِنَاتِ ثُمَّ طَلَّقْتُمُوْهُنَّ" (اے ایمان والو تم جب مسلمان عورتوں سے نکاح کرو پھر ان کو طلاق دیدو) میں مرد کے چھونے سے پہلے طلاق دینے میں عدت واجب نہ ہونے کو مومن خواتین کے ساتھ کیوں مختص کیا ہے حالانکہ اہل کتاب خواتین کا بھی یہی حکم ہے؟

جواب: یہاں مؤمن خواتین کے ذکر سے ان کی تخصیص مراد نہیں بلکہ اکثر اور غالب ہونے کی وجہ سے ان کا ذکر فرمایا۔

سوال: اللہ تبارک وتعالیٰ نے: "وَبَنَاتِ عَمِّكَ وَبَنَاتِ عَمّٰتِكَ وَبَنَاتِ خَالِكَ وَبَنٰتِ خٰلٰتِكَ" (اور آپ کے چچا کے بیٹیاں اور آپ کی پھوپھیوں کی بیٹیاں اور آپ کی ماموں کی بیٹیاں اور آپ کے خالاؤں کی بیٹیاں) میں عم اور خال کو مفرد ذکر فرمایا جبکہ عمات اور خالات کو جمع ذکر فرمایا حالانکہ عرب کا قاعدہ ہے کہ جمع کے مقابل جمع کو ذکر کرتے ہیں؟

جواب: "عم" خم کی طرح وزن مصدر ہے' اسی طرح خال بھی قال کے وزن پر ہے جو کہ مصدر ہے اور مصدر میں افراد تثنیہ اور جمع برابر ہوتا ہے بخلاف عمة اور خالة کے۔ اسی طرح ارشاد باری تعالیٰ ہے: "خَتَمَ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ وَعَلٰى سَمْعِهِمْ وَعَلٰى اَبْصَارِهِمْ" (بند لگا دیا ہے اللہ تعالیٰ نے ان کے دلوں پر اور ان کے کانوں پر اور ان کی آنکھوں پر پردہ ہے)

سوال: "اَوْ بُيُوْتِ اَعْمَامِكُمْ اَوْ بُيُوْتِ اَخْوَالِكُمْ" کو پیش نظر رکھیں تو یہ جواب غلط معلوم ہوتا ہے؟

جواب: عم اور خال حقیقی مصدر نہیں ہیں بلکہ مصدر کے وزن پر ہیں۔ یہاں مصدر کے ساتھ مشابہت کا اعتبار ہے جبکہ وہاں اس کی حقیقت کے مطابق عمل کیا۔ اسی لئے دونوں طرح اس کا استعمال جائز ہے۔ بخلاف "سمع" کے کہ وہ حقیقی مصدر ہے اسی لئے قرآن کریم میں ہر جگہ مفرد ہی استعمال ہوا ہے۔

سوال: اللہ تبارک وتعالیٰ نے: "لَا جُنَاحَ عَلَيْهِنَّ فِيْ اٰبَآئِهِنَّ" (پیغمبروں کی بیبیوں پر اپنے باپوں کے بارہ میں کوئی گناہ نہیں) میں اقارب کا ذکر کیا لیکن چچا اور ماموں کا تذکرہ نہیں فرمایا

حالانکہ وہ بھی اس حکم میں داخل ہیں؟

جواب: اسی قسم کا سوال وجواب سورۃ النور میں: ''وَلَا يُبْدِيْنَ زِيْنَتَهُنَّ اِلَّا لِبُعُوْ لَتِهِنَّ'' کے تحت گذر چکا ہے' بہتر یہی ہے کہ عورت اپنے چچا اور ماموں کے سامنے بھی نہ آئے کہ وہ اپنے بیٹے کے سامنے اس کے محاسن بیان کرے اور فتنہ کا سبب بنے۔

سوال: ''اِنَّآ اَطَعْنَا سَادَتَنَا وَكُبَرَآءَ نَا'' (ہم نے اپنے سرداروں کا اور اپنے بڑوں کا کہنا مانا تھا) یہاں جب سادت اور کبراء کا ایک ہی معنی ہے تو ایک کا دوسرے پر عطف کیوں کیا گیا؟۔

جواب: بعض اوقات ایک ہی معنی کے دو الفاظ میں سے ایک کا عطف دوسرے پر کر دیتے ہیں جیسے کہ فلان عاقل لبیب' هذا حسن جمیل وغیرہ۔

اور جیسے کہ ایک شاعر کہتا ہے:

''معاذاللّٰہ من کذب ومین'' کذب اور جھوٹ سے اللہ کی پناہ

سوال: ''وَحَمَلَهَا الْاِنْسَانُ'' (اور انسان نے اس کو اپنے ذمہ لے لیا) میں اگر انسان سے مراد حضرت آدمؑ ہیں تو پھر ان کے بارہ میں: ''اِنَّهٗ كَانَ ظَلُوْمًا جَهُوْلًا'' (وہ ظالم ہے جاہل ہے) کیوں کہا گیا؟ حالانکہ فعول کا وزن مبالغہ کے لئے استعمال ہوتا ہے جس کا مطلب ہے کہ معاذ اللہ آپ سے بار بار ظلم وجہل سرزد ہوا حالانکہ ایسا قطعاً نہیں؟

جواب: آپ کی رفعتِ شان کو دیکھتے ہوئے ادنیٰ سی خطاء بھی بہت بڑی تصور کی جاتی ہے' لہٰذا اسے کثرت اور مبالغہ کے ساتھ ذکر فرمادیا' نیز یہی بات سورۃ آل عمران میں: ''وَاَنَّ اللّٰهَ لَيْسَ بِظَلَّامٍ لِّلْعَبِيْدِ'' کے تحت بھی گذری ہے۔

بعض حضرات فرماتے ہیں کہ حضرت آدمؑ کے لئے ظلوم اور جہول کا لفظ اس لئے ارشاد فرمایا کیونکہ آپ کی خطاء کی پاداش تمام انسانوں کو بھگتنی پڑی کہ حضرت آدمؑ ہی کے سبب انہیں جنت سے نکالا گیا اور ان پر ابلیس کا لشکر مسلط کیا گیا۔

# سورۃ سبا

سوال: اللہ تبارک وتعالیٰ نے ارشاد فرمایا: ''اَفَلَمْ يَرَوْا اِلٰى مَا بَيْنَ اَيْدِيْهِمْ وَمَا خَلْفَهُمْ مِّنَ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ'' (تو کیا انہوں نے آسمان اور زمین کی طرف نظر نہیں کی جو ان کے آگے اور پیچھے موجود ہے) ما فوقهم و ما تحتهم (اوپر نیچے) کے الفاظ کیوں ارشاد نہیں فرمائے؟۔

جواب: آگے کے لفظ سے مراد ہر وہ چیز ہے جو انسان کو بغیر چہرہ پھیرے نظر آسکے اور پیچھے کے

لفظ سے ہر وہ چیز مراد ہوتی ہے جو انسان کو چہرہ پھیرنے سے نظر آ سکے' لہٰذا مذکورہ الفاظ کا ذکر بالکل کافی ہے۔

سوال: تو پھر اللہ تبارک وتعالیٰ نے: "ثُمَّ لَاٰتِیَنَّھُمۡ مِّنۡۢ بَیۡنِ اَیۡدِیۡھِمۡ وَمِنۡ خَلۡفِھِمۡ وَعَنۡ اَیۡمَانِھِمۡ وَعَنۡ شَمَآئِلِھِمۡ" (پھر ان پر حملہ کروں گا ان کے آگے سے بھی اور ان کے پیچھے سے بھی اور ان کی داہنی جانب سے بھی اور ان کی بائیں جانب سے بھی) میں دائیں بائیں کو کیوں ذکر فرمایا؟

جواب: یہاں تو آسمان وزمین کے ذکر سے الفاظ میں عموم آ گیا ہے جبکہ وہاں ایسا نہیں ہے۔

سوال: حضرت سلیمانؑ تماثیل یعنی تصاویر کیسے بناتے تھے؟۔

جواب: بعض حضرات فرماتے ہیں کہ ان کی شریعت میں تصویر بنانے کا عمل ناجائز نہیں تھا' اور یہ بھی عین ممکن ہے کہ تصاویر کسی غیر ذی روح مثلاً درخت وغیرہ کی ہوں جو ہماری شریعت میں بھی ناجائز نہیں ہیں۔

سوال: اللہ تبارک وتعالیٰ نے: "لَقَدۡ کَانَ لِسَبَاٍ فِیۡ مَسۡکَنِھِمۡ اٰیَۃٌ" (سبا کیلئے ان کے وطن میں نشانیاں موجود تھیں) میں دو باغوں کو اپنی توحید کی ایک نشانی کیوں کہا' حالانکہ وہ تو دو نشانیاں تھیں نہ کہ ایک؟

جواب: جب دونوں اپنے مدلول کے اعتبار سے ایک جیسی ہیں اور ان دونوں کی جہت بھی ایک ہی ہے تو ان دونوں کو ایک ہی ذکر کر دیا جیسے کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے: "وَجَعَلۡنَا ابۡنَ مَرۡیَمَ وَاُمَّہٗۤ اٰیَۃً" (اور ہم نے مریم کے بیٹے اور ان کی ماں کو بڑی نشانی بنایا)

سوال: اللہ تبارک وتعالیٰ نے: "قُلِ ادۡعُوا الَّذِیۡنَ زَعَمۡتُمۡ مِّنۡ دُوۡنِ اللّٰہِ" (آپ فرمایئے کہ جن کو تم خدا کے سوا سمجھ رہے ہو ان کو پکارو) کیوں فرمایا؟ اس کا مطلب تو یہ ہے کہ اللہ کے سوا جنہیں تم خدا گمان کرتے ہو حالانکہ مشرکین اللہ تبارک وتعالیٰ کے سوا نہیں بلکہ اللہ تبارک وتعالیٰ کے ساتھ ساتھ انہیں معبود مانتے تھے؟

جواب: اول تو اس عبارت سے آپ کا مدعا ثابت نہیں ہوتا اگر ہو بھی جائے تو ہم اس کا یہ جواب دیں گے کہ اس عبارت میں تقدیم وتاخیر ہے' اصل عبارت ہے: "ادعوا الذین من دون اللہ زعمتم انھم شرکاء للہ" (اللہ تبارک وتعالیٰ کے سوا انہیں پکار لو جنہیں تم اس کا شریک سمجھتے ہو)۔

سوال: "وَاِنَّاۤ اَوۡ اِیَّاکُمۡ لَعَلٰی ھُدًی اَوۡ فِیۡ ضَلٰلٍ مُّبِیۡنٍ" (اور بے شک ہم یا تم ضرور راہ

راست پر ہیں یا صریح گمراہی میں ہیں) اس آیت میں موجود تشکیک کا کیا حاصل ہے؟

جواب: بعض حضرات فرماتے ہیں کہ ''او'' دونوں جگہ ''واؤ'' کے معنی میں ہے تو معنی ہوگا کہ ہم راست پر ہیں اور تم گمراہی پر ہو۔ اور بعض حضرات اس کا مطلب یہ بیان فرماتے ہیں کہ ہم اور تم ہدایت یافتہ ہیں یا گمراہ ہیں یہ ان کی گمراہی پر تعریض ہے جیسے کہ انسان جب کسی کو جھٹلانے کا ارادہ کرتا ہے تو کہتا ہے واللہ ہم میں سے کوئی ایک تو جھوٹا ہے ہی۔ اس سے مراد دوسرے کی تکذیب ہوتی ہے۔

سوال: ملائکہ علیہم السلام نے مشرکین کے متعلق یہ کیسے فرمادیا: ''بَلْ كَانُوْا يَعْبُدُوْنَ الْجِنَّ'' (بلکہ یہ لوگ شیطان کی پوجا کرتے تھے) حالانکہ کسی نے بھی مشرکین کے متعلق یہ نقل نہیں کیا کہ وہ جنات کی عبادت کرتے تھے؟

جواب: اس کا معنی یہ ہے کہ شیطان جن کی عبادت کا حکم دیتا تھا یہ ان کی عبادت کیا کرتے تھے یعنی شیطان کی اطاعت کیا کرتے تھے، جن سے مراد شیطان ہے، نیز اکثر مشرکین شیاطین کی خبروں کی تصدیق کیا کرتے تھے مثلاً ملائکہ کو شیاطین کے کہنے ہی کی وجہ سے خدا تعالیٰ کی بیٹیاں تصور کرتے تھے۔

# سورۃ فاطر

سوال: ''وَاللّٰهُ الَّذِیْٓ اَرْسَلَ الرِّیٰحَ فَتُثِیْرُ سَحَابًا فَسُقْنٰهُ اِلٰی بَلَدٍ مَّیِّتٍ فَاَحْیَیْنَا بِهِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا'' (اور اللہ ایسا ہے جو ہواؤں کو بھیجتا ہے پھر وہ بادلوں کو اٹھاتی ہیں پھر ہم اس بادل کو خشک قطعہ زمین کی طرف ہانک لے جاتے ہیں پھر اس کے ذریعے زمین کو زندہ کرتے ہیں) میں فتثیر کو مضارع کیوں ذکر کیا جبکہ اس کا ماقبل اور مابعد ماضی ہے؟

جواب: یہاں مضارع کو ماضی کے معنوں میں استعمال کیا گیا ہے، جیسا کہ: ''وَاِذْ تَقُوْلُ لِلَّذِیْٓ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَیْهِ'' میں تقول کو قلت کی جگہ استعمال کیا گیا۔

سوال: اللہ تبارک وتعالیٰ نے: ''وَاِنْ مِّنْ اُمَّةٍ اِلَّا خَلَا فِیْهَا نَذِیْرٌ'' (اور کوئی امت ایسی نہیں ہوئی جس میں کوئی ڈرانے والا نہ ہو) کیسے ارشاد فرمایا حالانکہ آنحضرتؐ اور حضرت عیسیٰؑ کے مابین ایک طویل عرصہ گذرا ہے جس میں کوئی نذیر نہیں آیا؟

جواب: چونکہ انذار و ترہیب کے آثار باقی تھے لہٰذا حکماً نذیر موجود تھا البتہ جب یہ آثار ختم ہوگئے تو اللہ تبارک وتعالیٰ نے آنحضرتؐ کو مبعوث فرمادیا۔

سوال: اللہ تبارک وتعالیٰ نے آیت کے آخر میں صرف نذیر ذکر فرمایا بشیر ذکر نہیں فرمایا' حالانکہ ابتداء میں بشیر نذیر دونوں ذکر کیے گئے؟

جواب: چونکہ ابتداء میں دونوں ذکر ہو چکے تھے اس لئے آخر میں صرف ایک کے ذکر پر اکتفاء کیا گیا کہ دوسرا اس سے خود بخود سمجھ آسکتا ہے۔

سوال: نصب اور لغوب میں کیا فرق ہے کہ ایک کا دوسرے پر عطف کیا گیا؟

جواب: نصب' مشقت وکلفت کو کہا جاتا ہے' اور اس مشقت کے بعد جو حالت ہوتی ہے اسے لغوب کہا جاتا ہے۔ یہ فرق امام زمخشری کا ذکر کردہ ہے' لیکن اس پر یہ اعتراض وارد ہوتا ہے کہ پھر دوسرے کی نفی سے پہلے کی نفی خود بخود سمجھ آسکتی تھی۔ لہٰذا پہلے کو ذکر کرنے کی ضرورت نہیں تھی۔

سوال: ''رَبَّنَآ اَخْرِجْنَا نَعْمَلْ صَالِحًا غَيْرَ الَّذِىْ كُنَّا نَعْمَلُ'' (اے ہمارے پروردگار ہم کو نکال لیجئے ہم اچھے کام کریں گے برخلاف ان کاموں کے جو کیا کرتے تھے) کا کیا مطلب ہے' اس کا مطلب تو یہ معلوم ہو رہا ہے کہ جو نیک عمل پہلے کرتے تھے۔ اب اس کے علاوہ اور نیک عمل کریں گے حالانکہ انہوں نے اپنی زندگی میں کوئی نیک عمل نہیں کیا؟

جواب: کفار یہی گمان کرتے ہیں کہ وہ نیک کام کرتے ہیں جیسے کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے: ''وَهُمْ يَحْسَبُوْنَ اَنَّهُمْ يُحْسِنُوْنَ صُنْعًا'' (اور وہ اس خیال میں ہیں کہ وہ اچھا کام کر رہے ہیں) یعنی جسے ہم نیکی سمجھتے تھے اس کے علاوہ اور نیکیاں کریں گے۔

## سورۃ یٰسٓ

سوال: پہلے اللہ تبارک وتعالیٰ نے: ''اِنَّآ اِلَيْكُمْ مُّرْسَلُوْنَ'' (بے شک ہم تمہاری طرف بھیجے گئے ہیں) فرمایا اور پھر فرمایا: ''اِنَّآ اِلَيْكُمْ لَمُرْسَلُوْنَ'' (بے شک ہم تمہاری طرف بھیجے گئے ہیں) بعد میں تاکید ذکر کرنے کی کیا ضرورت تھی؟۔

جواب: چونکہ پہلے جملہ سے صرف خبر دینا مقصود تھا اس لئے لام تاکید کی ضرورت نہیں تھی جبکہ دوسرا جملہ انکار اور تکذیب کے بعد آرہا ہے لہٰذا تاکید کی ضرورت تھی اس لئے لام تاکید ذکر فرمادیا۔

سوال: فطرنی میں فطر کی نسبت اپنی طرف جبکہ والیہ ترجعون میں بعث کی نسبت کفار مکہ کی طرف کی، چاہیئے تو یہ تھا کہ یا تو دونوں کی نسبت اپنی طرف کرتے یا دونوں کی کفار کی طرف؟

جواب: فطر کی نسبت اپنی طرف اس لئے کی کہ پیدائش تو اللہ تبارک وتعالیٰ کی ایک نعمت ہے

جس پر شکر واجب ہے اور نعمت کی نسبت اپنی طرف کرنا زیادتی شکر کا موجب ہے' جبکہ بعث میں زجر و توبیخ پائی جاتی ہے لہٰذا کفار کی طرف اس کی نسبت زیادتی توبیخ کا باعث ہوگی۔

سوال: اللہ تبارک وتعالیٰ نے یٰحَسْرَةً عَلَى الْعِبَادِ کیوں فرمایا حالانکہ تحسر علی اللہ محال ہے؟

جواب: اس آیت سے مخلوق پر تحسر مراد ہے' مطلب یہ ہے کہ لوگو! کہو کہ ہم پر حسرت ہو۔

سوال: اللہ تبارک وتعالیٰ نے سورج کے متعلق فرمایا کہ وہ چاند کو نہیں پا سکتا' چاند کے متعلق یہ نہیں فرمایا کہ وہ سورج کو نہیں پا سکتا۔ اس کی کیا وجہ ہے؟

جواب: اس لئے کہ چاند کی رفتار تیز ہے' وہ اپنا ایک چکر مہینہ میں مکمل کر لیتا ہے جبکہ سورج اپنا ایک چکر سال میں مکمل کرتا ہے۔ لہٰذا سورج کی نفی کر دی گئی کیونکہ اس کی چال سست ہے' لہٰذا اس کے متعلق کہہ دیا گیا کہ وہ چاند کو نہیں پا سکتا' یہ جواب امام زمخشریؒ نے دیا ہے' لیکن اس پر یہ اعتراض وارد ہوتا ہے کہ چاند کی رفتار چونکہ تیز ہے اس لئے مناسب یہی تھا کہ اس کی نفی کی جاتی' سورج کی رفتار تو چاند سے کم ہے لہٰذا اس کا چاند کو پا لینا تو ممکن ہی نہیں ہے احتمال یہی تھا کہ چاند' سورج کو پا لیتا لہٰذا مناسب یہی تھا کہ چاند کے پانے کی نفی کی جاتی۔

سوال: اللہ تبارک وتعالیٰ نے اہل مکہ کے متعلق کیسے ارشاد فرمایا: ''وَاٰيَةٌ لَّهُمْ اَنَّا حَمَلْنَا ذُرِّيَّتَهُمْ فِي الْفُلْكِ الْمَشْحُوْنِ'' (اور ایک نشانی ان کے لئے یہ ہے کہ ہم نے ان کی اولاد کو بھری ہوئی کشتی میں سوار کیا) حالانکہ کشتی میں تو ان کے آباء کو بٹھایا گیا تھا نہ کہ اولاد کو؟

جواب: ذریۃ اسماء اضداد میں سے ہے یعنی جیسے اس کا معنی اولاد ہے اسی طرح اس کا معنی آباء بھی ہے۔ جیسے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے: ''اِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰى اٰدَمَ وَنُوْحًا وَّاٰلَ اِبْرٰهِيْمَ وَاٰلَ عِمْرٰنَ عَلَى الْعٰلَمِيْنَ ذُرِّيَّةً ۢ بَعْضُهَا مِنْۢ بَعْضٍ'' (بے شک اللہ تعالیٰ نے منتخب فرمایا ہے آدم کو اور نوح کو اور ابراہیم کی اولاد کو اور عمران کی اولاد کو تمام جہانوں پر بعض ان میں سے بعض کی اولاد ہیں) میں ہر ایک کے متعلق ارشاد فرمایا کہ وہ ایک دوسرے کی ذریۃ تھے حالانکہ ان میں سے کچھ آباء تھے اور کچھ اولاد۔ یا پھر اس کا یہ جواب دیا جا سکتا ہے کہ ذریۃ سے مراد اگر اہلِ مکہ کی اولاد ہے تو چونکہ یہ اس وقت اپنے آباء کی پیٹھ میں تھے لہٰذا ان پر بھی حکماً احسان جتایا جا سکتا ہے۔

سوال: ارشادِ باری تعالیٰ ''وَيَقُوْلُوْنَ مَتٰى هٰذَا الْوَعْدُ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ'' (اور یہ لوگ کہتے ہیں یہ وعدہ کب ہوگا اگر تم سچے ہو) میں جب وعد سے مراد بعث اور جزاء ہے تو یہ تو رونما ہو چکے

ہونگے پھران کے انتظار کا کیا مطلب؟

جواب: اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ وعدہ پورا کب ہوا گا، دراصل یہاں مضاف محذوف ہے یا وعد بول کر موعود مراد ہے۔

سوال: ''مَنْ بَعَثَنَا مِنْ مَّرْقَدِنَا'' (ہم کو قبروں سے کس نے اٹھادیا) میں سوال یہ ہے کہ ہمیں کون اٹھائے گا لیکن اس کا جواب اس کے مطابق نہیں ہے؟

جواب: اس کا مطلب یہ ہے کہ تمہیں وہ رحمٰن اٹھائے گا جس نے تمہارے بعث کا وعدہ کیا تھا باقی جواب کے لئے یہ طریقہ زیادتی توبیخ کے لئے اختیار کیا گیا۔

سوال: اللہ تبارک وتعالیٰ نے اہل جنت اور ان کی ازواج کے متعلق یہ کیوں فرمایا: ''هُمْ وَاَزْوَاجُهُمْ فِي ظِلٰلٍ'' (وہ اوران کی بیبیاں سایوں میں ہونگی) سایہ کا حصول تو سورج سے بچنے کے لئے ہوتا ہے اسی لئے رات کے وقت کسی چیز کے نیچے بیٹھنے کو سایہ سے تعبیر نہیں کیا جاتا۔ اور جنت میں سورج ہوگا ہی نہیں ارشاد باری تعالیٰ ہے: ''لَا يَرَوْنَ فِيهَا شَمْسًا وَّلَا زَمْهَرِيرًا'' (نہ وہاں تپش پاویں گے اور نہ جاڑا)

جواب: جنت کے درختوں کا سایہ نور عرش سے ہوگا تا کہ اہل جنت کی نگاہیں اس سے خیرہ نہ ہوں کیونکہ اس کی روشنی سورج کی روشنی سے بدر جہا زیادہ ہوگی۔

بعض حضرات نے نور قنادیل عرش سے سایہ مراد لیا ہے۔

سوال: اللہ تبارک وتعالیٰ نے: ''وَتُكَلِّمُنَا اَيْدِيهِمْ وَتَشْهَدُ اَرْجُلُهُمْ'' (اوران کے ہاتھ ہم سے کلام کریں گے اوران کے پاؤں شہادت دیں گے) میں ہاتھوں کے کلام اور پاؤں کی گواہی کا ذکر فرمایا ہے اس کی وجہ؟۔

جواب: اس لئے کہ ہاتھ تو انسان کے ساتھ گناہ میں شریک ہوتے ہیں جبکہ پاؤں شریک نہیں ہوتے بلکہ صرف موجود ہوتے ہیں اور جو موجود ہووہ غیر کے خلاف گواہی دے سکتا ہے لیکن جو خود اپنے خلاف کوئی بھی گواہی نہیں دے سکتا ہاں اقرار کر سکتا ہے البتہ اس جواب پر ایک اعتراض وارد کیا ہے۔

سوال: اللہ تبارک وتعالیٰ نے آنحضرتؐ کی شان مبارک میں ارشاد فرمایا: ''وَمَا عَلَّمْنٰهُ الشِّعْرَ'' حالانکہ آپؐ سے اشعار بھی منقول ہیں جیسے کہ

انا النبی لا کذب انا ابن عبدالمطلب

میں نبی ہوں اس میں کوئی جھوٹ نہیں　　　میں عبدالمطلب کا بیٹا ہوں

یا: هل انت الا اصبع دميت　　　وفي سبيل الله ما لقيت

جواب اوّل: یہ شطور، بحر رجز ہے شعر نہیں ہے، اور امام خلیل کے نزدیک مشطور، بحر رجز شعر نہیں ہوتا کیونکہ آپؐ نے دمیت اور لقیت کو بفتح یاء اور بسکونِ تاء ارشاد فرمایا لہٰذا یہ شعر نہیں ہے لیکن راوی نے انمیں تحریف کر کے اسے شعر بنادیا۔

جوابِ ثانی: شعر کی تعریف یہ ہے جو مقفّی اور موزون کلام ہو اور اس سے شعر گوئی کا قصد بھی ہو۔ اگر آنحضرتؐ کے ان فرامین کو اشعار کے وزن مان بھی لیا جائے تو بھی ان میں قصد شعر گوئی مفقود ہونے کے سبب انہیں شعر نہیں کہا جائیگا، جیسے کہ اگر بعض اوقات خطبات اور رسائل ومحاورات میں کوئی مقفّی کلام آجائے تو اسے شعر نہیں کہا جاتا۔

سوال: اللہ تبارک وتعالیٰ نے: "مِمَّا عَمِلَتْ اَيْدِيْنَآ اَنْعَامًا" (اپنے ہاتھ کی ساختہ چیزوں میں سے مواشی پیدا کیا) کیوں فرمایا حالانکہ سبحانہ جل وعلیٰ اس سے پاک ہیں؟

جواب: یہ الفاظ بغیر شرکت کام کرنے کے لئے استعمال کئے جاتے ہیں جیسے کہ محبت اور افعال قلب میں کہا جاتا ہے کہ یہ میں نے خود اپنے ہاتھوں سے کیا ہے۔ یا جس شخص کے ہاتھ بھی نہ ہوں اسے بھی کہا جاتا ہے کہ آپ نے یہ کام اپنے ہاتھ سے کیا ہے؟ ارشادِ باری تعالیٰ: "لِمَا خَلَقْتُ بِيَدَيَّ" (جس چیز کو میں نے اپنے ہاتھ سے بنایا) بھی اسی قبیل سے ہے۔

سوال: اللہ تبارک وتعالیٰ نے "مَنْ يُّحْيِ الْعِظَامَ وَهِيَ رَمِيْمٌ" (کہ ہڈیوں کو جب بوسیدہ ہوجائیں گی کون زندہ کرے گا) کو مثال کیسے کہا حالانکہ یہ مثال نہیں بلکہ استفہام انکاری ہے؟

جواب: اسے مثال اس لئے کہا کہ یہ ایک عجیب قصہ پر دلالت کرتی ہے جو مثال جیسا ہی ہے، وہ یہ کہ انسان مردہ کو زندہ کرنے کی قدرت خداوندی کا انکار کرتا ہے باوجودیکہ عقل اور نقل دونوں خدا عزوجل کی قدرت کے شاہد ہیں۔

# سورۃ الصّٰفّٰت

سوال: اللہ تبارک وتعالیٰ نے مشارق کو جمع ذکر فرمایا جبکہ سورۃ رحمٰن میں اسے تثنیہ ذکر فرمایا اور اس جگہ صرف مشارق کا ذکر فرمایا جبکہ وہاں مغربین بھی مذکور ہے۔ نیز اس جگہ مشارق ومغارب دونوں کو جمع کے طور سے بھی ذکر فرمایا ہے جیسے کہ "فَلَآ اُقْسِمُ بِرَبِّ الْمَشَارِقِ وَالْمَغَارِبِ"

(پھر میں قسم کھاتا ہوں شرقوں اور غربوں کے مالک کی) جبکہ ایک جگہ ان دونوں کو مفرد بھی ذکر فرمایا ہے' ارشادِ باری تعالیٰ ہے: ''قَالَ رَبُّ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ وَمَا بَيْنَهُمَا اِنْ كُنْتُمْ تَعْقِلُوْنَ'' (موسیٰ نے فرمایا کہ وہ پروردگار ہے مشرق اور مغرب کا اور جو کچھ ان کے درمیان میں ہے اس کا بھی اگر تم کو عقل ہو)؟

جواب: قرآنِ کریم' عرب کے اسالیب میں نازل ہوا ہے اور عرب کے اسالیب میں اجمال' تفصیل اور بسط وایجاز بہ کثرت پایا جاتا ہے۔ اسی لئے اللہ تبارک وتعالیٰ نے کبھی اسے اجمالاً ذکر فرمایا رَبُّ الْمَشْرِقَيْنِ وَرَبُّ الْمَغْرِبَيْنِ اس سے مراد سردی اور گرمی کے الگ الگ مشرق ومغرب ہیں' کبھی اسے تفصیل سے ذکر فرمایا کہ فَلَآ اُقْسِمُ بِرَبِّ الْمَشَارِقِ وَالْمَغَارِبِ اس سے مراد سال بھر کے روزانہ کے الگ الگ مشرق ومغرب مراد ہیں جو سات سو سے زائد ہیں' کبھی انہیں الفاظ کو بسط کے ساتھ ذکر فرمایا فَلَآ اُقْسِمُ بِرَبِّ الْمَشَارِقِ وَالْمَغَارِبِ اور کبھی اسے اختصار کے ساتھ بیان فرمادیا ورب المشارق لیکن اس سے مراد مشارق و مغارب دونوں ہوتے ہیں باقی رہا یہ کہ مغارب کو چھوڑ کر مشارق کو کیوں ذکر فرمایا؟

وہ یا تو اس لئے کہ طلوع' غروب سے پہلے ہوتا ہے اور یا پھر اس لئے کہ مشارق منبع نور اور سرچشمہ روشنی ہے۔

سوال: ارشادِ باری تعالیٰ: ''اِنَّا زَيَّنَّا السَّمَآءَ الدُّنْيَا بِزِيْنَةِ نِ الْكَوَاكِبِ'' (بیشک ہم نے رونق دی ہے اس طرف والے آسمان کو ایک عجیب آرائش یعنی ستاروں کے ساتھ) میں اللہ تبارک وتعالیٰ نے زینت کواکب۔ کے ساتھ آسمان دنیا کو کیوں مختص فرمایا حالانکہ سماء دنیا کے علاوہ دیگر آسمان بھی کواکب سے مزین ہیں؟

جواب: اللہ تبارک وتعالیٰ نے آسمان دنیا کو اس لئے ذکر فرمایا کیونکہ ہم اسے دیکھ سکتے ہیں؟

سوال: ''بل عجبت'' میں اگر تاء پر ضمہ پڑھیں جیسے کہ حضرت علیؓ 'اور حضرت ابن مسعودؓ حضرت ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ جسے امام فراء نے اختیار کیا ہے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ تعجب فرما رہے ہیں حالانکہ تعجب اس مرعوبیت کو کہا جاتا ہے جو کسی چیز کو بڑا سمجھ کر انسان پر طاری ہوتی ہے اور اللہ تعالیٰ یقیناً ایسی چیزوں سے مبراء اور پاک ہیں؟

جوابِ اوّل: یہاں تعجب سے مراد کسی چیز کو عظیم جاننا ہے اور یہ اللہ تبارک وتعالیٰ کے لئے بھی جائز ہے جیسے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے عورتوں کے مکروفریب اور کفار کے انکار معجزات انبیاءِ کرام کو 'عظیم' کہا۔

جوابِ ثانی: یا پھراس سے یہ مراد ہے کہ اے محمدؐ آپ کہہ دیجئے کہ مجھے تعجب ہے۔ حضرت شریحؒ عجبت کو فتح تاء کے ساتھ پڑھتے تھے اور فرماتے تھے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ کسی چیز پر تعجب نہیں فرماتے، تعجب وہ کیا کرتا ہے جو نہ جانتا ہو، حضرت ابراہیم نخعیؒ فرماتے ہیں کہ شریحؒ کو اپنے علم پر ناز ہے حالانکہ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ جو عجبت کو ضم تاء کے ساتھ پڑھتے تھے اور وہ ان سے بڑے عالم تھے۔ حضرت زجاجؒ فرماتے ہیں کہ ضم تاء والی قراءت کا انکار غلط ہے اس لئے کہ باری تعالیٰ کے تعجب اور انسانوں کے تعجب میں بہت فرق ہے اس کی نظیر ارشادِ باری تعالیٰ ہے: ''وَمَكَرُوْا وَمَكَرَ اللّٰهُ'' (اوران لوگوں نے خفیہ تدبیر کی اور اللہ نے خفیہ تدبیر فرمائی) ''سَخِرَ اللّٰهُ مِنْهُمْ وغیرہ'' باقی یہ کہ تعجب کس چیز پر ہے اس میں دو قول ہیں (۱) انکارِ قرآن پر (۲) انکارِ قیامت پر۔

سوال: اللہ تبارک وتعالیٰ نے حضرت نوحؑ کی مدح میں یہ کیوں ارشاد فرمایا: ''اِنَّهٗ مِنْ عِبَادِنَا الْمُؤْمِنِيْنَ'' (بیشک وہ ہمارے ایماندار بندوں میں سے تھے) حالانکہ رسولوں کا مرتبہ مؤمنین کے مرتبہ سے زیادہ ہوتا ہے؟

جواب: اللہ تبارک وتعالیٰ نے ان الفاظ میں اس لئے مدح فرمائی تاکہ ہمیں ایمان کی رفعت شان کا اندازہ ہوسکے اور ہمیں اس کی تحصیل اور اس پر ثابت قدمی کی ترغیب بھی ہوسکے جیسے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے حضرت ابراہیمؑ کی مدح میں ارشاد فرمایا: '' وَاِنَّهٗ فِى الْاٰخِرَةِ لَمِنَ الصّٰلِحِيْنَ'' (اور وہ آخرت میں اچھے لوگوں میں ہونگے)۔

سوال: اللہ تبارک وتعالیٰ نے ''فَنَظَرَ نَظْرَةً فِى النُّجُوْمِ'' میں ''فی'' کیوں ذکر کیا حالانکہ نظر کا صلہ تو الی آتا ہے جیسے کہ ارشادِ باری تعالیٰ ہے ''وَلٰكِنِ انْظُرْ اِلَى الْجَبَلِ ' فَانْظُرْ اِلٰٓى اٰثَارِ رَحْمَةِ اللّٰهِ''

جوابِ اوّل: اس آیۂ مبارکہ میں فی الی کے معنیٰ میں ہے جیسے کہ ارشادِ باری تعالیٰ: ''فَرَدُّوْٓا اَيْدِيَهُمْ فِىْٓ اَفْوَاهِهِمْ'' (سو ان قوموں نے اپنے ہاتھ ان پیغمبروں کے منہ میں دے دئے)۔

جوابِ ثانی: اس نظر سے مراد آنکھ کی نظر نہیں بلکہ نظر تفکر مراد ہے جیسے کہ: ''اَوَلَمْ يَنْظُرُوْا فِىْ مَلَكُوْتِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ'' (اور کیا ان لوگوں نے غور نہیں کیا آسمانوں اور زمین کے عالم میں) میں ہے۔ تو اس کا معنیٰ ہوگا کہ انہوں نے علم نجوم کے متعلق سوچا۔

سوال: حضرت ابراہیمؑ نے ''اِنِّىْ سَقِيْمٌ'' (میں بیمار ہونے کو ہوں) کیوں فرمایا حالانکہ آپؑ بیمار نہیں تھے۔

جواب: اس کا معنی یہ ہے کہ میں بیمار ہو جاؤں گا' جیسے کہ "اِنَّکَ مَیِّتٌ" (آپ کو بھی مرنا ہے) میں مستقبل کا معنی مراد ہے' حضرت ابراہیمؑ نے ایسا لفظ جس کے دونوں معنی محتمل ہیں اس لئے ذکر فرمایا تا کہ قوم دوسرا معنی مراد لے اور انہیں تنہا چھوڑ کر چلی جائے اور آپؑ ان کے بتوں کا تیاپانچا کر سکیں۔ امام ابن الانباریؒ فرماتے ہیں کہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے انہیں بتا دیا تھا کہ جب یہ ستارہ طلوع ہوگا تو آپ بیمار ہو جائیں گے۔ جب آپؑ نے وہ ستارہ دیکھا تو آپؑ کو معلوم ہو گیا کہ میں بیمار ہوا ہی چاہتا ہوں۔ بعض حضرات نے اس کا مطلب یہ مراد لیا ہے کہ تمہاری عبادت اصنام اور کہانت نجوم سے میرا دل رنجیدہ اور بیمار ہے جبکہ بعض حضرات فرماتے ہیں کہ آپ اس وقت واقعتاً بیمار تھے۔ امام زمخشریؒ فرماتے ہیں کہ بعض حضرات' لڑائی میں' ضرر عظیم سے بچنے کے لئے بیوی کو راضی کرنے کے لئے اور صلح کرانے کے لئے جھوٹ بولنے کو جائز قرار دیتے ہیں لیکن صحیح یہی ہے کہ جھوٹ حرام ہے مگر یہ کہ ایسے لفظ کے ساتھ بولا جائے جس کے دو معنی محتمل ہوں متکلم اس سے ایک معنی مراد لے جبکہ مخاطب دوسرا معنی سمجھے۔ حضرت ابراہیمؑ نے بھی اسی لئے ایسا لفظ استعمال کیا کہ مخاطب کچھ اور سمجھے جبکہ آپؑ کی مراد یہ تھی کہ میرے سر پر موت لٹک رہی ہے جو کسی بھی وقت آسکتی ہے جیسے کہ مشہور مقولہ ہے "کفی بالسلامة داء"

لبید کہتا ہے

دعوت ربی بالسلامة جاهدا      لیصحنی فاذا السلامة داء

ایک شخص کی اچانک موت واقع ہوئی' لوگ جمع ہوئے اور کہنے لگے یہ کیسے مر گیا یہ تو چنگا بھلا اور تندرست تھا۔ ایک اعرابی وہاں سے گذرا اور کہنے لگا کہ کیا یہ اس موت سے بھی تندرست تھا جو ہر وقت اس کے سر پر لٹک رہی تھی۔

سوال: ستاروں میں نظر تفکر جب جائز نہیں ہے تو حضرت ابراہیمؑ نے یہ نظر کیوں کی؟

جواب: اگر دیکھنے والا حضرت ابراہیمؑ جیسا ہو تو اسے نظر فی الکواکب کی اجازت ہے۔

سوال: ارشادِ باری تعالیٰ: "فَرَاغَ عَلَيْهِمْ ضَرْبًا بِالْيَمِيْنِ فَاَقْبَلُوْا اِلَيْهِ يَزِفُّوْنَ" (پھر ان پر قوت کے ساتھ جا پڑے اور مارنے لگے ........) سے تو ثابت ہوتا ہے کہ انہیں اس بات کا علم تھا کہ ان بتوں کو توڑنے والے حضرت ابراہیمؑ ہیں جبکہ سورۃ الانبیاء کی آیات مبارکہ: "قَالُوْا مَنْ فَعَلَ هٰذَا بِاٰلِهَتِنَا" (یہ کس نے کیا ہمارے بتوں کے ساتھ اس میں کوئی شک نہیں کہ اس نے بڑا ہی غضب کیا الخ) سے ظاہر ہوتا ہے کہ انہیں معلوم نہیں تھا کہ بتوں کا تیاپانچا کرنے والا کون ہے؟۔ ان آیات میں تطبیق کی کیا صورت ہوگی؟

جواب: ہوسکتا ہے کہ جن لوگوں کو علم ہوا اور جو جلدی سے حضرت ابراہیمؑ کی طرف لپکے وہ اور لوگ ہوں جبکہ سوال کرنے والے اور ناواقف رہنے والے دوسرے لوگ ہوں۔ یہ بھی ممکن ہے کہ پہلے کسی کو بھی علم نہ ہوا اور ہر ایک دوسرے سے پوچھتا رہا ہو اور پھر جب معلوم ہوا ہو کہ ان بتوں کو حضرت ابراہیمؑ ہی نے پاش پاش کیا ہے تو تیزی سے ان کی طرف لپکے ہوں۔

سوال: ''اِنِّیْ ذَاهِبٌ اِلٰی رَبِّیْ'' (میں تو اپنے رب کی طرف چلا جاتا ہوں) کا کیا مفہوم ہے؟۔

جواب: اس کا مطلب ہے کہ جس طرف ہجرت کرنے کا مجھے اللہ تبارک وتعالیٰ نے حکم دیا ہے یعنی شام کی طرف جارہا ہوں۔ بعض حضرات فرماتے ہیں کہ الی ربی سے مراد الی ارض ربی ہے۔ زمین کی نسبت رب کی طرف اس ارض مقدسہ کی شرافت وعظمت کے لئے کی جیسے کہ ارشادِ باری تعالیٰ ہے'' وَاَنَّ الْمَسَاجِدَ لِلّٰهِ '' اور '' وَعِبَادُ الرَّحْمٰنِ الَّذِيْنَ يَمْشُوْنَ عَلَى الْاَرْضِ هَوْنًا '' (اور رحمان کے بندے وہ ہیں جو زمین پر عاجزی کے ساتھ چلتے ہیں)

سوال: '' سَيَهْدِيْنِ '' (وہ پہنچادے گا مجھکو) کہنے کا کیا مطلب ہے؟ حالانکہ آپؑ تو ہدایت یافتہ تھے۔

جواب: یعنی مجھے ہدایت پر ثابت قدمی اور رسوخ عطاء فرمائیں گے۔ بعض حضرات فرماتے ہیں کہ اس کا مطلب ہے کہ جنت کی طرف میری رہنمائی فرمائیں گے جبکہ بعض حضرات فرماتے ہیں کہ اس کا مطلب ہے کہ ہر قسم کے حالات میں درست امور کی طرف میری رہنمائی فرمائیں گے۔
اس کی نظیر حضرت موسیٰؑ کا ارشادِ گرامی ہے'' كَلَّا اِنَّ مَعِيَ رَبِّيْ سَيَهْدِيْنِ ''

سوال: حضرت ابراہیمؑ نے اپنے بیٹے حضرت اسماعیلؑ سے ذبح کا مشورہ کیوں کیا؟ '' فَانْظُرْ مَاذَا تَرٰى '' (سو تم بھی سوچو تمہاری کیا رائے ہے) حالانکہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے آپ کو بیٹے کے ذبح کا حکم فرمایا تھا کیونکہ '' اِنِّيْ اَرٰى فِي الْمَنَامِ اَنِّيْ اَذْبَحُكَ '' (میں خواب میں دیکھتا ہوں کہ تم کو ذبح کر رہا ہوں) اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے حکم تھا کہ اپنے بیٹے کو ذبح کردو کیونکہ انبیاءِ کرام کا خواب بھی وحی ہوتا ہے وہ جو خواب میں دیکھتے ہیں وہ دراصل بیداری میں اسے سرانجام دینے کا حکم ہوتا ہے وحی جیسے کہ حضرت اسماعیلؑ کے جواب سے واضح ہے: '' يٰاَبَتِ افْعَلْ مَا تُؤْمَرُ '' (ابا جان آپ کو جو حکم ہوا ہے آپ کیجئے)؟

جواب: آپؑ نے ان سے رائے طلب کرنے کے لئے مشورہ نہیں کیا تھا بلکہ وہ تو آزمائش خداوندی پر بیٹے کا صبر دیکھنا چاہتے تھے تاکہ بیٹے میں اگر کوئی بات خلاف صبر معلوم ہو تو اسے صبر کی تلقین کرسکیں نیز اس لئے بھی تاکہ بیٹے کو آئندہ پیش آمدہ حالات کا علم ہوجائے تاکہ وہ بھی

ذبح کے لئے تیار ہو سکے اور خود کو ذہنی طور پر آمادہ کر سکے اور امر خداوندی کے سامنے سر تسلیم خم کر کے ثواب حاصل کرے۔ نیز اس لئے بھی تا کہ مشورہ کی سنت پر عمل ہو جائے' یہ بھی ایک قول ہے کہ اگر حضرت آدمؑ درخت سے کھانے کے متعلق فرشتوں سے مشورہ کر لیتے تو اس آزمائش میں مبتلاء نہ ہوتے۔

سوال: اللہ تبارک وتعالیٰ نے: "قَدْ صَدَّقْتَ الرُّؤْيَا" (تم نے خواب کو خوب سچ کر کے دکھایا) کیوں ارشاد فرمایا کیونکہ خواب کی تصدیق تو تب ہوتی اگر حضرت اسماعیلؑ ذبح ہو جاتے حالانکہ ایسا نہیں ہوا؟

جواب: اس کا مطلب یہ ہے کہ جو کچھ آپ کے اختیار میں تھا اور جو کچھ آپ کر سکتے تھے آپ نے کر دیا کہ اپنے بیٹے کو لٹا کر اس کے حلقوم پر چھری چلا دی باقی یہ تو امر خداوندی تھا کہ چھری گلہ کاٹنے سے عاجز رہی۔ جبکہ بعض حضرات فرماتے ہیں کہ آپؑ نے خواب میں یہی دیکھا تھا کہ آپ ذبح کر رہے ہیں حضرت اسماعیلؑ کا ذبح ہونا نہیں دیکھا تھا' اور یہی کچھ آپؑ نے بیداری میں کر دیا تو آپؑ نے اپنا خواب سچ کر دکھایا۔

سوال: "فَلَمَّا اَسْلَمَا" (غرض جب دونوں نے تسلیم کر لیا) میں لَمَّا کا جواب کیا ہے؟

جواب: بعض حضرات فرماتے ہیں کہ اس کا جواب محذوف ہے۔ تقدیر عبارت یوں ہے انہیں خوشخبری مل گئی کہ حضرت اسماعیلؑ کی جگہ یہ فدیہ قبول کر لیا جائے گا تو وہ اللہ کی اس نعمت پر سراپا شکر بن گئے' جبکہ بعض حضرات فرماتے ہیں کہ اس کا جواب و نادیناہ ہے جس میں واؤ زائدہ ہے۔ جیسا کہ امرؤ القیس کے اس شعر میں واؤ زائد ہے۔

فلما اجزنا ساحة الحی وانتحی بنا بطن خبت ذی خفاف عقنقل

ابن الانباریؒ نے انتحی کو فلما اجزنا کا جواب قرار دیا ہے۔

سوال: اللہ تبارک وتعالیٰ نے حضرت ابراہیم کے متعلق ارشاد فرمایا: "كَذٰلِكَ نَجْزِي الْمُحْسِنِيْنَ" (ہم مخلصین کو ایسا ہی صلہ دیا کرتے ہیں) جبکہ اس سے پہلے اور بعد کے سبھی قصوں میں ارشاد فرمایا: "اِنَّا كَذٰلِكَ نَجْزِي الْمُحْسِنِيْنَ" (وہ وقت عجیب تھا ہم مخلصین کو ایسا ہی صلہ دیا کرتے ہیں) اس کی کیا وجہ ہے؟

جواب: کیونکہ حضرت ابراہیمؑ کے قصہ میں ایک بار گذر چکا تھا: "اِنَّا كَذٰلِكَ نَجْزِي الْمُحْسِنِيْنَ" اس لئے دوبارہ اختصار کے ساتھ ارشاد فرما دیا۔

سوال: ارشاد باری تعالیٰ ہے: "وَاِنَّ لُوْطًا لَّمِنَ الْمُرْسَلِيْنَ اِذْ نَجَّيْنٰهُ وَاَهْلَهٗۤ اَجْمَعِيْنَ"

حالانکہ حضرت نوحؑ زمانہ نجات سے قبل بھی رسول تھے؟
جواب: ''اِذْ نَجَّیْنٰہُ'' ماقبل سے متعلق نہیں ہے بلکہ اس کا متعلق محذوف ہے اور وہ یہ ہے کہ ''واذکر لھم یا محمد اذ نجیناہ'' یعنی اے محمدؐ انہیں بتادیجئے جب ہم نے اپنی نعمت سے اسے نجات دی۔ اس قسم کا سوال: ''وَاِنَّ یُوْنُسَ لَمِنَ الْمُرْسَلِیْنَ اِذْ اَبَقَ اِلَی الْفُلْکِ الْمَشْحُوْنَ'' (اور بے شک یونس بھی پیغمبروں میں سے ہیں جبکہ بھاگ کر بھری ہوئی کشتی کے پاس پہنچے) میں بھی وارد ہوتا ہے۔
سوال: ''وَاَرْسَلْنٰہُ اِلٰی مِاَۃِ اَلْفٍ اَوْ یَزِیْدُوْنَ'' (اور ہم نے ان کو ایک لاکھ یا اس سے زیادہ آدمیوں کی طرف پیغمبر بنا کر بھیجا) میں لفظ او شک کے لئے ہے اور اللہ تبارک وتعالیٰ کا شک میں مبتلاء ہونا محال ہے۔
جواب: اس آیۃ مبارکہ میں ''او'' ''بل'' کے معنی میں ہے' بعض فرماتے ہیں کہ واؤ کے معنی میں ہے جیسے کہ ''اَوْ لٰمَسْتُمُ النِّسَآءَ'' اور عُذْرًا اور نُذْرًا میں' جبکہ بعض حضرات اس کا یہ معنی بیان کرتے ہیں کہ لفظ او مخاطب کے اعتبار سے کہا گیا ہے کہ اگر تم میں سے کوئی انہیں دیکھتا تو کہتا کہ وہ ایک لاکھ یا زیادہ تھے۔ اسی طرح ''فَکَانَ قَابَ قَوْسَیْنِ اَوْ اَدْنٰی'' (پس اور نزدیک آیا سو دو کمانوں کے برابر فاصلہ رکھے گا بلکہ اور بھی کم) میں اَو کی تفصیل ہے۔
سوال: ''فَتَوَلَّ عَنْھُمْ حَتّٰی حِیْنٍ'' (تو آپ تھوڑے زمانے تک ان کا خیال نہ کیجئے) اور ''اَبْصِرْھُمْ'' کے تکرار کی کیا ضرورت تھی؟
جواب: تاکہ وعید اور تخویف میں مزید تاکید پیدا ہو سکے۔
سوال: اللہ تعالیٰ نے پہلے ارشاد فرمایا: ''وَاَبْصِرْھُمْ'' پھر فرمایا ''وَاَبْصِرْ'' (اور دیکھتے رہیے) اس کی کیا وجہ ہے؟
جواب: چونکہ پہلے کلمہ میں مفعول کی ضمیر گذر چکی تھی اس لئے دوبارہ اس کے ذکر کی ضرورت نہیں تھی' بعض حضرات نے اس کا یہ مطلب بیان فرمایا ہے کہ پہلے کا مطلب ہے کہ جب ان پر عذاب اترے تو انہیں دیکھنا اور دوسرے کا مطلب ہے کہ جب ان پر عذاب اترے تو عذاب کو دیکھنا لیکن معنوی اعتبار سے دونوں میں کچھ فرق نہیں۔

## سورۃ صٓ

سوال: ''صٓ وَالْقُرْاٰنِ ذِی الذِّکْرِ'' (ص' قسم ہے قرآن کی جو نصیحت سے پر ہے) کا جواب

قسم کہاں ہے؟

جوابِ اوّل: اللہ تبارک وتعالیٰ نے ابتداء سورۃ میں ایک ایسا لفظ 'ص' بیان فرمایا جو قرآن کریم کے معجزہ ہونے کی دلیل ہے بعدازاں قسم کو ذکر فرمایا جس کا جواب محذوف ہے۔ تقدیر عبارت اس طرح ہے کہ نصیحت والے قرآن کی قسم ہے کہ یہ کلام معجزہ ہے۔

جوابِ ثانی: ص الخ خبر ہے جس کا مبتداء محذوف ہے یعنی اس قرآن نے اہل عرب کو عاجز کردیا قرآن ذی الذکر کی قسم' جیسے کہ مقولہ ہے ھذا حاتم واللہ یعنی قسم کو مؤخر بھی کردیتے ہیں۔

جوابِ ثالث: قسم کا جواب کم اھلکنا ہے' کلام طویل ہونے کے سبب جواب قسم سے لام حذف کردیا گیا' جیسے کہ ''وَالشَّمْسِ وَضُحٰھَا'' قَدْ اَفْلَحَ مَنْ تَزَکّٰی ''میں جواب قسم سے لام محذوف ہے۔

جوابِ رابع: امام کسائی فرماتے ہیں''اِنَّ ذٰلِکَ لَحَقٌّ تَخَاصُمُ اَھْلِ النَّارِ ''اس کا جواب ہے لیکن امام فراءؒ فرماتے ہیں کہ کلام عرب میں جواب قسم کو قسم سے اتنا مؤخر ذکر نہیں کیا جاتا۔

سوال: ''اِصْبِرْ عَلٰی مَا یَقُوْلُوْنَ'' (یہ لوگ جو باتیں کرتے ہیں ان پر صبر کرو) اور ''وَاذْکُرْ عَبْدَنَا اَیُّوْبَ'' (اور آپ ہمارے بندے ایوب کو یاد کیجئے) میں کیا ربط ہے؟

جوابِ اوّل: مطلب یہ ہے کہ عبادت وریاضت میں حضرت یعقوبؑ کے صبر سے قوت حاصل کرو۔

جوابِ ثانی: ان کفار مکہ کو عبادت وریاضت اور مجاہدات میں حضرت داؤد کی شہرت کا علم ہے کہ وہ ایک دن چھوڑ کر ضرور روزہ رکھتے تھے اور روزانہ آدھی رات عبادت کرتے تھے۔ بایں ہمہ جب حضرت داؤدؑ رو روکر استغفار فرماتے تھے تو ان کفار مکہ کو کیا ہوا کہ گناہ کرنے کے باوجود ہماری طرف رجوع نہیں کرتے۔

سوال: فرشتوں نے حضرت داؤدؑ کے پاس آکر کہا:'' خَصْمَانِ بَغٰی بَعْضُنَا عَلٰی بَعْضٍ'' (ہم دو اہل معاملہ ہیں کہ ایک نے دوسرے پر زیادتی کی ہے) حالانکہ فرشتوں سے بغاوت اور ظلم متصور نہیں۔ نیز انہوں نے یہ بھی جھوٹ بولا کہ:''اِنَّ ھٰذَا اَخِیْ لَهٗ تِسْعٌ وَّ تِسْعُوْنَ نَعْجَةً وَّلِیَ نَعْجَةٌ وَّاحِدَةٌ'' (یہ شخص میرا بھائی ہے اس کے پاس ننانوے دنبیاں ہیں اور میرے پاس ایک دنبی ہے)؟

جواب: انہوں نے یہ بات فرضی طور پر صورت مسئلہ بیان کرنے کے لئے کہی' اس لئے اسے جھوٹ نہیں کہا جاسکتا۔ جیسے کہ ہم صورت مسئلہ میں کہہ دیتے ہیں کہ زید کی چالیس بکریاں ہیں اور

عمرو کی بھی چالیس بکریاں ہیں انہوں نے اپنی بکریاں خلط ملط کرلیں۔ اب سال گذرنے کے بعد ان پر زکوٰۃ واجب ہوگی یا نہیں؟۔

سوال: حضرت داؤدؑ نے مدعی علیہ کی بات سننے سے پہلے ہی اس کے ظالم ہونے کا فیصلہ کیسے سنادیا؟

جواب: آپؑ نے اس کے اعتراف کے بعد یہ حکم صادر فرمایا تھا اگرچہ یہ اعتراف قرآن کریم میں موجود نہیں ہے لیکن امام سدی سے اسی طرح منقول ہے۔ اور قصص میں دلالت حال کی وجہ سے اختصاراً ایسے الفاظ حذف بھی کردیئے جاتے ہیں جیسے کہ عرب حضرات کہتے ہیں۔ میں نے اسے تجارت کا حکم دیا پس اس نے خوب مال کمایا مطلب ہے کہ تجارت کی اور خوب مال کمایا۔

سوال: ''اِنِّیٓ اَحۡبَبۡتُ حُبَّ الۡخَیۡرِ'' (میں اس مال کی محبت میں) میں تکرار حُبّ کا کیا مطلب ہے؟ بظاہر اس کا مطلب یہ معلوم ہو رہا ہے کہ مجھے اس کے ساتھ مال جتنی محبت ہے جیسے کہ عرب کا مقولہ ہے ''احببت حب زید'' یعنی مجھے زید جتنی محبت ہے۔ نیز اس کا صلہ عن ذکر کرنے کا کیا فائدہ ہے؟۔

جوابِ اوّل: آیت میں احببت کا معنی ترجیح دینا ہے۔ جیسے اگر انسان کو دو چیزوں میں اختیار ہو تو وہ ایک کے بارہ میں کہہ دیتا ہے احببت ھذا یعنی میں اسے ترجیح دیتا ہوں استحب بھی ترجیح کے معنی میں استعمال ہوتا ہے جیسے کہ ارشادِ باری تعالیٰ ہے: ''وَاَمَّا ثَمُوۡدُ فَهَدَیۡنٰهُمۡ فَاسۡتَحَبُّوا الۡعَمٰی عَلَی الۡهُدٰی'' (اور وہ جو ثمود تھے تو ہم نے ان کو رستہ بتلایا سو انہوں نے گمراہی کو بمقابلہ ہدایت کے پسند کیا) ویسے جو شخص کسی سے محبت رکھتا ہے اسے دوسروں پر ترجیح دیتا ہے۔ باقی اس آیت میں مذکور صلہ عن علیٰ کے معنی میں ہے جیسے کہ ارشاد باری تعالیٰ: ''وَمَنۡ یَّبۡخَلۡ فَاِنَّمَا یَبۡخَلُ عَنۡ نَّفۡسِهٖ'' (اور جو شخص بخل کرتا ہے تو وہ خود اپنے سے بخل کرتا ہے) اب آیت کا معنی بن جائیگا کہ میں نے مال کی محبت کو اپنے رب کے ذکر پر ترجیح دی۔

جوابِ ثانی: صاحب معانی القرآن امام جرجانیؒ فرماتے ہیں کہ احببت بیٹھنے اور تاخیر کرنے کے معنی میں ہے جیسے کہ احب الجمل کا معنی ہے اونٹ بیٹھا۔

ایک شاعر کہتا ہے:

دعتک الیها سقلتاها وجیدها فملت کما مال المحب علی فمد

جو شخص بھی کسی چیز کو چھوڑ کر اس سے پہلو تہی برتے تو وہ اسے چھوڑ بیٹھتا ہے۔ پس آیت کا ترجمہ ہوگا کہ میں نے مال کی محبت کے سبب اپنے رب سے پہلو تہی کی۔ اس صورت میں لفظ حب

مفعول لہ ہونے کے سبب منصوب ہوگا۔

**سوال:** حضرت سلیمانؑ نے: ''وَهَبْ لِیْ مُلْكًا لَّا یَنْبَغِیْ لِاَحَدٍ مِّنْ بَعْدِیْ'' (اور مجھ کو ایسی سلطنت دے کر کہ میرے سوا کسی کو میسر نہ ہو) کیوں فرمایا؟ اس سے تو معاذ اللہ بخل اور حسد کا اظہار ہو رہا ہے جبکہ حضرت سلیمانؑ یقیناً ان بیماریوں سے محفوظ تھے؟

**جوابِ اوّل:** امام حسن وقتادہؒ فرماتے ہیں اس کا مطلب یہ ہے کہ کوئی بھی میری زندگی میں مجھ سے یہ سلطنت چھین نہ سکے جیسے کہ شیطان آپؑ کی انگوٹھی پہن کر آپؑ کی کرسی مبارک پر جا بیٹھا تھا۔

**جوابِ ثانی:** چونکہ اللہ تبارک وتعالیٰ کو معلوم تھا کہ آپؑ کے علاوہ کوئی بھی اس کی صلاحیت نہیں رکھتا لہٰذا اللہ تبارک وتعالیٰ نے آپؑ کے دل میں یہ بات ڈالی کہ آپؑ اللہ تبارک وتعالیٰ سے یہ دعاء کریں تا کہ یہ سلطنت آپؑ کے ساتھ خاص کر دی جائے۔

**جوابِ ثالث:** آپؑ کی مراد اس جملہ سے عظیم سلطنت تھی البتہ اس کی تعبیر کے لئے عبارت یہی اختیار کی گئی جیسے کہ اگر کسی کے متعلق کہا جائے کہ کسی کے پاس اس جیسا فضل یا اس جیسا مال نہیں ہے تو اس کا یہی مطلب ہوتا ہے کہ اس کو فضل عظیم یا مال عظیم حاصل ہے۔ یہ مطلب نہیں ہوتا کہ فی الحقیقت کسی کے پاس بھی اس جتنا مال وفضل نہیں ہے۔

**سوال:** اللہ تبارک وتعالیٰ نے حضرت ایوبؑ کی تعریف میں: '' اِنَّا وَجَدْنٰهُ صَابِرًا'' (بے شک ہم نے ان کو صابر پایا) کیوں فرمایا حالانکہ صبر تو ترک شکوہ وشکایت اور ترکِ جزع وفزع کو کہا جاتا ہے) اور حضرت ایوبؑ نے تو جزع فزع کی تھی؟

**جواب:** اللہ تبارک وتعالیٰ کے سامنے جزع فزع صبر کے منافی نہیں ہے کیونکہ اس سے اظہار خضوع وعبودیت اور احتیاج الی اللہ مراد ہوتی ہے حضرت ایوبؑ نے بھی فرمایا تھا: ''اِنَّمَآ اَشْكُوْا بَثِّیْ وَحُزْنِیْٓ اِلَى اللّٰهِ'' (میں تو اپنے رنج وغم کی صرف اللہ سے شکایت کرتا ہوں) لیکن اس کے باوجود اسے صبر سے تعبیر فرمایا: ''فَصَبْرٌ جَمِیْلٌ'' (سو صبر ہی کروں گا)۔ باقی رہی صبر کی یہ تعریف کہ جس میں شکوہ شکایت نہ ہو تو اس کا مطلب ہے کہ لوگوں کے سامنے شکوہ شکایت نہ کیا جائے۔

**جوابِ ثانی:** آپؑ نے تو اس وقت شفاء کی درخواست کی تھی جب آپؑ کا صرف قلب مبارک اور زبان مبارک بیماری سے محفوظ رہ گئے تھے اور وہ بھی اس لئے تا کہ شیطان قوم کے دل میں یہ وسوسہ نہ ڈال سکے کہ اگر ایوبؑ اللہ کے نبی ہوتے تو یہ اللہ سے دعاء کر لیتے اور شفاء پا لیتے یا اگر یہ حقیقی نبی ہوتے تو وہ اس بیماری میں مبتلا ہی کیوں ہوتے۔

بعض روایات میں ہے کہ آپؑ نے ان الفاظ کے ساتھ اللہ تبارک وتعالیٰ کے حضور

دعاء کی جو قبول ہوئی' ''اے اللہ آپ جانتے ہیں کہ میری زبان نے کبھی میرے دل کی مخالفت نہیں کی' میرے دل نے کبھی میری آنکھوں کی پیروی نہیں کی' مجھے میری مملوکہ چیزیں (باندیاں وغیرہ) کبھی غافل نہ کر سکیں' میں نے یتیموں کو ساتھ لئے بغیر کبھی کھانا نہیں کھایا اور کبھی ایسا نہیں ہوا کہ میں کپڑے پہن کر اور سیر ہو کر سویا ہوں اور میرے قریب میں کوئی بھوکا یا عریاں ہو''۔ اس دعاء کے سبب اللہ تبارک وتعالیٰ نے آپ کی تکلیف کو دور فرمادیا۔

سوال: اللہ تبارک وتعالیٰ نے ابلیس کو فرمایا: ''وَاِنَّ عَلَیۡکَ لَعۡنَتِیۡۤ اِلٰی یَوۡمِ الدِّیۡنِ'' (اور بے شک تجھ پر میری لعنت رہے گی قیامت کے دن تک) اس سے تو یہ پتہ چلتا ہے کہ قیامت تک ابلیس پر لعنت رہے گی اور پھر ختم ہو جائیگی؟

جواب: ابلیس سے لعنت کیسے ختم ہو سکتی ہے؟ اللہ تبارک وتعالیٰ قیامت کے دن کے بارہ میں فرماتے ہیں: ''فَاَذَّنَ مُؤَذِّنٌۢ بَیۡنَہُمۡ اَنۡ لَّعۡنَۃُ اللّٰہِ عَلَی الظّٰلِمِیۡنَ'' (ہاں پھر ایک پکارنے والا دونوں کے درمیان پکاریگا کہ اللہ کی مار ہو ان ظالموں پر جو اللہ تعالیٰ کی راہ سے اعراض کرتے ہیں) البتہ آیت کا مطلب یہ ہے کہ جب تک دنیا باقی ہے اس پر لعنتیں برستی رہیں گی اور اختتام دنیا کے بعد اسے ایسا دردناک عذاب چکھنا پڑے گا جس کے سبب وہ اس تمام لعنت کو بھی بھول جائے گا۔

# سورۃ الزمر

سوال: اللہ تبارک وتعالیٰ نے: ''اِنَّ اللّٰہَ لَا یَہۡدِیۡ مَنۡ ہُوَ کٰذِبٌ کَفَّارٌ'' (اللہ تعالیٰ ایسے شخص کو راہ پر نہیں لاتا جو جھوٹا اور کافر ہو) کیوں فرمایا حالانکہ بہت سے کاذب اور کفار ایسے بھی ہیں جنہیں اللہ تبارک وتعالیٰ ہدایت دیتے ہیں کہ وہ اسلام قبول کر لیتے ہیں؟

جواب: اس کا مطلب یہ ہے کہ جب تک وہ اپنے کفر اور تکذیب اسلام پر ڈٹے رہتے ہیں انہیں ہدایت سے سرفراز نہیں کیا جاتا جبکہ بعض حضرات فرماتے ہیں اس کا مطلب یہ ہے کہ کسی ایسی بات کی طرف ان کی رہنمائی نہیں فرماتے جو مسلمانوں کے خلاف حجت بن سکے۔

سوال: اللہ تبارک وتعالیٰ نے ان لوگوں کے رد میں جو اس کے لئے اولاد ثابت کرتے ہیں ارشاد فرمایا: ''لَوۡ اَرَادَ اللّٰہُ اَنۡ یَّتَّخِذَ وَلَدًا لَّاصۡطَفٰی مِمَّا یَخۡلُقُ مَا یَشَآءُ'' (اگر اللہ تعالیٰ کسی کو اولاد بنانے کا ارادہ کرتا تو ضرور اپنی مخلوق میں سے جس کو چاہتا منتخب فرماتا) باوجودیکہ جو بھی اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف اولاد منسوب کرتے ہیں وہ کہتے ہیں کہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے اسے اپنی اولاد کے

طور پر منتخب فرمالیا ہے۔ مثلاً یہودی حضرت عزیرؑ اور عیسائی حضرت عیسیٰؑ کے بیٹا ہونے کے متعلق جبکہ بعض مشرکین عرب ملائکہ کے متعلق یہ عقیدہ رکھتے تھے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے انہیں اپنی بیٹیاں بنالیا ہے۔تو آیت میں مذکور: ''لَاصْطَفٰی مِمَّا یَخْلُقُ مَا یَشَآءُ'' کا کیا مطلب ہے؟

جواب: اگراس سے یہود ونصاریٰ پر رد مقصود ہو تو اس کا مطلب ہوگا کہ پھر اللہ تبارک وتعالیٰ فرشتوں کو اولاد بناتے نہ کہ انسانوں کو کیونکہ یہود ونصاریٰ دونوں کے نزدیک ملائکہ انسانوں سے افضل ہیں اور اگر اس سے مشرکین عرب پر رد کیا جائے تو اس کا مطلب ہوگا کہ اگر اللہ تبارک و تعالیٰ اپنے لئے اولاد کا انتخاب فرماتے تو کسی ایسی جنس میں سے انتخاب کیا جاتا جس میں صفت تخلیق موجود ہوتا کہ اللہ تعالیٰ کی اولاد اللہ تعالیٰ کی صفت سے متصف تو ہو۔اور ملائکہ تو تمام مل کر ایک مچھر کا پر بھی پیدا نہیں کر سکتے۔ وہ کیسے خدا تعالیٰ کی بیٹیاں ہو سکتے ہیں۔ اس پر یہ اعتراض وارد نہیں ہوتا کہ حضرت عیسیٰؑ میں تو مادہ تخلیق موجود تھا کہ آپؑ پرندوں کو پیدا فرمادیا کرتے تھے اس کا جواب یہ ہے کہ آپؑ تو مٹی سے پرندوں کی صورت بنایا کرتے تھے پھر اس میں پھونکا کرتے تھے باقی اس پرندے کا معجزۃً جاندار بن جانا یہ اللہ تبارک وتعالیٰ کے حکم سے ہوتا تھا۔

سوال: ہر ایک کو معلوم ہے کہ حضرت حواءؑ ہم سے صدیوں سال پہلے پیدا ہوئیں تو پھر اللہ تبارک وتعالیٰ نے: ''خَلَقَکُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَۃٍ ثُمَّ جَعَلَ مِنْهَا زَوْجَهَا'' (اس نے تم لوگوں کو تنِ واحد سے پیدا کیا پھر اسی نے اس کا جوڑا بنایا) میں لفظ ثُمَّ سے عطف کیوں کیا حالانکہ ثُمَّ تو تراخی اور ترتیب کے لئے ہوتا ہے؟

جوابِ اوّل: ایک آیت مبارکہ میں ثُمَّ خبر میں ترتیب کے لئے آیا ہے نہ کہ ایجاد میں ترتیب کے لئے جیسے کہ ہم اپنے محاورہ میں کہتے ہیں میں نے آج تمہیں یہ دیا اور پھر کل یہ دیا تھا۔ایک شاعر کہتا ہے:

ان من سادثم ساد ابوہ        ثم قد ساد قبل ذلک جدہ

جوابِ ثانی: ثُمَّ کا عطف واحدۃ پر ہے نہ کہ خلقکم پر' اس کا مطلب ہوگا کہ میں نے تمہیں جس نفس سے پیدا کیا پہلے میں نے اسے پیدا کیا پھر اس کی راحت کے لئے اس کی بیوی پیدا کی۔

جوابِ ثالث: ثُمَّ کو اپنے ظاہری معنی پر بھی لیا جا سکتا ہے' کیونکہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے اوّلاً حضرت آدمؑ کو پیدا فرمایا پھر ان کی پیٹھ میں سے تمام انسانوں کو پیدا فرما کر ان سے عہد اَلَسْتُ لیا پھر دوبارہ ان تمام انسانوں کو حضرت آدمؑ کی پیٹھ مبارک میں داخل فرمایا بعدازاں حضرت حواءؑ کو پیدا فرمایا۔تو ارشاد باری تعالیٰ خَلَقَکُمْ سے عہد الست کے دن کی تخلیق مراد ہے نہ کہ موجودہ تخلیق

کیونکہ یہ تو توالد وتناسل کے اعتبار سے ہوتی ہے۔

سوال: اللہ تبارک وتعالیٰ نے: ''وَاَنْزَلَ لَكُمْ مِّنَ الْاَنْعَامِ ثَمٰنِيَةَ اَزْوَاجٍ'' (اور تمہارے آٹھ نر وماده چار پایوں کے پیدا کئے) کیوں فرمایا؟ حالانکہ چوپائے تو زمین میں پیدا ہوتے ہیں نہ کہ آسمان سے اترتے ہیں؟

جوابِ اوّل: اللہ تبارک وتعالیٰ نے آٹھوں جوڑوں کو جنت میں پیدا فرمایا اور پھر حضرت آدمؑ کے زمین پر اترنے کے بعد ان چوپاؤں کو ان کے لئے جنت سے نازل فرمایا۔

جوابِ ثانی: اللہ تبارک وتعالیٰ نے آسمان سے پانی نازل فرمایا' چونکہ چوپائے بغیر نباتات کے اور نباتات بغیر پانی کے نہیں پائی جاتیں اس لئے گویا کہ چوپائے بھی آسمان سے منزل ہیں۔ جیسے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے ارشاد فرمایا: ''يٰبَنِيْٓ اٰدَمَ قَدْ اَنْزَلْنَا عَلَيْكُمْ لِبَاسًا يُّوَارِيْ سَوْاٰتِكُمْ'' (اے اولاد آدم کی ہم نے تمہارے لئے لباس پیدا کیا جو کہ تمہارے پردہ دار بدن کو بھی چھپاتا ہے) اس کا مطلب بھی یہی ہے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے آسمان سے پانی نازل فرمایا جو روئی اور صوف وغیرہ کا سبب ہے جس سے کپڑے تیار ہوتے ہیں تو گویا کہ کپڑے بھی منزل من السماء ہیں۔

سوال: اللہ تبارک وتعالیٰ نے: ''قُلْ لِّلّٰهِ الشَّفَاعَةُ جَمِيْعًا'' (آپ کہہ دیجئے سفارش تو تمام خدا ہی کے اختیار میں ہے) کیوں فرمایا؟ باوجودیکہ انبیاء' علماء' شہداء اور بچوں کی شفاعت احادیث سے ثابت ہے؟

جواب: مطلب یہ ہے کہ کوئی اللہ تبارک وتعالیٰ کے مالک بنائے بغیر شفاعت کا مالک نہیں ہوگا: ''مَنْ ذَا الَّذِيْ يَشْفَعُ عِنْدَهٗٓ اِلَّا بِاِذْنِهٖ'' (ایسا کون شخص ہے جو اس کے پاس سفارش کر سکے بدون اس کی اجازت کے) اور: ''وَلَا يَشْفَعُوْنَ اِلَّا لِمَنِ ارْتَضٰى'' (اور وہ بجز اس کے جس کے لئے خدا تعالیٰ کی مرضی ہو) اور کسی کی سفارش نہیں کر سکتے)۔

سوال: ''ثُمَّ اِذَا خَوَّلْنٰهُ نِعْمَةً مِّنَّا قَالَ اِنَّمَآ اُوْتِيْتُهٗ عَلٰى عِلْمٍ'' (پھر جب ہم اس کو اپنی طرف سے کوئی نعمت عطاء فرمادیتے ہیں تو کہتا ہے کہ یہ مجھ کو تدبیر سے ملی ہے) میں اللہ تبارک وتعالیٰ نے اوتیتہ میں مذکر ضمیر ذکر کی حالانکہ اس کا مرجع نعمة ہے اور وہ مؤنث ہے؟

جواب: اس کا مرجع نعمة نہیں بلکہ قسم من النعمة یا شیء من النعمة ہے اور یا پھر اس کا مرجع نعمة نہیں بلکہ انعام ہے۔

سوال: اللہ تبارک وتعالیٰ: ''وَاتَّبِعُوْٓا اَحْسَنَ مَآ اُنْزِلَ اِلَيْكُمْ مِّنْ رَّبِّكُمْ'' (اور تم اپنے رب کے پاس سے آئے ہوئے اچھے اچھے حکموں پر چلو) کیوں فرمایا حالانکہ قرآن تو سارے کا سارا ہی

احسن ہے؟

جواب: اس کا مطلب ہے کہ اس بہترین وحی اور اس بہترین کتاب کی پیروی کرو جو تمہارے رب کی طرف سے تم پر نازل کی گئی ہے اور وہ مکمل قرآن ہے۔

بعض حضرات فرماتے ہیں کہ احسن قرآن سے آیات محکمات مراد ہیں جبکہ بعض حضرات کے نزدیک اس سے ہر وہ آیت مراد ہے جس میں اطاعت واحسان کا حکم ہو۔ اس اعتراض کے مزید جوابات سورۃ الاعراف میں ''وَأْمُرْ قَوْمَکَ يَأْخُذُوا بِأَحْسَنِهَا'' کے تحت ملاحظہ فرمائیں۔

سوال: ارشادِ باری تعالیٰ: ''وَلَقَدْ أُوحِيَ إِلَيْکَ وَإِلَى الَّذِينَ مِنْ قَبْلِکَ لَئِنْ أَشْرَکْتَ'' (اور آپ کی طرف بھی اور جو پیغمبر آپ سے پہلے ہو گزرے ہیں ان کی طرف بھی یہ وحی بھیجی جا چکی ہے) سے تو یہ ظاہر ہو رہا ہے گذشتہ امتوں کی طرف جو وحی کی گئی اس میں بھی آپؐ کو خطاب کیا گیا کہ ''لئن اشرکت'' حالانکہ ایسا نہیں ہے۔

جوابِ اوّل: اس کا مطلب یہ ہے کہ گذشتہ امتوں میں ہر ایک کو اور آپ کی امت میں سے بھی سب کو وحی کے ذریعے بتایا جا رہا ہے کہ اگر وہ شرک کریگا...... یعنی اشرکت سے مراد ہر مخاطب ہے۔

جوابِ ثانی: اس میں کچھ عبارت مقدر ہے مطلب یہ ہے کہ تمہاری طرف اور تم سے پہلے لوگوں کی طرف توحید پر عمل پیرا ہونے کی وحی کی گئی ہے پھر ''لئن اشرکت'' سے نیا کلام شروع کیا جا رہا ہے۔

جوابِ ثالث: عبارت میں تقدیم و تاخیر ہے۔ مطلب یہ ہے کہ آپؐ کی طرف وحی کی گئی کہ ''لئن اشرکت'' اور اسی طرح آپ سے پہلے لوگوں کی طرف بھی وحی کی گئی۔

سوال: اللہ تبارک وتعالیٰ نے اہل جنت اور اہل نار دونوں کے لئے لفظ سیق استعمال کیا ہے، جس کا معنی ہے ہانکا جائیگا، اس لفظ سے تو ذلت عیاں ہے یہ دونوں پر کیسے صادق آ سکتا ہے؟۔

جواب: اہل نار کے ھانکے جانے سے مراد یہ ہے کہ جیسے قیدیوں کو ھانکا جاتا ہے اسی طرح اہل نار کو بھی قیامت کے دن ھانکا جائیگا۔ جبکہ اہل جنت کے لئے لفظ سیق کا مطلب ہے کہ انہیں اعزاز واکرام کے ساتھ لے جایا جائیگا جس طرح کہ بادشاہ کے دربار میں مختلف وفود کو لے جایا جاتا ہے۔

سوال: اللہ تبارک وتعالیٰ نے جہنم کے لئے بغیر واؤ کے: ''فُتِحَتْ أَبْوَابُهَا'' (اس کے دروازے کھول دیئے جاویں گے) فرمایا اور جنت کے لئے واؤ کے ساتھ ''وَفُتِحَتْ أَبْوَابُهَا'' (اور اس

کے دروازے کھلے ہوئے ہوں گے) فرمایا۔اس کی کیا وجہ ہے؟

جوابِ اوّل: امام فراء فرماتے ہیں کہ واؤ زائد ہے۔

جوابِ ثانی: واؤ حالیہ ہے' اس کا مطلب ہے کہ جنت لائی جائیگی تو اس کے دروازے کھلے ہوں گے جبکہ جہنم کے دروازے اس کے لانے کے بعد کھولے جائیں گے' اس کی بھی بہت سی وجوہات ہیں (۱) اہل جنت جب جنت کے دروازے کھلے دیکھیں گے تو انہیں مزید فرحت و خوشی ہوگی جبکہ جہنم کے دروازے بند رکھے جائیں گے تاکہ اس کی تپش میں مزید اضافہ ہو سکے۔(۲) بند دروازے پر کھڑے ہونے سے ذلت ٹپکتی ہے' اللہ تبارک وتعالیٰ اہل جنت کو اس سے محفوظ رکھیں گے (۳) سخی اجر جلدی دیتا ہے اور سزا میں تاخیر کرتا ہے۔اگر جنت کے دروازے بند ہوتے تو اہل جنت کو انتظار کرنا پڑتا جو کمال کرم کے خلاف ہے۔

# سورۃ المؤمن

سوال: اللہ تبارک وتعالیٰ نے: ''مَا يُجَادِلُ فِيْ ايٰتِ اللّٰهِ اِلَّا الَّذِيْنَ كَفَرُوْا'' (اور اللہ تعالیٰ کی ان آیتوں میں وہی لوگ جھگڑے نکالتے ہیں جو منکر ہیں) کیوں ارشاد فرمایا حالانکہ اہل ایمان بھی آیات کے متعلق جھگڑتے ہیں کہ یہ منسوخہ ہیں یا محکمہ؟ یہ اپنے حقیقی معنی پر دلالت کر رہی ہیں یا مجازی معنی پر؟ یہ قدیم ہیں یا حادث؟ وغیرہ وغیرہ؟

جواب: ''جدال'' سے مراد آیات کی تکذیب کر کے نورِ خداوندی بجھانے کی مذموم سعی کرنا ہے' اس کے فوراً بعد ''وَجَادَلُوْا بِالْبَاطِلِ لِيُدْحِضُوْا بِهِ الْحَقَّ'' (اور ناحق کے جھگڑے نکالے تاکہ اس ناحق سے حق کو باطل کر دیں)۔ سے یہ بات بہ خوبی سمجھ آ رہی ہے۔

سوال: حاملینِ عرش کے متعلق ''وَيُؤْمِنُوْنَ بِهٖ'' (اور اس پر ایمان رکھتے ہیں) فرمانے کا کیا فائدہ؟ یہ تو سبھی کو معلوم ہے کہ حاملینِ عرش اللہ تبارک وتعالیٰ پر ایمان رکھتے ہیں؟

جواب: اس سے ایمان کی شرافت وعظمت اور ترغیب مقصود ہے جیسے کہ انبیاء کرام کو قرآن مقدس میں کئی جگہ ایمان اور عمل صالح سے متصف کیا گیا اس سے بھی یہی مقصود ہے۔نیز ایک اور جگہ اعمالِ خیر کے بعد اللہ تبارک وتعالیٰ نے ''ثُمَّ كَانَ مِنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا'' بھی اسی لئے ارشاد فرمایا ہے۔

سوال: اللہ تعالیٰ کے اس ارشادِ مبارک میں: ''قَالُوْا رَبَّنَآ اَمَتَّنَا اثْنَتَيْنِ وَ اَحْيَيْتَنَا اثْنَتَيْنِ'' اموات کو موت دینے سے کیا مراد ہے حالانکہ یہ امر محال ہے؟

جواب: یہ ایسا ہی ہے جیسے کہ کہا جاتا ہے" پاک ہے وہ ذات جس نے مچھر کو چھوٹے اور ہاتھی کو بڑے جسم سے نوازا یا جیسے کہ کنواں کھودنے والے سے کہا جاتا ہے کہ کنویں کے منہ کو تنگ رکھو اور پیٹ کو وسیع کر دو۔ ان مثالوں میں کبر سے صغر اور صغر سے کبر یا وسعت سے تنگی اور تنگی سے وسعت کی طرف منتقل ہونا مقصود نہیں بلکہ صرف ان حالتوں کا وجود بیان کرنا مقصود ہے۔ جب ایک چیز میں صغر و کبر اور تنگی و کشادگی دونوں ممکن ہوں تو پھر ایک کو چھوڑ کر دوسرے کو اختیار کرنا ایک سے دوسرے کی طرف منتقل ہونا ہی ہے۔

سوال: "یَوْمَ هُمْ بَارِزُوْنَ لَا یَخْفٰی عَلَی اللّٰهِ مِنْهُمْ شَیْءٌ" (جس دن سب لوگ سامنے آموجود ہوں گے ان کی کوئی بات خدا سے مخفی نہ رہے گی) کیوں فرمایا حالانکہ وہ ظاہر ہو یا ظاہر نہ ہوں اللہ تبارک وتعالیٰ سے تو مخفی نہیں ہو سکتے؟

جواب: مطلب یہ ہے کہ اعتقاد کے مطابق بھی وہ اللہ تبارک وتعالیٰ سے چھپ نہیں سکیں گے۔ کیونکہ ان کے اعتقاد کے مطابق جب وہ دیواروں یا پردوں کے پیچھے ہوتے ہیں تو اللہ تبارک وتعالیٰ سے مخفی ہوتے ہیں ارشادِ باری تعالیٰ: "وَلٰكِنْ ظَنَنْتُمْ اَنَّ اللّٰهَ لَا یَعْلَمُ كَثِیْرًا مِّمَّا تَعْمَلُوْنَ" (اور لیکن تم اس گمان میں رہے کہ اللہ تعالیٰ کو تمہارے بہت سے اعمال کی خبر ہی نہیں) سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے۔

سوال: حضرت موسیٰ پر ایمان رکھنے والے نے حضرت موسیٰ کے متعلق یہ کیسے فرمایا: "وَاِنْ یَّكُ صَادِقًا یُّصِبْكُمْ بَعْضُ الَّذِیْ یَعِدُكُمْ" (اور اگر وہ سچا ہو تو وہ جو کچھ پیش گوئی کر رہا ہے اس میں سے کچھ تو تم پر پڑے گا) حالانکہ قائل کے زعم میں نیز حقیقت میں بھی انہیں حضرت موسیٰ کے تمام وعدوں کا سامنا کرنا تھا نہ کہ بعض کا؟

جوابِ اوّل: لفظ بعض صلہ ہے۔

جوابِ ثانی: بعض کل کے معنی میں ہے جیسے کہ ایک شاعر کہتا ہے۔

ان الامور اذا الاحداث دبرها دون الشیوخ تری فی بعضها خللا

لبید کہتا ہے:

اولم تکن تدری نوار باننی وصال عقد حبائل جذامها

تراک امکنة اذالم ارضها او یرتبط بعض النفوس حمامها

ہوسکتا ہے کہ کوئی یہ اعتراض کر دے کہ لفظ بعض دونوں اشعار میں اپنے حقیقی معنی میں مستعمل ہے۔ لبید نے بعض النفوس سے خود اپنی ذات مراد لی ہے۔ امام ابن الانباری نے حضرت

ابوعبیدہ سے اسی طرح اس کی تفسیر نقل کی ہے کہ بعض کل کے معنی میں ہے اور لبید کے انہیں دو اشعار سے انہوں نے استدلال کیا ہے۔ البتہ امام زمخشریؒ نے حضرت ابوعبیدہ کی اس تفسیر کا تو انکار کیا ہے تاہم انہوں نے: ''وَلِاُبَیِّنَ لَکُمْ بَعْضَ الَّذِیْ تَخْتَلِفُوْنَ فِیْهِ'' (اور تا کہ بعض باتیں جن میں تم اختلاف کر رہے ہو تم سے بیان کردوں) میں لفظ بعض کو کل کے معنی میں لیا ہے۔

جوابِ ثالث: بعض اپنی اصل حالت پر ہے' اس صورت میں لفظ بعض ذکر کرنے کی دو وجہیں ہیں۔

(۱) ان سے دو وعدے کئے گئے تھے کہ اگر ایمان لائیں گے تو نجات ملے گی اور اگر گمراہی اختیار کریں گے عذاب چکھنا ہوگا۔ یقیناً وہ دو حالتوں میں سے کسی ایک حالت پر ہی ہونگے تو انہیں بعض وعدوں ہی کا سامنا ہوگا۔

(۲) یا پھر ان سے یہ دو وعدے کئے گئے تھے کہ وہ دنیا میں کفر پر مریں گے اور آخرت میں انہیں عذاب بھگتنا پڑے گا تو دنیا میں کفر پر ہلاکت یقیناً بعض ہے نہ کہ کل۔

جوابِ رابع: انہیں نصیحت کرنے کے لئے لفظ بعض استعمال کیا گیا کہ ہوسکتا ہے وہ بات مان لیں اور نصیحت پر کچھ کان دھرلیں۔ مطلب یہ ہے کہ کم از کم تمہیں ان کے کچھ نہ کچھ وعدوں کا تو سامنا کرنا ہی ہوگا۔ جیسے کہ ایک شاعر کہتا ہے۔

قد یدرک المتأنی بعض حاجته　　　وقد یکون من المستعجل الزلل

تاخیر کرنے والا اپنی بعض حاجات تو حاصل کر ہی لیتا ہے جلد باز لغزش کا شکار ہو ہی جاتا ہے امام زمخشریؒ نے اسی جوابِ رابع کو پسند فرمایا ہے۔

سوال: تولی اور ادبار جب دونوں کا معنیٰ ایک ہے تو پھر: ''یَوْمَ تُوَلُّوْنَ مُدْبِرِیْنَ'' (جس روز پشت پھیر کر لوٹو گے) کہنے کی کیا صرورت تھی؟۔

جوابِ اوّل: تاکید مقصود ہے جیسا کہ ارشادِ باری تعالیٰ: ''فَخَرَّ عَلَیْهِمُ السَّقْفُ مِنْ فَوْقِهِمْ'' (پھر اوپر سے ان پر چھت آپڑی)۔

جوابِ ثانی: ان کی غیرت کو ابھارنا مقصود ہے کیونکہ مدبرین میں دبر کا لفظ آتا ہے جو غیرت کے منافی ہے۔ اس کی نظیر: ''وَیُوَلُّوْنَ الْاُدُبَرَ'' (اور پیٹھ پھیر کر بھاگیں گے) ہے۔

سوال: ''لَعَلِّیْ اَبْلُغُ الْاَسْبَابَ اَسْبَابَ السَّمٰوٰتِ'' (شاید میں آسمان پر جانے کی راہوں تک پہنچ جاؤں) میں لفظ اسباب کے تکرار کی کیا ضرورت تھی؟ یہی کافی تھا کہ ابلغ اسباب السموات ؟

جواب: جب کسی چیز کو مبہم ذکر کر کے اس کی وضاحت کی جائے تو اس سے اس چیز کی جلالت شان ظاہر ہوتی ہے۔ یہاں بھی یہی مراد ہے۔

سوال: بری چیز جیسی چیز بھی بری ہوتی ہے تو پھر: "مَنْ عَمِلَ سَيِّئَةً فَلَا يُجْزٰى اِلَّا مِثْلَهَا" (جو شخص گناہ کرتا ہے اس کو تو برابر سرابر ہی بدلہ ملتا ہے) کا کیا مطلب ہے؟

جواب: مطلب یہ ہے کہ برائی کا بدلہ حساب کے مطابق دیا جائیگا۔ اس مقدار سے زیادہ سزا نہیں دی جائیگی تاہم نیک کام کی جزاء بغیر حساب دی جائیگی جیسے کہ ایک اور جگہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے۔

سوال: تو پھر: "مَنْ جَاءَ بِالْحَسَنَةِ فَلَهٗ عَشْرُ اَمْثَالِهَا" (جو شخص نیک کام کرے گا اس کو اس کے دس حصے ملیں گے) کا کیا مطلب ہے؟

جواب: اس کا مطلب یہ ہے کہ جزاء دس گنا سے کم نہیں ہوگی اس آیت میں زیادہ کی نفی نہیں ہے ارشاد باری تعالیٰ ہے: "لِلَّذِيْنَ اَحْسَنُوا الْحُسْنٰى وَزِيَادَةٌ" (جن لوگوں نے نیکی کی ان کے واسطے خوبی ہے اور مزید برآں بھی)۔

سوال: "وَقَالَ الَّذِيْنَ فِي النَّارِ لِخَزَنَةِ جَهَنَّمَ" (اور جتنے لوگ دوزخ میں ہوں گے جہنم کے موکل فرشتوں سے کہیں گے) میں لخزنتها کیوں نہیں فرمایا حالانکہ لخزنتها بہ نسبت لخزنہ جہنم کے زیادہ مختصر ہے؟

جواب: چونکہ جہنم کے ذکر میں ایک قسم کی ہولنا کی ہے لہٰذا مناسب یہی تھا کہ اسے ذکر کیا جاتا جبکہ بعض حضرات فرماتے ہیں کہ جہنم دوزخ کے ایک گڑھے کا نام ہے۔ جو اس کا داروغہ ہے وہ جہنم کے منتظم تمام ملائکہ کا سردار ہے اسی لئے جہنمی لوگ اسے پکاریں گے۔

سوال: کبھی تو مشرک کہیں گے: "بَلْ لَّمْ نَكُنْ نَّدْعُوْا مِنْ قَبْلُ شَيْئًا" (بلکہ ہم اس کے قبل کسی کو نہیں پوجتے تھے) کبھی کہیں گے "هٰٓؤُلَآءِ شُرَكَآؤُنَا الَّذِيْنَ كُنَّا نَدْعُوْا مِنْ دُوْنِكَ" (وہ ہمارے شریک بھی ہیں کہ آپ کو چھوڑ کر ہم ان کو پوجا کرتے تھے) یہ تو کھلا تعارض ہے؟

جوابِ اوّل: یعنی جن بتوں کی ہم پرستش کرتے رہے ان کی تو حقیقت کچھ بھی نہیں ہے یہ نہ تو نفع پہنچا سکتے ہیں اور نہ نقصان۔

جوابِ ثانی: اہل جہنم جھوٹ بولیں گے جیسے کہ: "وَاللّٰهِ رَبِّنَا مَا كُنَّا مُشْرِكِيْنَ" (کہ قسم اللہ کی اپنے پروردگار کی کہ ہم مشرک نہ تھے)؟

سوال: اللہ تبارک وتعالیٰ نے ارشاد فرمایا: "وَعَلَى الْفُلْكِ تُحْمَلُوْنَ" (اور کشتی پر لدے لدے

پھرتے ہیں) یہ ارشاد نہیں فرمایا کہ "وَفِی الْفُلْکِ" (کشتی میں) جیسا کہ ایک اور جگہ ارشاد فرمایا: "قُلْنَا احْمِلْ فِیْهَا مِنْ کُلٍّ زَوْجَیْنِ اثْنَیْنِ" (ہم نے فرمایا کہ ہر قسم میں سے ایک ایک نر اور ایک ایک مادہ یعنی دو عدد اس میں سوار ہو جائے)۔

جواب: کشتی کے لئے میں اور اوپر دونوں ہی صحیح ہیں اور کلام عرب میں مستعمل ہیں لہذا کبھی اللہ تبارک وتعالیٰ نے میں اور کبھی اوپر کا لفظ استعمال فرمایا۔

# سورۃ حٰم السجدۃ

سوال: "وَمِنْ م بَیْنِنَا وَبَیْنِکَ حِجَابٌ" (اور ہمارے اور آپ کے درمیان ایک حجاب ہے) میں اگر لفظ من استعمال نہ کیا جاتا تو بھی معنی درست تھا؟

جواب: اگر لفظ من استعمال نہ کیا جاتا تو اس کا معنی ہوتا کہ ہمارے اور آپ کے درمیان ایک پردہ ہے لیکن من کا لفظ استعمال کرنے کے بعد اب اس کا مطلب ہے کہ ہمارے اور آپ کے درمیان جو مسافت ہے اس میں ہم سے لے کر تم تک مسلسل پردہ ہے درمیان میں کوئی جگہ ہی نہیں جو پردہ سے خالی ہو۔

سوال: "اَئِنَّکُمْ لَتَکْفُرُوْنَ بِالَّذِیْ خَلَقَ الْاَرْضَ فِیْ یَوْمَیْنِ........" (آپ فرمایئے کہ کیا تم لوگ ایسے خدا کا انکار کرتے ہو جس نے زمین کو دو روز میں پیدا کر دیا) سے تو یہ واضح ہوتا ہے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے زمین و آسمان آٹھ دنوں میں پیدا فرمائے جبکہ سورۃ الفرقان کی آیت مبارکہ: "اَلَّذِیْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَمَا بَیْنَهُمَا فِیْ سِتَّةِ اَیَّامٍ" (کہ اس نے آسمانوں اور زمینوں کو چھ روز میں پیدا کیا) سے پتہ چلتا ہے کہ زمین و آسمان چھ دنوں میں پیدا فرمائے۔ ان دونوں میں تطبیق کیسے دی جا سکتی ہے؟

جواب: فی اربعہ ایام میں وہ دو دن بھی شامل ہیں جسمیں زمین کو بنایا گیا یعنی ان چار دنوں میں زمین اور دیگر چیزیں بنائی گئیں اور دو دنوں میں آسمان وغیرہ بنائے گئے تو اس طرح کل چھ دن ہوئے نہ کہ آٹھ' اس تفسیر میں تمام مفسرین کا اتفاق ہے۔ کسی بھی مفسر نے اس سے اختلاف نہیں فرمایا۔

سوال: آسمان اور ان میں موجود عالم زمین ومافیہا سے کئی گنا بڑھ کر ہیں پھر اسمیں کیا حکمت ہے کہ زمین ومافیہا کو تو چار دنوں میں بنایا جبکہ آسمان وغیرہ کو صرف دو دنوں میں پیدا فرمایا؟

جوابِ اوّل: اس لئے کہ آسمان اور ان میں موجود عالم' عالم غیب سے تعلق رکھتے ہیں اس لئے

انہیں صرف دو دنوں میں پیدا فرمادیا بخلاف زمین وغیرہ کے کیونکہ یہ عالم موجودات سے تعلق رکھتے ہیں لہٰذا انہیں چار دنوں میں پیدا فرمایا گیا۔

جوابِ ثانی: اللہ تبارک وتعالیٰ نے زمین و مافیہا کو اس لئے چار دنوں میں پیدا فرمایا تا کہ اہل زمین کو پتہ چل جائے کہ ہر کام بہ تدریج کرنا چاہیے' وگرنہ اگر اللہ تبارک وتعالیٰ چاہتے تو اس تمام کو ایک آن میں پیدا فرما دیتے۔ نیز اس کام میں بھی یہی حکمت مضمر ہے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے عالم اکبر کو تو چھ دنوں میں پیدا فرمادیا جبکہ عالم اصغر یعنی انسان کو چھ مہینوں میں پیدا فرمایا۔

سوال: اللہ تبارک وتعالیٰ نے اہل جہنم کے بارہ میں فرمایا: '' فَاِنۡ یَّصۡبِرُوۡا فَالنَّارُ مَثۡوًی لَّہُمۡ '' (سو اگر یہ لوگ صبر کریں تب ہی دوزخ انکا ٹھکانا ہے) حالانکہ وہ صبر کریں یا نہ کریں بہر صورت ان کا ٹھکانہ جہنم ہی ہے؟

جوابِ اوّل: اس میں عبارت مقدر ہے مطلب ہے کہ وہ صبر کریں یا نہ کریں بہر صورت ان کا ٹھکانا جہنم ہے۔ آخرت میں صبر انہیں کچھ فائدہ نہیں دے گا۔ صبر صرف دنیا ہی میں مفید ہے جیسے کہ کہا جاتا ہے کہ صبر آسانیوں کی چابی ہے' جس نے صبر کیا وہ کامیاب ہوا۔

جوابِ ثانی: یہ اصل میں مشرکین کے اس قول کا جواب ہے: '' اَنِ امۡشُوۡا وَاصۡبِرُوۡا عَلٰۤی اٰلِہَتِکُمۡ '' (کہ چلو اور اپنے معبودوں پر قائم رہو) مطلب یہ ہوا کہ اگر تم دنیا میں عبادت اصنام پر جمے رہے تو آخرت میں تمہارا ٹھکانا جہنم ہوگا۔

سوال: اللہ تبارک وتعالیٰ نے کفار کے متعلق یہ کیوں فرمایا کہ انہیں بدترین اعمال کا بدلہ دیا جائیگا: '' وَلَنَجۡزِیَنَّہُمۡ اَسۡوَاَ الَّذِیۡ کَانُوۡا یَعۡمَلُوۡنَ '' (اور ان کو ان کے برے کاموں کی سزا دیں گے) حالانکہ کفار کو صرف بدترین کا نہیں بلکہ برے اعمال کا بھی بدلہ دیا جائیگا؟

جواب: اس قسم کا سوال سورۃ توبہ کے آخر میں گذر چکا ہے۔

سوال: '' لَا تَسۡجُدُوۡا لِلشَّمۡسِ '' (تم لوگ نہ سورج کو سجدہ کرو) کے بعد '' ولا للقمر '' کی کیا ضرورت تھی حالانکہ یہ '' لا تسجدوا للشمس '' ہی سے سمجھ میں آرہا تھا۔

جواب: تاکہ نہی عن عبادۃ القمر بھی نص سے ثابت ہو سکے۔ اس لئے اسے وضاحۃً ارشاد فرمادیا۔

# سورۃ الشوریٰ

سوال: اللہ تبارک وتعالیٰ نے: '' کَذٰلِکَ یُوۡحِیۡۤ اِلَیۡکَ وَاِلَی الَّذِیۡنَ مِنۡ قَبۡلِکَ '' (اسی طرح

آپ اور جو آپ سے پہلے گذر چکے ہیں ان پر اللہ تعالیٰ وحی بھیجتا رہا۔ میں مضارع کا لفظ کیوں استعمال کیا، حالانکہ آپ سے پہلے لوگوں کی طرف وحی تو زمانہ ماضی میں تھی؟

جواب: امام زمخشریؒ فرماتے ہیں کہ مضارع میں چونکہ عادت اور سنت کا معنی پایا جاتا ہے جو ماضی میں نہیں پایا جاتا اس لئے یہاں مضارع کا انتخاب فرمایا۔ جبکہ میری رائے یہ ہے کہ یہ مضارع ماضی کے معنی میں ہے جیسا کہ: "قُلِ اللّٰهُ يُحْيِيكُمْ" (آپ یوں کہہ دیجئے کہ اللہ تعالیٰ تم کو زندہ رکھتا ہے) میں۔ یا پھر اس میں عبارت مقدر مانی جائے کہ "اوحی الی الذین من قبلک"

سوال: "يَذْرَؤُكُمْ فِيهِ" (اس کے ذریعے سے تمہاری نسل چلاتا رہتا ہے) میں ضمیر کا مرجع کیا ہے؟

جواب: اس کا مرجع هذا التدبير يا الجعل المذكور ہے۔ جبکہ بعض حضرات فرماتے ہیں کہ اس کا مرجع ارحام ہے جن پر ازواج کا مذکر ہونا دلالت کر رہا ہے۔

سوال: اللہ تبارک وتعالیٰ نے: "لَيْسَ كَمِثْلِهِ شَيْءٌ" (کوئی چیز اس کی مثل نہیں) فرمایا۔ جس کا مطلب ہے کہ اللہ کی مثل تو موجود ہے لیکن مثل کی مثل موجود نہیں۔ جیسے کہ اگر کہا جائے کہ زید کے گھر جیسا کوئی گھر نہیں ہے تو اس کا مطلب ہوتا ہے کہ زید کا گھر موجود ہے لیکن اس کی مثل موجود نہیں؟

جوابِ اوّل: مثل ذات سے کنایہ ہے مطلب ہے کہ اس کی ذات جیسی کوئی چیز نہیں۔

جوابِ ثانی: کاف زائد ہے تاکید کے لئے ذکر کیا گیا مطلب ہے کہ "ليس مثله شيء"

جوابِ ثالث: لفظ مثل زائد ہے پہلے اور تیسرے جواب میں یہ فرق ہوگا کہ پہلے میں مثل سے مراد ذات جبکہ تیسرے میں بالکل زائد ہے گویا کہ مذکور ہی نہیں۔

سوال: اللہ تبارک وتعالیٰ نے: "اِلَّا الْمَوَدَّةَ فِي الْقُرْبٰى" (بجز رشتہ داری کی محبت کے) کیوں فرمایا "مودة القربى" یعنی رشتہ داری یا مودة للقربى کیوں نہیں فرمایا؟

جواب: قربى کو مبالغہ کے لئے مودت کا محل بنادیا یعنی "المودة الثابتة المستقرة فى القربى" جیسے کہ کہتے ہیں "فى ال فلان مودة" آل فلاں میں بڑی مودت و محبت ہے۔

سوال: اللہ تبارک وتعالیٰ نے: "وَمِنْ اٰيٰتِهٖ خَلْقُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا بَثَّ فِيهِمَا مِنْ دَآبَّةٍ" (اور منجملہ اس کی نشانیوں میں پیدا کرنا ہے آسمانوں کا اور زمین کا اور ان جانداروں کا جو اس نے زمین و آسمان میں پھیلا رکھے ہیں) کیوں ارشاد فرمایا حالانکہ چوپائے تو صرف زمین میں پائے جاتے ہیں؟

جوابِ اوّل: فیهما کا مطلب فیھا ہے کیونکہ کبھی تثنیہ واحد کے لئے بھی استعمال ہوتا ہے جیسا کہ ارشادِ باری تعالیٰ ہے: "یَخْرُجُ مِنْهُمَا اللُّؤْلُؤُ وَالْمَرْجَانُ" (ان دونوں سے موتی اور مونگا برآمد ہوتا ہے) حالانکہ یہ صرف ایک یعنی نمکین سمندر میں پیدا ہوتے ہیں۔
جوابِ ثانی: بعض حضرات فرماتے ہیں کہ جس طرح زمین میں چوپائے وغیرہ ہیں اسی طرح آسمانوں میں بھی ملائکہ کے چوپائے اور پرندے ہوتے ہیں۔ اس کی تائید: "وَمَا مِنْ دَآبَّةٍ فِی الْاَرْضِ" "اور جتنے قسم کے جاندار زمین پر چلنے والے ہیں) سے بھی ہوتی ہے کہ اگر زمین کے علاوہ کہیں چوپائے موجود نہ ہوتے تو "فی الارض" کی قید کی ضرورت ہی نہ رہتی۔
سوال: اللہ تبارک وتعالیٰ نے: "یَهَبُ لِمَنْ یَّشَآءُ اِنَاثًا وَّ یَهَبُ لِمَنْ یَّشَآءُ الذُّكُوْرَ" (جس کو چاہتا ہے بیٹیاں عطا فرماتا ہے اور جس کو چاہتا ہے بیٹے عطا فرماتا ہے) میں اللہ تبارک وتعالیٰ نے اناث کو مقدم اور ذکور کو مؤخر کیوں فرمایا؟ اور اس کے فوراً بعد پھر ذکور کو اناث پر کیوں مقدم فرمایا نیز پہلے جملہ میں اناث کو نکرہ اور ذکور کو معرفہ کیوں ذکر فرمایا؟۔
جواب: چونکہ اس آیت مبارکہ میں اللہ تبارک وتعالیٰ کی عظمت اور اس کی مشیت کا بیان اور مخلوق کی مشیت کی نفی ہے اس لئے اناث کو ابتداءً مقدم فرمایا کیونکہ انہیں مخلوق پسند نہیں کرتی اور جب انہیں مقدم کر کے ذکور کو مؤخر کیا تو اس کے تدارک کے لے ذکور کو معرفہ ذکر فرمادیا بعد ازاں ہر ایک کو اپنے حق کے مطابق ذکر فرمایا۔ اب چونکہ تقدیم وتاخیر حسب ضابطہ تھی لہٰذا کسی کو معرفہ ذکر کرنے کی ضرورت بھی نہیں تھی۔ ارشاد فرمایا ذُكْرَانًا وَّاِنَاثًا۔ جیسا کہ ارشاد گرامی ہے: "اِنَّا خَلَقْنٰكُمْ مِّنْ ذَكَرٍ وَّ اُنْثٰى" اور "فَجَعَلَ مِنْهُ الزَّوْجَیْنِ الذَّكَرَ وَالْاُنْثٰى"
سوال: ارشادِ الٰہی ہے: "وَمَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنْ یُّكَلِّمَهُ اللّٰهُ اِلَّا وَحْیًا اَوْ مِنْ وَّرَآءِ حِجَابٍ" (اور کسی بشر کی یہ شان نہیں کہ اللہ تعالیٰ اس سے کلام فرمادے یا تو الہام سے یا حجاب کے باہر سے) پھر آنحضرتؐ کے بارہ میں یہ کیسے کہدیا جاتا ہے کہ آپؐ نے اللہ تبارک وتعالیٰ سے بلا حجاب اور بغیر واسطہ کے گفتگو فرمائی۔ حالانکہ اللہ تبارک وتعالیٰ یا تو الہام کے ذریعے کلام فرماتے ہیں جیسا کہ ام موسیٰؑ سے کلام فرمایا یا پھر پردے کے پیچھے سے گفتگو فرماتے ہیں جیسا کہ حضرت موسیٰؑ سے کلام فرمایا اور یا پھر کسی واسطے کے ذریعے کلام فرماتے ہیں جیسا کہ حضرت جبرائیلؑ کے واسطہ سے انبیاء کرامؑ کے ساتھ اور انبیاء کرامؑ کے واسطہ سے امت کے ساتھ کلام فرماتے ہیں۔
جواب: یہاں وحی سے مراد اشارہ ہے جیسے کہ کہا جاتا ہے "وحی العین اور وحی الحاجب" یعنی آنکھ اور ابرو کا اشارہ: "فَاَوْحٰۤى اِلَیْهِمْ اَنْ سَبِّحُوْا" (اور ان کو اشارہ سے فرمایا تم لوگ خدا

کی پاکی بیان کرو) میں بھی یہی معنی مراد ہے۔شب معراج میں اللہ تبارک وتعالیٰ کی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ گفتگو بھی۔

سوال: اللہ تبارک وتعالیٰ نے:'' مَا کُنتَ تَدرِی مَا الکِتَابُ وَلَا الاِیمَانُ '' (آپ کو نہ یہ خبر تھی کہ کتاب کیا چیز ہے اور نہ یہ خبر تھی کہ ایمان کیا چیز ہے) کیوں فرمایا حالانکہ انبیاء کرامؑ تو وحی سے پہلے بھی عقلی دلائل کے ساتھ وجود باری تعالیٰ اور اس کی توحید پر ایمان رکھتے ہیں؟

جواب: یہاں ایمان سے مراد ایمان کے شرائع واحکام ہیں مثلاً نماز روزہ وغیرہ۔

بعض حضرات اس سے کلمہ توحید'' لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ مُحَمَّدٌ رَّسُولُ اللّٰهِ '' پر ایمان مراد لیتے ہیں اور اس کی تعلیم یقیناً آپ کو وحی کے ذریعے دی گئی نہ کہ آپؐ نے اسے عقل کے ذریعے جانا۔

# سورۃ الزخرف

سوال: اللہ تبارک وتعالیٰ نے:'' اِنَّا جَعَلنٰهُ قُرءٰنًا عَرَبِیًّا '' (کہ ہم نے اس کو عربی زبان کا قرآن بنایا ہے) میں جعلنا کا لفظ کیوں استعمال فرمایا حالانکہ'' قلنا یا انزلنا وغیرہ'' الفاظ زیادہ مناسب تھے۔ کیونکہ جعل کا معنی تو پیدا کرنا ہوتا ہے جیسا کہ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:'' وَجَعَلَ الظُّلُمٰتِ وَالنُّورَ '' (اور تاریکیوں کو اور نور کو بنایا)''فَجَعَلَ مِنهُ الزَّوجَینِ الذَّکَرَ وَالاُنثٰی'' (پھر اس کی دو قسمیں کر دیں مرد اور عورت)۔

جواب:'' جعل '' کبھی قول کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے جیسا کہ'' وَیَجعَلُونَ لِلّٰهِ البَنٰتِ '' (اور اللہ تعالیٰ کے لئے بیٹیاں تجویز کرتے ہیں) اور'' جَعَلُوا لِلّٰهِ اَندَادًا '' (اور ان لوگوں نے اللہ کے ساجھی قرار دیئے) میں کیونکہ کفار کہتے تھے نہ کہ پیدا کرتے تھے۔

سوال: اللہ تبارک وتعالیٰ نے'' وَاسئَل مَن اَرسَلنَا مِن قَبلِکَ مِن رُّسُلِنَا '' (اور آپ ان سب پیغمبروں سے جن کو ہم نے آپ سے پہلے بھیجا ہے پوچھ لیجئے) کیوں فرمایا حالانکہ آپؐ کی ان سے ملاقات ہی نہیں ہوئی کہ آپؐ ان سے استفسار فرماتے؟

جوابِ اوّل: اس میں عبارت مقدر ہے مطلب ہے کہ انؑ کے پیروکاروں سے پوچھیں۔

جوابِ ثانی: شبِ معراج میں آنحضرتؐ کی تمام انبیاء کرامؑ سے ملاقات ہوئی۔ یہ آیۃ مبارکہ اس وقت نازل ہوئی جبکہ تمام انبیاء کرامؑ موجود تھے۔ آپؐ نے آیۃ مبارکہ کے نزول کے بعد فرمایا میں نہیں پوچھتا مجھے یہ آیت ہی کافی ہے۔

سوال: اللہ تبارک وتعالیٰ نے حضرت موسیٰؑ کے نو معجزات کے متعلق ارشاد فرمایا:'' وَمَا نُرِیهِم مِن

اٰیَةٍ اِلَّا ھِیَ اَکْبَرُ مِنْ اُخْتِھَا'' (اور ہم ان کو جو نشانی دکھاتے ہیں وہ دوسری نشانی سے بڑھ کر ہوتی ہے)۔ اس کا تو مطلب یہ ہے کہ جب ہر ایک دوسرے سے بڑی ہے تو ان میں سے ہر ایک فاضل اور ہر ایک مفضول ہے حالانکہ ایسا ہونا ممکن نہیں۔ اور اگر اس سے مراد یہ لیں کہ بعض بعض سے بڑی ہیں تو پھر بڑی چھوٹی کا تعین کیسے ہوگا؟۔

جواب: اس کا مطلب یہ ہے کہ ہر ایک بہت بڑی نشانی ہے۔ حماسہ کا شعر ہے:

من تلق منهم تقل لا قيت سيدهم    مثل النجوم التي يسري بها الساري

تو جن سے بھی ملے گا تو کہے گا کہ میں ان کے سردار سے ملا ہوں۔ وہ تمام ان ستاروں کی مانند ہیں جن سے چلنے والے ہدایت پاتے ہیں۔

سوال: حضرت عیسیٰؑ نے اپنی امت سے: '' وَلِاُبَیِّنَ لَکُمْ بَعْضَ الَّذِیْ تَخْتَلِفُوْنَ فِیْهِ '' (اور تاکہ بعض باتیں جن میں تم اختلاف کرتے ہو تم سے بیان کردوں) کیوں فرمایا؟

جوابِ اوّل: وہ آپؑ سے دو قسم کے معاملات میں اختلاف رکھتے تھے دینی اور دیگر فضول معاملات تو آپؑ نے تو صرف انہیں شریعت کے احکام ہی بتانے تھے۔

جواب: بعض کل کے معنی میں ہے۔ جیسا کہ سورۃ المؤمن میں '' وَاِنْ یَّکُ صَادِقًا یُّصِبْکُمْ بَعْضُ الَّذِیْ '' کے تحت تفصیل سے گذرا ہے۔

سوال: اللہ تبارک وتعالیٰ نے '' بغتة (اچانک) کے بعد '' وهم لا يشعرون '' کیوں فرمایا؟

جواب: اس کا مطلب یہ ہے کہ جب ان پر عذاب آئیگا تو وہ اپنے دنیاوی امور میں مشغول ہونگے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے: '' مَا یَنْظُرُوْنَ اِلَّا صَیْحَةً وَّاحِدَةً تَاْخُذُھُمْ وَھُمْ یَخِصِّمُوْنَ '' (پس یہ لوگ ایک آواز سخت کے منتظر ہیں جو ان کو آ پکڑے گی اور وہ سب باہم لڑ جھگڑ رہے ہوں گے) اگر '' وهم لا يشعرون '' مذکور نہ ہوتا تو ہو سکتا تھا کہ بعض لوگ یہ مطلب سمجھتے کہ جب ان پر اچانک عذاب آئیگا تو وہ اس کے لئے تیار ہونگے۔

سوال: جہنمی لوگوں کے بارہ میں اللہ تبارک وتعالیٰ فرماتے ہیں کہ وہ رحمت خداوندی سے مایوس ہونگے پھر ارشاد فرمایا کہ وہ کہیں گے: '' وَنَادَوْا یَا مَالِکُ لِیَقْضِ عَلَیْنَا رَبُّکَ '' (اور پکاریں گے کہ اے مالک تمہارا پروردگار ہمارا کام ہی تمام کردے) یعنی موت کے ذریعے اپنی پریشانیوں کا خاتمہ چاہیں گے؟

جواب: جہنمیوں کو جہنم میں ایک طویل عرصہ تک رہنا ہوگا لہٰذا کبھی تو ان پر مایوسی طاری ہوگی اور کبھی استغاثہ وفریاد میں مشغول ہوں گے۔

سوال: اللہ تبارک وتعالیٰ نے: " وَهُوَ الَّذِیْ فِی السَّمَآءِ اِلٰهٌ وَّفِی الْاَرْضِ اِلٰهٌ " (اور وہ وہی ذات ہے جو آسمان میں بھی قابل عبادت ہے اور زمین میں بھی قابل عبادت ہے) کیوں فرمایا؟ اس سے تعدد الٰہ لازم آتا ہے۔ کیونکہ نکرہ کو جب مکرر ذکر کیا جاتا ہے تو اس سے مراد تعدد ہوتا ہے۔ جیسا کہ اله علی درهم ودرهم اور انت طالق و طالق وغیرہ میں تعدد مراد ہے؟

جواب: یہاں الہ معبود کے معنی میں ہے مطلب یہ ہے کہ جو آسمان میں معبود ہے وہی زمین میں معبود ہے۔ معبود تو زمین وآسمان میں ایک ہی ہے لیکن عابدین الگ الگ ہیں لہٰذا عابدین کے اعتبار سے تو مغایرت ممکن ہے لیکن معبود میں مغایرت ممکن نہیں۔

# سورۃ الدخان

سوال: آنحضرتؐ اور منکرین بعث کے درمیان اختلاف تو حیات بعد الممات میں تھا نہ کہ صرف موت میں تو اللہ تبارک وتعالیٰ نے یہ کیوں فرمایا: " اِنَّ هٰٓؤُلَآءِ لَيَقُوْلُوْنَ اِنْ هِیَ اِلَّا مَوْتَتُنَا الْاُوْلٰى " (یہ لوگ کہتے ہیں کہ اخیر حالت بس یہی ہمارا دنیا کا مرنا ہے) الا حیاتنا نہیں کہا جیسا کہ دوسری جگہ منقول ہے "اِنْ هِیَ اِلَّا حَيَاتُنَا الدُّنْيَا" اور پہلی موت سے کیا مراد ہے؟ کیا ان سے دوسری موت کا بھی وعدہ کیا گیا تھا جس کا انہوں نے انکار کیا؟

جواب: جب ان سے اس موت کا وعدہ کیا گیا جس کے بعد حیات ہے تو انہوں نے اس کا انکار کیا۔ یعنی وہ اس کے قائل تھے کہ ان پر اب کوئی ایسی موت طاری نہیں ہوگی جس کے بعد حیات ہو۔ ایسی موت صرف ایک ہی تھی یعنی موت عدم اور وہ گذر چکی ہے۔ بعض حضرات فرماتے ہیں کہ اس سے اس موت کی نفی مراد ہے جو منکر نکیر کے سوال کے بعد قبر میں واقع ہوگی۔

سوال: اللہ تبارک وتعالیٰ نے " ثُمَّ صُبُّوْا فَوْقَ رَاْسِهٖ مِنْ عَذَابِ الْحَمِيْمِ " (پھر اس کے سر کے اوپر سے تکلیف دینے والا گرم پانی چھوڑو) کیوں ارشاد فرمایا حالانکہ عذاب تو انڈیلا نہیں جاسکتا صرف پانی انڈیلا جاسکتا ہے جیسا کہ دوسری جگہ ارشاد ہے: " يُصَبُّ مِنْ فَوْقِ رُءُوْسِهِمُ الْحَمِيْمُ " (ان کے سر کے اوپر تیز گرم پانی چھوڑا جاوے گا)؟

جواب: یہ استعارہ ہے بات کو ہیبت ناک اور ہولناک بنانے کے لئے یہ الفاظ استعمال کئے گئے اس کی نظیر ہے: " فَصَبَّ عَلَيْهِمْ رَبُّكَ سَوْطَ عَذَابٍ " (سو آپ کے رب نے اُن پر عذاب کا کوڑا برسایا) اور " اَفْرِغْ عَلَيْنَا صَبْرًا " (اے ہمارے پروردگار ہم پر استقلال نازل فرمایئے)

سوال: اللہ تبارک وتعالیٰ نے اہل جنت سے استبرق پہننے کا وعدہ کیوں فرمایا؟: " يَلْبَسُوْنَ مِنْ

سُنْدُسٍ وَّاِسْتَبْرَقٍ ''(وہ لباس پہنیں گے باریک اور دبیز ریشم کا) حالانکہ استبرق گاڑھے ریشم کو کہا جاتا ہے جسے اہل دنیا پسند نہیں کرتے؟

جوابِ اوّل: جیسا کہ جنت کا باریک ریشم دنیا کے باریک ریشم جیسا نہیں ہوگا اسی طرح جنت کا گاڑھا ریشم بھی دنیا کے گاڑھے ریشم جیسا نہیں ہوگا۔

جوابِ ثانی: پتلا ریشم جنت میں سرداروں کا لباس ہوگا اور گاڑھا ریشم ان کے خدام اور غلاموں کا لباس ہوگا تا کہ فرق مراتب ظاہر ہو سکے۔

سوال: اللہ تبارک وتعالیٰ نے اہل جنت کے بارہ میں کیوں فرمایا: '' لَا يَذُوْقُوْنَ فِيْهَا الْمَوْتَ اِلَّا الْمَوْتَةَ الْاُوْلٰى '' (اور وہاں بجز اس موت کے جو دنیا میں آچکی تھی اور موت کا ذائقہ بھی نہ چکھیں گے) حالانکہ انہیں پہلی موت جنت میں نہیں آئیگی۔

جوابِ اوّل: امام زجاج اور فراء فرماتے ہیں کہ الا سوی کے معنی میں ہے جیسے کہ اِلَّا مَا قَدْ سَلَفَ اور اِلَّا مَاشَآءَ رَبُّکَ میں۔

جوابِ ثانی: '' الا بعد '' کے معنی میں ہے' جیسا کہ بعض حضرات فرماتے ہیں کہ الا ماقد سلف میں بھی الا بعد کے معنی میں ہے۔

جوابِ ثالث: جنتی لوگوں کی جب موت آتی ہے تو پردے اٹھائے دیے جاتے ہیں اور عالم نزع ہی میں ان کو جنت میں اپنا ٹھکانا اور جنتی نعمتیں دکھادی جاتی ہیں تو گویا ان کی موت بھی جنت ہی میں واقع ہوتی ہے۔ یہ حضرت ابن قتیبہ کا قول ہے۔

## سورۃ جاثیہ

سوال: '' وَاِذَا تُتْلٰى عَلَيْهِمْ اٰيٰتُنَا بَيِّنٰتٍ مَّا كَانَ حُجَّتَهُمْ اِلَّا اَنْ قَالُوا ائْتُوْا بِاٰبَآئِنَآ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ '' (اور جس وقت ان کے سامنے ہماری کھلی کھلی آیتیں پڑھی جاتی ہیں تو ان کا بجز اس کے اور کوئی جواب نہیں ہوتا کہ کہتے ہیں ہمارے باپ دادوں کو سامنے اور اگر تم سچے ہو) میں سوال وجواب میں مطابقت ہے؟

جواب: جب وہ اس بات کو مان لیں گے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ انہیں موت دے کر انہیں دوبارہ زندہ کرنے پر قادر ہے تو پھر وہ ان کے اباء کو موت دے کر انہیں بھی دوبارہ زندہ کرنے پر قادر ہے۔

سوال: اللہ تبارک وتعالیٰ نے '' كُلُّ اُمَّةٍ تُدْعٰى اِلٰى كِتٰبِهَا '' (ہر فرقہ اپنے نامہ اعمال کی طرف بلایا جاوے گا......) میں کتاب کی اضافت امت کی طرف اور '' هٰذَا كِتٰبُنَا '' (یہ

ہمارا دفتر ہے) میں اپنی طرف کیوں فرمائی؟۔
جواب: اضافت ادنیٰ تعلق سے بھی صحیح ہو جاتی ہے۔امت کی طرف اس کی اضافت اس لئے صحیح ہے کہ اس میں ان لوگوں کے اعمال مذکور ہیں اور اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف اس کی اضافت اس لئے صحیح ہے کہ اس کے اصل مالک وہی ہیں اور انہی کے حکم سے فرشتوں نے اس میں اعمال تحریر کئے ہیں۔

# سورۃ الاحقاف

سوال: اللہ تبارک وتعالیٰ نے "اُولٰٓئِکَ الَّذِیۡنَ نَتَقَبَّلُ عَنۡهُمۡ اَحۡسَنَ مَا عَمِلُوۡا" (یہ وہ لوگ ہیں کہ ہم ان کے نیک کاموں کو قبول کرلیں گے) کیوں فرمایا؟ حالانکہ ان کے عمدہ ترین اعمال کے ساتھ ساتھ صرف عمدہ اعمال بھی قبول کئے جائیں گے؟
جواب: احسن اس آیۃ مبارکہ میں حسن کے معنوں میں مستعمل ہے۔اس کی نظیر سورۃ روم میں گذر چکی ہے۔
سوال: اللہ تبارک وتعالیٰ نے گناہ گاروں اور نیکو کاروں دونوں کے متعلق "وَلِکُلٍّ دَرَجٰتٌ مِّمَّا عَمِلُوۡا" (اور ہر ایک کے لیے ان کے اعمال کی وجہ سے الگ الگ درجے ملیں گے) کیوں فرمایا حالانکہ گناہ گاروں کے لئے درجات (بلندیاں) نہیں بلکہ درکات (پستیاں) ہیں؟
جوابِ اوّل: درجات سے مراد طبقات اور مراتب ہیں بغیر کسی اختصاص کے۔
جوابِ ثانی: اس میں عبارت مقدر ہے۔مطلب ہے کہ ہر فریق کے لئے یا تو درجات ہیں یا درکات۔اس عبارت کو مقدر لانے کی وجہ یہ ہے کہ مذکور اس پر دلالت کر رہی ہے۔
سوال: "فَاۡتِنَا بِمَا تَعِدُنَاۤ اِنۡ کُنۡتَ مِنَ الصّٰدِقِیۡنَ قَالَ اِنَّمَا الۡعِلۡمُ عِنۡدَ اللّٰهِ" (اگر تم سچے ہو تو جس کا تم ہم سے وعدہ کرتے ہو اس کو ہم پر واقع کردو انہوں نے فرمایا پورا علم تو خدا ہی کو ہے) سوال وجواب میں کیا مطابقت ہے؟
جواب: اس میں یہ مطابقت ہے کہ وہ عذاب کو وقت سے پہلے طلب کر رہے تھے "بَلۡ هُوَ مَا اسۡتَعۡجَلۡتُمۡ بِهٖ" (بلکہ یہ وہی ہے جس کی تم جلدی مچاتے تھے) تو آپؑ نے فرمایا کہ مجھے عذاب کے وقت کا علم نہیں ہے۔اللہ ہی بہتر جانتے ہیں۔
سوال: اللہ تبارک وتعالیٰ نے ہوا کے متعلق "تُدَمِّرُ کُلَّ شَیۡءٍۭ بِاَمۡرِ رَبِّهَا" (وہ ہر چیز کو اپنے رب کے حکم سے ہلاک کردے گی) کیوں فرمایا حالانکہ بہت سی چیزیں ایسی ہیں جنہیں ہوا نہیں

اکھاڑ سکتی؟

جواب: مطلب یہ ہے کہ جب یہ ہوا قوم عاد کی املاک پر گذری تو اس نے ہر چیز کو تہس نہس کر دیا۔

سوال: اللہ تبارک وتعالیٰ نے " یَغْفِرْ لَکُمْ مِّنْ ذُنُوْبِکُمْ " (اللہ تعالیٰ تمہارے گناہ معاف کردے گا) کیوں فرمایا یغفر لکم ذنوبکم (تمہارے تمام گناہ معاف کردے گا) کیوں نہیں فرمایا؟۔

جواب: اس لئے کہ کچھ گناہ ایسے بھی ہیں جو صرف ایمان سے معاف نہیں کئے جاتے جیسے ظلم وغیرہ۔ ان کے حالات بیان فرماتا ہے۔

# سورۃ محمد

سوال: اللہ تبارک وتعالیٰ نے " کَذٰلِکَ یَضْرِبُ اللّٰهُ لِلنَّاسِ اَمْثَالَهُمْ " (اللہ تعالیٰ اسی طرح لوگوں کے لئے) کیوں فرمایا حالانکہ اس سے پہلے کوئی مثال نہیں گذری۔

جوابِ اوّل: اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ مؤمنین کی اچھائیوں اور کفار کی برائیوں کو یونہی بیان فرماتے ہیں۔

جوابِ ثانی: اللہ تبارک وتعالیٰ نے کفار کی مثال باطل کے پیروکاروں سے اور مؤمنین کی مثال حق کے پیروکاروں سے دی۔

جوابِ ثالث: گمراہی کو کفار کی رسوائی کی مثال بنایا اور گناہوں کی بخشش کو مؤمنین کی کامیابی کی مثال بنایا۔

سوال: اللہ تبارک وتعالیٰ نے شہداء کے حق میں ان کی شہادت کے بعد " سَیَهْدِیْهِمْ " (اور اللہ تعالیٰ ان کو مقصود تک پہنچائیں) کیوں فرمایا؟ حالانکہ ہدایت تو موت سے پہلے ہوتی ہے نہ کہ بعد میں۔

جواب: اس کا مطلب ہے کہ منکر نکیر کے سوال جواب کے وقت ان کی رہنمائی فرمائیں گے۔ بعض حضرات یہ مطلب بیان کرتے ہیں کہ قیامت کے دن جنت کی طرف رہنمائی فرمائیں گے۔

سوال: " مَثَلُ الْجَنَّةِ الَّتِیْ وُعِدَ الْمُتَّقُوْنَ..... کَمَنْ هُوَ خَالِدٌ " کا کیا مطلب ہے؟۔

جواب: امام فراء فرماتے ہیں کہ اس کا معنی ہے کہ جو شخص ان نعمتوں میں ہو کیا وہ اس شخص جیسا ہے جو ہمیشہ آگ میں رہے۔ جبکہ دیگر حضرات فرماتے ہیں کہ تقدیری عبارت یوں ہے کیا یہ جنت

اس شخص کی قراءت جیسی ہے جو ہمیشہ جہنم میں رہے اقتصار کی وجہ سے اس عبارت کو مقدر ذکر فرمایا۔

سوال: اللہ تبارک وتعالیٰ نے آنحضرت ﷺ سے "فَاعْلَمْ اَنَّهٗ لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ" (تو آپ اس کا یقین رکھئے کہ بجز اللہ کے اور کوئی قابل عبادت نہیں کیوں فرمایا حالانکہ آنحضرت کو تو پہلے ہی حتیٰ کہ نزول وحی سے پہلے بھی اس کا علم تھا۔

جواب: مطلب ہے کہ اپنے علم پر ثابت رہیں۔ امام زجاجؒ فرماتے ہیں کہ خطاب آپ کو ہے لیکن اس سے مراد اُمت ہے۔ جیسے کہ سورۃ احزاب کی ابتداء میں گذرا ہے۔

# سورۃ الفتح

سوال: اللہ تبارک وتعالیٰ نے فتح مکہ کو مغفرت کی علت کیوں قرار دیا؟ "اِنَّا فَتَحْنَا لَکَ فَتْحًا مُّبِیْنًا لِّیَغْفِرَ لَکَ اللّٰهُ" (بے شک ہم نے آپ کو ایک کھلم کھلا فتح دی تا کہ اللہ معاف فرمادے)۔

جواب: اللہ تبارک وتعالیٰ نے اسے مغفرت کی علت قرار نہیں دیا بلکہ چار وعدوں کے اجتماع کی علت قرار دیا ہے وہ چار وعدے یہ ہیں۔(۱) مغفرت (۲) اتمام نعمت (۳) ہدایت صراط مستقیم (۴) نصر عزیز۔ چونکہ فتح مکہ سے پہلے اتمام نعمت اور نصر عزیز حاصل نہیں تھے لہٰذا فتح مکہ ان چار وعدوں کے اجتماع کی علت قرار دیا۔ یہ بھی ممکن ہے کہ فتح مکہ ہی کو مغفرت کی علت قرار دیا ہو اس حقیقت سے کہ وہ دشمن کے ساتھ جہاد ہے۔

سوال: ارشادِ باری تعالیٰ "مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْبِکَ وَمَا تَاَخَّرَ" (اگلے پچھلے خطائیں معاف فرمادے اور آپ اپنے احسانات کی تکمیل کریں اگر ماتأخر سے وہ ذنوب مراد لئے جائیں جو خطاب سے متأخر ہیں تو وقت خطاب وہ گناہ معدوم تھے تو اللہ تبارک وتعالیٰ نے معدوم گناہوں کی کیسی مغفرت فرمائی اور اگر ماتأخر سے خطاب سے پہلے کے گناہ مراد ہوں تو وہ ماتأخر نہیں ہیں۔ تو اس ارشادِ باری تعالیٰ کا کیا مطلب ہے؟۔

جواب: ماتقدم سے مراد حضرت ماریہؓ کا قصہ ہے اور ماتأخر سے مراد حضرت زینبؓ کا قصہ ہے۔ بعض حضرات فرماتے ہیں کہ ماتقدم سے موجود ذنوب اور ماتأخر سے وہ ذنوب جو آئندہ سرزد ہو سکتے ہیں مراد ہیں۔ ان کی مغفرت کا مطلب یہ ہے کہ اگر وہ سرزد ہونگے تو اللہ تبارک وتعالیٰ انہیں معاف فرمادیں گے۔ یا پھر علی الطریق المبالغۃ ارشاد فرمایا جیسا کہ عرب کا محاورہ ہے فلان یضرب من یلقاہ ومن لم یلقاہ۔ فلاں کے کوئی ہاتھ لگے یا نہ لگے وہ ہر ایک کو مارتا ہے۔ مطلب ہے کہ ہر ایک کو مارتا ہے تو آیۃ مذکورہ میں بھی ماتقدم وماتأخر سے ہر گناہ مراد ہوگا۔

سوال: اللہ تبارک وتعالیٰ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو "وَیَھْدِیَکَ صِرَاطًا مُّسْتَقِیْمًا" (اور آپ کو سیدھے رستے پر لے چلے) کیوں فرمایا حالانکہ آپ تو کیا آپ کی امت بھی راہ راست پر گامزن تھی۔

جواب: مطلب ہے کہ زیادتی ہدایت عطا فرمائیں گے۔ بعض حضرات فرماتے ہیں کہ ہدایت پر ثابت رکھیں گے جبکہ بعض حضرات اس کا یہ مطلب بیان فرماتے ہیں کہ ہر پیش آمدہ معاملہ میں آپ کو راہ راست کی ہدایت عطا فرمائیں گے۔

سوال: یہ کیسے کہا جاسکتا ہے کہ ایمان کمی وزیادتی کو قبول نہیں کرتا۔ حالانکہ اللہ تبارک وتعالیٰ فرماتے ہیں "لِیَزْدَادُوْا اِیْمَانًا مَّعَ اِیْمَانِھِمْ" (تاکہ ان کے پہلے ایمان کے ساتھ ان کا ایمان اور زیادہ ہوں)۔

جواب: اگر ایمان سے اقرار وجود خداوندی مراد لیا جائے تو وہ کمی زیادتی کو قبول نہیں کرتا۔ اگر ایمان سے مراد یقین وتصدیق ہو تو پھر اس میں کمی زیادتی کا احتمال ہے۔ آیت مذکورہ میں ایمان سے مراد یہی تصدیق ہے کیونکہ یہی تصدیق اطمینان وسکون کا باعث ہے۔ یعنی جب بھی کوئی شرعی حکم سامنے آتا ہے وہ اس کی تصدیق کرتے ہیں۔ یوں ان کی تصدیق میں زیادتی ہوتی رہتی ہے۔

سوال: اللہ تبارک وتعالیٰ نے "وَکَانُوْا اَحَقَّ بِھَا" (وہ اس کے زیادہ مستحق ہیں) کے بعد واھلھا کیوں فرمایا؟

جواب: بھا میں ضمیر کا مرجع کلمۂ توحید اور اھلھا کی ضمیر کا مرجع تقویٰ ہے۔ لہٰذا تکرار نہیں پایا گیا۔

سوال: اللہ تبارک وتعالیٰ نے لَتَدْخُلُنَّ الْمَسْجِدَ الْحَرَامَ اِنْ شَآءَ اللّٰهُ میں ان شاء اللہ کی قید کیوں لگائی۔

جوابِ اوّل: ان اذ کے معنی میں ہے جیسے کہ وَذَرُوْا مَا بَقِیَ مِنَ الرِّبٰوا اِنْ کُنْتُمْ مُّؤْمِنِیْنَ میں

جوابِ ثانی: اللہ تبارک وتعالیٰ نے اس لئے ان شاء اللہ فرمایا تاکہ لوگوں کو ترغیب ہو کہ جب اللہ تبارک وتعالیٰ سب کچھ جاننے کے باوجود ان شاء اللہ فرمارہے ہیں تو مخلوق کو تو نامعلوم چیزوں میں ضرور انشاء اللہ کہنا چاہیے۔

جوابِ ثالث: نبی کریمؐ نے کسی کو خواب میں دیکھا وہ کہہ رہا تھا "لَتَدْخُلُنَّ الْمَسْجِدَ الْحَرَامَ اِنْ شَآءَ اللّٰهُ" (انہیں الفاظ کو قرآن کریم میں نازل فرمادیا گیا۔

جوابِ رابع: استثناء امنین کے متعلق ہے نہ کہ لتدخلن کے۔

سوال: اللہ تبارک وتعالیٰ امنین کے بعد لاتخافون کیوں فرمایا؟

جواب: یعنی تم امن کے ساتھ داخل ہو گے اور اس بات سے بھی نہ ڈرو کہ تمہارے دشمن تمہیں مستقبل میں اس سے نکال دیں گے۔
سوال: " لِيَغِيظَ بِهِمُ الْكُفَّارَ " (تا کہ ان سے کافروں کو جلا دے) کس چیز کی علت ہے؟۔
جواب: اللہ تبارک وتعالیٰ نے صحابہ کرامؓ کی تعداد کو زیادہ فرمادیا اور انہیں قوت بخشی لیغیظ بھم الکفار۔
سوال: اللہ تبارک وتعالیٰ نے " وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ مِنْهُمْ مَّغْفِرَةً وَّاَجْرًا عَظِيْمًا " (اللہ تعالیٰ نے ان صاحبوں سے جو کہ ایمان لائے ہیں اور نیک کام کر رہے ہیں مغفرت اور اجر عظیم کا وعدہ کر رکھا ہے) کیوں فرمایا؟ حالانکہ نبی کا ہر صحابیؓ آیت میں مذکور صفات سے متصف ہے۔ پھر بعض صحابہ کے لئے مغفرت کا وعدہ چہ معنی؟
جواب: آیت مذکورہ میں من تبعیض کے لئے نہیں بلکہ جنس کے لئے ہے۔ جیسا کہ " فَاجْتَنِبُوا الرِّجْسَ مِنَ الْاَوْثَانِ " (تو تم لوگ گندگی سے یعنی بتوں سے کنارہ کش رہیں)۔

# سورۃ الحجرات

سوال: اللہ تبارک وتعالیٰ نے " يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تُقَدِّمُوْا بَيْنَ يَدَيِ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَاتَّقُوا اللّٰهَ " (اے ایمان والو اللہ اور رسول سے پہلے تم سبقت مت کیا کرو اور اللہ سے ڈرتے رہو) فرمایا اس کا مطلب تو یہ ہے کہ کسی غیر کو آپ پر مقدم نہ کرو حالانکہ مقصود یہ تھا کہ صحابہؓ اپنے کسی قول وفعل میں آپ پر مقدم نہ ہوں؟
جواب: آیۃ مذکورہ میں قدم بمعنی تقدم یعنی لازم ہے نہ کہ متعدی جیسے کہ بعض اوقات فکر تفکر کے معنوں میں اور وقف توقف کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔
ایک شاعر کہتا ہے:

اذا نحن سرنا سارت الناس خلفنا
وان نحن اومأ نا الی الناس وقفوا

جب ہم چلتے ہیں تو لوگ ہمارے پیچھے چلتے ہیں اور اگر ہم لوگوں کو اشارہ کر دیں تو وہ ٹھہر جاتے ہیں۔ اس شعر میں بھی وقفوا توقفوا کے معنی میں ہے۔
سوال: جب اللہ تبارک وتعالیٰ نے " لَا تَرْفَعُوْۤا اَصْوَاتَكُمْ فَوْقَ صَوْتِ النَّبِيِّ " (اپنی آوازیں پیغمبر کی آواز سے مت بلند کرو) فرمادیا تھا تو " وَلَا تَجْهَرُوْا لَهٗ بِالْقَوْلِ " (اور نہ ان سے ایسے

کھل کر بولا کرو) کہنے کی کیا ضرورت تھی؟۔
جواب: اس سے آپ کو نام لے کر پکارنے کی حرمت مقصود ہے۔ جیسے یا محمد یا احمد کہنا۔ کیونکہ یہ آپ کی توقیر اور عظمت کے خلاف ہے۔ بلکہ اگر آپ کو پکارنا ہو تو یارسول اللہ اور یا نبی اللہ کہہ کر پکاریں۔
اس کی نظیر ہے" لَا تَجْعَلُوْا دُعَاءَ الرَّسُوْلِ بَيْنَكُمْ كَدُعَاءِ بَعْضِكُمْ بَعْضًا "(تم لوگ رسول کے بلانے کو ایسا مت سمجھو جیسا تم میں ایک دوسرے کو بلا لیتا ہے)
سوال: اللہ تبارک وتعالیٰ نے" اَنْ تَحْبَطَ اَعْمَالُكُمْ "(کبھی تمہارے اعمال برباد ہو جاویں) کیوں فرمایا؟ حالانکہ حبطِ اعمال تو صرف کفر سے ہوتا ہے نہ کہ دیگر گناہوں سے اور آنحضرت کی مجلس مبارک میں آواز بلند کرنا معصیت ہے نہ کہ کفر۔ بعض حضرات تو یہ روایت کرتے ہیں کہ یہ آیت' حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ کے بارہ میں نازل ہوئی کہ ایک بار ان کی آواز آپ کی مجلس مبارک میں بلند ہو گئی تھی اور بعض حضرات کے نزدیک یہ آیت' ثابت بن قیس بن شماس انصاریؓ کے بارہ میں نازل ہوئی۔ کیونکہ آپؓ کی آواز بہت بلند تھی اس لئے کبھی کبھی آپؓ کی آواز سے آنحضرتؐ کو تکلیف ہوتی تھی۔
جواب: مطلب یہ ہے کہ اس کام کو ہلکا نہ سمجھو۔ اگر ہلکا سمجھو گے تو کسی دن دانستہ یہ کر بیٹھو گے اور دانستہ ایسا کرنا تمہیں کفر تک لے جائیگا جو حبطِ اعمال کا سبب ہے۔ جبکہ بعض حضرات فرماتے ہیں کہ حبط اعمال مرتبہ کم ہونے سے مجاز ہے۔
سوال:" وَلٰكِنَّ اللّٰهَ حَبَّبَ اِلَيْكُمُ الْاِيْمَانَ "کا ماقبل سے کیا تعلق ہے؟
جواب: یعنی جاہلیت کی عبادت کو ترک کر دو کیونکہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے تمہیں اس پر عامل نہیں رکھا" وَلٰكِنَّ اللّٰهَ حَبَّبَ اِلَيْكُمُ الْاِيْمَانَ "(اور لیکن اللہ تعالیٰ نے تم کو ایمان کی محبت دی)۔
سوال: اگر ہم فسوق اور عصیان کا ایک ہی معنی مراد لیں تو پھر ایک آیت میں ان دونوں کو جمع کرنے کا کیا فائدہ؟ اور اگر ہم عصیان کو فسوق سے عام مانیں تو پھر اس کے ذکر کے بعد فسوق کے ذکر کی ضرورت نہیں رہتی کیونکہ فسوق اس میں داخل ہے؟
جواب: حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں کہ یہاں فسوق سے مراد کذب ہے اور عصیان سے مراد دیگر معاصی ہیں۔ باقی کذب کو اس لئے الگ سے بیان فرمایا کہ یہ نزول آیت کا سبب ہے۔
سوال: یہ کیسے کہا جا سکتا ہے کہ ایمان اور اسلام کا ایک معنی ہے حالانکہ اللہ تبارک وتعالیٰ فرماتے ہیں" قُلْ لَّمْ تُؤْمِنُوْا وَلٰكِنْ قُوْلُوْا اَسْلَمْنَا "(آپ فرما دیجئے کہ تم ایمان تو نہیں لائے اور لیکن

یوں کہو کہ ہم مطیع ہو گئے)؟

جواب: یہاں ایمان بالقلب کی نفی مراد ہے۔ اس کی دلیل اللہ تبارک وتعالیٰ کا یہ فرمان ہے" وَلَمَّا يَدْخُلِ الْإِيمَانُ فِي قُلُوبِكُمْ "(اور ابھی تک ایمان تمہارے دلوں میں داخل نہیں ہوا) یعنی اپنے دل سے تصدیق نہ کرو" وَلٰكِنْ قُولُوا أَسْلَمْنَا "(اور لیکن یوں کہو کہ ہم مطیع ہو گئے) یعنی ہم تسلیم ہوتے ہیں اور تلوار کے خوف سے تابعداری اختیار کرتے ہیں۔ اگر اسلام اور ایمان کو ان معانی میں لیں تو یقیناً ان میں فرق ہے۔

سوال: یہ کیسے کہا جا سکتا ہے کہ اعمال ایمان میں داخل نہیں جبکہ اللہ تبارک وتعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں إِنَّمَا الْمُؤْمِنُونَ الَّذِينَ آمَنُوا۔

جواب: یہاں ایمان سے ایمان کامل مراد ہے جیسے کہ" إِنَّمَا يَخْشَى اللّٰهَ مِنْ عِبَادِهِ الْعُلَمٰٓؤُا" (خدا سے اس کے وہی بندے ڈرتے ہیں جو علم رکھتے ہیں) اور المسلم من سلم المسلون من لسانه ویده (مسلمان وہ ہے جس کی زبان اور ہاتھ سے سارے مسلمان محفوظ رہیں) میں۔ جیسا کہ عرب کا مقولہ ہے" الرجل من یصبر علی الشدائد "(مرد تو وہ ہے جو مصیبتوں پر صبر کرے) وغیرہ وغیرہ۔ اس جواب پر یہ اعتراض ہو سکتا ہے کہ اول آیت میں اعراب سے ایمان کامل کی نفی کی گئی تھی۔ اب یہ مناسب نہیں ہے کہ اس کے بعد ایمان کامل کو ثابت کیا جائے بلکہ نفس ایمان کا ثبوت ہی کافی ہے۔

# سورۃ ق

سوال:" قٓ وَالْقُرْاٰنِ الْمَجِيدِ "(ق قسم ہے قرآن مجید کی) کا جوابِ قسم کہاں ہے؟

جوابِ اوّل: جوابِ قسم مقدر ہے وہ یہ ہے کہ انہیں موت کے بعد اٹھایا جائیگا۔

جوابِ ثانی: اس کا جواب" قَدْ عَلِمْنَا مَا تَنْقُصُ الْأَرْضُ "(ہم ان کے ان اجزاء کو جانتے ہیں جن کو مٹی کم کرتی ہے) جوابِ قسم سے لام کو تطویل کلام کی وجہ سے حذف کر دیا۔ جیسا کہ" قَدْ أَفْلَحَ مَنْ زَكّٰهَا "(یقیناً وہ مراد کو پہنچا جس نے اس کو پاک کر لیا) میں لام حذف کیا گیا

جوابِ ثالث:" مَا يَلْفِظُ مِنْ قَوْلٍ "(وہ کوئی لفظ منہ سے نہیں نکالنے پاتا) جوابِ قسم ہے۔

سوال: اللہ تبارک وتعالیٰ نے وحب الحصید کیوں فرمایا حالانکہ اس سے مراد الحب الحصید ہے اللہ تبارک وتعالیٰ نے ایک چیز کی اضافت اسی چیز کی طرف فرمادی حالانکہ اضافت تو مضاف اور مضاف الیہ میں تغایر کو چاہتی ہے۔

جوابِ اوّل: اس کا مطلب ہے کہ حب الزرع الحصید یا النبات الحصید۔
جوابِ ثانی: ایک چیز کی اضافت اپنی طرف اس وقت جائز ہوتی ہے جب الفاظ مختلف ہوں۔ جیسے کہ حق الیقین حبل الورید دار الاخرۃ اور وعد الصدق۔
سوال: اللہ تبارک وتعالیٰ نے "عَنِ الْيَمِيْنِ وَعَنِ الشِّمَالِ قَعِيْدٌ" (دائیں اور بائیں طرف بیٹھے رہتے ہیں) کیوں فرمایا۔ قعید ان کیوں نہیں فرمایا۔ حالانکہ دو فرشتوں کے متعلق خبر دی جا رہی ہے جن کا ذکر پہلے گذر چکا ہے۔ اِذْ يَتَلَقَّى الْمُتَلَقِّيٰنِ۔
جواب: اس کا مطلب ہے کہ دائیں طرف بھی بیٹھا ہے اور بائیں طرف بھی ایک قعید کو حذف کر دیا کیونکہ مذکور اس پر دلالت کر رہا ہے۔ جیسا کہ ایک شاعر کہتا ہے:

نحن بما عندنا وانت بما عندک راض والرأی مختلف

(جو کچھ ہمارے پاس ہے اس سے ہم اور جو کچھ آپ کے پاس ہے اس سے آپ راضی ہیں اور رائے مختلف ہے)

یا رمانی بامر کنت منه ووالدی بریئا ومن اجل الطوی رمانی

جواب ثانی: جو لفظ فعیل کے وزن پر ہو اس میں واحد تثنیہ اور جمع برابر ہوتے ہیں۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے "وَالْمَلَائِكَةُ بَعْدَ ذٰلِكَ ظَهِيْرٌ" (اور ان کے علاوہ فرشتے مددگار ہیں)
سوال: اللہ تبارک وتعالیٰ نے داروغۂ جہنم کے لئے تثنیہ کا صیغہ استعمال فرمایا اَلْقِيَا۔ (پس ایسے شخص کو ڈال دو)۔ حالانکہ وہ واحد ہیں؟
جوابِ اوّل: امام مبرد فرماتے ہیں کہ فاعل کا تثنیہ فعل کے تثنیہ ہونے پر بھی دلالت کرتا ہے۔ اَلْقِيَا کا مطلب ہے الق الق۔ جیسا کہ امرأ القیس کہتا ہے قفانبک۔ یعنی قف قف۔
جوابِ ثانی: عرب حضرات اکثر واحد کے لئے تثنیہ کا صیغہ استعمال کرتے ہیں مثلاً کہا جاتا ہے، خلیلی وصاحبی وقفا واسمداو عوجا۔ امام فراء فرماتے ہیں کہ میں نے عرب کو بہت مرتبہ ایسا کرتے سنا ہے، مجھے بعض حضرات نے یہ شعر بھی سنایا ہے۔

فقالت لصاحبی لا تحبسانا بنزع اصوله واجتز شیحا

مخاطب ایک ہونے کے باوجود لا تحبسانا کہا گیا۔ مجھے ابو ثور نے یہ شعر سنایا

فان تزجرانی یابن عفان انزجر وان تدعانی رجم عرضا ممتعا

امرؤ القیس کہتا ہے:

خلیلی مرابی علی ام جندب نقضی لبانات الفواد المعذب

پھر کہتا ہے:

الم ترانی کلما جئت طارقا    وجدت بھا طیبا وان لم تطیب

جب بھی میں رات کواس کے پاس آتا ہوں مجھے اس کے پاس ایک خوشبو محسوس ہوتی ہے اگرچہ وہ خوشبو نہ لگائے۔

جوابِ ثالث: یہ اصل میں ان دو فرشتوں کو حکم دیا جارہا ہے جنکا ذکر پہلے ہو چکا۔ ''وَجَآءَتْ كُلُّ نَفْسٍ مَّعَهَا سَآئِقٌ وَّشَهِيْدٌ'' (اور ہر شخص اس طرح آوے گا کہ اس کے ساتھ ایک اس کو اپنے ہمراہ لاوے گا اور ایک گواہ ہوگا)۔

سوال: اللہ تبارک وتعالیٰ نے جنة کی صفت بیان فرمائی غیر بعید' حالانکہ غیر بعیدة بیان فرمانی چاہیے تھی؟۔

جواب: بعید مصدر کے وزن پر ہے جیسے کہ زبیر اور صلیل۔ اور مصادر کو جب صفت بنایا جائے تو ان کے لئے تذکیر وتانیث برابر ہوتی ہے۔ یا پھر غیر بعید کے موصوف کو محذوف مان لیا جائے یعنی مکانا غیر بعید۔ یہ دونوں جواب امام زمخشریؒ کے بیان فرمودہ ہیں۔

سوال: '' وَأُزْلِفَتِ الْجَنَّةُ '' (اور جنت قریب لائی جائے گی) کے بعد غیر بعید کہنے کی کیا ضرورت تھی؟

جواب: تاکید کے لئے ایسا کیا گیا جیسا کہا جاتا ہے ہوقریب غیر بعید' عزیز غیر ذلیل وغیرہ۔

سوال: اللہ تبارک وتعالیٰ نے'' اِنَّ فِیْ ذٰلِکَ لَذِکْرٰی لِمَنْ کَانَ لَهٗ قَلْبٌ '' (اس شخص کے لئے اس میں بڑی عبرت ہے جس کے پاس دل ہو) کیوں فرمایا حالانکہ ہر انسان تو کیا ہر حیوان کا بھی دل ہوتا ہے؟

جوابِ اوّل: حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں کہ یہاں قلب سے مراد عقل ہے۔ حضرت ابن قتیبہؒ فرماتے ہیں کیونکہ عقل دل سے متعلق ہے لہٰذا کنایۃً اسے ذکر فرمادیا۔

جوابِ ثانی: لمن کان له قلب کا مطلب یہ ہے کہ جس کا دل غور کرنے والا ہو۔ اور جس کا دل غور نہیں کرتا گویا کہ اس کا دل ہی نہیں ہے۔ اس کی تائید'' وَلَقَدْ ذَرَأْنَا لِجَهَنَّمَ كَثِيْرًا مِّنَ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ '' (اور ہم نے ایسے بہت سے جن اور انسان دوزخ کے لئے پیدا کئے) سے بھی ہوتی ہے۔

## سورۃ الذّاریات

سوال: اللہ تبارک وتعالیٰ نے اِنَّمَا تُوْعَدُوْنَ لَصَادِقٌ کیوں فرمایا؟ حالانکہ صادق قائل کی

صفت بن سکتا ہے نہ کہ وعلکی؟

جواب: صادق مصدوق کے معنی میں ہے جیسا کہ عِیْشَۃٍ رَّاضِیَۃٍ اور مَآءٍ دَافِقٍ میں۔ جبکہ بعض حضرات فرماتے ہیں کہ اسم فاعل صادق مصدر صدق کے معنی میں ہے کیونکہ کبھی مصدر اسم فاعل کے وزن پر بھی آتا ہے جیسا کہ قمت قائما بمعنی قیاما اور لحفت بهم الائمة بمعنی اللوم۔

س·· اللہ ـب وتعالیٰ نے اِنَّ الْمُتَّقِیْنَ فِیْ جَنّٰتٍ وَّعُیُوْنٍ (بیشک متقی لوگ بہشتوں اور چشموں میں ہوں گے) کیوں فرمایا؟ حالانکہ متقی لوگ باغوں کے اندر یا چشموں کے اندر نہیں رہیں گے؟

جواب: مطلب یہ ہے کہ جنت میں ہر طرف باغات پھیلے ہوئے ہونگے اور ہر طرف چشمے جاری ہونگے تو وہ مجموعہ باغات یا مجموعہ چشمہ جات میں ہونگے نہ کہ ایک باغ یا ایک چشمہ میں۔ اسی کی نظیر" اِنَّ الْمُتَّقِیْنَ فِیْ جَنّٰتٍ وَّ نَهَرٍ "(پرہیزگار لوگ باغوں اور نہروں میں ہوں گے) ہے کیونکہ نہر انہار کے معنی میں ہے۔ رعایتِ فواصل کی وجہ سے انہار کی جگہ نہر ذکر کیا گیا۔

سوال: اللہ تبارک وتعالیٰ نے" وَتَرَكْنَا فِیْهَآ اٰیَةً لِّلَّذِیْنَ یَخَافُوْنَ الْعَذَابَ الْاَلِیْمَ "(اور ہم نے اس واقعہ میں ایسے لوگوں کے لئے عبرت رہنے دی جو دردناک عذاب سے ڈرتے ہیں)۔ یعنی قوم لوطؑ کی بستیوں میں۔ کیوں فرمایا؟ حالانکہ قوم لوطؑ کی بستیاں تو موجود ہی نہیں ہیں ان میں نشانیوں کا کیا تذکرہ؟۔

جوابِ اوّل: فیها من ضمیر کا مرجع وہ سرزمین ہے نہ کہ قوم لوطؑ کی بستیاں۔

جوابِ ثانی: اگر مرجع قوم لوط کی بستیاں مانا جائے تو پھر فی من کے معنی میں ہے جیسا کہ ویوم نبعث فی کل امة شهیدا اور وارزقوهم فیها وغیرہ میں۔ اس کی تائید سورۃ عنکبوت کی اس آیۃ مبارکہ سے بھی ہوتی ہے جسمیں لفظ من صراحۃً مذکور ہے" وَلَقَدْ تَّرَكْنَا مِنْهَآ اٰیَةً ۢ بَیِّنَةً لِّقَوْمٍ یَّعْقِلُوْنَ "(اور ہم نے اس بستی کے کچھ ظاہر نشان رہنے دیئے ہیں ان لوگوں کے لئے جو عقل رکھتے ہیں)۔ پھر وہ نشانیاں کیا ہیں اس کے متعلق بعض حضرات فرماتے ہیں ... سا برباد گھروں کے اثار ہیں جبکہ بعض حضرات کے نزدیک وہ پتھر ہیں جنہیں اللہ تبارک وتعالیٰ نے باقی رکھا ہوا تھا حتی کہ اس امت کے اول لوگوں نے ان کا مشاہدہ فرمایا۔ بعض حضرات کے نزدیک اس سے مراد سیاہ چشمے کا پانی ہے جو زمین سے نکلے گا۔

سوال: اللہ تبارک وتعالیٰ نے" وَمِنْ كُلِّ شَیْءٍ خَلَقْنَا زَوْجَیْنِ "(اور ہم نے ہر چیز کو دو دو قسم کا بنایا) کیوں فرمایا حالانکہ عرش وکرسی اور لوح وقلم وغیرہ بہت سی چیزیں ایسی ہیں جنکا جوڑا نہیں پیدا

کیا گیا؟

جواب: اس کا مطلب ہے کہ ہر حیوان میں مذکر و مؤنث پیدا کیا گیا' جبکہ بعض حضرات نے اس کا یہ مطلب بیان کیا ہے کہ جو چیزیں انسانی مشاہدات میں ہیں اس کی دو صفیں پیدا کی گئی ہیں مثلاً' دن رات' سردی گرمی' روشنی تاریکی' خیر و شر' زندگی موت' بر و بحر' زمین و آسمان اور چاند سورج وغیرہ۔

سوال: اللہ تبارک وتعالیٰ نے کہیں ارشاد فرمایا' ففروا الی اللہ '' (تو تم اللہ ہی کی طرف دوڑو) اور کہیں فرمایا'' ویحذرکم اللہ نفسہ '' (اور اللہ تعالیٰ تم کو اپنی ذات سے ڈراتا ہے) یہ تو صریح تعارض ہے؟

جواب: ففروا الی اللہ کا مطلب ہے کہ توبہ کے ذریعے اسی کی پناہ میں آجاؤ' اور بعض حضرات کے نزدیک اللہ کی پکڑ سے اس کی رحمت کی طرف بھاگو' اور ویحذرکم اللہ نفسہ کا مطلب ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے عذاب اور اپنی پکڑ سے ڈراتے ہیں۔

امام زجاجؒ کے نزدیک نفسہ کا مطلب ایاہ ہے یعنی اللہ تبارک وتعالیٰ خود ہی سے ڈراتے ہیں جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے یریدون وجھہ بمعنی ایاہ۔ اس تفصیل سے واضح ہو گیا کہ دونوں آیتوں میں کچھ تناقض نہیں۔

سوال: ارشادِ باری تعالیٰ ہے'' وما خلقت الجن والانس الا لیعبدون '' (اور میں نے جن اور انسان کو اسی واسطے پیدا کیا کہ میری عبادت کیا کریں) اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے جن وانس کو اس ارادہ سے پیدا فرمایا کہ وہ اس کی عبادت کریں۔ اللہ تبارک وتعالیٰ کا یہ کیسا ارادہ ہے جسے جن وانس پورا نہیں کرتے؟

جوابِ اوّل: آیۃ مبارکہ میں اگرچہ جن وانس کو عام ذکر کیا گیا لیکن اس سے مراد خاص ہے یعنی مؤمنین اس آیۃ مبارکہ کے عموم میں سے بعض اللہ تبارک وتعالیٰ کے اس ارشاد کی وجہ سے نکل جائیں گے۔'' ولقد ذرأنا لجھنم کثیرا من الجن والانس '' (اور ہم نے ایسے بہت سے جن اور انسان دوزخ کے لئے پیدا کئے ہیں) جس مخلوق کو اللہ تبارک وتعالیٰ نے جہنم کے لئے پیدا فرمایا ہو اسے عبادت کے لئے پیدا نہیں فرمایا۔

جوابِ ثانی: یہ آیتِ مبارکہ اپنے عموم پر ہے اور عبادت سے مراد توحید ہے اور یوم میثاق میں ہر ایک نے توحید کا اقرار کیا تھا لیکن یہ جواب صرف انسانوں کے ساتھ مختص ہے کیونکہ میثاق بھی صرف انسانوں سے لیا گیا تھا۔

جوابِ ثالث: الا لیعبدون کا مطلب ہے کہ وہ میرے فرمانبردار بن جائیں۔

جوابِ رابع: مطلب ہے کہ وہ میرے احکامات مانیں اور جو حکم دوں اس سے سرتابی نہ کریں۔
جوابِ خامس: مطلب۔ہے کہ اگر وہ عبادت کو اختیار کریں تو لِیَعْبُلُوْنَ۔
جوابِ سادس: اس عبادت سے مراد وہ عبادت ہے جو "وَلِلّٰہِ یَسْجُدُ مَنْ فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ طَوْعًا وَّکَرْھًا" (اور اللہ ہی کے سامنے سب سرخم کئے ہیں اور جتنے زمین میں خوشی سے اور مجبوری سے) میں مراد ہے۔
سوال: "مَآ اُرِیْدُ مِنْھُمْ مِّنْ رِّزْقٍ" (میں ان سے رزق رسانی کی درخواست نہیں کرتا) کے بعد "وَمَآ اُرِیْدُ اَنْ یُّطْعِمُوْنِ" (اور یہ کہ وہ مجھ کو کھلایا کریں) کے ذکر کی ضرورت تھی؟
جواب: مَآ اُرِیْدُ مِنْھُمْ مِّنْ رِّزْقٍ یعنی اپنے لئے اور مَآ اُرِیْدُ اَنْ یُّطْعِمُوْنَ یعنی اپنے غلاموں کے لئے۔ اطعام کی نسبت اللہ تبارک وتعالیٰ نے اپنی ذات مقدس کی طرف فرمائی' کیونکہ مخلوق اللہ تعالیٰ کے عیال ہیں۔ جو کسی کے عیال کو کھلاتا ہے وہ گویا خود اسی کو کھلاتا ہے' اس کی تائید اس حدیث مبارک سے بھی ہوتی ہے کہ "اللہ تبارک وتعالیٰ قیامت کے دن ارشاد فرمائیں گے' اے انسان! میں نے تجھ سے کھانا مانگا تو نے مجھے کھانا نہیں کھلایا" یعنی میرے بندوں نے تجھ سے کھانا طلب کیا تو تو نے انہیں کھانا نہیں کھلایا۔

# سورۃ الطّور

سوال: اللہ تبارک وتعالیٰ نے "وَزَوَّجْنٰھُمْ بِحُوْرٍ عِیْنٍ" (اور ہم ان کا گوری گوری بڑی بڑی آنکھوں والیوں سے بیاہ کردیں گے) کیوں فرمایا؟ حالانکہ وہ تو جنت میں ہماری باندیاں ہونگی نہ کہ بیویاں؟
جواب: مطلب ہے کہ ہم اہل جنت کو ان کے ساتھ ملادیں گے یعنی آیت میں لفظ زوج ملانے کے معنی میں ہے نہ کہ نکاح کے معنی میں۔ کیونکہ اگر یہ عقد نکاح کے معنی میں ہوتا تو پھر اس کا صلہ باء استعمال نہ ہوتا جیسے کہ ارشاد باری تعالیٰ زوجنکھا میں بغیر باء کے لفظ زوج کو استعمال کیا گیا۔
سوال: اللہ تبارک وتعالیٰ نے اہل جنت کے متعلق "کُلُّ امْرِیٍٔ بِمَا کَسَبَ رَھِیْنٌ" (ہر شخص اپنے اعمال میں محبوس رہے گا) یعنی اپنے عمل کے بدلے میں جہنم میں رہن رکھا ہوا ہے کیسے فرمایا؟
جواب: امام زمخشریؒ فرماتے ہیں جیسے کہ انسان اپنے قرض کے بدلے میں اپنے غلام وغیرہ کو رہن رکھ دیتا ہے اس طرح گویا کہ ہر نفس عمل صالح کے بدلے میں اللہ تبارک وتعالیٰ کے ہاں

رہن رکھا ہوا ہے کہ اگر نیک عمل کرے گا تو اس کی خلاصی ہو جائیگی وگرنہ نہیں۔ جبکہ دیگر حضرات اس کا یہ جواب دیتے ہیں کہ یہ جہنمیوں کے بارہ میں ہے جو جملہ معترضہ کے طور پر درمیان میں آ گیا۔ اس کی تائید حضرت مقاتلؒ کی اس روایت سے بھی ہوتی ہے کہ انہوں نے فرمایا اس کا معنی یہ ہے کہ ہر کافر اپنے کفریہ اعمال کے سبب جہنم میں رہن رکھا ہوا ہو اور مؤمن رہن نہیں ہو گا۔

ارشاد باری تعالیٰ ہے" كُلُّ نَفْسٍ بِمَا كَسَبَتْ رَهِينَةٌ اِلَّا اَصْحٰبَ الْيَمِيْنِ فِيْ جَنّٰتٍ "(ہر شخص اپنے اعمال کے بدلہ محبوس ہو گا مگر داہنے والے بہشتوں میں ہوں گے)۔

سوال: اللہ تبارک وتعالیٰ نے آنحضرتؐ کے متعلق یہ کیسے ارشاد فرمایا" فَمَآ اَنْتَ بِنِعْمَةِ رَبِّكَ بِكَاهِنٍ وَّلَا مَجْنُوْنٍ "( کیوں کہ آپ بفضلہٖ تعالیٰ نہ تو کاہن ہیں اور نہ مجنون ہیں) حالانکہ دیگر افراد بھی اللہ کی نعمت کے سبب ہی جنون اور کہانت سے محفوظ ہیں؟

جواب: مطلب یہ ہے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ کی نعمتِ نبوت کے سبب آپ کاہن یا مجنون نہیں ہیں جیسے کہ کفار کہتے ہیں۔ جبکہ بعض حضرات اس کا یہ جواب دیتے ہیں کہ اس آیۃ مبارکہ میں با مع کے معنی میں ہے جیسے کہ تَنْۢبُتُ بِالدُّهْنِ اور "فَتَسْتَجِيْبُوْنَ بِحَمْدِهٖ" وغیرہ ہیں۔

سوال: اللہ تبارک وتعالیٰ نے" فَاِنَّكَ بِاَعْيُنِنَا "( کہ آپ ہماری حفاظت میں ہیں) میں جمع کی ضمیر کیوں استعمال فرمائی؟۔

جواب: تعظیم شان کے لئے جمع کی ضمیر استعمال فرمائی۔ مطلب یہ ہے کہ جب ہم آپ کو دیکھ رہے ہیں تو آپ کی حفاظت بھی فرمائیں گے۔ اللہ تبارک وتعالیٰ نے واحد کی ضمیر بھی استعمال فرمائی ہے جیسے کہ ارشاد ہے" وَلِتُصْنَعَ عَلٰى عَيْنِيْ "(اور تاکہ تو میری نگرانی میں پرورش پاؤ) اور تفخیم شان اور عظمت کے لئے جمع کی ضمیر بھی استعمال فرمائی ارشادِ باری تعالیٰ ہے۔" تَجْرِيْ بِاَعْيُنِنَا "(ہماری نگرانی میں رواں تھی) اور" اَوَلَمْ يَرَوْا اَنَّا خَلَقْنَا لَهُمْ مِّمَّا عَمِلَتْ اَيْدِيْنَآ اَنْعَامًا "( کیا ان لوگوں نے اس پر نظر نہیں کی کہ ہم نے ان کے لئے اپنے ہاتھوں کی ساختہ چیزوں میں سے مواشی پیدا کیے)۔

## سورۃ النجم

سوال: جب ضلال اور غوایت کا ایک ہی معنی ہے تو پھر" مَا ضَلَّ صَاحِبُكُمْ وَمَا غَوٰى "(یہ تمہارے ساتھ کے رہنے والے نہ راہ سے بھٹکے)؟ میں ان دونوں الفاظ کو جمع کرنے کی کیا ضرورت تھی؟۔

جواب: ان میں خفیف سا فرق ہے ضلالت ہدایت کی ضد اور غی رشد کی ضد ہے۔ اور ان دونوں کے معنی قریب قریب ہونے کے باوجود الگ الگ ہیں۔ جبکہ بعض حضرات کے نزدیک ضلالت قول میں اور غی فعل میں ہوتی ہے۔ اور اگر ان دونوں کا معنی ایک بھی مان لیا جائے تو بھی الفاظ مختلف ہونے کے سبب تاکید مراد لی جاسکتی ہے۔

سوال: اللہ تبارک وتعالیٰ نے " فَكَانَ قَابَ قَوْسَيْنِ اَوْاَدْنٰى " (پھر اور نزدیک آیا سو دو کمانوں کے برابر فاصلہ رہ گیا بلکہ اور بھی کم) میں کلمۂ شک (اَو) کیوں استعمال فرمایا حالانکہ اللہ تبارک و تعالیٰ سے شک کا احتمال ممکن ہی نہیں؟

جواب: اَوْ تاخیر کے لئے ہے نہ کہ شک کے لئے یعنی یا تو تم قاب قوسین کا قرب حاصل کرلو یا اس سے بھی زیادہ قریب ہو جاؤ۔ بعض حضرات نے اَوْ کا معنی بل بیان فرمایا ہے جبکہ بعض حضرات کے نزدیک اللہ تبارک وتعالیٰ نے یہ جملہ کفار کو شک میں ڈالنے کے لئے بیان فرمایا تاکہ انہیں اس قرب کے متعلق معلوم نہ ہوسکے۔ یہی سوال جواب " وَاَرْسَلْنٰهُ اِلٰى مِاَةِ اَلْفٍ اَوْيَزِيْدُوْنَ " (اور ہم نے ان کو ایک لاکھ یا اس سے زیادہ آدمیوں کی طرف پیغمبر بنا کر بھیجا تھا) میں بھی وارد ہوتے ہیں۔

سوال: " اَفَرَاَيْتُمُ اللّٰتَ وَالْعُزّٰى وَمَنٰوةَ الثَّالِثَةَ الْاُخْرٰى " (بھلا تم نے لات اور عزیٰ اور ایک تیسرے منات کے حال میں غور بھی کیا ہے) میں مستعمل فعل رویۃ افعال قلوب میں سے ہے نہ کہ رویت بصر میں سے لہٰذا اس کا مفعول ثانی کدھر ہے؟

جواب: محذوف ہے۔ تقدیر عبارت اس طرح ہے کہ کیا تم ملائکہ اور بتوں کو اللہ تبارک وتعالیٰ کی بیٹیاں سمجھتے ہو؟ کیونکہ مشرکین ایسے ہی سمجھتے تھے۔

سوال: اللہ تبارک وتعالیٰ نے الثالثة الاخرى میں اخری کو ثالثه کی صفت بنایا ہے۔ اخری ثانیه کی تو صفت ہوسکتا ہے ثالثه کی صفت نہیں ہوسکتا۔ اگر ہم اسے ثالثه کی صفت مانیں تو اس کا مطلب ہے کہ ثالثه اولی بھی موجود ہے جسکے بعد ثالثه اخری آیا ہے۔ تو ثالثه اولی کہاں ہے؟ کیا اس جگہ دو ثالثه موجود ہیں؟۔

جواب: الاخری العزة کی صفت ہے۔ تقدیر عبارت ہے " اَرَاَيْتُمُ اللّٰتَ وَالْعُزّٰى وَمَنٰوةَ الثَّالِثَةَ الْاُخْرٰى " باقی اخری کو رعایتِ فواصل کی وجہ سے مؤخر کیا گیا۔ جیسے کہ ولی فیها مآرب اخری میں رعایتِ فواصل کے سبب اخری کہا گیا ہے ورنہ اخر کہا جاتا۔

سوال: اللہ تبارک وتعالیٰ نے " وَاِنَّ الظَّنَّ لَا يُغْنِىْ مِنَ الْحَقِّ شَيْـًٔا " (اور یقیناً بے اصل خیالات امر حق میں ذرا بھی مفید نہیں ہوتے) یعنی ظن علم کے قائم مقام نہیں ہوسکتا کیوں فرمایا؟

حالانکہ صورت قیاس میں یہ علم کے قائم مقام ہو جاتا ہے؟
جواب: یہاں وہ ظن مراد ہے جو خواہشات کی اتباع کی وجہ سے ہوتا ہے نہ کہ وہ ظن جو نظر واستدلال سے حاصل ہوتا ہے۔ "اِنْ یَّتَّبِعُوْنَ اِلَّا الظَّنَّ" (اور یہ لوگ صرف بے اصل خیالات پر چلتے ہیں) سے بھی اسی کی تائید ہوتی ہے۔
سوال: اللہ تبارک وتعالیٰ نے "وَاَنْ لَّیْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰی" (اور یہ کہ انسان کو صرف اپنی ہی کمائی ملے گی) کیوں فرمایا؟ حالانکہ صدقہ، حج اور قراءت قرآن وغیرہ کا ایصال ثواب صحیح احادیث میں وارد ہے؟
جوابِ اوّل: حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں کہ یہ آیہ مبارکہ اس آیت کی وجہ سے منسوخ الحکم ہے "وَاتَّبَعَتْهُمْ ذُرِّیَّتُهُمْ بِاِیْمَانٍ اَلْحَقْنَا بِهِمْ ذُرِّیَّتَهُمْ" (اور ان کی اولاد نے بھی ایمان میں ان کا ساتھ دیا، ہم ان کی اولاد کو ان کے ساتھ شامل کر دیں گے) کیونکہ اس کا مطلب ہے کہ بیٹے باپ کی نیکی کی وجہ سے جنت میں داخل ہو جائیں گے۔ لیکن دیگر حضرات فرماتے ہیں کہ یہ قول صحیح نہیں کیونکہ دونوں آیتیں خبر ہیں اور خبر منسوخ نہیں ہو سکتی۔
جوابِ ثانی: یہ حکم قوم ابراہیم وموسیٰ کے ساتھ خاص تھا جو ان کے صحف میں مذکور تھا لیکن اس امت کو اپنی نیکی کا اور جو نیکی اس کے لئے کی جاتی ہے دونوں کا ثواب ملتا ہے۔
جوابِ ثالث: اگر دونوں آیات کو اپنے ظاہر پر مانیں تو بھی صحیح ہے کیونکہ اولاد اور دوستوں وغیرہ کی نیکیوں کا ثواب جو ملتا ہے اس میں بھی تو اس کی سعی کو دخل ہے کیونکہ اس نے رشتہ داری، دوستی اور حب فی اللہ کو قائم رکھا جس نے انہیں ایصالِ ثواب پر ابھارا۔
سوال: اللہ تبارک وتعالیٰ نے اپنے عذاب کے تذکرے کے بعد "فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّکَ تَتَمَارٰی" (سو تو اپنے رب کو نظر کی کون کونسی نعمت میں شک کرتا رہے گا) کیوں فرمایا؟۔
جواب: چونکہ عذاب سے ڈرانا بھی اللہ تبارک وتعالیٰ کی ایک نعمت ہے۔ اس لئے اللہ تبارک و تعالیٰ نے اس کے بعد فرمایا کہ اے والید بن مغیرہ تم اپنے رب کی کن کن نعمتوں کو جو اس کی وحدانیت پر دلالت کرتی ہیں جھٹلاؤ گے۔

## سورۃ القمر

سوال: اللہ تبارک وتعالیٰ نے "کَذَّبَتْ قَبْلَهُمْ قَوْمُ نُوْحٍ فَکَذَّبُوْا عَبْدَنَا" (ان لوگوں سے پہلے قوم نوح نے تکذیب کی یعنی ہمارے بندے کی تکذیب کی) میں تکذیب کا اعادہ کیوں فرمایا؟ صرف

انتاقی فرماد ہے کذبت قبلھم قوم نوح عبدنا۔
جواب: اس کا معنی ہے کہ انہوں نے تکذیب پر تکذیب کی۔ بعض حضرات فرماتے ہیں کہ پہلی تکذیب سے تکذیب توحید اور دوسری سے تکذیب رسالت مراد ہے۔ جبکہ بعض حضرات کے نزدیک پہلی تکذیب سے تکذیب اللہ اور ثانی سے تکذیب الرسول مراد ہے۔
سوال: اللہ تبارک وتعالیٰ نے زمین وآسمان دونوں کے پانیوں کے لئے واحد کا لفظ استعمال فرمایا" فَالْتَقَى الْمَاءُ " (پھر پانی اس کام کے لئے مل گیا)
جواب: اس سے جنسِ ماء مراد ہے۔
سوال: جزاء تو کافر کے لئے ہوتی ہے نہ کہ مکفور کے لئے تو پھر اللہ تبارک وتعالیٰ نے " جَزَاءً لِّمَنْ كَانَ كُفِرَ " (یہ سب کچھ اس شخص کا بدلہ لینے کے لئے کیا) کیوں ارشاد فرمایا؟
جوابِ اوّل: جزاءً مفعول لہ ہے۔ مطلب ہے کہ ہم نے آسمان کے دروازے کھول کر انہیں عذاب میں مبتلاء کر دیا تا کہ انہیں اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے جزاء مل سکے کیونکہ انہوں نے اللہ تبارک وتعالیٰ کی تکفیر کی ہے۔ مفعول سے حرف جار کو حذف کر دیا گیا جیسے کہ واختار موسی قومہ میں جزاء بھی دیگر تمام مصادر کی طرف اپنے فاعل یا مفعول دونوں کی طرف مضاف ہوسکتا ہے۔
جوابِ ثانی: مکفور حضرت نوحؑ ہیں یا تو اس لئے کہ انکی حقیقی تکفیر کی گئی یعنی ان پر ایمان نہیں لایا گیا اور یا پھر اس لئے کہ آپؑ اللہ تبارک وتعالیٰ کی ایک نعمت ہیں ارشادِ باری تعالیٰ ہے:" وَمَا اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ " (اور ہم نے آپ کو اس طرح نہیں بھیجا مگر دنیا جہاں کے لوگوں پر مہربانی کرنے کے لئے) ایک بار ایک آدمی نے خلیفہ ہارون الرشید سے کہا الحمد للہ علیک (میں تجھ جیسی نعمت پر اللہ کی تعریف کرتا ہوں) ہارون الرشید کہنے لگے کہ کیا مطلب؟ وہ کہنے لگا کہ آپ ایک نعمت خداوندی ہیں اور میں اس پر اللہ تبارک وتعالیٰ کا شکر ادا کر رہا ہوں۔ یا پھر حضرت نوحؑ کی تکفیر سے یہ مراد لیا جائے کہ آپؑ اللہ تبارک وتعالیٰ کی نعمت ہیں اور کبھی اللہ تبارک وتعالیٰ کفران نعمت کو اپنی تکفیر پر بھی محمول فرماتے ہیں۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے ولاتکفرون (   )۔
جوابِ ثالث: "من" "ما" کے معنی میں ہے۔ اس کا معنی ہے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ کی جن عمومی نعمتوں کی تم نے تکفیر کی ہے یہ اس کی جزاء ہے۔ حضرت قتادہؒ نے کفر با لفتح پڑھا ہے جس کا ترجمہ ہے کہ یہ کافروں کی جزاء ہے۔
سوال: اللہ تبارک وتعالیٰ نے " اَعْجَازُ نَخْلٍ مُّنْقَعِرٍ " (وہ اکھڑی ہوئی کھجوروں کے تنے

ہیں) کیوں فرمایا منقعرہ کیوں نہیں فرمایا؟۔
جواب اوّل: لفظ نخل لفظی اعتبار سے منکر ہے کیونکہ اس میں کوئی علامت تانیث نہیں ہے۔ اسی لئے لفظی اعتبار سے اس کی صفت مذکر استعمال کی گئی۔ البتہ یہ معنوی طور پر مؤنث ہے اسی لئے قرآن مقدس میں ایک اور جگہ معنوی اعتبار سے اس کی صفت مؤنث ذکر کی گئی ہے''اَعۡجَازُ نَخۡلٍ خَاوِيَةٍ'' (گویا وہ گری ہوئی کھجوروں کے تنے ہیں) ان دونوں کی اجتماعی نظیر اس آیہ مبارکہ میں موجود ہے۔'' لَاٰكِلُوۡنَ مِنۡ شَجَرٍ مِّنۡ زَقُّوۡمٍ فَمَالِئُوۡنَ مِنۡهَا الۡبُطُوۡنَ فَشَارِبُوۡنَ عَلَيۡهِ مِنَ الۡحَمِيۡمِ'' (پھر اس سے پیٹ بھرنا ہوگا پھر اس پر کھولتا ہوا پانی پینا ہوگا) حضرت ابوعبیدہؓ فرماتے ہیں کہ لفظ نخل کبھی مذکر استعمال ہوتا ہے اور کبھی مؤنث۔ قرآن کریم نے دونوں لغات کو جمع فرمادیا۔
جوابِ ثانی: صفت کو رعایت فواصل کے سبب مذکر استعمال کیا گیا۔

## سورۃ الرحمٰن

سوال: رفع السماء اور وضع میزان میں کیا مناسبت ہے؟ کہ ان دونوں کو اکٹھا ذکر فرمایا؟
جواب: اس سورۃ مبارکہ میں اللہ تبارک وتعالیٰ بندوں پر اپنی نعمتیں بیان فرمارہے ہیں۔ انہیں نعمتوں میں سے ایک نعمت وضع میزان ہے جس کے ذریعے نظام عالم قائم ہے۔ بالخصوص اگر میزان سے میزان عدل مراد لیا جائے جیسا کہ اکثر مفسرین کی رائے ہے جبکہ ایک قول میں اس سے قرآن کریم اور ایک قول میں ہر وہ چیز مراد ہے جس کے ذریعے پیمائش کی جاسکے۔ مثلاً ترازو اور گز وغیرہ۔
سوال: '' اَلَّا تَطۡغَوۡا فِي الۡمِيۡزَانِ'' (تاکہ تم تولنے میں کمی بیشی نہ کرو) سے معلوم ہوگیا کہ عدل سے تجاوز نہیں کرنا تو پھر اس کے بعد'' وَاَقِيۡمُوا الۡوَزۡنَ بِالۡقِسۡطِ وَلَا تُخۡسِرُوا الۡمِيۡزَانَ'' (اور انصاف کے ساتھ وزن کو ٹھیک رکھو اور تول کو گھٹاؤ مت) ذکر کرنے کی کیا ضرورت تھی؟۔
جواب: طغیان سے مراد ہوتا ہے زیادہ چیز یا زیادہ دام لینا اور اخسار کا مطلب ہوتا ہے کم چیز دینا۔ ان دونوں سے بچنے کے لئے درمیانی راہ اختیار کی جائیگی اور وہ ہے اقامۃ الوزن بالقسط۔
سوال: اللہ تبارک وتعالیٰ نے یہاں ارشاد فرمایا'' خَلَقَ الۡاِنۡسَانَ مِنۡ صَلۡصَالٍ كَالۡفَخَّارِ'' (اسی نے انسان کو ایسی مٹی سے جو ٹھیکرے کی طرح بجتی تھی پیدا کیا) اور ایک جگہ فرمایا''من طین لازب'' نیز ایک اور جگہ ارشاد ہے من تراب یہ تعارض کیسے رفع ہوگا؟

جواب: ان آیات میں کوئی تعارض نہیں کہ کیونکہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے ہمیں مٹی سے پیدا فرمایا پھر ان مٹی کو گارا بنایا پھر اسے سڑا ہوا اور کھنکھناتا ہوا بنایا۔ ہر آیت سے ایک الگ تدریجی مرحلے کی طرف اشارہ ہے۔

سوال: اللہ تبارک وتعالیٰ نے رَبُّ الْمَشْرِقَيْنِ وَرَبُّ الْمَغْرِبَيْنِ میں لفظ رب کو مکرر کیوں ارشاد فرمایا جبکہ سورۃ المعارج "فَلَآ اُقْسِمُ بِرَبِّ الْمَشَارِقِ وَالْمَغَارِبِ" اور سورۃ المزمل "رَبُّ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ" میں لفظ رب کو صرف ایک بار ذکر فرمایا۔

جواب: یہاں لفظ رب کو تاکید کے لئے مکرر ذکر فرمایا گیا کیونکہ اس جگہ تاکید کی ضرورت اس وجہ سے ہے کہ یہاں نعمتوں اور احسانات کا تذکرہ ہو رہا ہے اور یا پھر اس لئے کہ یہاں دو جنسوں یعنی انسان و جنات کو خطاب ہے لہٰذا لفظ رب کو بھی دو بار ذکر فرمایا گیا۔

سوال: اس سورۃ میں بعض ایسے جملے بھی ہیں جن میں نعمت کا تذکرہ نہیں جیسے "كُلُّ مَنْ عَلَيْهَا فَانٍ" (جیسے روئے زمین پر موجود ہیں سب فنا ہو جاویں گے) اور "يُرْسَلُ عَلَيْكُمَا شُوَاظٌ مِّنْ نَّارٍ وَّ نُحَاسٌ فَلَا تَنْتَصِرَانِ" (تم دونوں پر آگ کا شعلہ اور دھواں چھوڑا جاوے گا پھر تم ہٹا نہ سکو گے) ایسے جملوں کے بعد احسان جتانے کا کیا مطلب ہے؟ کہ ایسے جملوں کے بعد بھی فرمایا گیا "فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ" (سوائے جن وانس تم اپنے رب کی کون کون سی نعمتوں کے منکر ہو جاؤ گے۔

جواب: دفع بلاء اور تاخیر عذاب بھی اللہ تبارک وتعالیٰ کی ایک نعمت ہے جسے فناء کے لئے پیدا کیا گیا ہو اسے باقی رکھنا نعمت ہی تو ہے۔ لہٰذا ایسے جملوں کے بعد احسان جتانا یقیناً صحیح ہے۔

سوال: اللہ تبارک وتعالیٰ نے "سَنَفْرُغُ لَكُمْ اَيُّهَا الثَّقَلٰنِ" (اے جن وانس ہم عنقریب تمہارے لئے خالی ہو جائے جاتے ہیں) کیسے فرمایا: حالانکہ اللہ تبارک وتعالیٰ کو کوئی بھی شغل مصروف نہیں رکھ سکتا۔

جواب: امام زجاجؒ فرماتے ہیں لفظ فراغ کے "معنی ہیں (۱) مصروفیت سے فارغ ہونا (۲) کسی چیز کا ارادہ کرنا اور اس کی طرف متوجہ ہونا۔ یہ دوسرا معنی تہدید و تخویف کے لئے استعمال ہوتا ہے۔ جیسے کہ کہا جاتا ہے سا تفرغ لفلان۔ تو آیت کا بھی یہی معنی ہے کہ ہم تمہارے حساب و عذاب کی طرف متوجہ ہونگے۔

سوال: اللہ تبارک وتعالیٰ نے خود سے ڈرنے والے کے لئے صرف دو باغات کا ارادہ کیوں فرمایا؟۔

جواب: چونکہ خطاب جن وانس دو کو تھا تو مطلب یہ ہے کہ ایک باغ انسان خائف کو اور ایک باغ جن خائف کو دیا جائیگا۔ بعض حضرات فرماتے ہیں کہ ہر خائف کو دو باغ دیئے جائیں گے۔ ایک باغ نیکیوں پر عمل پیرا ہونے کے سبب اور ایک باغ گناہوں سے رکنے کے سبب' جبکہ بعض حضرات کے نزدیک اس کا مطلب یہ ہے کہ ایک باغ تو ثواب کے طور پر عطاء اور دوسرا تفضیلاً اور عنایۃً عطاء فرمایا جائیگا۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے "لِلَّذِيْنَ اَحْسَنُوا الْحُسْنٰى وَزِيَادَةٌ" (جن لوگوں نے نیکی کی ہے ان کے واسطے خوبی ہے اور مزید برآن بھی )۔

سوال: اللہ تبارک وتعالیٰ نے "فِيْهِنَّ قٰصِرٰتُ الطَّرْفِ" (ان میں نیچی نگاہ والیاں ہوں گی) میں جمع کی ضمیر ارشاد فرمائی حالانکہ اس کا مرجع جنتان ہے۔

جواب: ضمیر کا مرجع اللہ تبارک وتعالیٰ کی تمام نعمتیں' باغات' چشمے اور فواکہ وغیرہ جو ماقبل میں مذکور ہو چکی ہیں۔ جبکہ بعض حضرات کے نزدیک اس کا مرجع جنتان ہی ہے باقی جمع کی ضمیر اس لئے ذکر کی گئی کیونکہ ان جنتان میں بہت سے محل اور مکانات ہیں ان کی رعایت کے سبب جمع کی ضمیر لائی گئی۔ اور بعض حضرات فرماتے ہیں کہ اس سے مراد جمیع باغات ہیں جن پر جنتان کا لفظ دلالت کرتا ہے۔ بعض حضرات کے نزدیک ضمیر کا مرجع فرش ہے کیونکہ وہی قریب ہے لیکن اس قول پر فی علی کے ترجمہ ہیں۔ جیسا کہ "اَمْ لَهُمْ سُلَّمٌ يَّسْتَمِعُوْنَ فِيْهِ" (کیا ان کے پاس کوئی سیڑھی ہے اس پر باتیں سن لیا کرتے ہیں)۔

سوال: اللہ تبارک وتعالیٰ نے حور کی تعریف میں "لَمْ يَطْمِثْهُنَّ اِنْسٌ قَبْلَهُمْ وَلَا جَآنٌّ" (ان لوگوں سے پہلے ان پر نہ تو کسی آدمی نے تصرف کیا ہوگا اور نہ کسی جن نے) کیوں فرمایا؟ حالانکہ جو دنیاوی خواتین ہیں انہیں بھی جنات نے ہاتھ نہیں لگایا۔

جواب: یعنی وہ قصرات الطرف انسانوں کے لئے انسان اور جنات کے لئے جنات ہونگی۔ کسی انسان کو کسی انسان نے اور کسی جنی کو کسی جن نے ہاتھ نہیں لگایا ہوگا یہ آیت اس بات کی دلیل ہے کہ جن بھی انسانوں کی طرح مشغول ہوتے ہیں۔

## سورۃ الواقعہ

سوال: "وَالسّٰبِقُوْنَ السّٰبِقُوْنَ" میں تکرار کا کیا فائدہ؟۔

جواب اوّل: چونکہ ماقبل میں تاکید مذکور تھی "فَاَصْحٰبُ الْمَيْمَنَةِ مَآ اَصْحٰبُ الْمَيْمَنَةِ وَاَصْحٰبُ الْمَشْئَمَةِ مَآ اَصْحٰبُ الْمَشْئَمَةِ" (سو جو داہنے والے ہیں وہ داہنے والے کیسے

اچھے ہیں اور جو بائیں والے ہیں اور وہ بائیں والے کیسے برے ہیں) لہذا اللہ تبارک وتعالیٰ نے اسے بھی تاکید کے لئے مکرر ارشاد فرمادیا۔ مطلب یہ ہے کہ سابقون تو وہ لوگ ہیں جس کے حالات اور جنکی صفات مشہور ومعروف ہیں۔ جیسا کہ ابوالنجم کہتا ہے انا ابوالنجم وشعری شعری۔

جوابِ ثانی: اس کا معنی ہے کہ اللہ کی اطاعت کی طرف سبقت کرنے والے جنت کی طرف سبقت کرنے والے ہیں۔ بعض حضرات کے نزدیک سابقین سے ہر امت میں کے ایمان کی طرف سبقت کرنے والے مراد ہیں اور بعض کے نزدیک وہ مراد ہیں جنہوں نے دو قبلوں کی طرف نماز پڑھی۔ بعض کے نزدیک اہل قرآن، بعض کے نزدیک مساجد کی طرف سبقت کرنے والے اور جہاد فی سبیل اللہ کے لئے جانے والے مراد ہیں، جبکہ بعض حضرات فرماتے ہیں کہ وہ اس سے حضرات انبیاء کرام علیہم الصلواۃ والسلام مراد ہیں۔

سوال: اللہ تبارک وتعالیٰ نے ''یَطُوفُونَ عَلَیۡهِمۡ وِلۡدَانٌ مُّخَلَّدُونَ'' (اوران کے پاس ایسے لڑکے آمدورفت کریں گے جو ہمیشہ لڑکے ہی رہیں گے) کیوں فرمایا؟ حالانکہ مخلدون صرف ولدان نہیں ہونگے بلکہ جتنے بھی جنتی ہیں سبھی مخلدون ہونگے۔ نہ کبھی بڑھاپا آئیگا اور نہ ہی کوئی غم ہوگا بلکہ ہر ایک اپنی اسی حالت پر باقی رہے گا جس پر وہ جنت میں داخل ہوا تھا۔

جواب: مطلب یہ ہے کہ ان کا بچپنا کبھی تبدیل نہیں ہوگا۔

سوال: اللہ تبارک وتعالیٰ نے ''لَاٰكِلُونَ مِنۡ شَجَرٍ مِّنۡ زَقُّومٍ فَمَالِـُٔونَ مِنۡهَا الۡبُطُونَ فَشَارِبُونَ عَلَیۡهِ مِنَ الۡحَمِیۡمِ'' میں پہلے شجر کے لئے مؤنث ضمیر ذکر فرمائی اور پھر مذکر اس کی کیا وجہ ہے؟۔

جواب: اس کا جواب سورۃ القمر میں گذر چکا ہے۔

سوال: اللہ تبارک وتعالیٰ نے ''نَحۡنُ خَلَقۡنٰكُمۡ فَلَوۡلَا تُصَدِّقُونَ'' کیوں فرمایا؟ حالانکہ کفار تو اس بات کو تسلیم کرتے تھے کہ ان کا خالق اللہ ہے بدلیل قولہ تعالیٰ ''وَلَئِنۡ سَاَلۡتَهُمۡ مَّنۡ خَلَقَهُمۡ لَیَقُولُنَّ اللّٰهُ''

جوابِ اوّل: زبان سے تو اقرار کرتے تھے لیکن ان کا عمل اس کے خلاف تھا۔ یعنی عملاً تصدیق نہیں کرتے تھے۔

جوابِ ثانی: بعث بعد الموت کی تصدیق مراد ہے۔ یعنی جس اللہ تبارک وتعالیٰ نے تمہیں پہلے پیدا فرمایا وہی تمہیں دوبارہ پیدا فرمائے گا تم اس کی تصدیق کیوں نہیں کرتے؟

سوال: اللہ تبارک وتعالیٰ نے زراعت کے متعلق ''لَوۡ نَشَآءُ لَجَعَلۡنٰهُ حُطٰمًا'' اور پانی کے

متعلق "لَوْ نَشَآءُ جَعَلْنٰهُ اُجَاجًا" بغیر اللام ارشاد فرمایا۔ اسکی وجہ؟۔
جوابِ اوّل: اصل تو یہی ہے کہ دونوں جگہ لام ذکر کیا جائے۔ اس لئے کہ "لَوْ" کے جواب پر لام ضرور داخل ہوتا ہے۔ لیکن دوسرے کلمہ سے اختصارًا لام حذف کر دیا گیا کیونکہ پہلا کلمہ اس پر دلالت کر رہا ہے۔
جوابِ ثانی: یہ لام تاکید ہے جو مطعوم کے ساتھ تو مذکور ہے، لیکن مشروب کے ساتھ مذکور نہیں۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ مطعوم ہر اعتبار سے وجودًا اور رتبۃً مقدم ہوتا ہے کیونکہ پانی کی ضرورت کھانے کے تابع ہو کر ہی ہوتی ہے اسی لئے مطعوم کو مشروب پر مقدم کیا گیا اور فقد مطعوم کو بڑی شدت کے ساتھ ذکر کیا گیا بایں طور کہ اس کے شروع میں لام تاکید کو ذکر فرمایا۔
سوال: تسبیح کا مطلب ہے کہ کسی کے متعلق یہ بیان کرنا کہ وہ فلاں برائی ونقص سے پاک ہے تو اللہ تبارک وتعالیٰ نے فَسَبِّحْ بِاسْمِ رَبِّکَ الْعَظِیْمِ (اپنے ربِ عظیم کے نام کی تسبیح کرو) لفظ اسم کو کیوں ذکر فرمایا؟
جوابِ اوّل: باء زائد ہے اور اسم ذات کے معنی میں ہے۔
جوابِ ثانی: اسم ذکر کے معنی میں ہے معنی ہے کہ اپنے رب کے ذکر کی تسبیح کیجئے۔
جوابِ ثالث: اسم سے پہلے لفظ ذکر مضمر ہے مطلب ہے کہ اپنے رب کے نام کے ذکر کی تسبیح کیجئے۔
جوابِ رابع: امام ضحاکؒ فرماتے ہیں کہ فسبح کا معنی ہے. فصل، یعنی نماز اپنے رب کے نام کے ساتھ پڑھیے اور تکبیر تحریمہ سے افتتاح کیجئے۔
سوال: جب قرآن کریم اللہ تبارک وتعالیٰ کی صفت قدیم اور قائم بذاتہ المقدسہ ہے تو پھر اللہ تبارک وتعالیٰ نے یہ کیسے فرمایا "اِنَّهٗ لَقُرْاٰنٌ کَرِیْمٌ فِیْ کِتٰبٍ مَّکْنُوْنٍ" یعنی وہ لوح محفوظ یا مصحف میں ہے۔
جوابِ اوّل: مطلب یہ ہے کہ کتاب مکنون میں لکھی ہوئی ہے۔ کسی کتاب میں قرآن کریم کو لکھنے سے یہ لازم نہیں آتا کہ قرآن کریم اس کتاب میں حلول شدہ ہے۔ جیسے اگر کسی انسان کے ہاتھ پر لفظ ہزار دینار لکھ دیا جائے تو اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ اس کے ہاتھ میں واقعۃً ہزار دینار آجائیں۔ جیسے کہ آنحضرتؐ کی تعریف میں ارشادِ باری تعالیٰ ہے۔ "یَجِدُوْنَهٗ مَکْتُوْبًا عِنْدَهُمْ فِی التَّوْرٰةِ وَالْاِنْجِیْلِ"
جوابِ ثانی: اگر قرآن کریم مصحف میں حلول شدہ ہوتا تو پھر یا تو سارے کا سارا ایک ہی مصحف

میں ہوتا یا پھر تمام مصاحف میں ہوتا اور یا پھر بعض مصاحف میں ہوتا۔ پہلی بات بھی صحیح نہیں کیونکہ تمام مصاحف کتابت اور حکم میں ایک جیسے ہیں اور اس لئے کہ ایک کو دوسرے پر فوقیت نہیں دی جاسکتی۔ دوسری بات بھی صحیح نہیں وگرنہ اسے تسلیم کرنے سے تعدد قرآن لازم آئیگا۔ حالانکہ وہ ایک ہی ہے۔ تیسری بات بھی صحیح نہیں اس لئے کہ وہ سارے کا سارا ہر مصحف میں موجود ہے۔ لہٰذا یہ بات ثابت ہوگئی کہ قرآن کریم کسی بھی مصحف میں حلول شدہ نہیں بلکہ قرآن کریم تو کلام اللہ تعالیٰ ہے اور اس کی صفت قدیم ہے جو اس سے جدا نہیں ہوسکتی۔

سوال: جب قرآن کریم اللہ تبارک وتعالیٰ سے جدا نہیں ہوسکتا تو پھر اللہ تبارک وتعالیٰ نے اس کی تنزیل کے متعلق جو ارشاد فرمایا ہے "نَزَلَ بِهِ الرُّوْحُ الْاَمِيْنُ" وغیرہ کیونکہ تنزیل کا معنی ہے کہ یہ اللہ تبارک سے جدا ہوسکتا ہے اور جو چیز جدا ہو جائے وہ عین نہیں غیر ہوتی ہے اور جو غیر اللہ ہے وہ مخلوق ہے۔

جواب: انزال اور تنزیل کا مطلب ہے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے حضرت جبرائیلؑ کو تعلیم دی اور انہیں حکم دیا کہ وہ آنحضرت تک پہنچادیں اور انہیں کہدیں کہ وہ اپنی امت کو اس کی تعلیم دیدیں۔ لہٰذا تنزیل سے اس کے صفت خداوندی ہونے کی نفی نہیں کی جاسکتی۔

# سورۃ الحدید

سوال: اس آیتِ کریمہ کا کیا معنی ہے' پہلے تو فرمایا "وَمَا لَكُمْ لَا تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ" (اور تمہارے لئے اس کا کون سبب ہے کہ تم اللہ پر ایمان نہیں لاتے) پھر فرمایا: "اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ" (اگر تم مومن ہو)؟

جوابِ اوّل: اس کا معنی یہ ہے کہ اگر تم موسیٰ وعیسیٰ علیہما السلام پر ایمان رکھتے ہو۔ کیونکہ ان دونوں پیغمبروں کی شریعت' ایمانِ محمدیؐ کی متقاضی ہے۔

جوابِ ثانی: اس کا معنی یہ ہے کہ اگر تم اس عہد کو ماننے والے ہو جو اللہ تعالیٰ نے تم سے اس دن لیا تھا جب اس نے آدمؑ کی پشت سے تمہیں نکالا تھا۔

جوابِ ثالث: اس کا مطلب یہ ہے کہ آخر ایمان نہ لانے کا تمہارے پاس کونسا عذر ہے حالانکہ رسول کریم ﷺ تمہیں اللہ کی طرف دعوت دے رہے ہیں اور تمہارے سامنے ایسی کتاب کی تلاوت بھی کررہے ہیں جو براہین و دلائل کی ناطق ہے۔ نیز اس اللہ نے تمہارے اندر غور وفکر کے لئے عقل بھی رکھی ہے اور تمہاری تمام علتوں کو دور کردیا ہے۔ ان تمام تر باتوں کے باوجود اب کونسا عذر باقی

ہے کہ تم ایمان نہیں لاتے؟

سوال: ارشادِ خداوندی ہے: "لَا یَسْتَوِیْ مِنْکُمْ مَّنْ اَنْفَقَ مِنْ قَبْلِ الْفَتْحِ وَقَاتَلَ" (جو لوگ فتح مکہ سے پہلے خرچ کر چکے اور لڑ چکے برابر نہیں) اس آیت میں یہ ذکر نہیں کہ وہ کن لوگوں کے برابر نہیں؟ حالانکہ "استواء" کا معنی اس وقت تام ہوتا ہے جب دو آدمیوں کا ذکر ہو جیسے یہ ارشاد ہے "قُلْ لَّا یَسْتَوِی الْخَبِیْثُ وَالطَّیِّبُ" نیز جیسے یہ فرمان ہے "لَا یَسْتَوِیْ اَصْحٰبُ النَّارِ وَاَصْحٰبُ الْجَنَّةِ"

جواب: عبارت محذوف ہے اصل میں ہے "وَمن انفق وقاتل من بعدالفتح" یعنی ان کے برابر نہیں جو فتح مکہ کے بعد خرچ کر چکے اور لڑ چکے اور یہ عبارت اس لئے حذف کر دی گئی کہ مابعد کلام اس پر دال ہے۔

سوال: ارشادِ الٰہی ہے "وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَرُسُلِهٖۤ اُولٰٓئِکَ هُمُ الصِّدِّیْقُوْنَ صلے وَالشُّهَدَآءُ عِنْدَ رَبِّهِمْ" (اور جو لوگ اللہ پر اور اس کے رسولوں پر ایمان رکھتے ہیں ایسے ہی لوگ اپنے رب کے نزدیک صدّیق اور شہید ہیں) کیا وجہ ہے کہ کہا جاتا ہے کہ انبیاء علیہم السلام کے بعد سب سے اعلیٰ درجہ صدیقین کا درجہ ہے حالانکہ اللہ تعالیٰ نے اس آیت مبارکہ میں ہر مومن کے لئے اس کے صدیق ہونے کا حکم لگایا ہے؟

جوابِ اوّل: ابن مسعودؓ اور مجاہدؒ فرماتے ہیں ہر مومن صدیق ہے۔

جوابِ ثانی: صدیق اس شخص کو کہتے ہیں جو بہت زیادہ سچا ہو جو اپنے تمام اقوال افعال اور احوال میں سچا ہو پس بناء بریں اس سے مراد بعض مومنین ہوں گے نہ کہ تمام مومنین۔ ضحاکؒ سے مروی ہے کہ یہ آیت ان آٹھ آدمیوں کی جماعت کے متعلق نازل ہوئی ہے جو اپنے زمانہ میں سابقین الی الاسلام تھے اور وہ یہ ہیں ابوبکرؓ عثمانؓ علیؓ حمزہؓ بن عبدالمطلب طلحہؓ زبیرؓ سعدؓ اور زیدؓ حضرت عمرؓ کو بھی ان میں شامل کیا گیا یوں تعداد نو ہو جاتی ہے۔

سوال: اللہ تعالیٰ نے مذکورہ آیت میں مذکورہ افراد کے شہید ہونے کا تذکرہ کیا ہے حالانکہ ان افراد میں بعض شہید نہیں ہوئے؟

جوابِ اوّل: اس کا معنی یہ ہے کہ ان لوگوں کے لئے شہداء کا سا اجر و ثواب ہے۔

جوابِ ثانی: شہداء شہید کی جمع ہے بمعنی شاہد چنانچہ معنی یہ ہوگا کہ انہوں نے اپنے رب کے پاس اپنے ایمان کا مشاہدہ کیا ہے۔

جوابِ ثالث: یہ شہداء مبتداء ہے اور ماقبل سے منقطع ہے یعنی ماقبل پر معطوف نہیں ہے معنی یہ

ہوگا کہ اور شہداء کے لئے ان کے رب کے پاس اجر اور نور ہے۔

**سوال:** اس آیت سے کیا مراد ہے "سَابِقُوْٓا اِلٰی مَغْفِرَۃٍ مِّنْ رَّبِّکُمْ" (تم اپنے پروردگار کی مغفرت کی طرف دوڑو) "مسابقہ" بابِ مفاعلہ سے ہے' اس باب میں شرکت جانبین سے ضروری ہے۔ جیسے کہتے ہیں زید نے عمرو سے مسابقت کی؟۔

**جوابِ اوّل:** اس کا معنی ہے تم ایسی جلدی کرو جیسے مقابلہ کے میدان میں دوڑ لگانے والے جلدی کرتے ہیں' اس کی تائید لفظِ مسارعت سے ہوتی ہے جو سورۃ آل عمران میں آیا ہے۔

**جوابِ ثانی:** مطلب یہ ہے کہ تم موت کے فرشتہ سے مسابقت کرو اس سے قبل کہ وہ موت کے ذریعہ تمہارا ان اعمال سے تعلق قطع کر دے جو حصولِ جنت کا سبب ہیں۔

**جوابِ ثالث:** تم ابلیسِ لعین سے مسابقت کرو اس سے قبل کہ وہ اپنے مکروفریب کے ذریعہ تمہیں ان اعمال کے بجالانے سے روک دے۔

**سوال:** یہاں فرمایا: "وَجَنَّۃٍ عَرْضُھَا کَعَرْضِ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ" (ایسی جنت کی طرف جس کی وسعت آسمان وزمین کی وسعت کے برابر ہے) اور آل عمران میں فرمایا "وَجَنَّۃٍ عَرْضُھَا السَّمٰوٰتُ وَالْاَرْضُ" (ایسی جنت جس کی وسعت آسمانوں اور زمین کے برابر ہے) دونوں میں بظاہر تعارض ہے' جنت کی وسعت ایک آسمان کی وسعت کے برابر ہے یا سات آسمانوں کی وسعت کے برابر؟

**جواب:** "اَلسَّمَآءِ" سے جنسِ سماوات مراد ہے نہ کہ ایک آسمان۔ جس طرح دونوں آیتوں میں "ارض" سے مراد جنس ارضین ہے۔ لہٰذا دونوں آیتوں میں تشبیہ سات آسمانوں اور سات زمینوں کی وسعت کے ساتھ ہے۔

**سوال:** اس آیتِ کریمہ سے کیا مراد ہے: "لِکَیْلَا تَاْسَوْا عَلٰی مَا فَاتَکُمْ وَلَا تَفْرَحُوْا بِمَآ اٰتٰکُمْ" (تاکہ جو چیز تم سے جاتی رہی تم اس پر رنج نہ کرو اور تاکہ جو چیز تمکو عطا فرمائی ہے اس پر اتراؤ نہیں) حالانکہ ایسا کوئی بھی انسان نہیں ہے جو نقصان کے وقت رنج وغم سے دوچار نہ ہوتا ہو اور نفع کے وقت خوش نہ ہوتا ہو؟

**جواب:** اس سے مراد وہ طبعی رنج وخوشی نہیں ہے جو انسان سے جدا نہیں ہوتی' بلکہ اس سے مراد ایسا حزن ہے جو اس شخص کو صبر وضبط اور حکمِ خداوندی کے انقیاد وتسلیم سے نکال کر ذہول میں مبتلا کردے اور فرح سے مراد ایسی خوشی ہے جو سرکش بنا دینے والی اور شکرِ خداوندی سے غافل کردینے والی ہو۔ نعوذ باللہ منہما۔

سوال: ارشادِ باری تعالیٰ ہے"وَاَنزَلْنَا مَعَهُمُ الْكِتٰبَ وَالْمِيزَانَ" (اور ہم نے ان کے ساتھ کتاب کو اور ترازو کو نازل کیا) ترازو تو آسمان سے نازل نہیں ہوئی؟۔

جوابِ اوّل: یہاں میزان سے مراد عدل ہے۔

جوابِ ثانی: میزان سے مراد عقل ہے۔

جوابِ ثالث: وہ زنجیر ہے جو اللہ تعالیٰ نے داؤد علیہ السلام پر نازل فرمائی۔

جوابِ رابع: معروف میزان ہی مراد ہے جو جبریلؑ لے کر نازل ہوئے اور حضرت نوح علیہ السلام کو وہ میزان دے کر فرمایا' اپنی قوم کو حکم دیں کہ اس کے ذریعہ وزن کیا کریں۔

سوال: اس آیت کا کیا معنی ہے"يٰٓاَيُّهَا الَّذِينَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَاٰمِنُوا بِرَسُولِهٖ" (اے ایمان رکھنے والو تم اللہ سے ڈرو اور اس کے رسول پر ایمان لاؤ) حالانکہ مسلمان اپنے پیغمبر علیہ السلام پر ایمان تو رکھتے ہیں؟

جوابِ اوّل: اس کا معنی یہ ہے' اے موسیٰ و عیسیٰ علیہما السلام پر ایمان رکھنے والو تم محمد ﷺ پر بھی ایمان لاؤ' اس لحاظ سے خطاب صرف یہود و نصاریٰ کو ہوگا۔ اور یہ اکثر اہلِ علم کا قول ہے۔

جوابِ ثانی: اس کا معنی یہ ہے: اے میثاق کے دن پر ایمان رکھنے والو تم اللہ سے ڈرو اور آج اس کے رسول پر ایمان لاؤ۔

جوابِ ثالث: اس کا معنی یہ ہے: اے زبان سے علانیہ اللہ پر ایمان لانے والو تم اللہ سے ڈرو اور دل کی تصدیق کے ساتھ سراً اس کے رسولؐ پر ایمان لاؤ۔

# سورۃ المجادلۃ

سوال: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: "مَا يَكُونُ مِن نَّجْوٰى ثَلٰثَةٍ اِلَّا هُوَ رَابِعُهُمْ وَلَا خَمْسَةٍ اِلَّا هُوَ سَادِسُهُمْ" (کوئی سرگوشی تین آدمیوں کی ایسی نہیں ہوتی جس میں چوتھا وہ نہ ہو اور نہ پانچ کی مگر وہ ان کا چھٹا ہے) کیا وجہ ہے کہ اعداد میں سے تین اور پانچ کے عدد کو خاص طور سے ذکر کیا گیا ہے؟

جواب: اس کی وجہ یہ ہے کہ منافقین کی ایک جماعت مسلمانوں کے خلاف غم و غصہ کے اظہار کے لئے انہی دو عدد کے مطابق سرگوشی کے لئے پیچھے رہ گئی تھی چنانچہ ان کی حالت کو بیان کرنے' ان کو سنانے اور ان پر تعریض کے لئے یہ آیتِ کریمہ نازل ہوئی اور پھر: "وَلَآ اَدْنٰى مِن ذٰلِكَ وَلَآ اَكْثَرَ" فرما کر ان کے علاوہ ہر سرگوشیاں کرنے والے دو آدمیوں کو بھی شامل کر دیا۔

سوال: اس فرمانِ الٰہی کا فائدہ کیا ہے؟ ''وَيَحْلِفُوْنَ عَلَى الْكَذِبِ وَهُمْ يَعْلَمُوْنَ'' (اور قسم کھا جاتے ہیں جھوٹ اور وہ جانتے ہیں)؟

جواب: منافقین کے بارے میں خبر دی جارہی ہے کہ وہ اس بات پر جھوٹی جان بوجھ کر قسم کھا جاتے ہیں کہ انہوں نے یہودیوں کے ساتھ مل کر رسول اللہ ﷺ اور ان کے صحابہؓ کو برا بھلا نہیں کہا ہے۔ یہ یمینِ غموس ہے' لہٰذا یہ ان کی مذمت کو بدرجہ اتم بیان کرنا ہے۔

# سورۃ الحشر

سوال: اللہ تعالیٰ کے اس فرمان کا کیا مطلب ہے: ''وَالَّذِيْنَ تَبَوَّؤُ الدَّارَ وَالْاِيْمَانَ مِنْ قَبْلِهِمْ'' (اور ان لوگوں کا جو دارالاسلام میں ان کے (آنے کے) قبل سے قرار پکڑے ہوئے ہیں) ایمان تو قرار پکڑنے کی جگہ نہیں ہے' کیوں کہ ''التبوء'' کا معنی ہوتا ہے کسی جگہ کو منزل بنانا؟

جوابِ اوّل: عبارت مقدر ہے: ''وَاخلصوا الایمان'' یعنی اور انہوں نے ایمان کو خالص کیا۔ جیسے کسی شاعر کا قول ہے:

علفتها تبناً وماءً بارداً یعنی وَسَقَيْتُهَا کہ میں نے اس کو ٹھنڈا پانی پلایا۔

جوابِ ثانی: یہ کلام اپنے ظاہری مفہوم پر ہے' اس میں کوئی عبارت محذوف نہیں ہے' لیکن یہ مجازاً ہے۔ مطلب یہ ہوگا کہ انہوں نے استقامت علی الایمان کی وجہ سے ایمان کو اپنا مستقر بنایا' جیسے انہوں نے دارالہجرت یعنی مدینہ منورہ کو جائے استقرار بنایا۔

سوال: ارشادِ خداوندی ہے: ''وَلَئِنْ نَّصَرُوْهُمْ'' (اور اگر ان کی مدد بھی کی) جبکہ اس سے پہلے اللہ تعالیٰ نے یہ فرمایا ہے: ''لَا يَنْصُرُوْنَهُمْ'' (یہ ان کی مدد نہیں کریں گے) تو اس آیت کا مطلب کیا ہے۔ کیونکہ کلمہ ''ان'' ایسی چیز پر داخل ہوتا ہے' جس کا وجود اور عدم دونوں محتمل ہو؟۔

جواب: معنی یہ ہے کہ اگر بالفرض والمحال یہ ان کی مدد کریں۔ جیسے حضور نبی کریم ﷺ سے فرمایا گیا: ''لَئِنْ اَشْرَكْتَ لَيَحْبَطَنَّ عَمَلُكَ'' یعنی اگر بالفرض والتقدیر آپ بھی شریک ٹھہرائیں تو آپ کے بھی عمل ضائع ہو جاتے۔ نیز جیسے یہ فرمایا ہے: ''لَوْ كَانَ فِيْهِمَا اٰلِهَةٌ اِلَّا اللّٰهُ لَفَسَدَتَا'' جیسے اللہ تعالیٰ کو کسی بھی چیز کا علم اس کے وجود میں آنے سے پہلے ہی ہوتا ہے اسی طرح ان کو اس کا بھی علم ہوتا ہے کہ جو چیز موجود نہیں ہے اگر موجود ہوتی تو اس کی کیفیت کیا ہوتی؟

سوال: اللہ تعالیٰ مومنین سے فرماتے ہیں: ''لَاَنْتُمْ اَشَدُّ رَهْبَةً فِيْ صُدُوْرِهِمْ مِّنَ اللّٰهِ'' (بے شک تم لوگوں کا خوف ان کے دلوں میں اللہ سے بھی زیادہ ہے) اس کا کیا مطلب ہے؟ کیونکہ

صدور سے مراد یاصدور المنافقین (منافقوں کے دل) ہے یا صدور الیهود (یہود کے دل)
اگر "من" "متعلق ہے "اَشَدُّ" کے ساتھ تو خوفِ خدا کا ثبوت لازم آتا ہے جیسے تم کہتے ہو: زید اشد خوفًا فی الدار من عمرو "اور یہ محال ہے اور اگر "من اللّٰہ" متعلق ہے خوف کے ساتھ تو پھر مفضل علیہ کہاں ہے جس پر مخاطبین کو فضیلت دی گئی ہے نیز آیت کا تقاضا یہ ہے کہ مومنین کے لئے خوف کی زیادتی ثابت ہو حالانکہ باتفاق مفسرین یہ مراد نہیں ہے؟۔

جواب: "رَهْبَة" مصدر ہے رَهَبَ کا اور مبنی للمفعول ہے۔ گویا یوں فرمایا: "اَشد مرهوبية" یعنی تم ان کے دلوں میں اللہ کی بہ نسبت زیادہ خوف والے ہو: "كذا فسره ابن عباسؓ" اس کی نظیر تمہارا یہ کہنا ہے: "زيد اشد ضربًا فی الدار من عمرو" یعنی مضروبیت میں زیادہ ہے۔

سوال: "اَشَدُّ رَهْبَةً" (زیادہ خوف) فرما کر یہ تفضیل کیسے درست ہو سکتی ہے کیونکہ وہ تو اللہ سے مطلق نہیں ڈرتے تھے اگر انہیں اللہ کا کچھ بھی خوف ہوتا تو وہ کفر و نفاق سے باز آجاتے؟

جواب: اس کا معنی یہ ہے کہ ان کا سراتم سے خوف اللہ کی بہ نسبت زیادہ ہے جس کو وہ تمہارے سامنے ظاہر کرتے ہیں کیونکہ وہ منافقین مومنین کے لئے اللہ تعالیٰ سے زیادہ خوف ظاہر کرتے تھے۔

سوال: ابلیس نے یہ کیسے کہا: "اِنِّی اَخَافُ اللّٰهَ" (تحقیق میں اللہ سے ڈرتا ہوں) حالانکہ وہ اللہ تعالیٰ سے نہیں ڈرتا اگر ڈرتا ہوتا تو اللہ کے حکم کی مخالفت نہ کرتا اور اللہ کے بندوں کو گمراہ نہ کرتا؟

جواب: یہ سوال مع جواب سورۃ الانفال میں گزر چکا ہے۔

سوال: اس کی کیا وجہ ہے کہ اس ارشادِ مبارک میں: "وَلْتَنْظُرْ نَفْسٌ مَّا قَدَّمَتْ لِغَدٍ" (اور چاہیے کہ دیکھے ہر جی جو کچھ آگے بھیجا واسطے آنے والی کل کے) "نفس" اور "غد" کو نکرہ لائے ہیں؟

جواب: "نفس" کو نکرہ اس کے استقلال کے لئے لائے ہیں مطلب یہ ہے کہ ہر نفس جو اعمال آخرت میں بھیج رہا ہے مستقل طور پر غور کرے گویا یوں فرمایا: ہر ہر نفس اس بارے غور کرے اور "غد" کو نکرہ اس کی عظمت کے لئے اور اس کے امر کو مبہم رکھنے کے لئے ہے۔

سوال: یہ کیسے فرمایا: "لغد" اور اس سے قیامت کا دن مراد لیا حالانکہ "غد" نام ہے ایسے دن کا کہ اس کے درمیان اور ہمارے درمیان ایک رات ہو؟

جوابِ اوّل: "غد" کے دو مفہوم ہیں ایک تو وہی جو مذکور ہوا اور دوسرا معنی مطلق زمانہ مستقبل ہے۔ جیسے شاعر کا قول ہے:

واعلم ما فی اليوم والامس قبله ☆ ولكنّنی عن علم ما فی غد عَمِی

اس شعر میں جیسے "امس" سے مطلق زمانہ ماضی مراد ہے اسی طرح "غد" سے مطلق زمانہ مستقبل

مراد ہے۔اس کی تائید اس سے ہوتی ہے: ''كَأَنْ لَّمْ تَغْنَ بِالْأَمْسِ''
جوابِ ثانی: قیامت کے دن ''غد'' کے لفظ کا اطلاق اس کو قریب بتانے کے لئے ہے۔ جیسے ''اِقْتَرَبَتِ السَّاعَةُ'' نیز جیسے وَمَآ اَمْرُ السَّاعَةِ اِلَّا كَلَمْحِ الْبَصَرِ اَوْ هُوَ اَقْرَبُ'' گویا اللہ تعالیٰ نے یوں فرمایا: بے شک قیامت کا دن اپنے قریب ہونے کی وجہ سے اس چیز کی مانند ہے کہ اس کے اور تمہارے درمیان صرف ایک رات کا فاصلہ ہو۔ اسی لئے نبی کریم ﷺ نے فرمایا: ''رات کو عمل کرلو جس کی صبح کو قیامت کا دن ہے'' اس رات سے مراد موت کی رات ہے۔

سوال: اس آیت کا کیا معنی ہے: ''لَوْ اَنْزَلْنَا هٰذَا الْقُرْاٰنَ عَلٰى جَبَلٍ''؟

جواب: اس کا معنی یہ ہے اگر اللہ تعالیٰ پہاڑوں کے اندر ان کی سختی کے باوجود قوتِ تمیز رکھ دیتے جیسے انسان میں رکھی ہے پھر اس پر قرآن نازل کرتے تو وہ اللہ کے خوف سے پھٹ جاتے اور تعظیمِ قرآن کا حق ادا نہ کرنے کی بناء پر ریزہ ریزہ ہو جاتے' اصل مقصد انسان کو اس کی قساوتِ قلبی اور تلاوت کے وقت خشیت اور تدبر کی کمی اور اعراض پر تنبیہ اور توبیخ کرنا ہے۔

سوال: خالق اور باری میں کیا فرق ہے' جس کی وجہ سے ایک کا دوسرے پر عطف کیا گیا ہے؟

جواب: خالق کہتے ہیں جو اس چیز کی تقدیر بنانے والا ہو جس کو وہ بنائے۔ اور باریٔ کہتے ہیں کہ جو مختلف شکلیں بنا کر بعض کو بعض سے ممتاز کرنے والا ہو۔ بعض کہتے ہیں کہ خالق کا معنی ہے پہلی بار پیدا کرنے والا اور باریٔ کہتے ہیں پھر دوبارہ پیدا کرنے والا۔

# سورة الممتحنة

سوال: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ''اِلَّا قَوْلَ اِبْرٰهِيْمَ لِاَبِيْهِ'' اس کا مستثنیٰ منہ کیا ہے؟۔

جواب: اس کا مستثنیٰ منہ یہ ہے ''قعدم كَانَتْ لَكُمْ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ فِيْ اِبْرٰهِيْمَ'' اس لئے کہ اللہ تعالیٰ کی ''اسوۃٌ حسنہ'' سے مراد وہ قول ہے جس کو اس نے اس سے اس کے متبعین اور پیروکاروں سے نقل کیا ہے تا کہ وہ اس کی اقتداء اور پیروی کریں۔ اور اللہ تعالیٰ نے ابراہیمؑ کے استغفار کو جو انہوں نے اپنے والد کے لئے کیا مستثنیٰ کر دیا' کیونکہ ابراہیمؑ اس کا اپنے والد سے وعدہ کر چکے تھے۔

سوال: اگر حضرت ابراہیمؑ کا اپنے والد کے لئے استغفار یا ان سے استغفار کا وعدہ اس اسوۃٌ حسنہ سے مستثنیٰ ہے تو پھر اس پر اس قول ''وَمَآ اَمْلِكُ لَكَ مِنَ اللّٰهِ مِنْ شَيْءٍ'' کا عطف کیسے کیا گیا' اس کا استثناء درست نہیں ہے؟۔

جواب: استثناء سے مقصود صرف پہلا جملہ ہے اور مابعد جملہ کو اس لئے ذکر کیا گیا کہ یہ کلامِ ابراہیمی کی تمامیت میں سے ہے نہ کہ استثناء مقصود ہے۔ گویایوں فرمایا: میں آپ کے لئے استغفار کروں گا اور مجھ میں استغفار کے سوا کوئی طاقت نہیں ہے۔

سوال: اس ارشادِ الٰہی کو ذکر کرنے کا کیا فائدہ ہے "وَلَا يَعْصِيْنَكَ فِيْ مَعْرُوْفٍ" (اور مشروع باتوں میں آپ کی نافرمانی نہیں کرینگی) جبکہ یہ بات واضح ہے کہ حضور ﷺ معروف کا ہی حکم دیں گے لہٰذا "ولا يعصينك" پر اکتفاء کیوں نہیں کیا گیا؟

جواب: اس کا فائدہ یہ ہے کہ ان کے ذہن فوراً بلا توقف معصیت کی قباحت کی طرف جائیں گے۔

# سورۃ الصّف

سوال: اللہ تعالیٰ کے اس ارشادِ مبارک "وَقَدْ تَعْلَمُوْنَ" میں لفظ "قَدْ" کا کیا فائدہ ہے؟

جوابِ اوّل: اس کا فائدہ تاکید ہے۔ گویایوں فرمایا اور تم یقینی طور پر جانتے ہو تمہیں اس میں کوئی شک وشبہ نہیں ہے۔ یہ زمخشریؒ کا جواب ہے۔

جوابِ ثانی: اس کا فائدہ تکثیر ہے اس لئے کہ "قَدْ" فعل مضارع پر آئے تو کبھی تقلیل کا فائدہ دیتا ہے جیسے کہتے ہیں۔ "ان الكذوب قد يصدق" یعنی جھوٹا شخص کبھی سچ بول دیتا ہے۔ اور کبھی تکثیر کا فائدہ دیتا ہے جیسے شاعر کا قول ہے:

قد اعسف النازح المجهود معسفة ☆ فى ظلّ اخضر يدعو هامة البوم

شاعر کثیر الوجود چیز کی مدح سرائی کرنا چاہتا ہے نہ کہ اس چیز کی جو قلیل الوجود ہو۔

سوال: حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے یہ کیسے فرمایا "وَمُبَشِّرًا بِرَسُوْلٍ يَّأْتِيْ مِنْ بَعْدِى اسْمُهٗ اَحْمَدُ" (اور خوشخبری دینے والے ساتھ اس پیغمبر کے کہ آئے گا پیچھے مجھ سے نام اس کا احمد ہے) "محمدؐ" نہیں کہا حالانکہ "محمدؐ" حضور ﷺ کا زیادہ مشہور نام ہے؟

جوابِ اوّل: "احمد" اس لئے فرمایا کہ انجیل میں یہی ایسی عبارت کے ساتھ مذکور ہے جس کا معنی "احمدؐ" ہے نہ کہ محمدؐ۔ حضورؐ کا آسمانوں میں نام احمد ہے اور زمین میں محمدؐ۔ چنانچہ آسمانی نام کتاب انجیل میں نازل ہوا۔

جوابِ ثانی: "احمد" کا لفظ حمد کے معنی میں ابلغ ہے بہ نسبت محمدؐ کے کیونکہ احمد صیغہ تفضیل کا ہے۔ جبکہ بعض یہ کہتے ہیں کہ "محمدؐ" اس جہت سے ابلغ ہے کہ یہ صیغہ تفضیل ہے جو تکثیر کا معنی

دیتا ہے۔

سوال: ارشاد ہے "فَلَمَّا جَآءَهُمْ بِالْبَيِّنٰتِ قَالُوْا هٰذَا سِحْرٌ مُّبِيْنٌ" (پس جب آیا ان کے پاس وہ پیغمبر ساتھ ظاہر دلیلوں کے انہوں نے کہا یہ جادو ہے ظاہر) یہاں بظاہر "ہٰذِہٖ" ہونا چاہئے کیونکہ مشار الیہ یعنی "بینٰت" "مؤنث" ہے؟۔

جواب: اس کا معنی ہے "ھذا الذی جئت به" یعنی یہ جو تو لے کر آیا ہے پس اشارہ اس چیز کی طرف ہے جو لائی گئی ہے۔

سوال: "مَنْ اَنْصَارِیْٓ اِلَی اللّٰهِ" اس آیت کریمہ میں وجہ تشبیہ کیا ہے بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ ان کے انصار اللہ ہونے کو حضرت عیسیٰؑ کے اس قول مذکور کے ساتھ تشبیہ دی گئی ہے؟

جواب: تشبیہ اس معنی پر محمول ہے جو مقدر ہے: تم اللہ کے دین کے مددگار ہو جاؤ جیسے حواری عیسیٰ علیہ السلام کے مددگار ہوئے تھے جب عیسیٰؑ نے ان سے کہا تھا مَنْ اَنْصَارِیْٓ اِلَی اللّٰهِ۔

# سورۃ الجمعۃ

سوال: اس سے کیا مراد ہے: "فَاسْعَوْا اِلٰی ذِكْرِ اللّٰهِ" (پس جلدی کرو اللہ کی طرف) "سَعْی" کا معنی تو دوڑنا ہے نماز جمعہ کے لئے بلکہ ہر نماز کے لئے دوڑنا تو مکروہ ہے؟

جواب: "سعی" سے مراد قصد ہے۔ حضرت حسنؒ فرماتے ہیں: اس سے مراد قدموں سے دوڑنا نہیں بلکہ نیتوں اور دلوں کی سعی ہے۔ قول حسنؒ کی تائید اس ارشاد الٰہی سے ہوتی ہے: "وان لیس للانسان الا ماسعی" نیز دعائے قنوت سے ہوتی ہے۔ "والیک نسعی ونحفد" اس "سعی" سے مراد دوڑنا یا تیز تیز قدم اٹھانا نہیں ہے۔

سوال: اس کی کیا وجہ ہے کہ "اِنْفَضُّوْٓا اِلَيْهَا" (دوڑے جاتے ہیں اس کی طرف) فرمایا ہے۔ حالانکہ پیچھے دو چیزیں مذکور ہیں ایک لہو اور دوسری تجارت؟۔

جواب: اس کا جواب سورۃ التوبۃ میں "وَلَا يُنْفِقُوْنَهَا فِیْ سَبِيْلِ اللّٰهِ" کے تحت گزر گیا ہے۔ نیز اس کی تائید زجاج کے قول سے بھی ہوتی ہے کہ اس کا معنی ہے کہ جب "تجارت" کو دیکھتے ہیں تو اس کی طرف دوڑنے کے لئے کھڑے ہو جاتے ہیں اور جب "لہو" دیکھتے ہیں تو اس کی طرف دوڑے جاتے ہیں۔ ایک کو حذف کر دیا کیونکہ مذکور امر اس پر دال ہے۔ اور حضرت ابن مسعودؓ سے "الیھما" تثنیہ کے ساتھ پڑھا ہے بناء بریں عبارت حذف ماننے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔

# سورۃ المنافقون

سوال: "وَاللّٰهُ يَعْلَمُ اِنَّكَ لَرَسُوْلُهٗ" (اور اللہ جانتا ہے تحقیق آپ اللہ کے رسول ہیں) کے ارشاد کو ذکر کرنے میں کیا فائدہ ہے؟

جواب: اگر اللہ تعالیٰ صرف یہ فرماتے: "قَالُوْا نَشْهَدُ اِنَّكَ لَرَسُوْلُ اللّٰهِ وَاللّٰهُ يَشْهَدُ اِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ لَكٰذِبُوْنَ" تو یہ وہم ہوتا کہ ان کا یہ قول کاذب ہے حالانکہ یہ مراد نہیں ہے کہ ان کی یہ شہادت کاذب ہے بلکہ مراد یہ ہے کہ وہ اس شہادت کے علاوہ میں کاذب ہیں۔

اکثر مفسرین فرماتے ہیں: منافقین کی تکذیب ان کی شہادت میں ہے اس لئے کہ منافقین کا اظہار ان کے مافی الضمیر کے خلاف تھا کیونکہ وہ اپنے دلوں سے حضور کو اللہ کا رسول نہیں مانتے تھے۔ اسی لئے ان کو کاذب کہا گیا۔ بنابریں یہ قول: "وَاللّٰهُ يَعْلَمُ الخ" تاکید کے لئے ہوگا۔

سوال: اس کا کیا معنی ہے؟ "ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ اٰمَنُوْا ثُمَّ كَفَرُوْا" (یہ بسبب اس کے ہے کہ وہ ایمان لائے پھر کافر ہوئے) حالانکہ منافقین ہمیشہ کفر پر ہی قائم رہے؟

جوابِ اوّل: اس کا معنی یہ ہے کہ یہ کذب جس کا ان پر حکم لگایا گیا یا ان کے متعلق جو یہ خبر دی گئی کہ ان کے اعمال بہت بُرے ہیں یہ اس سبب سے ہے کہ وہ اپنی زبانوں سے ایمان لائے پھر "کفروا" یعنی اپنے دلوں سے کفر کیا پھر "فَطُبِعَ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ" یعنی ان کے دلوں پر مہر کر دی گئی۔ جیسے ان منافقین کے بارے میں ارشادِ ربانی ہے "وَاِذَا لَقُوا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا قَالُوْٓا اٰمَنَّا وَاِذَا خَلَوْا اِلٰى شَيٰطِيْنِهِمْ" الآیۃ

جوابِ ثانی: اس سے مراد منافقین میں سے اہلِ ارتداد ہیں۔

سوال: اس کی کیا وجہ ہے کہ "يَحْسَبُوْنَ كُلَّ صَيْحَةٍ عَلَيْهِمْ هُمُ الْعَدُوُّ" (ہر غل پکار کو اپنے اوپر خیال کرنے لگتے ہیں یہی لوگ دشمن ہیں) فرمایا ہے "هِيَ الْعَدُوُّ" نہیں فرمایا؟

جواب: "عَلَيْهِمْ" یحسبون کا دوسرا مفعول ہے۔ تقدیرِ عبارت یہ ہے "یحسبون کل صیحۃ واقعۃ علیھم" یعنی اپنی بزدلی کی وجہ سے۔ لہٰذا "علیھم" پر وقف ہے اور "ھم العدو" نیا کلام ہے۔ بعض کہتے ہیں کہ مفعول ثانی "ھم العدو" پہلا مفعول ہے لیکن عبارت یوں مقدر

ہوگی: "یحسبون اهل کل صیحة علیهم هم العدو" واضح ہے جس کی دلیل "عدو" پر نصب کا نہ ہونا ہے۔

## سورۃ التغابن

سوال: اس کی کیا وجہ ہے کہ اس آیتِ مبارکہ میں "فَمِنْكُمْ كَافِرٌ وَّمِنْكُمْ مُّؤْمِنٌ" (پس بعضے تم میں سے کافر ہیں اور بعضے تم میں سے مسلمان ہیں) کافر کو مومن پر مقدم کیا گیا ہے؟

جواب: واؤ ترتیب کا فائدہ نہیں دیتا ہے اور نہ ترتیب کا تقاضا کرتا ہے۔ جیسے ان آیاتِ کریمہ میں: "فَمِنْهُمْ شَقِيٌّ وَّسَعِيْدٌ". "لَا يَسْتَوِيْ اَصْحٰبُ النَّارِ وَاَصْحٰبُ الْجَنَّةِ "فَمِنْهُمْ ظَالِمٌ لِّنَفْسِهٖ وَمِنْهُمْ مُّقْتَصِدٌ وَّمِنْهُمْ سَابِقٌ بِالْخَيْرَاتِ "يَهَبُ لِمَنْ يَّشَآءُ اِنَاثًا وَّيَهَبُ لِمَنْ يَّشَآءُ الذُّكُوْرَ" آخری آیت کے متعلق ایک اور مطلب ہم نے اس کے مقام پر ذکر کیا ہے۔

سوال: "وَتَوَلَّوْا وَّاسْتَغْنَى اللّٰهُ" (اور انہوں نے منہ پھیر لیا اور خدا نے بھی پروانہ کی) اس سے وہم ہوتا ہے کہ ان کے پاس پیغمبر کے آنے کے بعد تولی (اعراض) اور استغنا (خدا کی بے پرواہی) دونوں ایک ساتھ پائے گئے' حالانکہ اللہ تعالیٰ ہمیشہ سے غنی (بے نیاز) ہے؟۔

جواب: اس کا معنی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کا ان کے ایمان اور عبادت سے استغناء کا ظہور ہوا کہ ان کو قدرت کے باوجود ایمان کی طرف مجبور نہیں کیا۔

سوال: اس سے کیا مراد ہے "وَمَنْ يُّؤْمِنْ م بِاللّٰهِ يَهْدِ قَلْبَهٗ" (اور جو کوئی ایمان لائے ساتھ اللہ کے ہدایت کرتا ہے اس کے دل کو) حالانکہ ہدایت' ایمان سے پہلے ہوتی ہے۔ کیونکہ اگر پہلے ہدایت نہ ہو تو ایمان نہیں پایا جائیگا؟

جوابِ اوّل: اس سے یہ مراد نہیں ہے' بلکہ اس سے مراد یہ ہے کہ نزولِ مصائب کے وقت اس کے قلب کو یقین کی ہدایت کرتے ہیں۔

جوابِ ثانی: مراد یہ ہے کہ اس کے قلب کو نزولِ آفات کے وقت رضا و تسلیم کی ہدایت دیتے ہیں۔

جوابِ ثالث: یعنی نزولِ مصائب کے وقت استرجاع (اناللہ پڑھنے) کی ہدایت دیتے ہیں۔

جوابِ رابع: "يَهْدِ قَلْبَه" کا مطلب یہ ہے کہ اس کو ان لوگوں میں سے بنا دیتے جو مصیبت میں مبتلا ہونے کے بعد اس پر صبر کرتے ہیں' اور جب کسی نعمت سے نوازے جاتے ہیں تو شکر کرتے ہیں' جب ان پر ظلم ہوتا ہے تو معاف کر دیتے ہیں۔

جوابِ خامس: مراد یہ ہے کہ اس کے قلب کو اتباعِ سنت کی ہدایت کرتے ہیں جب اس کا

ایمان صحیح ہو۔ اور ''یَھْدَأ'' کو دال کے فتح اور ہمزہ کے ساتھ بھی پڑھا گیا ہے۔ جو ''ہدو'' بمعنی سکون سے ماخوذ ہے۔ لہٰذا معنی ہوگا کہ جو شخص اللہ پر خالص ایمان لاتا ہے اللہ تعالیٰ اس کے قلب کو نزولِ مصائب کے موقع پر مطمئن اور پرسکون بناتے ہیں کہ پھر وہ جزع فزع نہیں کرتا۔

# سورۃ الطّلاق

سوال: ارشادِ باری تعالیٰ ہے: ''یٰاَیُّھَا النَّبِیُّ اِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَآءَ'' (اے نبی جس وقت تم طلاق دو عورتوں کو) کیا وجہ ہے کہ پہلے خطاب کو مفرد لائے پھر اس کو جمع لائے؟۔

جوابِ اوّل: اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ پہلے خطاب کو مفرد اس لئے لائے کہ حضور ﷺ اپنی امت کے امام اور پیشوا ہیں اس لئے آپ کے تقدم اور ریاست کو ظاہر کیا گیا۔ آپ اکیلے ساری امت کے حکم میں ہیں اور سب کے قائم مقام ہیں۔

جوابِ ثانی: اس کا معنی یہ ہے کہ اے پیغمبرؑ! اپنی امت کو کہہ دیجئے کہ جب تم عورتوں کو طلاق دو۔

سوال: اس آیت کا کیا معنی ہے ''وَمَنْ یَّتَّقِ اللّٰہَ یَجْعَلْ لَّہٗ مَخْرَجًا'' (اور جو شخص اللہ سے ڈرتا ہے اللہ تعالیٰ اس کے لئے (مضرتوں سے) نجات کی شکل نکال دیتے ہیں) جب کہ ہم بہت سے متقی لوگوں کو دیکھتے ہیں کہ وہ رزق کے معاملہ میں تنگی کا شکار ہوتے ہیں؟

جواب: اس کا معنی یہ ہے کہ اس کے لئے دنیا و آخرت کی فکرات سے نکلنے کی راہ نکال دیتے ہیں۔ نبی ﷺ سے مروی ہے کہ آپؐ نے فرمایا: ''وہ دنیا کے شبہات، موت کی سختی اور قیامت کے دن کی مشکلات سے خلاصی پاتا ہے'' حضرت ابنِ عباسؓ فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ اس کو دنیا و آخرت کے ہر کرب سے نجات دیتے ہیں۔ صحیح یہ ہے کہ آیت عام ہے بلاشبہ اللہ تعالیٰ متقی انسان کے لئے مضرات سے نکلنے کی جو راہ پیدا فرماتے ہیں وہ غیر متقی کے لئے پیدا نہیں فرماتے۔ اسی لئے حضور ﷺ نے فرمایا: ''میں ایک ایسی آیت جانتا ہوں کہ اگر لوگ اس پر عمل پیرا ہو جائیں تو وہ آیت ان کے لئے کافی ہو جائے اور وہ ہے: ''وَمَنْ یَّتَّقِ اللّٰہَ'' الآیۃ حضورؐ اس کو بار بار پڑھتے رہے''۔

رہی بات متقی لوگوں کے رزق کی تنگی کی، تو ان کے پاس باوجود تنگی رزق کے ایسی جگہوں سے رزق آتا ہے جہاں سے انہیں امید تک نہیں ہوتی۔ رزق کی قلت اصل میں ان پر لطف و رحمت ہے ۔ کیونکہ اس سے مقصد آخرت میں ان کو وافر حصہ عطا کرنا ہوتا ہے اور حساب و کتاب میں تخفیف کرنی ہوتی ہے۔ نیز اس قلتِ رزق سے مقصد یہ ہوتا ہے کہ ایسے تعلقات کم سے کم ہوں جو ان کو ان کے مولیٰ حقیقی سے دور کرنے والے ہیں، کہیں رزق کی وسعت اور فراوانی ان کو اللہ کی عبادت

وطاعت سے غافل نہ کر دے' یہی وجہ ہے کہ انبیاء کرام' اولیاءِ عظام اور صدیقین حضرات فقر کو غنٰی پر ترجیح دیا کرتے ہیں۔

سوال: اس سے کیا مراد ہے: "وَمَنْ يَّتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ فَهُوَ حَسْبُهٗ" (اور جو شخص اللہ تعالیٰ پر توکل کرے گا تو اللہ تعالیٰ اس کے لئے کافی ہے) جب کہ ہم بہت سے لوگوں کو دیکھتے ہیں کہ جو اللہ پر اپنے بعض امور و حاجات میں توکل کرتے ہیں مگر اللہ تعالیٰ ان کی مہمات کے لئے کافی نہیں ہوتے؟۔

جواب: یہ محال ہے کہ کوئی شخص اللہ تعالیٰ پر ایسا توکل کرے جیسے توکل کا حق ہے اور اللہ اس کی مہمات کے لئے کافی نہ ہو۔ بلکہ اکثر یہ ہوتا ہے کہ وہ شخص قلق واضطراب میں مبتلا ہو جاتا ہے اور اپنے دل یا زبان سے بھی حاجت روائی میں تاخیر کی شکایت کرتا ہے جس سے اس کا توکل علی اللہ فاسد ہو جاتا ہے' اس فرمانِ باری میں اسی بات کی طرف اشارہ ہے: "اِنَّ اللّٰهَ بَالِغُ اَمْرِهٖ" یعنی اللہ تعالیٰ اپنا کام جس طرح چاہتا ہے پورا کر کے رہتا ہے' کوئی مراد اس سے فوت نہیں ہوتی اور کوئی مطلوب اس کو عاجز نہیں کرتا' آگے فرمایا "قَدْ جَعَلَ اللّٰهُ لِكُلِّ شَيْءٍ قَدْرًا" یعنی اللہ تعالیٰ نے ہر شے کا ایک اندازہ اپنے علم میں مقرر کر رکھا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہر چیز کا خواہ وہ فقر و غنٰی ہو یا مرض وصحت یا آسودہ حالی وتنگ حالی ہو سب کا ایک اندازہ' ایک انتہاء اور مدت مقرر کر رکھی ہے جس میں نہ تقدم ہو سکتا ہے اور نہ تأخر۔

سوال: ارشادِ خداوندی ہے: "وَالّٰٓـىِٕيْ يَىِٕسْنَ مِنَ الْمَحِيْضِ مِنْ نِّسَآىِٕكُمْ اِنِ ارْتَبْتُمْ فَعِدَّتُهُنَّ ثَلٰثَةُ اَشْهُرٍ" (اور جو عورتیں حیض آنے سے مایوس ہو چکی ہیں اگر تم کو شبہ ہو تو ان کی عدت تین مہینے ہے) اس آیت میں عورتوں کی عدت کو ہمارے شک کے ساتھ معلق کیا گیا ہے' حالانکہ ان کی عدت یہی ہے' خواہ ہمارا شک پایا جائے یا نہ پایا جائے؟

جواب: شک سے مراد حیض سے مایوس اور صغیرہ (کم عمر لڑکی) کی عدت کی مقدار سے جہالت ہے' اور معلق اس لئے کیا کہ جب سورۃ البقرۃ میں حیض والیوں کی عدت کا بیان نازل ہوا تو بعض صحابہؓ کہنے لگے' بڑی عمر والی اور کم عمر والی عورتوں کی عدت باقی رہ گئی۔ ہم نہیں جانتے کہ کبیرہ و صغیرہ کی عدت کتنی ہے؟ چنانچہ اس وجہ سے یہ آیت نازل ہوئی اور اسی لئے اس میں شک اور جہالت کی قید لگائی گئی۔

سوال: جب بعض علماء کے نزدیک مطلقہ بطلاقِ بائن کا نفقہ واجب ہے تو ان کے نزدیک اس ارشادِ مبارک: "وَاِنْ كُنَّ اُولَاتِ حَمْلٍ فَاَنْفِقُوْا عَلَيْهِنَّ" (اگر وہ (مطلقہ) عورتیں حمل

والیاں ہوں تو ان کو خرچ دو) کا کیا فائدہ ہوگا؟۔

جواب: اس کا فائدہ یہ ہے کہ وہ یہ وہم نہ کرے کہ جب طلاق کے بعد مدتِ حمل طویل ہو جائے حتی کہ عدتِ حامل کی مدت سے بھی گزر جائے تو نفقہ ساقط ہو جائے گا' چنانچہ اس وہم کا ازالہ اس ارشادِ عالی: ''حَتّٰی یَضَعْنَ حَمْلَهُنَّ'' (یہاں تک کہ رکھیں اپنا حمل) سے کر دیا۔

سوال: یہاں فرمایا ہے: ''سَیَجْعَلُ اللّٰهُ بَعْدَ عُسْرٍ یُّسْرًا'' (خدا تعالیٰ تنگی کے بعد جلدی فراغت بھی دے گا) جبکہ ایک دوسرے مقام پر یوں فرمایا ہے: ''اِنَّ مَعَ الْعُسْرِ یُسْرًا'' (تحقیق سختی کے ساتھ آسانی ہے) دونوں میں تطبیق کس طرح ہوگی؟

جواب: اللہ تعالیٰ کے ارشاد میں ''مع'' کا مطلب ''بعد'' ہے' اس لئے کہ دو ضدیں جمع نہیں ہوسکتیں۔

سوال: اس آیت کا کیا معنی ہے: ''وَكَاَیِّنْ مِّنْ قَرْیَةٍ عَتَتْ عَنْ اَمْرِ رَبِّهَا وَرُسُلِهٖ فَحَاسَبْنٰهَا حِسَابًا شَدِیْدًا وَّ عَذَّبْنٰهَا عَذَابًا نُّكْرًا'' (بہت سی بستیاں تھیں جنہوں نے اپنے رب کے حکم سے اور اس کے رسولوں سے سرکشی کی سو ہم نے ان (کے اعمال) کا سخت حساب کیا اور ہم نے ان کو بڑی بھاری سزا دی) اس آیت میں سرکشی کو ان بستیوں کی طرف منسوب کیا ہے' اور ''فحاسبنها'' اور ''عذّبنها'' کو لفظِ ماضی کے ساتھ بیان کیا ہے' حالانکہ حساب اور عذاب دونوں آخرت میں ہوں گے نہ کہ دنیا میں؟

جواب: اس کا معنی ہے کہ ان بستی والوں نے سرکشی کی۔ اور ماضی کے الفاظ اس لئے لائے تا کہ اس امر کی تحقیق و تقریر ہو۔ اس لئے کہ اللہ تعالیٰ کا جو وعدہ یا وعید آئندہ واقع ہوگی وہ ایسی ہی ہے جیسے واقع ہو چکی ہے' اس کی نظیر یہ ارشاد ہے: ''وَنَادٰی اَصْحٰبُ النَّارِ'' وغیرہ۔

# سورۃ التحریم

سوال: اگر ''صَالِحُ الْمُؤْمِنِیْنَ'' سے مراد فرد ہے تو وہ کونسا فرد ہے' نیز یہ ملائکہ جو جمع ہے اس کے مناسب بھی نہیں ہے' اور اگر اس سے مراد جمع ہے تو پھر مصحف شریف میں واؤ کے ساتھ مکتوب کیوں نہیں ہے؟۔

جوابِ اوّل: یہ فرد ہے جس سے مراد جمع ہے۔ جیسے آپ کہتے ہیں: ''لا یفعل هذا الفعل الصالح من الناس'' مراد آپ کی جنس ہوتی ہے۔ نیز جیسے آپ کہتے ہیں: ''لا یفعله من صلح منهم'' نیز یہ آیات اس کی نظیر ہیں: ''اِنَّ الْاِنْسَانَ لَفِیْ خُسْرٍ'' ''اِنَّ الْاِنْسَانَ خُلِقَ هَلُوْعًا''

وَالۡمَلَكُ عَلٰٓى اَرۡجَآئِهَا "ثُمَّ يُخۡرِجُكُمۡ طِفۡلًا" ایسے نظائر بہت زیادہ ہیں۔
جوابِ ثانی: جمع بھی مراد ہو سکتا ہے۔ لیکن مصحف میں بغیر واؤ کے لفظ کی بناء پر لکھا گیا ہے' ایسے الفاظ قرآنِ پاک میں بہت زیادہ ہیں جو لفظ کی بناء پر ہیں نہ کہ خط کی اصطلاح کے مطابق۔
سوال: اس کی کیا وجہ ہے کہ "وَالۡمَلٰٓئِكَةُ بَعۡدَ ذٰلِكَ ظَهِيۡرٌ" میں "ظھیر" فرمایا۔ ہے "ظھراء" نہیں فرمایا' حالانکہ یہ ملائکہ جو جمع ہے اس کی خبر ہے؟
جوابِ اوّل: یہ فرد ہے جمع کے قائم مقام ہے جیسے گزر چکا ہے۔
جوابِ ثانی: "ظھیر" اسم ہے' مصدر کے وزن پر جیسے زمیل' دبیب' ضلیل وغیرہ۔ اور مصدر میں واحد' تثنیہ و جمع برابر ہوتے ہیں۔
جوابِ ثالث: فعیل کے وزن میں واحد' تثنیہ اور جمع برابر ہوتے ہیں' دلیل یہ ہے "عَنِ الیمین وعن الشمال قعید"
سوال: یہ جملہ "بَعۡدَ ذٰلِكَ" ملائکہ کی اور ان کی نصرت کی عظمت بتانے کے لئے ہے' حالانکہ اللہ تعالیٰ کی نصرت زیادہ عظیم ہے؟
جواب: ملائکہ کی نصرت درحقیقت اللہ تعالیٰ کی ہی نصرت میں سے ہے گویا کہ اللہ تعالیٰ نے تمام فرشتوں کے ذریعہ اپنی نصرت کو ان کے فضل و شرف کی وجہ سے باقی تمام وجوہِ نصرت پر ترجیح دی ہے۔ اس لئے کہ اللہ تعالیٰ کی تمام فرشتوں کے ذریعہ نصرت فرمانا اکیلے جبریل یا صرف نیک مومنین کے ذریعہ نصرت فرمانے سے زیادہ عظیم ہے۔
سوال: ارشادِ الٰہی ہے: "عَسٰى رَبُّهٗٓ اِنۡ طَلَّقَكُنَّ اَنۡ يُّبۡدِلَهٗٓ اَزۡوَاجًا خَيۡرًا مِّنۡكُنَّ مُسۡلِمٰتٍ مُّؤۡمِنٰتٍ" الآیۃ (اگر پیغمبر تم عورتوں کو طلاق دے دیں تو ان کا پروردگار بہت جلد تمہارے بدلہ ان کو تم سے اچھی بیبیاں دے گا جو اسلام والیاں ایمان والیاں۔۔۔) اس آیت میں عورتوں کو ان صفات مذکورہ کے ساتھ موصوف کر کے ان کے لئے خیریت (اچھی ہونا) ثابت کی گئی ہے' اگر ان کی خیریت ان صفات کے ساتھ متصف ہونے کی بناء پر ہے تو یہ اس وقت ممکن ہے جب ازواج مطہراتؓ میں یہ صفات موجود نہ ہوں حالانکہ یہ صفات ازواجِ مطہرات میں بھی موجود تھیں؟
جواب: اس سے مراد ہے حضور کی رضا کی اتباع اور آپؐ کے قلب مبارک کے خیال رکھنے میں تم سے اچھی ہوں بایں ہمہ وہ ان صفات کے ساتھ بھی متصف ہوں جو دونوں میں مشترک ہیں۔
سوال: اس کی کیا وجہ ہے کہ تمام صفات کو واؤ کے بغیر ذکر کیا گیا مگر "ثیبات" اور "ابکار" کے درمیان واؤ لایا گیا ہے؟

جواب: کیوں کہ یہ دونوں متضاد صفات ہیں جو باقی صفات کے اجتماع کی طرح عورتوں میں جمع نہیں ہوسکتیں۔ اس لئے ان میں واؤ لانا ضروری ہوا اور اس کو واؤ ثمانیہ قرار دینا غلطی ہے کیونکہ واؤ ثمانیہ اگر کلام میں حذف کردی جائے تو کلام فاسد نہیں ہوتا جبکہ یہ ایسا نہیں ہے۔

سوال: یہ صفات مقامِ مدح میں ذکر کی گئیں ہیں لہٰذا ان کے ثیبہ ہونے میں کونسی مدح ہے؟۔

جواب: ثیبہ (بیوہ) ہونا بھی ایک لحاظ سے قابلِ مدح ہے کیونکہ ثیبہ بھی بعض مصالح کی وجہ سے قابلِ رغبت ہوتی ہے اور تجربہ وعقل میں بھی زیادہ ہوتی ہے۔ اور بکارت (کنواری ہونا) بھی ایک اعتبار سے قابلِ مدح ہے کیونکہ وہ بہت پاک وپاکیزہ ہوتی ہے۔ اور اس کی طرف رغبت اور ملاعبت بھی زیادہ ہوتی ہے۔

سوال: جب یہ فرمادیا کہ: ”لَا یَعْصُوْنَ اللّٰہَ مَآ اَمَرَھُمْ“ (نہیں نافرمانی کرتے اللہ کی جو حکم کرے ان کو) تو پھر آگے یہ کہنے کا کیا فائدہ ہے: ”وَیَفْعَلُوْنَ مَا یُؤْمَرُوْنَ“ (اور کرتے ہیں جو حکم کئے جاتے ہیں)؟

جواب: بعض کہتے ہیں کہ پہلے امر سے مراد عبادت وطاعت کا امر ہے اور دوسرے امر سے مراد اہلِ دوزخ کو عذاب دینے کا امر ہے۔ بعض کہتے ہیں کہ دوسرا امر تاکید کے لئے ہے۔

سوال: اس کی کیا وجہ ہے کہ: ”تَوْبَةً نَّصُوْحًا“ (توبہ خالص) فرمایا ہے، یوں کیوں نہیں فرمایا: ”تَوْبَةً نَصُوْحَةً“؟

جواب: اس لئے کہ فعول، مبالغہ کے اوزان میں سے ہے جس میں مذکر ومؤنث دونوں برابر ہیں، جیسے کہتے ہیں: ”امرأة صبور وشکور“ وغیرہ۔

سوال: جب یہ فرمادیا کہ: ”کَانَتَا تَحْتَ عَبْدَیْنِ“ (وہ دونوں دو بندوں کے نکاح میں تھیں) تو پھر آگے یہ فرمانے کی ضرورت کیا ہے: ”مِنْ عِبَادِنَا“ (ہمارے بندوں میں سے)؟

جواب: اس کا فائدہ یہ ہے کہ ان دونوں کی اپنی طرف تشریف وتخصیص کی نسبت سے مدح وثناء ثابت ہوئی۔ جیسے: ”وَعِبَادُ الرَّحْمٰنِ“ ہے۔ نیز جیسے: ”فَادْخُلِیْ فِیْ عِبَادِیْ“ ہے۔ یہ معنی مقصود میں مبالغہ ہے، اور وہ یہ ہے کہ انسان کو خود اس کا نیک ہونا کام آئیگا، دوسرے کا نیک ہونا کام نہیں آئے گا، اگرچہ وہ دوسرا نیکی اور اللہ تعالیٰ کے قرب کے اعلیٰ درجہ پر ہو۔

سوال: اس کی کیا وجہ ہے کہ یوں ارشاد فرمایا: ”وَکَانَتْ مِنَ الْقٰنِتِیْنَ“ (اور تھی فرمانبرداروں میں سے) یوں نہیں فرمایا: ”مِنَ الْقَانِتَاتِ“ (فرمانبردار عورتوں میں سے)؟

جوابِ اوّل: اس کا معنی یہ ہے کہ وہ فرمان بردار قوم میں سے تھیں یعنی اہلِ اطاعت میں سے

تھیں۔ گویا یوں فرمایا: ''وکانت من بنات الصالحین'' یعنی نیک لوگوں کی بیٹیوں میں سے تھیں۔

جوابِ ثانی: جب اللہ تعالیٰ نے ان کی نذر کو قبول فرمایا اور ان کو مردوں والا مرتبہ عطا فرمایا جو نذر کے قابل ہوا کرتے تھے تو ان کے ساتھ بعض موقعوں پر مذکر والا معاملہ کیا' جیسے فرمایا: ''وَارْکَعِیْ مَعَ الرَّاکِعِیْنَ'' نیز فرمایا: ''وَکَانَتْ مِنَ الْقَانِتِیْنَ'' یا پھر فواصل کی رعایت رکھنے کے لئے ایسا فرمایا ہے۔

# سورۃ الملک

سوال: ارشادِ عالی ہے: ''اَلَّذِیْ خَلَقَ الْمَوْتَ وَالْحَیٰوۃَ'' (جس نے پیدا کیا موت کو اور زندگی کو) موت کو حیات پر مقدم کرنے کی کیا وجہ ہے؟

جواب: موت کو اللہ تعالیٰ نے اس لئے مقدم کیا کہ موت اوّلاً پیدا کی گئی ہے۔ ابن عباسؓ فرماتے ہیں: اس سے مراد دنیا میں موت کو اور آخرت میں حیات کو پیدا کرنا ہے' اگر تسلیم کرلیا جائے کہ اس سے مراد حیات فی الدنیا ہے تو موت اس پر مقدم ہے کیونکہ ارشادِ ربانی ہے: ''وَکُنْتُمْ اَمْوَاتًا فَاَحْیَاکُمْ ثُمَّ یُمِیْتُکُمْ ثُمَّ یُحْیِیْکُمْ''۔

سوال: اس آیت کریمہ سے کیا مراد ہے: ''مَا تَرٰی فِیْ خَلْقِ الرَّحْمٰنِ مِنْ تَفٰوُتٍ'' (نہ دیکھے گا تو بیچ پیدائش رحمٰن کے کوئی خلل) جب کہ ہم اس کی صنعت میں عظیم تفاوت دیکھتے ہیں' کیونکہ تمام اضداد بھی اس کے پیدا کردہ ہیں اور ان میں بھی تفاوت ہے۔ تمام آسمانوں میں بھی چھوٹے بڑے ہونے اور بلند و پست ہونے کے اعتبار سے تفاوت ہے؟۔

جواب: یہاں تفاوت سے مراد آسمانوں کی پیدائش میں کوئی خلل عیب و نقص ہے' جس کی تائید اس سے ہوتی ہے: ''فَارْجِعِ الْبَصَرَ هَلْ تَرٰی مِنْ فُطُوْرٍ'' یعنی سو تو پھر نگاہ ڈال کر دیکھ لے کہیں تجھ کو کوئی خلل نظر آتا ہے۔

سوال: ارشادِ باری ہے: ''ءَ اَمِنْتُمْ مَنْ فِی السَّمَآءِ'' (یا نڈر ہو گئے تم اس سے جو کہ آسمان میں ہے) اللہ تعالیٰ نہ آسمان میں ہے اور نہ غیرِ آسمان میں' اللہ کی ذات تو ہر مکان سے منزہ ہے؟۔

جوابِ اوّل: اس کا مطلب ہے: ''من ملکوته فی السماء'' یعنی اس ذات سے بے خوف ہو گئے ہو جس کی بادشاہت آسمانوں میں ہے' اس لئے کہ آسمان اللہ تعالیٰ کے فرشتوں کا مسکن' اس کے عرش و کرسی اور لوحِ محفوظ کا محل ہے۔ آسمان سے ہی خدائی فیصلے' کتابیں اور اوامر و نواہی

اتر تے ہیں۔

جوابِ ثانی: لوگ تشبیہ کے معتقد تھے کہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ آسمان میں ہیں اس لئے ان کے اعتقاد کے مطابق ان سے خطاب کیا گیا ہے۔

# سورۃ القلم

سوال: ارشادِ خداوندی ہے: ''وَلَا يَسْتَثْنُونَ'' (انشاء اللہ بھی نہ کہتے تھے) کیا وجہ ہے کہ شرط کو استثناء کا نام دیا ہے؟

جواب: اس لئے کہ وہ اس کے معنی میں ہے اس لئے کہ ''لا خرجن ان شاء اللّٰہ'' اور ''لا اخرج الا ان یشاء اللّٰہ'' دونوں کا معنی ایک ہے، حضرت عکرمہ فرماتے ہیں: اس سے حقیقۃً استثناء مراد ہے یعنی وہ مساکین کے حق کو مستثنیٰ کرتے تھے، لیکن جمہور علماء پہلی بات کے قائل ہیں۔

سوال: ارشادِ الٰہی ہے: ''قَالَ اَوْسَطُهُمْ اَلَمْ اَقُلْ لَّكُمْ لَوْلَا تُسَبِّحُوْنَ'' (ان میں جو اچھا آدمی تھا وہ کہنے لگا کہ کیوں میں نے تم کو کہا نہ تھا اب تسبیح کیوں نہیں کرتے) اس کی کیا وجہ ہے کہ ان کے اوسط (کسی قدر اچھا آدمی) نے استثنا کو تسبیح کا نام دیا ہے؟ کیونکہ اس کا معنی ہے کہ تم استثناء کیوں نہیں کرتے ہو؟

جوابِ اوّل: استثناء کو تسبیح کے ساتھ موسوم اس لئے کیا کہ یہ دونوں معنی تعظیم میں شریک ہیں۔ اس لئے کہ استثناء کہتے ہیں کہ اس کے سپرد کرنا اور اس بات کا اقرار کرنا کہ کوئی شخص اس کی مشیت کے بغیر کچھ نہیں کرسکتا۔ اور تسبیح کا معنی ہوتا ہے اس کو ہر برائی سے منزّہ قرار دینا۔

جوابِ ثانی: ان کا استثناء سبحان اللہ کہنا تھا۔

جوابِ ثالث: اس کا معنی یہ ہے کہ تم اپنی جانوں اور مالوں کو فقراء کے حق سے پاک کیوں نہیں کرتے؟

سوال: اس کا کیا مطلب ہے: ''وَقَدْ كَانُوْا يُدْعَوْنَ اِلَى السُّجُوْدِ'' (یہ لوگ سجدہ کی طرف بلائے جایا کرتے تھے) حالانکہ آخرت میں مکلّف بنانا تو نہیں ہوگا؟

جواب: ان کو مکلّف کے طور پر نہیں بلایا جائے گا البتہ دنیا میں ترکِ سجود پر توبیخ وتشدید ہوگی۔

سوال: یہ کیسے فرمایا کہ یہ لوگ سجدہ کی طرف بلائے جاتے تھے حالانکہ وہ نماز کی طرف بلائے جاتے تھے، کیونکہ آیت سے مراد یہ ہے کہ جب مؤذن ''حَيَّ عَلَى الصَّلٰوةِ'' کہتا تھا تو اس کی اذان سے وہ جماعت کے لئے بلائے جاتے تھے؟

جواب: اللہ تعالیٰ نے نماز کو سجدہ سے تعبیر کیا ہے' اس لئے کہ سجدہ بھی نماز کا ایک رکن ہے' بلکہ نماز کا رکنِ اعظم اور نماز کی اصل غایت ہے۔ جیسا کہ نماز کو رکوع اور قرآن سے بھی (بعض جگہوں پر) تعبیر کیا گیا ہے۔

سوال: یہ کیسے فرمایا: ''وَهُمْ سٰلِمُوْنَ'' (اور وہ صحیح سالم تھے) حالانکہ نماز کے واجب ہونے کے لئے صحت شرط نہیں ہے؟۔

جواب: نماز باجماعت کے لئے نکلنے کا وجوب صحت کے ساتھ مشروط ہے' یہی مراد ہے۔

# سورۃ الحاقۃ

سوال: کیا وجہ ہے کہ ''بِرِیْحٍ صَرْصَرٍ'' فرمایا ہے: یوں نہیں فرمایا: ''بِرِیْحٍ صَرْصَرَةٍ'' جیسے یہ فرمایا ہے: عَاتِیَةٍ'' حالانکہ یہ مؤنث کی صفت ہے؟۔

جواب: اس کی وجہ یہ ہے کہ ''صرصر'' ایسا وصف ہے جو ''ریح'' کے ساتھ مخصوص ہے کسی اور کے ساتھ یہ موصوف نہیں ہوتا ہے' لہٰذا یہ حائض' طامث اور حامل جیسے الفاظ کے مشابہ ہوا۔ بخلاف ''عاتیۃ'' کے کیوں کہ یہ ''ریح'' کے علاوہ دوسرے اسماء مؤنثہ کے ساتھ موصوف ہوتا ہے۔

سوال: ارشاد فرمایا: ''فَتَرَى الْقَوْمَ فِيْهَا صَرْعٰى'' (تو تو اس قوم کو گرا ہوا دیکھتا ہے) حالانکہ نبی ﷺ نے نہ ان کو دیکھا اور نہ وہ ان کو اس میں دیکھتے تھے؟۔

جواب: ''فِیْهَا'' ظرف ہے ''صَرْعٰی'' کا' نہ کہ ''فتری'' کا۔ اور رؤیت سے مراد علم اور اعتبار کی رؤیت ہے۔ لہٰذا معنی یہ ہو جائے گا کہ پس تو ان کو ان راتوں اور دنوں میں ہمارے باخبر کرنے سے گرا ہوا جان لینا کہ گویا تو ان کو دیکھ رہا ہے۔

سوال: اس آیت سے کیا مراد ہے: ''فَاِذَا نُفِخَ فِی الصُّوْرِ نَفْخَةٌ وَّاحِدَةٌ........ يَوْمَئِذٍ تُعْرَضُوْنَ'' (پھر جب صور میں یکبارگی پھونک ماردی جائیگی۔۔۔۔ اس دن حساب کے واسطے تم پیش کئے جاؤ گے) یہاں نفخۂ اولیٰ مراد ہے' جس کی دلیل یہ ہے کہ اس کے بعد عالمِ علوی و سفلی کے فساد کا ذکر ہے۔ حالانکہ ''عرض'' (دربارِ الٰہی میں پیشی) تو نفخۂ ثانیہ کے بعد ہوگا' اور ان دو نفخوں کے مابین اللہ تعالیٰ کی مرضی کے مطابق طویل زمانہ بھی ہوگا' لہٰذا یہ کیسے فرمایا: ''يَوْمَئِذٍ تُعْرَضُوْنَ'' یعنی اس دن تم پیش کئے جاؤ گے؟۔

جواب: ''یوم'' کو اس وسیع وقت کی جگہ میں رکھا گیا ہے جس میں دونوں نفخے وقوع پذیر ہوں گے اور ان کے مابعد کے امور واقع ہوں گے۔

سوال: اس کا کیا معنیٰ ہے: ''اِنِّیْ ظَنَنْتُ اَنِّیْ مُلٰقٍ حِسَابِیَهْ'' (تحقیق میں جانتا تھا کہ میں ملوں گا اپنے حساب سے)؟

جواب: ''ظننت'' ''تیقنت'' کے معنیٰ میں ہے' ظن کا لفظ یقین کے معنیٰ میں بھی آتا ہے' جیسے ''اَلَّذِیْنَ یَظُنُّوْنَ اَنَّهُمْ مُّلٰقُوْا رَبِّهِمْ''۔

سوال: اس جگہ ارشاد فرمایا: ''فَلَیْسَ لَهُ الْیَوْمَ هٰهُنَا حَمِیْمٌ وَّ لَا طَعَامٌ اِلَّا مِنْ غِسْلِیْنٍ'' (سو آج اس شخص کا نہ کوئی دوست دار ہے اور نہ اس کو کوئی کھانے کی چیز نصیب ہے بجز زخموں کے دھوون کے) ایک دوسری جگہ پر فرمایا: ''اِنَّ شَجَرَةَ الزَّقُّوْمِ طَعَامُ الْاَثِیْمِ'' (بے شک زقوم کا درخت بڑے مجرم کا کھانا ہوگا) اور دوسری جگہ میں یوں فرمایا ہے: ''ثُمَّ اِنَّكُمْ اَیُّهَا الضَّآلُّوْنَ الْمُكَذِّبُوْنَ لَاٰكِلُوْنَ مِنْ شَجَرٍ مِّنْ زَقُّوْمٍ فَمَالِئُوْنَ مِنْهَا الْبُطُوْنَ'' (پھر اے گمراہو تکذیب کرنے والو تم زقوم کے درخت سے کھاؤ گے پس اس سے اپنے پیٹوں کو بھرو گے) اور ایک دوسرے مقام پر یہ فرمایا ہے: ''اُولٰٓئِكَ مَا یَاْكُلُوْنَ فِیْ بُطُوْنِهِمْ اِلَّا النَّارَ'' (یہ لوگ نہیں کھاتے اپنے پیٹوں میں مگر آگ) ان میں تطبیق کیسے ہوگی؟

جوابِ اوّل: اس کا معنیٰ ہے: ''الا من غسلین وما اشبهه'' یعنی زخموں کے دھوون سے اور اس کے مشابہ چیزوں سے۔ یا غسلین کو ہر تکلیف دہ اور برے کھانے کی جگہ رکھا گیا ہے۔

جوابِ ثانی: عذاب مختلف انواع کا ہوگا۔ اور اہلِ عذاب کے مختلف طبقات ہوں گے' بعض معذّبین زقوم کھانے والے ہوں گے' بعض غِسْلِیْنَ اور بعض ضَرِیْع کھائیں گے۔

سوال: اس کا کیا معنیٰ؟ ''اِنَّهُ لَقَوْلُ رَسُوْلٍ كَرِیْمٍ'' یعنی یہ قرآن جبریل علیہ السلام کا قول ہے' حالانکہ یہ اللہ تعالیٰ کا قول ہے نہ کہ جبریلؑ کا؟۔

جواب: اس کا معنیٰ اکثر علماء کے نزدیک یہ ہے کہ اس سے مراد نبی ﷺ ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ آپ یہ قرآن بوجہ رسالت منجانب اللہ کہتے ہیں نہ کہ اپنی جانب سے جیسے تم خیال کرتے ہو۔

سوال: ارشاد ہوتا ہے: ''فَمَا مِنْكُمْ مِّنْ اَحَدٍ عَنْهُ حٰجِزِیْنَ'' (پھر تم میں کوئی ان کا اس سزا سے بچانے والا بھی نہ ہوتا) یہاں مفرد کو جمع کے ساتھ موصوف کیا ہے؟

جواب: اس طرح کا سوال و جواب سورۃ البقرۃ میں گزر چکا ہے۔

## سورۃ المعارج

سوال: ارشادِ خداوندی ہے: ''اِنَّ الْاِنْسَانَ خُلِقَ هَلُوْعًا'' (تحقیق آدمی پیدا کیا گیا ہے بے صبر)

حالانکہ پیدا ہونے کی حالت میں وہ ان صفات کے ساتھ موصوف نہ تھا جو ذکر کی گئیں ہیں؟۔
جواب: "هَلُوعًا" حالِ مقدرہ ہے' معنی یہ ہے کہ اس میں بے صبری مقدر کی گئی ہے۔ جیسے "محلقین رؤسکم" حالانکہ وہ دخولِ مکہ کے وقت سر منڈے ہوئے نہیں تھے۔
سوال: ان دو آیتوں میں کیا فرق ہے: (۱) "اَلَّذِیْنَ هُمْ عَلٰی صَلَاتِهِمْ دَائِمُوْنَ" (وہ جو اوپر نماز اپنی کے ہمیشہ رہنے والے ہیں)۔
(۲) "وَالَّذِیْنَ هُمْ عَلٰی صَلَاتِهِمْ یُحَافِظُوْنَ" (اور وہ لوگ کہ وہ اوپر نماز اپنی کے محافظت کرنے والے ہیں)۔
جواب: دوام سے مراد مواظبت اور ہمیشہ کے لئے ملازمت (پابندی) ہے۔
بعض کہتے ہیں کہ اس سے مراد ان کا نماز میں اس طرح سکون سے کھڑا ہونا ہے کہ دائیں بائیں التفات نہ کریں۔ واختارہ الزجاج۔ اور زجاج کہتا ہے کہ دائم بمعنی ساکن ہے۔ جیسے حدیث شریف میں آیا ہے' حضور ﷺ نے ماءِ دائم (ٹھہرے ہوئے پانی) میں پیشاب کرنے سے منع فرمایا ہے۔ میں کہتا ہوں کہ کلمہ "علی" اس معنی کی نفی کرتا ہے' کیونکہ یوں نہیں کہا جاتا ہے. ھوعلی صلاتہ ساکن" بلکہ یوں کہتے ہیں: "ھوصلاتہ ساکن" اور محافظت سے مراد نماز کو اس کے جملہ آداب وسنن کا خیال رکھتے ہوئے اکمل طریقہ سے ادا کرنا ہے۔ معلوم ہوا کہ دوام کا تعلق نفسِ صلوٰۃ سے ہے اور محافظت کا تعلق احوالِ صلوٰۃ سے ہے۔

# سورۃ نوح

سوال: اس سے کیا مراد ہے: "وَیُؤَخِّرْکُمْ اِلٰی اَجَلٍ مُّسَمًّی" (اور تم کو وقت مقرر تک مہلت دے گا) اگر اس تاخیر سے مراد ان کو اس مدت میں مہلت دینا ہے جو ازل میں ان کے لئے مقدر ہو چکی ہے تو یہ محال ہے' کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: "وَلَنْ یُّؤَخِّرَ اللّٰهُ نَفْسًا اِذَا جَآءَ اَجَلُهَا" نیز ارشاد ہے: "اِنَّ اَجَلَ اللّٰهِ اَذَا جَآءَ لَا یُؤَخَّرُ" اور اگر اس سے مراد ان کو اس مدت کے آنے تک مہلت دینا ہے جو ان کے لئے ازل میں مقدر ہوئی ہے تو پھر ان کی وجہ تخصیص میں کیا فائدہ ہے؟ وہ اور دوسرے سب اس میں برابر ہیں کہ ان سے وجودِ ایمان مقدر ہو یا عدمِ ایمان؟
جواب اوّل: اس کا معنی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ بتقدیر ایمان تمہاری مدتوں کی انتہاء تک تم سے عذاب مؤخر رکھیں گے۔ چنانچہ وہ دنیا میں عذاب نہیں دیں گے جیسے تمہارے علاوہ دوسری قوموں کو دنیا میں عذاب دیا۔

جوابِ ثانی: اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے یہ فیصلہ فرمایا تھا کہ اگر یہ لوگ ایمان لے آئے تو ان کو ہزار برس کی عمر دیں گے اور اگر ایمان نہ لائے تو پانچ سو برس کے پورا ہونے پر ہی عذاب دے کر ہلاک کردیں گے' چنانچہ ان سے کہا گیا کہ تم ایمان لے آؤ اللہ تعالیٰ اس مدت تک عذاب مؤخر کردیں گے۔

سوال: ان کو استغفار کا حکم کیسے دیا گیا' استغفار تو مومن کی طرف سے درست ہوتا ہے نہ کہ کافر کی طرف سے؟۔

جواب: اس کا معنی یہ ہے کہ تم اپنے رب سے اللہ تعالیٰ کے ساتھ شرک کرنے سے استغفار کرو۔

سوال: اس ارشاد کا کیا مطلب ہے: ''وَاللّٰہُ اَنۡۢبَتَکُمۡ مِّنَ الۡاَرۡضِ نَبَاتًا'' (اور اللہ نے اُگایا تم کو زمین سے ایک طرح کا اگانا) حیوان تو نبات کی ضد ہے' اس پر نبات ہونے کا اطلاق کیسے کیا گیا؟

جواب: یہ اصل میں بواسطۂ آدمؑ زمین سے نکالنے اور پیدا کرنے سے استعارہ ہے۔

سوال: حضرت نوح علیہ السلام نے اپنے اس قول سے اپنی قوم کے خلاف کیسے بد دعا فرمائی: ''وَلَا تَزِدِ الظّٰلِمِیۡنَ اِلَّا ضَلٰلًا'' (اور مت زیادہ کر الٰہی ظالموں کو مگر گمراہی میں) حالانکہ حضرت نوحؑ ان کی ہدایت و رہنمائی کے لئے ہی مبعوث فرمائے گئے تھے؟

جواب: حضرت نوح علیہ السلام نے بد دعا اس وقت فرمائی جب اللہ تعالیٰ نے ان کو یہ بتادیا کہ یہ لوگ اب ایمان لانے کے نہیں۔

سوال: اس سے کیا مراد ہے: ''وَلَا یَلِدُوۡۤا اِلَّا فَاجِرًا کَفَّارًا'' (اور نہ جنیں گے مگر بدکار کفر کرنے والا) حضرت نوحؑ نے ان کو بحالتِ ولادت ہی کفر و فجور کے ساتھ موصوف کیا' یہ ان کو کیسے معلوم ہوا کہ ان کے محض فاجر اور کافر ہی اولاد پیدا ہوگی؟۔

جواب: ان کے جو اولاد بھی پیدا ہوگی وہ بالغ ہونے کے بعد کفر و فجور ہی کرے گی یہ بات حضرت نوحؑ کو باطلاعِ خداوندی معلوم ہوئی تھی یا حضرت نوحؑ نے ان کو مآل کے اعتبار سے کفر و فجور کے ساتھ موصوف کیا اور وہ بھی اللہ تعالیٰ کے بتانے پر کیا۔

# سورۃ الجن

سوال: اس کا کیا سبب ہے کہ اس آیتِ مبارکہ میں: ''وَاَنَّہٗ لَمَّا قَامَ عَبۡدُ اللّٰہِ'' (اور یہ کہ جس وقت کھڑا ہوا بندہ خدا کا) ''عبداللہ'' فرمایا' رسول اللہ یا نبی اللہ نہیں فرمایا۔ ظاہر ہے کہ اس سے مراد حضور ﷺ ہی ہیں؟۔

جواب: اس کی وجہ یہ ہے کہ نبی ﷺ اس مقام میں ان کی طرف بھیجے نہیں گئے تھے' بلکہ وہ لوگ اتفاق سے حضورؐ کے پاس سے گزرے تھے' اگر اللہ تعالیٰ رسول اللہ یانبی اللہ کہتے تو اس سے یہ وہم ہوتا کہ ان لوگوں کی طرف رسالت کی ادائیگی کا قصد کیا گیا ہے۔

سوال: اس سے کیا مراد ہے: ''قُلْ اِنْ اَدْرِیْٓ اَقَرِیْبٌ مَّا تُوْعَدُوْنَ اَمْ یَجْعَلُ لَهٗ رَبِّیْٓ اَمَدًا'' (آپ کہئے کہ مجھ کو معلوم نہیں کہ جس چیز کا تم سے وعدہ کیا جاتا ہے وہ نزدیک ہے یا میرے پروردگار نے اس کے لئے کوئی مدت دراز مقرر کر رکھی ہے) جب کہ ''اَمَد'' غایت کا نام ہے اور غایت زمانہ قریب اور زمانہ بعید دونوں ہوتی ہیں' اس کی تائید اس ارشادِ خداوندی سے ہوتی ہے: ''تَوَدُّ لَوْ اَنَّ بَیْنَهَا وَ بَیْنَهٗٓ اَمَدًا بَعِیْدًا''؟

جواب: ''قریب'' سے مراد حال ہے' اور ''امد'' سے مراد مدت ہے خواہ قریب ہو یا بعید

# سورۃ المزمّل

سوال: ارشاد خداوندی ہے: ''اِنَّا سَنُلْقِیْ عَلَیْکَ قَوْلًا ثَقِیْلًا'' (تحقیق ہم اب ڈالیں گے اوپر تیرے بات بھاری) قرآنِ حکیم کے ''ثقل'' کے ساتھ موصوف ہونے کا کیا معنی ہے؟

جواب: اس کے چند مطلب ہیں: ایک یہ ہے کہ وحی کا نزول آنحضرت ﷺ پر ثقل کا باعث ہوتا تھا حتیٰ کہ سردی کے دنوں میں بھی آپ پسینہ مبارک سے شرابور ہو جاتے تھے۔ دوسرا یہ کہ قرآن حکیم کے تکلیفی احکام پر عمل شاق اور ثقیل ہے۔ تیسرا یہ کہ ثقل سے مراد قیامت کے دن میزانِ عمل میں ثقل ہے' چوتھا مطلب یہ ہے کہ اس سے مراد منافقین پر ثقل ہے' پانچواں مطلب یہ ہے کہ یہ ایسا کلام ہے جو وزن و ثقل رکھتا ہے۔ جیسے عقلمند آدمی کے لئے کہتے ہیں: رزین راجح' چھٹا معنی یہ ہے کہ ثقل سے مراد ہے کہ حقیر نہیں ہے کیونکہ حقیر وادنی کلام خفیف ہوتا ہے۔

سوال: ارشادِ ربانی ہے: ''اَلسَّمَآءُ مُنْفَطِرٌۢ بِهٖ'' (آسمان پھٹ جانے والا ہے ساتھ اس کے) حالانکہ ''السماء'' مؤنث ہے تو اس اعتبار سے ''منفطرۃ بہ'' ہونا چاہئے؟

جوابِ اوّل: یہ نسبت پر محمول ہے' یعنی ذات انفطار۔

جوابِ ثانی: ''السماء'' کا ذکر چھت کے معنی میں ہے۔

جوابِ ثالث: اس کا معنی ہے آسمان ایسی شے ہے جو پھٹ جانے والی ہے۔

جوابِ رابع: ''السماء'' مذکر و مؤنث دونوں طرح استعمال ہوتا ہے۔

سوال: ارشاد فرمایا: ''وَاللّٰهُ یُقَدِّرُ الَّیْلَ وَالنَّهَارَ ؕ عَلِمَ اَنْ لَّنْ تُحْصُوْهُ'' (اور اللہ اندازہ کرتا

ہے رات کو اور دن کو جانا یہ کہ ہرگز نہ نباہ سکو گے تم اس کو) حالانکہ یوں ہونا چاہئے: ''ان لن تحصوھما'' یعنی تم ہرگز دن و رات کی ساعات کی مقدار نہیں جان سکتے؟

جواب: ضمیر محذوف مصدر کی طرف راجع ہے: معنی یہ ہے کہ تم ان دونوں کی مقدار ہرگز شمار نہیں کر سکتے۔

# سورۃ المدثر

سوال: ''فَذٰلِکَ یَوْمَئِذٍ یَّوْمٌ عَسِیْرٌ'' (پس وہ اس دن دن بھاری ہے) فرمادینے کے بعد پھر اس ارشاد کا کیا فائدہ ہے''غَیْرُ یَسِیْرٍ'' (نہیں آسان)؟

جوابِ اوّل: اس کا معنی یہ ہے کہ وہ دن ایسا سخت ہوگا کہ پھر اس کے آسان ہو جانے کی امید نہ کی جائے۔ جیسے دنیا میں سختی کے بعد آسانی کی امید کی جاتی ہے۔

جوابِ ثانی: یہ ماقبل کی تاکید ہے۔

سوال: اس ارشادِ الٰہی میں تکرار کا کیا فائدہ ہے: ''لَا تُبْقِیْ وَلَا تَذَرُ'' (نہیں باقی رکھتی اور نہیں چھوڑتی) جب کہ دونوں کا معنی ایک ہے؟۔

جوابِ اوّل: اس کا معنی یہ ہے کہ وہ آگ کافروں کا گوشت باقی نہ رہنے دے گی اور ان کی ہڈیاں نہ چھوڑے گی۔

جوابِ ثانی: اس کا معنی یہ ہے کہ وہ آگ ان کو زندہ بھی باقی نہ رکھے گی اور موت دے کر بھی نہ چھوڑے گی۔

سوال: ارشادِ خداوندی ہے: ''وَلَا یَرْتَابَ الَّذِیْنَ اُوْتُوا الْکِتٰبَ وَالْمُؤْمِنُوْنَ'' (اور نہ شک کریں وہ لوگ کہ دیئے گئے ہیں کتاب اور ایمان والے) جب کہ اس سے پہلے ان کا وصف بیان ہوا کہ تاکہ اہلِ کتاب سننے کے ساتھ ہی یقین کرلیں اور ایمان والوں کا ایمان بڑھ جائے اس سے ان کا شک نہ کرنا بھی معلوم ہوگیا تھا کیوں کہ تمام جملوں کا تعلق داروغہ جہنم کی تعداد کے ساتھ ہے' اور مطلب یہ ہے کہ اہلِ کتاب حضورﷺ کی بتائی ہوئی بات کو اپنی کتاب تورات کے مطابق پا کر یقین کرلیں کہ آنحضرتؐ کی بات حق ہے اور اس سے اہلِ کتاب میں سے ایمان لانے والوں کا اپنے نبیؑ اور قرآن پر ایمان بھی بڑھ جائے کہ آنحضرتؐ نے جو کچھ ان کو بتایا وہ ان کی کتاب کے مطابق ہے؟ بہر حال! جب سابقہ جملوں سے ان کا عدمِ ارتیاب معلوم ہوگیا ہے تو پھر دوبارہ اس ارشاد کے فرمانے سے کیا فائدہ ہے؟۔

جواب: اس کا فائدہ تاکید بھی ہے اور ان شک کے علاوہ دوسرے شک کرنے والوں کی حالت پر تعریض بھی ہے یعنی کفار و منافقین کی حالت پر۔ چنانچہ معنی ہوں گے کہ یہ لوگ بھی شک نہ کریں جیسے ان لوگوں نے شک کیا تھا۔

سوال: اس سے کیا مراد ہے: ''مَا ذَآ اَرَادَ اللّٰهُ بِهٰذَا مَثَلًا'' (کیا ارادہ کیا ہے اللہ نے ساتھ اس مثال کے) یعنی جہنم کے داروغوں کی تعداد کو انیس میں منحصر کرنے سے اللہ کا کیا مقصود ہے ظاہر یہ ہے مثال تو نہیں ہے؟۔

جوابِ اوّل: یہ استعارۃً ہے عجیب وغریب کلام سے۔ مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس عجیب وغریب عدد سے کس چیز کا ارادہ کیا ہے؟ اور اس میں کونسی حکمت ہے کہ جہنم کے داروغوں کی تعداد انیس مقرر کی ہے' بیس نہیں کی۔

جوابِ ثانی: یہاں ''مثل'' صفت کے معنی میں ہے۔ جیسے اس فرمانِ الٰہی میں ہے ''مثل الجنة التی وعد المتقون'' معنی یہ ہوگا کہ اللہ تعالیٰ نے اس عدد سے جہنم کے داروغوں کی کس صفت کا ارادہ کیا ہے؟

سوال: ان دو جملوں میں تطبیق کس طرح ہوگی' پہلا جملہ ہے: ''یَتَسَآءَلُوْنَ عَنِ الْمُجْرِمِیْنَ'' (پوچھتے ہوں گے مجرموں سے) اور دوسرا جملہ ہے ''مَا سَلَکَکُمْ فِیْ سَقَرَ'' (کیا چیز لے گئی تم کو بیچ دوزخ کے) کیوں کہ پہلے جملہ سے معلوم ہوتا ہے کہ مجرموں کے بارے سوال ہوگا اور دوسرے جملہ سے معلوم ہوتا ہے کہ مجرموں سے سوال ہوگا۔ ہونا یوں چاہیئے کہ وہ مجرموں سے پوچھیں گے یا وہ آپس میں پوچھیں گے کہ ان کو کس چیز نے دوزخ میں داخل کیا' یعنی اہلِ جنت ایک دوسرے سے جہنمیوں کے بارے میں پوچھیں گے؟

جوابِ اوّل: ''مَاسَلَکَکُمْ'' ان کے آپس کے سوال کا بیان نہیں ہے' بلکہ یہ ان کے قول کی حکایت ہے جن سے مجرموں کے بارے میں سوال کیا گیا ہوگا' یعنی جب جنتیوں کے مابین مجرمین کی بات چل رہی ہوگی تو مسئولین جواب دیں گے۔ اس لئے کہ جب اللہ تعالیٰ مومنین کو ان کے گناہوں کے بقدر جہنم کا عذاب دینے کے بعد جہنم سے نکال کر جنت میں داخل کر دیں گے تو بعض اصحابِ یمین' مجرمین کی حالت اور ان کے خلود کا سبب ان سے پوچھیں گے تو مسئولین کہیں گے: ہم نے ان سے پوچھا تھا کہ ''مَا سَلَکَکُمْ فِیْ سَقَرَ'' الآیۃ اور جبکہ یہ مومنین جہنم سے نکل کر جنت میں داخل ہونے کے بعد اصحابِ یمین بن گئے ہونگے۔

جوابِ ثانی: اصحابِ یمین سے مراد ملائکہ علیہم السلام ہیں۔

جوابِ ثالث: اطفال (بچے) ہیں' اس لئے کہ وہ اپنے گناہوں کے بدلہ گروی نہیں رکھے جائیں گے کیونکہ وہ گناہوں سے معصوم تھے۔

# سورۃ القیامۃ

سوال: اس فرمانِ مبارک کا کیا معنی ہے: ''فَاِذَا قَرَاْنٰهُ فَاتَّبِعْ قُرْاٰنَهٗ'' (پس جس وقت پڑھیں ہم اس کو پس پیروی کر پڑھنے ہمارے کی) جب کہ نبی کریم ﷺ پر پڑھنے والے حضرت جبرائیل علیہ السلام ہیں؟

جوابِ اوّل: اس کا معنی یہ ہے کہ پس جب ہم اس کو آپ کے سینہ میں جمع کر دیں۔ اس کی تائید پچھلی آیت: ''اِنَّ عَلَيْنَا جَمْعَهٗ وَقُرْاٰنَهٗ'' سے ہوتی ہے یعنی بے شک ہمارے ذمے ہے آپ کے قلب میں اس کا جمع کر دینا پس آپ اسے جلدی نہ پڑھیں قبل اس کے کہ اس کا حفظ پورا ہو۔

جوابِ ثانی: قراءت (پڑھنا) کی اضافت اللہ تعالیٰ کی طرف اس لئے کی گئی ہے کہ جبریل علیہ السلام بھی اللہ کے حکم سے ہی اسے پڑھتے تھے' جیسا کہ محض حکم کی وجہ سے بادشاہوں اور حکمرانوں کی طرف افعال کو منسوب کر دیا کرتے ہیں' حالانکہ ان افعال کو براہِ راست اور بلاواسطہ اس کے وزراء اور متبعین بجالانے والے ہوتے ہیں۔

سوال: اس سے کیا مراد ہے: ''وُجُوْهٌ يَّوْمَئِذٍ نَّاضِرَةٌ اِلٰى رَبِّهَا نَاظِرَةٌ'' (کتنے چہرے اس دن تازے ہیں طرف پروردگار اپنے کے دیکھنے والے ہیں) حالانکہ دیکھنے کے ساتھ آنکھیں موصوف ہوتی ہیں اور ادراک آنکھ کا کام ہے نہ کہ چہرے کا؟۔

جواب: بعض علماء کہتے ہیں کہ یہاں ''وجوہ'' سے مراد چہرہ نہیں ہے جو کہ ایک عضوِ جسم ہے بلکہ قیامت کے دن کے اہلِ سعادت و وجاہت مراد ہیں۔ میرے خیال میں یہ جواب اس ارشادِ خداوندی کے مطابق نہیں ہے جو یہ ہے: ''وَوُجُوْهٌ يَّوْمَئِذٍ بَاسِرَةٌ'' (اور بہت سے چہرے اس روز بدرونق ہوں گے۔) کیوں کہ لفظ بدرونقی کے ساتھ چہرے ہی موصوف ہوتے ہیں' جو کہ عضوِ جسم ہے۔ علاوہ ازیں اس بات کی تائید کہ اس آیت سے معروف اعضاء مراد ہیں یہ ارشادِ باری بھی ہے: ''تَعْرِفُ فِيْ وُجُوْهِهِمْ نَضْرَةَ النَّعِيْمِ''

سوال: جب نطفہ منی ہی کو کہتے ہیں تو اس ارشادِ مبارک میں: ''اَلَمْ يَكُ نُطْفَةً مِّنْ مَّنِيٍّ'' (کیا نہ تھا ایک قطرہ منی) نطفہ کہنے کا کیا فائدہ ہے؟

جواب: یہاں ''نطفة'' قطرہ کے معنی میں مستعمل ہے کیونکہ لفظِ نطفہ کا اطلاق ماءِ قلیل و کثیر

دونوں پر ہوتا ہے۔ جیسے حدیث مبارک ہے: ''حتی یسیر الراکب بین النطفتین لا یخشی جوازا'' اس سے مراد مشرق ومغرب کا بحر ہے۔

# سورۃ الدھر

سوال: ارشاد ہوتا ہے: ''مِنْ نُّطْفَةٍ اَمْشَاجٍ '' (مخلوط نطفے سے) اس کی کیا وجہ ہے کہ مفرد (نطفة) کو جمع (امشاج) کے ساتھ موصوف کیا ہے' کیونکہ امشاج مشج کی جمع ہے بمعنی مخلوط کرنا' اور مراد یہ ہے کہ انسان مرد اور عورت کے مخلوط نطفہ سے پیدا کردہ ہے؟

جواب: زمخشریؒ فرماتے ہیں: امشاج مفرد ہے' جمع نہیں ہے۔ جیسے کہتے ہیں: ''برمة اعشار' بیت اکباش' برأهدام'' اور دوسرے حضرات یہ کہتے ہیں کہ اس سے موصوف نطفہ کے اجزاء اور ابعاض ہیں۔

سوال: اس آیت کا کیا مطلب ہے: ''نَّبْتَلِيْهِ فَجَعَلْنٰهُ سَمِيْعًا ۢ بَصِيْرًا'' (آزمائش کیا چاہتے ہیں ہم اس کو پس کیا ہم نے اس کو سننے والا دیکھنے والا) حالانکہ آزمائش اس کو سمیع وبصیر بنانے کے بعد ہوتی ہے؟۔

جوابِ اوّل: فراء کہتے ہیں: عبارت میں تقدیم وتاخیر ہے' اصل یوں ہے: ''فجعلنه سمیعًا بصیرًا لنبتلیه'' ۔

جوابِ ثانی: اس کا معنی یہ ہے کہ اس کو ایک حالت سے دوسری حالت کی جانب منتقل کرتے ہیں یعنی پہلے نطفہ پھر علقہ پھر مضغہ۔ چنانچہ اس کو استعارۃً ابتلاء کہا گیا۔

سوال: اس کا کیا معنی ہے: ''قَوَارِيْرَا۟ قَوَارِيْرَ مِنْ فِضَّةٍ'' (شیشے کے شیشے کہ ہیں بنائے ہوئے چاندی کے) جب کہ ''قواریر'' اس چیز کا نام ہے جو شیشہ سے بنائی جاتی ہے؟۔

جواب: اس کا معنی یہ ہے کہ وہ آبخورے چاندی کے بنے ہوں گے اور وہ چاندی کی سفیدی اور خوبصورتی کے ساتھ ساتھ شیشہ کی طرح صاف وشفاف ہوں گے۔

ابن عباسؓ فرماتے ہیں: دنیا کی چاندی میں آر پار پانی نظر نہیں آتا خواہ اسے مکھی کے پر کے برابر بنا دیا جائے جب کہ جنت کے قواریر جو چاندی کے ہوں گے اس کے اندر کی چیز باہر سے نظر آئے گی۔

سوال: ''كَانَتْ قَوَارِيْرَ'' کا کیا معنی ہے؟

جواب: اس کا معنی ہے کہ بنے ہوں گے' جیسے یہ ارشادات ہیں ''كُنْ فَيَكُوْنُ'' اور ''كَانَ

مِزَاجُهَا كَافُوْرًا"

سوال: اللہ تعالیٰ نے "وِلْدَان" (لڑکوں) کو "لؤلؤ منثور" (بکھرے موتی) کے ساتھ کیوں تشبیہ دی ہے؟۔

جوابِ اوّل: اللہ تعالیٰ نے ان کو "لؤلؤ منثور" کے ساتھ اس لئے تشبیہ دی ہے کہ اللہ تعالیٰ کی ان کو اس لؤلؤ منثور" کے ساتھ تشبیہ دینا ہے جس میں تا حال سوراخ نہ کیا گیا ہو کیونکہ جب اس میں سوراخ کر دیا جائے تو اس کی صفائی اور چمک کم ہو جاتی ہے اور ایسا موتی جو ابھی چھیدا نہ گیا ہو وہ منثور ہی ہوتا ہے۔

جوابِ ثانی: اللہ تعالیٰ نے ان کو "لؤلؤ منثور" کے ساتھ تشبیہ اس لئے دی ہے کہ "لؤلؤ منثور" منظوم کی بہ نسبت زیادہ حسین منظر پیش کرتا ہے جب اسے کسی بساط پر بکھیرا گیا ہو۔

جواب ثالث: "لؤلؤ منثور" کے ساتھ اس لئے تشبیہ دی ہے کہ وہ ولدان (غلام) اہل جنت کی مجالس اور منازل میں اسی طرح منتشر اور پھیلے ہوئے ہونگے جس کی دلیل یہ ارشاد ہے "وَیطوف علیهم" اگر وہ ایک ہی جگہ ایک قطار میں کھڑے ہوتے تو پھر منظوم کے ساتھ تشبیہ دی جاتی۔

سوال: ارشاد ہے: "وَحُلُّوْآ اَسَاوِرَ مِنْ فِضَّةٍ" (اور پہنائے جائینگے کنگن چاندی کے) حالانکہ یہ دنیا میں عورتوں اور باندیوں کی عادت ہے؟

جوابِ اوّل: قرآن کے اوّل مخاطب اہلِ عرب ہیں عرب کے شاہی مردوں اور عورتوں کی یہ عادت ہے کہ وہ ایک ساتھ یا الگ الگ سونے اور چاندی کا زیور پہنا کرتے ہیں۔

جوابِ ثانی: اگرچہ چاندی نام کے اعتبار سے دنیا و آخرت دونوں میں شترک ہے لیکن دونوں جہانوں کی چاندیوں میں بڑا بُعد اور فرق ہے۔ حضور نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: آخرت کی مثقال بھر چاندی دنیا و مافیہا سے کہیں بہتر ہے"۔ اسی طرح جنت کے استبرق اور سندس وغیرہ کا حال ہے۔

سوال: اس میں دارِ آخرت کے لئے کیا شرف و فضل ہے کہ اللہ تعالیٰ اس میں اپنے بندوں کو "شرابِ طہور" (پاکیزہ شراب) پلائے گا؟ جبکہ دنیا میں بھی اللہ تعالیٰ نے یہ پلایا ہوگا جس کی دلیل یہ ہے: "وَاَسْقَيْنَاكُمْ مَّآءً فُرَاتًا" نیز جیسے: "وانزلنا من السماء ماء فاسقیناکموه"؟

جواب: اس سے مراد بلاواسطہ ان کو پلانا ہے پھر دونوں جہاں کی شرابوں برتنوں اور مرتبوں میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔

سوال: اس آیتِ مبارکہ سے کیا مراد ہے؟: ''وَلَا تُطِعْ مِنْهُمْ اٰثِمًا اَوْ كَفُوْرًا'' (اور مت کہا مان ان میں سے گنہگار کا یا کفر کرنے والے کا) جب اس آیت میں ضمیر بالاتفاق مشرکینِ مکہ کی طرف راجع ہے تو پھر ان کو آثم اور کفور میں تقسیم کرنے کے کیا معنی ہے؟ حالانکہ وہ سب کے سب آثم بھی تھے اور کفور بھی؟

جواب: ''آثم'' سے مراد عتبہ بن ربیعہ ہے' کیونکہ وہ گناہوں میں پیش پیش تھا اور طرح طرح کے فسق وفجور کا مرتکب تھا' اور ''کفور'' سے مراد ولید بن مغیرہ ہے' کیوں کہ وہ غالی قسم کا کافر تھا اور کفر اس میں کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا' اگرچہ وہ دونوں آثم اور کافر تھے۔ اس آیت میں دراصل آپ کو ان کی اطاعت اور موافقت سے منع کیا گیا ہے کہ وہ آپ کو جس ترکِ دعوت کی طرف بلاتے ہیں آپؐ اس میں ان کا کہا نہ مانیں اور جس کفر وضلالت پر وہ جمے ہوئے ہیں اس میں ان کی موافقت نہ کریں۔

سوال: اس کا کیا معنی کہ آثم اور کفور میں سے ایک کا کہا نہ مانیں' یہ کیوں نہیں کہا گیا کہ ان دونوں کا کہا نہ مانیں؟

جوابِ اوّل: بعض کہتے ہیں کہ یہاں پر ''اَوْ'' کلمہ' واؤ کے معنی میں ہے' جیسے اس فرمانِ الٰہی میں: ''اَوِالْحَوَايَا''۔

جوابِ ثانی: جب یہ فرمایا کہ ان میں سے ایک کی بھی اطاعت نہ کرو تو یقینی سی بات ہے کہ یہ چیز ان دونوں کی اطاعت سے ممانعت پر لازماً دال ہوگی' کیونکہ اگر یہ کہتے کہ ان دونوں کی اطاعت نہ کرو تو ممکن نہ تھا کہ آپؐ کے لئے ان دونوں میں سے ایک کی اطاعت جائز ہوتی۔ حالانکہ یہ مطلب نہیں ہے۔

سوال: اس جگہ تو فرمایا ہے: ''وَشَدَدْنَآ اَسْرَهُمْ'' (اور ہم نے ان کے جوڑ بند مضبوط کئے) اور دوسری جگہ فرمایا: ''وَخُلِقَ الْاِنْسَانُ ضَعِيْفًا'' (اور انسان کمزور پیدا کیا گیا) دونوں میں یکسانیت کیسے ہوگی؟

جواب: حضرت ابن عباسؓ اور اکثر علماء فرماتے ہیں: اس سے مراد یہ ہے کہ انسان اس میں کمزور ہے کہ وہ عورتوں سے صبر کرے اس لئے اللہ تعالیٰ نے اس کو باندی سے نکاح کی اجازت دی' جیسے اس آیت کا ماسبق اس پر دلالت کرتا ہے۔ امام زجاجؒ فرماتے ہیں' اس کا معنی یہ ہے کہ انسان پر اس کی خواہشاتِ نفس غالب آجاتی ہیں اسی لئے انسان کو ضعف کے ساتھ موصوف کیا گیا۔ اور اس جگہ یہ فرمانا: ''وَشَدَدْنَآ اَسْرَهُمْ'' سو اس کا معنی یہ ہے کہ ہم نے انسان کے جوڑ بند کو آپس

میں رگوں اور پٹھوں کے ساتھ مضبوط کیا ہے۔ اور بعض کہتے ہیں کہ "اَسْر" سے مراد عُصعص (دم کی جڑ) ہے کیوں کہ انسان قبر میں ریزہ ریزہ ہو جاتا ہے مگر اس کی جڑ ریزہ ریزہ نہیں ہوتی ہے۔ امام مجاہدؒ فرماتے ہیں: "اَسْر" سے مراد بول و براز نکلنے کی جگہ ہے کیونکہ وہ حاجت کے وقت ڈھیلی ہو جاتی ہے حتی کہ اس سے گندگی نکل جاتی ہے پھر اللہ تعالیٰ کی قدرت سے سخت اور مضبوط ہو جاتی ہے۔

# سورۃ المرسلات

سوال: اس کا کیا معنی ہے؟ "هٰذَا يَوْمُ لَا يَنْطِقُوْنَ" الایۃ (یہ دن ہے کہ نہ بولیں گے) اس آیت میں اعتذار (عذر خواہی) کی نفی کی جارہی ہے اور اعتذار نطق (بولنا) سے ہی ہوتا ہے تو پھر نطق کی نفی کر دینے کے بعد اعتذار کی نفی کرنے میں کیا فائدہ ہے؟

جوابِ اوّل: اس کا معنی یہ ہے کہ وہ دن ایسا ہوگا کہ جس میں وہ لوگ نہ ابتداءً مقبول عذر اور صحیح حجت کے ساتھ بول سکیں گے اور نہ بعد میں ان کو اعتذار کی اجازت ہوگی کیوں کہ اسیر اور خوف زدہ مجرم عموماً فرطِ خوف و دہشت سے ابتداءً ہی عذر خواہی یا حجت بازی نہیں کر پاتا لیکن جب اسے اظہارِ عذر یا بیانِ حجت کی اجازت مل جائے تو پھر اس کی زبان کھل جاتی ہے۔ پس معلوم ہوا کہ یہ جملہ بھی بافائدہ ہے۔

جوابِ ثانی: اس معنی کی نفی ہے یعنی وہ لوگ نہ ابتداءً عذر بیان کر سکیں گے اور نہ اجازت کے بعد۔

سوال: پھر اس آیت سے کیا مراد ہے؟ "يَوْمَ لَا يَنْفَعُ الظّٰلِمِيْنَ مَعْذِرَتُهُمْ" (اس دن ظالموں کو ان کی معذرت کام نہ آئیگی) کیوں کہ اس سے تو معلوم ہوتا ہے کہ وہ عذر کریں گے؟ پھر ماقبل کی آیت اور آیتِ ہذا میں تطبیق کی صورت کیا ہوگی؟

جواب: اس آیت میں "ظالمین" سے مراد بعض مسلمان ہیں۔ جبکہ ہم کفار کے بارے بحث کر رہے ہیں۔ مگر اس آیت کا آخر اس جواب کو کمزور بنا دیتا ہے یعنی یہ ارشاد! "وَلَهُمُ اللَّعْنَةُ وَلَهُمْ سُوْٓءُ الدَّارِ"

# سورۃ النباء

سوال: ارشاد فرمایا: "اَلَمْ نَجْعَلِ الْاَرْضَ مِهٰدًا" (کیا ہم نے زمین کو فرش نہیں بنایا) اس آیت

کا ماقبل سے کیا ربط ہے؟

جواب: جب کہ "نباءِ عظیم" (بڑا واقعہ) سے مراد جس کے متعلق وہ آپس میں سوال جواب کرتے تھے بعث بعد الموت تھی اور وہ اس کے منکر تھے اس لئے ان سے کہا گیا کہ کیا بعث ونشور کا وعدہ کرنے والے (اللہ تعالیٰ) نے یہ عظیم مخلوقات پیدا نہیں کیں جو اس کی قدرت علی البعث پر دلالت کرتی ہیں؟

سوال: اگر آپ کے کہنے کے مطابق "نباءِ عظیم" سے مراد بعث ونشور ہے تو پھر اللہ جل جلالہ یہ نہ فرماتے: "اَلَّذِیْ هُمْ فِیْهِ مُخْتَلِفُوْنَ" (جس میں یہ لوگ اختلاف کر رہے ہیں) اس لئے کہ کفارِ مکہ بعث کے مسئلہ میں اختلاف نہیں رکھتے تھے بلکہ ان سب کا انکارِ بعث پر اتفاق تھا؟

جوابِ اوّل: ان میں بعض وہ تھے جو قطعی طور پر انکار کرتے تھے اور بعض اس مسئلہ میں متردد اور شک کرنے والے تھے۔ پس اختلاف ثابت ہوا' اس لئے کہ اختلاف کی جہت نہ جزم بلا اثبات میں منحصر ہے اور نہ ہی جزم بالنفی میں منحصر ہے۔

جوابِ ثانی: بعض بعث بعد الموت کی تصدیق کر کے مومن ہو گئے اور بعض تکذیب کر کے اپنے کفر پر قائم رہے' لہٰذا نفی اور اثبات میں اختلاف ثابت ہوا۔

جوابِ ثالث: "یَتَسَآءَلُوْنَ" میں ضمیر اور "هُمْ" کی ضمیر فریقین یعنی مسلمانوں اور مشرکوں کی طرف راجع ہے۔ سب کے سب اس دن کی عظمتِ شان کی وجہ سے اس کے متعلق ایک دوسرے سے دریافت کرتے ہیں' چنانچہ مسلمانوں نے اس کی تصدیق کر کے اس کا اثبات کیا اور مشرکین نے اس کی تکذیب کر کے اس کی نفی کی۔

سوال: ارشادِ باری ہے: "فَمَنْ شَآءَ اتَّخَذَ اِلٰی رَبِّهٖ مَاٰبًا" (پس جو کوئی چاہے پکڑے طرف پروردگار اپنے کے جگہ پھر جانے کی) آیت میں یہ جملہ شرط کی جزا ہے تو پھر شرط کہاں ہے؟ اکیلا "شَآءَ" شرط نہیں بن سکتا کیونکہ وہ مفعول کے بغیر مفید نہیں' اگر مذکور شرط ہے تو پھر جزا کہاں ہے؟۔

جوابِ اوّل: اس کا معنی یہ ہے: لہٰذا جو شخص ایسے دن سے نجات چاہتا ہے وہ اطاعت کے ذریعہ اپنے رب کے پاس ٹھکانا بنا لے۔

جوابِ ثانی: اس کا معنی یہ ہے: "فَمَنْ شَآءَ اَنْ یَّتَّخِذَ اِلٰی رَبِّهٖ مَاٰبًا" جیسے یہ ارشاد ہے: "فَمَنْ شَآءَ فَلْیُؤْمِنْ وَّمَنْ شَآءَ فَلْیَکْفُرْ" یعنی جو شخص ایمان لانا چاہے تو ایمان لے آئے اور جو کفر کرنا چاہے تو کفر کر لے۔

# سورۃ النازعات

سوال: اس کی کیا وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فرشتوں کے تمام اوصاف کو لفظ تانیث کے ساتھ ذکر فرمایا: ارشاد فرمایا: ''وَالنّٰزِعٰتِ غَرْقًا لا وَّالنّٰشِطٰتِ نَشْطًا۔ الآیۃ''
(قسم ہے ان فرشتوں کی کہ زور سے کھینچتے ہیں جان ڈوب کر اور قسم ہے ان فرشتوں کی کہ بند کھولدیتے ہیں جان کا بدن سے بند کھول دینے کے) حالانکہ فرشتے مؤنث نہیں ہیں؟۔
جواب: یہ ملائکہ کی جماعتوں اور فرقوں کی قسم کھائی گئی ہے' ظاہر ہے کہ جماعتیں اور فرقے مؤنث ہیں۔

سوال: ارشاد ہوتا ہے: ''قُلُوْبٌ یَّوْمَئِذٍ وَّاجِفَۃٌ اَبْصَارُھَا خَاشِعَۃٌ'' (کتنے دل اس دن دھڑکنے والے ہیں آنکھیں ان کی نیچے ہیں) اس آیتِ کریمہ میں اللہ تعالیٰ نے ابصار کی اضافت (نسبت) قلوب کی طرف کیسے کی ہے حالانکہ اس سے مراد بالاتفاق آنکھیں ہیں؟۔
جواب: ابصار سے اصحابِ ابصار مراد ہے' جس کی دلیل یہ قول ہے؟ ''یَقُوْلُوْنَ''

سوال: ارشادِ خداوندی ہے: ''فَاَرٰہُ الْاٰیَۃَ الْکُبْرٰی'' (پس دکھائی اس کو نشانی بڑی) جب کہ موسیٰ علیہ السلام نے فرعون کو تمام آیات (معجزات) دکھائی تھیں' دلیل یہ ہے ''وَلَقَدْ اَرَیْنٰہُ اٰیٰتِنَا کُلَّھَا فَکَذَّبَ'' اور ہر آیت (معجزہ) کبریٰ (بڑی) ہوتی ہے؟
جواب: اس آیتِ مبارکہ میں اس معجزہ کی خبر دینا ہے جو اوّل ملاقات میں اس کو دکھایا گیا تھا' یقیناً اوّل ملاقات میں عصا اور یدِ بیضاء کا معجزہ ہی دکھایا تھا' پھر متحد المعنیٰ ہونے کی وجہ سے ان دونوں پر ''آیتِ کبریٰ'' کا اطلاق کیا گیا ہے۔ جبکہ بعض کہتے ہیں کہ ''آیت کبریٰ'' سے مراد عصا کا معجزہ ہے' اس لئے کہ وہ مقدمہ اور اصل تھا جبکہ دوسرا معجزہ اس کے لئے بالتبع تھا' اس لئے آپ سے کہا گیا کہ اپنا ہاتھ اپنے گریبان میں ڈال لیے۔

سوال: ارشاد فرمایا: ''وَاَغْطَشَ لَیْلَھَا'' (اور اس کی رات کو ڈھانک دیا) یہاں پر رات کی اضافت آسمان کی طرف فرمائی ہے۔ حالانکہ رات زمین میں ہوتی ہے' نہ کہ آسمان میں؟
جواب: رات کی اضافت آسمان کی طرف اس لئے فرمائی کہ رات غروبِ آفتاب کے وقت سب سے پہلے ظاہر ہونے والی چیز ہے' جو غروب کی جگہ پر آسمان افق سے ظاہر ہوتی ہے' اور ''وَاَخْرَجَ ضُحٰھَا'' (اور اس کے دن کو ظاہر کیا) سے مراد سورج کی روشنی ہے جس کی دلیل یہ ہے: ''وَالشَّمْسِ وَضُحٰھَا'' یعنی سورج کی اور اس کی روشنی کی قسم ہے۔ لہٰذا رات کی آسمان کی

طرف اضافت کرنے میں کوئی اشکال نہیں۔

# سورۃ عبس

سوال: اس کا کیا سبب ہے کہ پہلے تو مؤنث کے ساتھ فرمایا: ''کَلَّآ اِنَّھَا تَذْکِرَۃٌ'' (ہرگز نہیں یوں تحقیق یہ نصیحت ہے) پھر مذکر کے ساتھ فرمایا: ''فَمَنْ شَآءَ ذَکَرَہٗ'' (پس جو کوئی چاہے یاد کرلے اس کو) یہاں یوں نہیں فرمایا: ''ذَکَرَھَا''؟

جوابِ اوّل: مؤنث کی ضمیر قرآن کی آیات یا اس سورت کی طرف راجع ہے' اور ''ذکرہ'' میں ضمیر قرآنِ کریم کی طرف راجع ہے۔

جوابِ ثانی: ضمیر لفظ کی طرف راجع نہیں ہے بلکہ ''تذکرۃ'' کے معنی کی طرف راجع ہے' بمعنی وعظ ونصیحت۔

سوال: ارشادِ باری تعالیٰ ہے: ''وَّفَاکِھَۃً وَّاَبًّا'' (اور میوہ اور چارہ) مروی ہے کہ حضرت عمرؓ نے یہ آیت تلاوت فرمائی' پھر فرمایا: ہم نے ان سب کو جان لیا مگر ''اَبٌّ'' کیا ہے؟ پھر فرمایا: اللہ کی قسم! یہ تکلف ہے' اے عمرؓ! تجھے یہ جاننا ضروری نہیں کہ ''اَبٌّ'' کا کیا مطلب ہے؟ پھر فرمایا: کتاب اللہ میں سے جو بات تمہارے لئے واضح ہو اس کی اتباع کرو اور جو ایسی نہ ہو اس کو چھوڑ دو'۔ یہ بات قرآن کے معانی ومشکلات کی بحث وتتبع سے منع کرنے کے مشابہ ہے؟۔

جواب: حضرتِ عمرؓ کی یہ مراد نہیں ہے کہ تم اس کے معانی ومشکلات میں تتبع وغیرہ نہ کرو' اصل میں صحابہ کرامؓ کا زیادہ تر کام یہ تھا کہ وہ عمل بالقرآن میں لگے رہتے تھے' ان کے نزدیک علم بلا عمل میں مشغول ہونا محض تکلف ہوتا تھا' لہٰذا مراد یہ ہے کہ آیت کا مقصد یہ ہے کہ اس میں اللہ تعالیٰ نے انسان پر اس کے کھانے کا احسان جتایا ہے اور اس پر شکر ادا کرنے کا فرمایا ہے۔ اور آیت کے سیاق وسباق سے یہ معلوم ہو ہی جاتا ہے کہ ''اَبٌّ'' سے مراد بعض وہ چیزیں ہیں جو اللہ تعالیٰ انسان کے اور اس کے مویشیوں کے فائدے کے لئے اُگاتے ہیں۔ معلوم ہوا کہ حضرت عمرؓ کی مراد یہ تھی کہ جو بات سب سے زیادہ اہم ہو پہلے اس کا خیال کرو' یعنی اللہ کی نعمتوں پر اس کا شکر بجالانا جو کہ تمہارے لئے بالکل واضح ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اپنی جو نعمتیں ذکر کی ہیں ان کا سمجھنا کوئی مشکل امر نہیں ہے' کہیں تم ''اَبٌّ'' کے معنی کی تلاش میں پڑ کر اور کسی خاص بوٹی کی معرفت میں لگ کر اس اہم بات سے غافل نہ ہو جاؤ۔

حضرت ابوبکر صدیقؓ سے مروی ہے کہ ان سے ''اَبٌّ'' کا معنی پوچھا گیا تو انہوں نے

فرمایا: کونسا آسمان مجھے سایہ دے گا اور کونسی زمین مجھے اٹھائے گی جب میں کتاب اللہ کے متعلق ایسی بات کہوں جس کا مجھے کوئی علم نہیں"۔
اکثر مفسرین کہتے ہیں کہ "ابّ" ہر اس چارہ اور گھاس وغیرہ کو کہتے ہیں جسے جانور چرتے ہوں۔

# سورۃ التکویر

سوال: ارشادِ باری تعالیٰ ہے: "وَاِذَا الْمَوْءٗدَةُ سُئِلَتْ" (اور جب زندہ گاڑی ہوئی لڑکی سے پوچھا جائے گا) سوال تو قاتل سے ہونا چاہئے نہ کہ مقتول سے؟۔
جواب: زندہ درگور لڑکی سے سوال اس کے قاتل کو نشانہ ملامت بنانے کے لئے ہوگا' کیونکہ وہ اس کو کہے گی میں بے گناہ قتل کی گئی۔ اس کی نظیر توبیخ وتبکیت میں اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے کہ اللہ تعالیٰ حضرت عیسیٰؑ سے فرمائیں گے: "ءَ اَنْتَ قُلْتَ لِلنَّاسِ اتَّخِذُوْنِیْ" حضرت عیسیٰؑ فرمائیں گے: "سُبْحَانَکَ مَا یَکُوْنُ لِیْ اَنْ اَقُوْلَ مَا لَیْسَ لِیْ بِحَقٍّ"
سوال: اس سے کیا مراد ہے: "عَلِمَتْ نَفْسٌ مَّآ اَحْضَرَتْ" (جان لے گا جی جو کچھ حاضر کیا ہے) اس میں علم (جاننے) کو ایک نفس (شخص) کے لئے ثابت کیا گیا ہے' جبکہ ہر شخص قیامت کے روز ان اعمال کو جان لے گا جو وہ لے کر آیا ہوگا' جس کی دلیل یہ فرمان ہے: "یَوْمَ تَجِدُ کُلُّ نَفْسٍ مَّا عَمِلَتْ"؟
جواب: یہ کلام ان امور میں سے ہے جس سے اس کے مدلول کا عکس مراد لیا گیا ہے' اللہ تعالیٰ کے کلام اور کلامِ عرب میں اس کی مثالیں بہت موجود ہیں جیسے: "رُبَمَا یَوَدُّ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا لَوْ کَانُوْا مُسْلِمِیْنَ" اب یہاں "رُبَّ" "کم" بمعنی کثیر کے معنی میں ہے۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان بھی جس میں موسیٰ علیہ السلام کی حکایت کا ذکر ہے کہ انہوں نے اپنی قوم سے فرمایا: "وَقَدْ تَّعْلَمُوْنَ اَنِّیْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَیْکُمْ" نیز ایک شاعر کا قول ہے:

قَد اترک القرن مصفرًا انا مله ☆ کان اثوابه مُجّت بفرصاد

# سورۃ الانفطار

سوال: ارشادِ الٰہی ہے: "مَا غَرَّکَ بِرَبِّکَ الْکَرِیْمِ" (کس چیز نے فریب دیا تجھ کو ساتھ پروردگار تیرے کرم کرنے والے کے) اللہ تعالیٰ کی دوسری صفات کو چھوڑ کر صفت "کرم" ذکر کرنے میں کیا خاص نکتہ ہے؟۔

جواب: بعض کہتے ہیں صفتِ کرم اس لئے ذکر کی تا کہ اپنے بندے پر لطف و مہربانی کا اظہار ہو اور اسے حجت اور عذر کی تلقین ہو کہ وہ یوں کہے: مجھے ذاتِ کریم کی کرم نوازی نے بھول میں ڈال رکھا تھا۔ حضرت فضیل فرماتے ہیں: اگر اللہ تعالیٰ یہ سوال مجھ سے کرتے تو میں کہتا کہ آپ کے لٹکے ہوئے پردوں نے مجھے بھول میں ڈالے رکھا۔ مروی ہے کہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے اپنے غلام کو کئی بار آواز دی مگر اس نے کوئی جواب نہیں دیا' حضرت علیؓ اس کی طرف متوجہ ہوئے اور فرمایا: تجھے کیا ہوا کہ میری بات کا جواب نہیں دیتا؟ اس نے کہا: آپ کی بردباری مانع ہوئی اور میں آپ کی سزا کو آزما رہا تھا' غلام کا یہ جواب حضرت علیؓ کو پسند آیا اور اس کو آزاد کر دیا۔

اسی لئے علماء کہتے ہیں کہ غلاموں کا بے ادب ہونا آدمی کی کرم نوازی کا حصہ ہے۔

حق بات یہ ہے کہ انسان پر واجب ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی ظاہری اور باطنی نعمتوں کی فراوانی کو دیکھ کر اور اس کی کرم نوازی کی وجہ سے خود فریبی میں مبتلا نہ ہو جائے کہ پھر اسکی نعمتوں کا کفران اور اس کے حکموں کی نافرمانی کرنے لگے۔

یہ درحقیقت ایک ناپسندیدہ حرکت ہے اور حکمت و دانائی سے خالی ہے۔ اسی لئے رسول اللہ ﷺ نے جب یہ آیتِ کریمہ تلاوت فرمائی تو فرمایا: انسان کی جہالت نے اس کو بھول میں ڈالے رکھا۔ حضرت عمرؓ فرماتے ہیں: اس کی حماقت اور جہالت نے اس کو دھوکہ میں رکھا۔ حضرت حسنؓ فرماتے ہیں: خدا کی قسم! اس کو اس کے خبیث شیطان نے دھوکہ میں ڈالا جو گناہوں کو اس کے سامنے خوشنما بنا کر پیش کرتا ہے' انسان کو کہتا ہے: جو دل میں آئے کرو' کیونکہ تیرا رب بڑا کریم ہے۔

سوال: اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ''يَوْمَ لَا تَمْلِكُ نَفْسٌ لِنَفْسٍ شَيْئًا'' (وہ ایسا دن ہے جس میں کسی شخص کا کسی شخص کے لئے کچھ بس نہ چلے گا) اس آیت سے تو بظاہر شفاعت کی نفی ہو رہی ہے' حالانکہ جن نفوس کی شفاعت مقبول ہو گی ان کو کچھ نہ کچھ نفع کا اختیار دیا جائے گا؟

جواب: جس بات کی نفی کی گئی ہے وہ ہے اپنی سلطنت و حکومت سے دوسری کی نصرت کرنا۔ جبکہ شفاعت بطورِ سلطنت و حکومت نہیں ہو گی' لہٰذا یہ نفی میں داخل نہیں ہے' اس کی تائید اس ارشادِ مبارک سے ہوتی ہے: ''وَالْأَمْرُ يَوْمَئِذٍ لِلَّهِ'' یعنی اور تمام تر حکومت اس روز اللہ ہی کی ہو گی۔

## سورۃ المطففین

سوال: یوں کیوں نہیں فرمایا: ''إِذَا اكْتَالُوا أَوْ وَزَنُوا عَلَى النَّاسِ يَسْتَوْفُونَ'' یعنی جب لوگوں سے ناپ کر لیں یا تول کر دیں تو پورا لیں۔ جیسے اللہ تعالیٰ نے اس کے مقابلہ میں فرمایا ہے: ''وَإِذَا

كَالُوْهُمْ اَوْ وَّزَنُوْهُمْ يُخْسِرُوْنَ" (جب ان کو ناپ کر یا تول کر دیں تو گھٹا کر دیں)؟

جواب: اس کی وجہ یہ ہے کہ ناپ تول میں کمی کرنے والوں کی یہ عادت تھی کہ وہ خود تو ہر کیلی اور وزنی چیز کو ناپ کر ہی لیتے تھے اس لئے کہ ناپ کر زیادہ وصول کرنا ان کے لئے تول کر لینے سے زیادہ ممکن اور اہون تھا لیکن جب دوسرے کو دیتے تو ناپ کر دیتے یا تول کر دیتے کیونکہ اس طرح ان کے لئے ان دونوں میں کمی کرنا ممکن تھا۔

سوال: ارشاد ہوتا ہے: "وَمَآ اَدْرٰکَ مَا سِجِّیْنٌ ۔ کِتٰبٌ مَّرْقُوْمٌ" (آپ کو کچھ معلوم ہے کہ سجین کیا ہے وہ لکھا ہوا دفتر ہے) اللہ تعالیٰ نے "سِجِّیْنٌ" کی تفسیر "کِتَابٌ مَّرْقُوْمٌ" سے اور "عِلِّیِّیْنَ" کی تفسیر بھی "کِتَابٌ مَرْقُوْمٌ" سے فرمائی ہے۔ حالانکہ "سِجِّیْنٌ" ساتویں زمین کا نام ہے اور یہ سجن سے فعیل کے وزن پر ہے۔ اور "عِلِّیِّیْنَ" جنت کا یا بلند مقام کا یا ساتویں آسمان یا سدرۃ المنتہیٰ کا نام ہے؟

جواب: اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد "کِتٰبٌ مَرْقُوْمٌ" سِجِّیْنٌ اور عِلِّیِّیْنَ کی تفسیر نہیں ہے بلکہ فجار کے نامۂ اعمال اور ابرار کے نامۂ اعمال کا معنوی وصف ہے۔ اصل عبارت یہ ہے: "وھو کتاب مرقوم"۔

## سورۃ الانشقاق

سوال: ارشاد فرمایا: "اِذَا السَّمَآءُ انْشَقَّتْ" (جب آسمان پھٹ جائیگا) "اذا" شرط ہے اس کا جواب کہاں ہے؟

جواب: اس میں چند وجوہ ہیں ایک وجہ یہ ہے کہ جوابِ شرط متروک ہے کیونکہ قرآن میں اس جیسا کلام مکرر ہے دوسری وجہ یہ ہے کہ جوابِ شرط "اَذِنَتْ" ہے اور اس میں واؤ زائدہ ہے۔ تیسری وجہ یہ ہے کہ جوابِ شرط اس قول "وَحُقَّتْ" کے بعد محذوف ہے اور وہ ہے: "بعثتم یا جوزیتم یا لاقیتم ماعملتم" اور اس محذوف پر اللہ تعالیٰ کا یہ قول: "فَمُلٰقِیْہِ" دلالت کرتا ہے۔ چوتھی وجہ یہ ہے کہ اصل میں یہاں تقدیم و تاخیر ہے۔ عبارت اس طرح ہے: "یٰٓاَیُّھَا الْاِنْسَانُ اِنَّکَ کَادِحٌ اِلٰی رَبِّکَ کَدْحًا فَمُلٰقِیْہِ اِذَا السَّمَآءُ انْشَقَّتْ"۔

## سورۃ البروج

سوال: جوابِ قسم کہاں ہے؟

جواب: اس میں چند وجوہ ہیں: پہلی وجہ یہ ہے کہ متروک ہے دوسری وجہ یہ ہے کہ "قُتِل" ہے

یعنی "لَقَدْ قُتِلَ" یعنی ملعون ہو گئے۔ تیسری وجہ یہ ہے کہ "اِنَّ بَطْشَ رَبِّکَ لَشَدِیْدٌ" ہے چوتھی وجہ یہ ہے کہ محذوف ہے اور وہ ہے "لتبعثن" وغیرہ۔ پانچویں وجہ یہ ہے کہ اس کا جواب قسم یہ ہے "اِنَّ الَّذِیْنَ فَتَنُوْا"

# سورۃ الطارق

سوال: جوابِ قسم کہاں ہے؟۔

جواب: جوابِ قسم "اِنْ کُلُّ نَفْسٍ" ہے یہاں "اِنْ" ما کے معنی میں ہے اور "لَمَّا" تشدید کے ساتھ "اِلَّا" کے معنی میں ہے مطلب یہ ہوگا کہ نہیں ہر شخص مگر اس پر ہے نگہبان اور "لما" تخفیف کے ساتھ ہو تو اس میں "ما" زائدہ ہے اور "ان" مخففہ من المثقلہ ہے چنانچہ معنی ہوں گے کہ بے شک ہر شخص البتہ اس پر ہے نگہبان اور قسم ان کے معنی میں استعمال ہوتی ہے۔

سوال: ارشاد ہوتا ہے: "فَلْیَنْظُرِ الْاِنْسَانُ" (پس چاہیے کہ دیکھے آدمی) اس آیت کا ماقبل سے ربط کیا ہے؟

جواب: وجہ ربط یہ ہے کہ جب پہلے یہ بات ذکر فرمائی کہ ہر شخص پر اعمال کا یاد رکھنے والا فرشتہ مقرر ہے تو اس کے بعد انسان کو تاکید اور نصیحت کی جا رہی ہے کہ اسے چاہئے کہ وہ اپنی ابتدائی حالت میں غور و فکر کرے، تاکہ اسے معلوم ہو کہ جس ذات نے اس کو پہلی بار پیدا کیا ہے وہ اسے دوبارہ پیدا کرنے پر بھی قادر ہے لہٰذا وہ اس روزِ جزا کے لئے اعمال بجالائے۔ اور اپنے فرشتہ کو وہی اعمال لکھوائے جو اس کے لئے آخرت میں کام آئیں۔

سوال: ان دونوں لفظوں "فَمَهِّلْ" اور "اَمْهِلْ" کے لانے کا کیا فائدہ ہے۔ حالانکہ ان دونوں کے معنی ایک ہیں؟۔

جواب: اس کا فائدہ تاکید ہے دونوں لفظوں کے درمیان فرق طلب خفت کے لئے کیا گیا ہے۔

# سورۃ الاعلیٰ

سوال: اس کا کیا معنی ہے: "فَذَکِّرْ اِنْ نَّفَعَتِ الذِّکْرٰی" (پس نصیحت کر اگر نفع دے نصیحت) حالانکہ نبی کریم ﷺ نصیحت پر مامور تھے خواہ نصیحت نفع دے یا نفع نہ دے؟

جوابِ اوّل: اس کا معنی یہ ہے کہ نصیحت کیجئے جب نفع دے۔

جوابِ ثانی: اس کا معنی یہ ہے کہ نصیحت نفع کی چیز ہے۔

جوابِ ثالث: مطلب یہ ہے کہ نصیحت کیجئے اگر نصیحت نفع دے یا نفع نہ دے' ایک چیز کو حذف کر دیا کیونکہ مذکور چیز اس پر دلالت کرتی ہے۔ امام ماوردیؒ فرماتے ہیں کہ "اِن" ما کے معنی میں ہے گویا ماظرفیہ کا معنی مراد ہے' اور اِنْ ماظرفیہ کے معنی میں معروف نہیں ہے۔

سوال: اس کا کیا مطلب ہے: "لَا یَمُوْتُ فِیْهَا وَلَا یَحْیٰی" (پھر نہ مرے گا بیچ اس کے اور نہ جیے گا) حالانکہ ہر جاندار ان دو وصفوں میں سے کسی ایک سے موصوف ضرور ہوتا ہے؟

جواب: اس کا معنی یہ ہے کہ وہ ایسی موت نہیں مریں گے جس سے ان کو راحت حاصل ہو سکے اور نہ ہی ایسی زندگی جئیں گے جس سے وہ نفع اٹھا سکیں۔

امام ابن جریرؒ فرماتے ہیں: اس کی روح اس کے حلق تک پہنچے گی مگر اس سے جدا نہیں ہو گی کہ موت آجائے اور واپس اپنی جگہ نہ جائے گی کہ زندگی ملے۔ واللّٰہ سبحانہ و تعالٰی اعلم

# سورۃ الغاشیۃ

سوال: اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: "وُجُوْهٌ یَّوْمَئِذٍ خَاشِعَةٌ عَامِلَةٌ نَّاصِبَةٌ تَصْلٰى نَارًا حَامِيَةً" (بہت سے چہرے اس روز ذلیل مصیبت جھیلنے والے خستہ ہونگے اور آتشِ سوزاں میں داخل ہوں گے) جب کہ ان کا سارا بدن دوزخ میں داخل ہو گا؟۔

جوابِ اوّل: لفظ "وَجْهٌ" سے بدن بھی مراد لیا جاتا ہے' جیسے اس فرمانِ خداوندی میں لیا گیا: "وَعَنَتِ الْوُجُوْهُ لِلْحَیِّ الْقَیُّوْمِ"۔

جوابِ ثانی: یہاں "وُجُوْهٌ" سے مراد اعیان اور روٴساء ہیں۔ جیسے کہا جاتا ہے "هؤلاء وجوه القوم" اور یاوجه العرب: یعنی اے عرب کے وجیہ۔ اور اس قول کی تائید حضرت ابن عباسؓ کی روایت سے بھی ہوتی ہے کہ آپؓ نے فرمایا: اس سے مراد عیسائی راہب اور ان کے عبادت خانے والے ہیں۔

سوال: ارشاد ہوتا ہے: "اَفَلَا یَنْظُرُوْنَ اِلَى الْاِبِلِ کَیْفَ خُلِقَتْ" (کیا پس نہیں دیکھتے طرف اونٹوں کے کیونکر پیدا کیے گئے ہیں) اس آیت کا ماقبل سے کیا ربط و مناسبت ہے؟ نیز آسمان' پہاڑ' زمین اور اونٹوں کے درمیان کیا مناسبت ہے کہ ان کو اس آیت میں جمع کیا گیا ہے؟

جوابِ اوّل: جب اللہ تعالیٰ نے جنت کے اوصاف بیان فرمائے تو اس سے کفار کو تعجب ہوا تو اللہ تعالیٰ نے یہاں ان کو اپنی صنعت کے عجائبات بیان فرمائے۔

جوابِ ثانی: حضرت قتادہؒ فرماتے ہیں' جب اللہ تعالیٰ نے جنت کے تختوں کی بلندی بیان فرمائی

تو وہ کہنے لگے کہ پھر ہم ان پر کس طرح سے چڑھیں گے؟ تو یہ آیتِ کریمہ نازل ہوئی کہ: "اَفَلَا يَنظُرُوْنَ اِلَى الْاِبِلِ" الآیۃ یعنی کیا وہ لوگ اونٹ کو عبرت کی نگاہ سے نہیں دیکھتے ہیں کہ: "كَيْفَ خُلِقَتْ" یعنی کس طرح عجیب طور پر پیدا کیا گیا ہے کہ بڑے بڑے بوجھ کس طرح اٹھا اٹھا کر دور دراز علاقوں میں لے جاتا ہے' حتیٰ کہ اسے ایسا بنایا گیا ہے کہ وہ نیچے بیٹھ جاتا ہے اور اس پر سامان لادا جاتا ہے اور اس پر بڑی آسانی سے سواری ہو جاتی ہے اور پھر وہ سارا لدا ہوا سامان وغیرہ اٹھا کر کھڑا ہو جاتا ہے' تمام جانوروں میں صرف اونٹ ہی ایک ایسا جانور ہے کہ جب وہ بیٹھا ہوا ہو اور اس پر سامان لادا جائے تو وہ اٹھ سکتا ہے۔ اور پھر جو بھی اس کی نکیل پکڑ کر اسے لے چلے تو وہ اس کے تابع ہو جاتا ہے حتیٰ کہ کوئی چھوٹا بچہ بھی اس کی لگام کو پکڑ کر اس کو لے چلے تو وہ اس کے بھی تابع ہو جاتا ہے۔ چونکہ اونٹ کو خشکی کی کشتی بنایا گیا ہے اس لئے اس میں دس دن یا اس سے بھی زیادہ دنوں تک پیاس برداشت کرنے کے لئے صبر کا مادہ رکھا گیا ہے' نیز اس کو ایسا بنایا گیا ہے کہ وہ جنگل کی وہ تمام نباتات جسے دوسرے جانور نہیں چرتے یہ چر لیتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے یہاں پر ہاتھی' زرافہ' گینڈے وغیرہ کا ذکر نہیں کیا حالانکہ یہ جانور' اونٹ سے بڑے ہیں تو اسکی وجہ یہ ہے کہ اہلِ عرب نے نہ ان کو دیکھا اور نہ ہی وہ ان جانوروں کو پہچانتے تھے' نیز اونٹ عرب کے ہاں نفیس ترین اموال میں سے شمار ہوتا ہے نیز یہ اونٹ ہی ان کے ہاں زیادہ ہوتے تھے' نہ یہ اونٹ ان سے جدا ہوتے اور نہ وہ اونٹ سے جدا ہوتے تھے۔ اور پھر ان اونٹوں کے ساتھ مابعد کی چیزوں کو اس لئے لائے ہیں کہ عرب لوگوں کی نظر اپنی وادیوں میں انہی چیزوں پر ہوتی تھی' اس لئے کثرتِ ملابست کی وجہ سے آیت میں ان امور کو ذکر کر دیا گیا۔

جن حضرات نے "ابل" کی تفسیر بادل اور پانی کے ساتھ کی ہے ان کی اس سے مراد بطریق تشبیہ مناسبت پیدا کرنا ہے' یعنی اونٹ کو چلنے اور نرمی کے اندر بادل کے ساتھ تشبیہ دی گئی ہے "ابل" سے بادل حقیقۃً مراد نہیں ہے۔ عرب کے اشعار میں بھی بادل کو اونٹ کے ساتھ بکثرت تشبیہ دی جاتی ہے۔ نیز ابن درید نے بھی اپنے قصیدہ میں اس کو بادل کے ساتھ تشبیہ دی ہے۔

حضرت ابی بن کعبؓ اور حضرت عائشہؓ نے "ابلّ" کو بتشدید اللام پڑھا ہے۔ ابوعمرو کہتے ہیں کہ "ابلّ" آب بردار بادل کو کہتے ہیں۔

# سورۃ الفجر

سوال: "وَالْفَجْرِ وَلَيَالٍ عَشْرٍ" (قسم ہے فجر کی اور دس راتوں کی) "لیال" کو نکرہ اور باقی

مقسم بہ کو معرفہ کیوں لائے۔ لیال کو بھی لام عہد کے ساتھ معرفہ کیوں نہ لایا گیا؟ حالانکہ یہ معہود راتیں ہیں یعنی ان سے مراد بقول جمہور ذی الحجہ کی دس راتیں ہیں؟

جواب: چونکہ یہ راتیں عام راتوں سے زیادہ فضیلت رکھتی ہیں اس لئے ان کو نکرہ لیا اور لام عہد کے ساتھ معہود نہ کر کے وجہ بھی یہی ہے۔ کہ نکرہ لانے کی صورت میں تنوین تفخیم و تعظیم پر زیادہ دلالت کرتی ہے۔ جیسا کہ فرمان الٰہی: "وَاِلٰهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ" میں "اله" کو نکرہ لانا بھی تعظیم و تفخیم پر دلالت کرنے کے لئے ہے۔

اسی طرح "لَآ اُقْسِمُ بِهٰذَا الْبَلَدِ" میں "البلد" کو معرفہ اور اس کے بعد "وَوَالِدٍ وَّمَا وَلَدَ" میں "والد اور ولد" کو نکرہ لانا بھی تعظیم کے لئے ہے چنانچہ اس سے مراد حضرت آدمؑ اور حضرت ابراہیمؑ یا حضرت محمد ﷺ ہیں۔

سوال: اللہ تعالیٰ نے انسان کو "رَبِّيْٓ اَكْرَمَنِ" (میرے رب نے مجھے عزت دی) کہنے پر مذمت کیوں کی حالانکہ وہ اپنے اس قول میں سچے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے اسکا اکرام کیا ہے چنانچہ اللہ تعالیٰ خود فرماتے ہیں: "فَاَكْرَمَهٗ وَنَعَّمَهٗ" اور یہ تحدث بالنعمت بھی ہے، تو اس پر تذمیم نہیں ہونی چاہیے؟۔

جواب: یہ مذمت بطور فخر اور دوسروں ان پر اپنی برتری ظاہر کرنے اور خود کو اس کے مستحق سمجھنے والوں کے لئے ہے۔ یہ قابل مذمت ہے لیکن اگر یہ کلمہ "ربی اکرمن" اظہار تشکر اور تحدث بالنعمت کے طور پر کہا جائے تو نہ مذموم ہے اور نہ ممنوع۔

سوال: پہلے جملے میں "فَاَكْرَمَهٗ" فرمایا لیکن دوسرے جملے میں فاھانہ نہیں فرمایا؟

جواب: اس لئے کہ وسیع رزق دینا اللہ تعالیٰ کی طرف سے اکرام اور انعام ہے اور اس میں کمی کرنا اہانت نہیں ہے۔ اس لئے کہ انعام نہ دینا توہین کرنا نہیں ہے۔ بلکہ یہ اکرام اور اہانت کے درمیان ایک درجہ ہے یعنی نہ انعام ہے اور نہ توہین۔ اس لئے کہ آقا کبھی اپنے غلاموں کا اکرام کرتا ہے اور کبھی اس کی توہین کرتا ہے اور کبھی اس کا نہ اکرام کرتا ہے اور نہ ہی بے توقیری۔

چنانچہ رزق میں تنگی کرنا قدر زائد عطاء نہ کرنے سے عبارت ہے لہٰذا یہ اہانت نہیں۔

سوال: یہ کیسے فرمایا اللہ تعالیٰ نے: "وَجَآءَ رَبُّكَ" جبکہ حرکت انتقال کرنے سے اللہ تعالیٰ بلند و برتر ہیں۔ یہ تو مخلوق کی صفات ہیں؟

جواب: حضرت عبداللہ بن عباسؓ فرماتے ہیں: اس سے مراد قیامت کے دن اللہ تعالیٰ کے جلال کا ظہور ہے۔ بعض علماء نے کہا: قیامت کے دن اس کی معرفت کے لئے اس کا ظہور ہوگا جس

سے تمام شکوک وشبہات زائل ومرتفع ہوں گے۔ جیسا کہ کسی کے آنے پر اس کے متعلق شکوک رفع ہوتے ہیں۔

## سورۃ البلد

سوال: ''وَوَالِدٍ وَّمَاوَلَدَ'' میں ''ما'' غیر عقل ہے ولد عاقل ہے ''من ولد'' ہونا چاہیئے؟۔
جواب: ''من'' کے مقابلے میں ''ما'' میں ابہام قدرے زیادہ ہے۔ لہٰذا نکرہ لاکر تفخیم وتعظیم کا قصد کیا گیا۔ جیسا کہ فرمانِ الٰہی: ''وَاللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا وَضَعَتْ'' میں تعظیماً لفظ ''ما'' استعمال کیا گیا ہے۔

## سورۃ الشّمس

سوال: ''وَنَفْسٍ وَّمَا سَوّٰهَا'' (نفس اور اسکی بناوٹ کی قسم) ''ونفس'' میں نفس نکرہ اور باقی دوسرے تمام منقسم بہ (مثلاً والشمس' والقمر' والنہار' واللیل' والسماء' اور والارض کو معرفہ کیوں لایا گیا؟۔
جواب: ''ونفس'' سے مرد انسانی نفس ہے' جو تمام حیوانات کے نفوس سے علیحدہ اور منفرد ہے ''فَاَلْهَمَهَا فُجُوْرَهَا وَتَقْوٰهَا'' سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے۔ اور لام عہد کے ساتھ معہود اس لئے نہ کیا گیا کہ اس سے کوئی خاص معہود نفس مراد نہیں ہے۔ جو لوگ ''ونفس وما سواھا'' کی تفسیر حضرت آدم علیہ السلام سے کرتے ہیں وہ ''نفس'' کی تنوین کو تفخیم وتعظیم کے لئے مانتے ہیں۔
سوال: اس میں قسم تو ہے مگر جوابِ قسم کہاں ہے؟
جواب: امام زجاجؒ وغیرہ علماء فرماتے ہیں: جوابِ قسم ''قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَكّٰهَا'' اور لامِ قسم کو تخفیفاً حذف کیا گیا ہے' ابن الانباریؒ فرماتے ہیں کہ جوابِ قسم محذوف ہے۔ امام زمخشریؒ نے کہا: تقدیر عبارت یوں ہے۔ ''لید مدمن اللّٰه علی اهل مکه لتکذیبهم رسول اللّٰه صلی اللّٰه علیه وسلم کماد مدم علی ثمود لتکذیبهم صالحا علیه السلام'' یعنی رسول اللہ ﷺ کی تکذیب کی وجہ سے اہل مکہ پر ایسا عذاب آئیگا جیسا کہ حضرت صالح علیہ السلام کو جھٹلانے کی وجہ سے قوم ثمود پر عذاب الٰہی نازل ہوا۔ ''قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَكّٰهَا'' کا جوابِ قسم سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ یہ ماقبل کلام کے تابع ہے۔

# سورۃ اللیل

سوال: کیسے فرمایا اللہ پاک نے ''لَا یَصْلٰهَآ اِلَّا الْاَشْقٰی'' جہنم میں سب سے زیادہ بدبخت ہی داخل ہوگا۔ جبکہ عام بدبخت بھی داخل ہوگا؟ اس کی گرمی اور عذاب کو برداشت کریگا۔

جواب: ابوعبیدہ فرماتے ہیں: الاشقی یہاں شقی کے معنی میں ہے۔ مراد اس سے ہر کافر ہے۔ اہلِ عرب بسا اوقات اسم تفضیل کے صیغے کو اسم فاعل کے معنی میں استعمال کرتے ہیں۔ یہ سوال مع الجواب سورۃ الروم میں ''وَهُوَ اَهْوَنُ عَلَيْهِ'' کے تحت گذر چکا ہے۔ وہاں ملاحظہ کیا جائے۔

امام زجاج نے کہا: جس آگ کا تذکرہ آیت میں ہے۔ اس سے مراد خاص قسم کی آگ ہے جو اشقیاء کے لئے معین ومختص ہے۔ زمخشریؒ بھی یہی فرماتے ہیں کہ الاشقی شقی کے معنی میں نہیں ہے۔ بلکہ تفضیل ہی کے معنی ہیں۔ مراد اس سے ابوجہل اور امیہ بن خلف وغیرہ ہیں۔ ''وَسَيُجَنَّبُهَا الْاَتْقَى'' میں الاتقی سے حضرت ابوبکرؓ مراد ہیں۔ چنانچہ یہ آیت عظیم تر مومن اور عظیم تر مشرک کے درمیان موازنہ کے لئے نازل ہوئی ہے۔

بعض علماء نے ''وَسَيُجَنَّبُهَا الْاَتْقَى'' سے حضرت ابوبکرؓ کے افضل الصحابہؓ ہونے کو ثابت کیا ہے۔ اس لئے کہ ان کی صفت ''الاتقی'' اسم تفضیل کے ساتھ لائی گئی ہے۔ فرمان باری ہے ''اِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقٰكُمْ'' جب کے ''اتقی'' سب سے زیادہ مکرم ہے تو حضرت ابوبکرؓ کے لئے اتقی کا لفظ استعمال ہوا ہے تو معلوم ہوا تمام صحابہؓ کے مقابلے میں اللہ کے ہاں وہ سب سے زیادہ مکرم ہیں۔

# سورۃ الضّحیٰ

سوال: ''وَوَجَدَكَ ضَآلًّا'' اللہ تعالیٰ نے نبی علیہ السلام کو کیوں فرمایا۔ حالانکہ نبی کبھی ضال نہیں ہوتا' نہ قبل از نبوت اور نہ ہی بعد از نبوت؟۔

جوابِ اوّل: ''ضال'' کا معنی یہاں بے خبر کے ہیں یعنی اس سے پہلے آپ معالم نبوت اور احکامِ شریعت سے بے خبر تھے تو اللہ تعالیٰ نے آپ کی رہنمائی فرمائی۔ یہ تشریح جمہور علماء کے اقوال کے مطابق ہے۔

جوابِ ثانی: آپ جب چھوٹے تھے۔ شعاب مکہ میں گم ہوگئے تو اللہ تعالیٰ نے آپ کو ان کے دادا عبدالمطلب کے پاس لوٹا دیا۔

جوابِ ثالث: "ضالا" کا معنی "ناسیا" (بھولنے والا) ہے اس لئے کہ ضلال نسیان کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے۔ نسیان کے معنی میں قرآن کریم میں ایک دوسری جگہ استعمال ہوا ہے فرمانِ باری تعالیٰ ہے: "اَنْ تَضِلَّ اِحْدٰهُمَا فَتُذَكِّرَ اِحْدٰهُمَا الْاُخْرٰى" ان تضل ان تنسی کے معنی میں ہے۔

سوال: "ضلال" اگر نسیان کے معنی میں ہے تو اللہ تعالیٰ نے ضلال اور نسیان کو عطف سے کیوں بیان کیا حالانکہ معطوف و معطوف علیہ میں مغایرت ہوتی ہے جیسا کہ فرمایا گیا "لَا يَضِلُّ رَبِّي وَلَا يَنْسَى"؟۔

جواب: ہم یہ دعویٰ کب کر رہے ہیں کہ ضلال جہاں بھی آجائے نسیان کے معنی میں ہوگا۔ بلکہ ہم کہتے ہیں کبھی کبھی نسیان کے معنی میں ہوگا۔ چنانچہ اس آیت میں "ضلال" خطاء کے معنی میں یا غفلت کے معنی میں ہے۔

# سورۃ الانشراح

سوال: "اَلَمْ نَشْرَحْ لَكَ صَدْرَكَ وَوَضَعْنَا عَنْكَ وِزْرَكَ" میں لفظ "لَکَ" اور "عَنکَ" لانے کا کیا فائدہ جبکہ کلام ان کے بغیر بھی مکمل ہے؟

جواب: اس کا فائدہ ابہام کے بعد ایضاح ہے جو بلاغت کی ایک نوع ہے۔ جب "اَلَمْ نَشْرَحْ لَكَ" فرمایا گیا تو مفہوم ہوا کہ کوئی چیز مشروح لہ ہے پھر "صَدْرَكَ" فرمایا تو "لَکَ" سے پیدا شدہ ابہام کی وضاحت ہوگئی۔ اسی طرح "وَوَضَعْنَا عَنْكَ" ہے۔

سوال: "فَاِنَّ مَعَ الْعُسْرِ يُسْرًا" میں کلمۃ "مع" مصاحبت کے لئے استعمال ہوا ہے تو عُسر اور یسر کے ملانے کا کیا مطلب ہے؟۔

جواب: اس آیت کے نزول کا سبب مشرکین کا نبی کریم ﷺ اور صحابہ کرام کو فقر و تنگ دستی پر عار دلانا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں عسر و تنگی کے فوراً بعد یسر و آسانی کا وعدہ کیا۔ اور مزید ان کی تسلی کے لئے موعود یسر کو عسر کے ساتھ بیان کیا یعنی عسر کے فوراً یسر ہوگا۔

سوال: حضرت عبداللہ بن مسعود اور حضرت عبداللہ بن عباسؓ کا قول "لن یغلب عسر یسرین" "ایک تنگی دو آسانیوں پر غالب ہرگز نہیں سکتی" کا کیا مطلب ہے۔ بلکہ آپ ﷺ سے بھی اس قسم کے الفاظ مروی ہیں؟۔

جواب: یہ قول قوت امید کی بناء پر ہے۔ اس لئے کہ اللہ تعالیٰ کے وعدے کو بہترین محل پر محمول

کرنا چاہئے جہاں تک جملہ ثانیہ "اِنَّ مَعَ الْعُسْرِ یُسْرًا" کا تعلق ہے۔ تو وہ جملہ اول "فَاِنَّ مَعَ الْعُسْرِ یُسْرًا" کی تاکید ہے۔ جیسا کہ کہا جاتا ہے۔ جاء رجل جاء رجل اس سے مراد ایک ہی آدمی ہوتا ہے۔ دوسرا جملہ محض تاکید کے لئے ہے۔ یا "عسر" کو معرفہ لانا اس کے موجود اور معہود ہونے کی وجہ سے اور "یسر" کو نکرہ لانا اس کی عدم موجودگی کی وجہ سے اور تعظیم وتفخیم کی غرض سے ہے۔ اور یہ بھی احتمال ہے کہ جملہ ثانیہ ایک علیحدہ وعدہ کے لئے ہو۔ تو اس صورت میں "یسر" متعدد ہوگا۔ یعنی کئی آسانیاں ہونے کا وعدہ ہے۔ لیکن پہلے قول (یعنی جملہ ثانیہ جملہ اولیٰ کی تائید کے لئے ہے) کی تائید حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کی قراءت سے بھی ہوتی ہے جس میں دوسرا جملہ نہیں ہے۔

سوال: اگر حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کی قراءت میں دوسرا جملہ ثابت نہیں ہے تو انہوں یہ جملہ "والذی نفسی بیدہ لو کان العسر فی جحر لطلبہ الیسر حتی یدخل علیہ انہ لن یغلب عسر یسرین" (قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضے میری جان ہے اگر عسر وتنگی کسی بل میں بھی ہو تو یسر وہاں بھی داخل ہوگا۔ بے شک ایک عسر دو یسروں پر غالب نہیں آسکتا) کیوں فرمایا؟۔

جواب: اس میں جو تفخیم ہے وہ مکرر بیان کے حکم میں ہے۔ جن لوگوں نے اس کی تفسیر دو یسروں سے کی ہے وہ ان کے وقوع کے بارے کہتے ہیں کہ ایک یسر وہ فتوحات ہیں جو نبی کریم ﷺ کے زمانے میں ہوئیں۔ اور دوسرے یسر کا وقوع حضرات خلفاء راشدین کے دور میں میسر آیا۔ بعض نے کہا "یسرین" سے مراد یسر الدنیا و یسر الآخرہ ہے۔

## سورۃ التین

سوال: "ثُمَّ رَدَدْنٰهُ اَسْفَلَ سٰفِلِيْنَ ۝ اِلَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ فَلَهُمْ اَجْرٌ غَيْرُ مَمْنُوْنٍ" "اِلَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا" کا استثنیٰ ماقبل سے کیسے صحیح ہوگا؟۔

جواب: اکثر علماء کی رائے یہ ہے یہاں "خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ" میں "الانسان" سے مراد جنس انسان ہے۔ اسفل سافلین سے مراد نار جہنم ہے۔ اس تشریح کے مطابق مستثنیٰ متصل ہوگا۔ اور "فَلَهُمْ اَجْرٌ غَيْرُ مَمْنُوْنٍ" "فلا نردھم اسفل سافلین" کا قائم مقام ہے۔ اور جن لوگوں نے اسفل سافلین کی تفسیر نہایت بڑھاپے سے کی ہے انہوں نے کہا "السافلین" سے مراد ضعفاء اطفال، شیخ فانی وغیرہ ہیں، اس تفسیر کے مطابق استثناء منقطع ہے اور "الا" "لکن" کے معنی میں

ہے یعنی جنہوں نے زمانہ شباب میں نیک اعمال کیے ہوں گے اور زمانہ بڑھاپے میں ان اعمال کو بجالانے سے عاجز ہوں گے تو ان کے لئے ان اعمال کا ثواب تادم مرگ لکھا جاتا رہیگا۔ چنانچہ حضرت عبداللہ بن عباسؓ کے اس قول ''قرآن پڑھنے والا ارذل عمر کی طرف نہیں لوٹایا جائے گا'' کا بھی یہی مطلب ہے۔ بعض علماء کرام یہ فرماتے ہیں جولوگ زمانہ شباب اور طاقت کے زمانے میں نیک اعمال پر کاربند رہیں گے ان پر ارذل عمر کی کیفیت طاری نہیں ہوگی اگرچہ طویل عمر کیوں نہ گذاریں۔ ان حضرات نے حضرت عبداللہ بن عباسؓ کے قول کے ظاہر سے استدلال کیا۔

# سورۃ العلق

سوال: ''اِقْرَأْ بِاسْمِ رَبِّکَ الَّذِیْ خَلَقَ o خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ'' دوسرے ''خلق'' کا مفعول ''الانسان'' ہے لیکن پہلے ''خلق'' کا مفعول کہاں ہے؟۔

جواب: اس کے متعلق دو احتمال ہیں۔

پہلا احتمال یہ ہے کہ اس کا کوئی مفعول نہ ہو۔ بلکہ اس سے مراد وہ ذات ہے جس سے خلق (پیدا کرنا) کا حصول ہو کہ اس کے سوا کوئی خالق نہیں ہے۔ جیسا کہ فرمان باری ''اَلَا یَعْلَمُ مَنْ خَلَقَ'' میں ہے اور جیسا کہ اہل عرب کہتے ہیں: ''فلان یعطی ویمنع ویصل و یقطع'' کہ فلاں عطا کرتا ہے یا منع کرتا ہے۔

دوسرا احتمال یہ ہے کہ اس کا مفعول مقدر ہو۔ تقدیر عبارت یوں ہو ''اَلَّذِیْ خَلَقَ کُلَّ شَیْءٍ'' پھر بطور خاص انسان کو اس کی شرافت بیان کرنے کے لئے ذکر فرمایا۔

سوال: کیسے فرمایا اللہ تعالیٰ نے ''خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ'' جمع کے ساتھ یوں نہیں فرمایا: ''خلق الانسان من علقة''؟

جواب: اس لئے الانسان! جمع کے معنی میں ہے دلیل اس کی ''اِنَّ الْاِنْسَانَ لَفِیْ خُسْرٍ اِلَّا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ'' ہے۔

سوال: فرمانِ الٰہی: ''یٰاَیُّھَا النَّاسُ اِنْ کُنْتُمْ فِیْ رَیْبٍ مِّنَ الْبَعْثِ فَاِنَّا خَلَقْنٰکُمْ مِّنْ تُرَابٍ ثُمَّ مِنْ نُّطْفَةٍ ثُمَّ مِنْ عَلَقَةٍ'' سے اس جواب کی تردید ہوتی ہے؟

جواب: آیت کا مطلب ہے ''انا خلقنا اباکم من تراب ثم خلقنا کل واحد من اولاد من نطفه'' یعنی ہم نے تمہارے جدامجد (آدم) کو مٹی سے پھر ان کی اولاد کو نطفہ سے پیدا کیا۔ بعض نے جواب میں کہا ''علق'' کو رعایتِ فواصل کے لئے ذکر کیا گیا ہے۔

# سورۃ القدر

سوال: ''مِنْ کُلِّ اَمْرٍ'' کا کیا مطلب ہے؟
جواب: یہاں لفظ ''من'' باء کے معنی میں ہے۔ یعنی بِکُلِّ امر ہے۔ جیسا کہ آیت ''یَحْفَظُوْنَهٗ مِنْ اَمْرِ اللّٰهِ'' اور ارشادِ باری ''یُلْقِی الرُّوْحَ مِنْ اَمْرِهٖ'' میں دونوں جگہ ''من'' باء کے معنی میں ہے۔ آیت کا مطلب یہ ہے اس سال جو کچھ رونما ہونے والا ہے اور جو تبدیلیاں ہونے والی ہیں ہر ایک کے بارے میں اللہ تعالیٰ کا حکم لیکر لوح محفوظ سے آسمان دنیا یا زمین کی طرف فرشتے آتے ہیں۔

# سورۃ البیّنۃ

سوال: ''رَسُوْلٌ مِّنَ اللّٰهِ یَتْلُوْا صُحُفًا مُّطَهَّرَةً فِیْهَا كُتُبٌ قَیِّمَةٌ'' (اللہ کا رسول جو ان کے سامنے تلاوت کرتا ہے ایسے صحیفے جو پاکیزہ ہیں) یہاں رسول سے بلا خلاف مراد محمد مصطفیٰ ﷺ ہیں۔ اور ان کے بارے فرمایا جارہا ہے ''یَتْلُوْا صُحُفًا'' اس کا بظاہر مطلب یہ ہے کہ کتاب میں دیکھ کر پڑھتے ہیں حالانکہ آپ اُمی تھے دیکھ کر نہیں پڑھ سکتے تھے۔
جواب: ''یتلوا'' سے دیکھے بغیر پڑھنا مراد ہے۔ اس لئے کہ آپ سے یہی متواتر منقول ہے۔
سوال: صُحف اور کتب میں کیا فرق ہے حتیٰ کہ فرمایا جارہا ہے ''صُحُفًا مُّطَهَّرَةً فِیْهَا كُتُبٌ قَیِّمَةٌ''؟
جواب: ''صحف'' سے کاغذ مراد ہے اور ''مطہرۃ'' کا معنیٰ شرک سے پاک اور ''فِیْهَا كُتُبٌ قَیِّمَةٌ'' کا مطلب ہے مکتوب سنقیمه ناطقة بالعدل مراد اس سے آیات اور احکام مراد ہیں۔
سوال: ''وَمَا تَفَرَّقَ الَّذِیْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ اِلَّا مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَتْهُمُ الْبَیِّنَةُ'' (نہیں مختلف ومتفرق ہوئے اہل کتاب مگر بعد اس کے کہ ان کے پاس واضح ثبوت آچکا)۔ اہلِ کتاب سے مراد یہود ونصاریٰ ہیں اور ''البینہ'' سے مراد حضور ﷺ یا قرآن ہے۔ یہود ونصاریٰ آپ ﷺ کی تشریف آوری سے قبل بھی آپس میں متفرق تھے ایک دوسرے کی تکفیر کیا کرتے تھے؟۔
جواب: یہاں ان کے تفرق سے مراد نبی کریم ﷺ کی بعثت سے قبل ان کی تصدیق اور ان پر ایمان لانے کے متعلق اختلاف ہے۔ چنانچہ توراۃ اور انجیل کے بیان کے مطابق آپ ﷺ کی آمد سے پہلے یہود ونصاریٰ بھی متفق تھے کہ ایک نبی آئے گا۔ ہم ان پر ایمان لائیں گے۔ لیکن جب آپ ﷺ مبعوث ہوئے تو آپس میں مختلف ہوگئے۔ مختلف فرقوں میں بٹ گئے بعض ایمان لائے اور

بعض آپ کی رسالت کے منکر ہو گئے۔

## سورۃ الزلزلۃ

سوال: "اِذَا زُلزِلَتِ الْاَرْضُ زِلْزَالَهَا" (جب ہلائے زمین کو اس کے بھونچال سے) "زلزال" مصدر کی اضافت زمین کی طرف کرنے کا کیا مطلب۔ یوں کیوں نہ فرمایا گیا "اذا زلزلت الارض زلزالا" جیسا کہ "اذا دُكَّتِ الْاَرْضُ دَكًّا دَكًّا" وغیرہ آیات میں مصدر بغیر اضافت کے لایا گیا؟۔

جواب: اس سے مراد وہ زلزلہ ہے جو اللہ تعالیٰ کے حکم اور اس کی مشیت کے مطابق صرف اسی دن ہوگا۔ اور اس کے بعد کوئی زلزلہ نہیں ہوگا۔ یہ زلزلہ اس دن کو مستوجب ہے۔ جیسا کہ اہل عرب کہتے ہیں۔ "اکرم التقی اکرامہ" پرہیزگار کا حق اکرام ادا کرو۔ "اَهِنِ الفاسق اهانته" (فاسق کو اس کا حق اہانت دو) اور یہ بھی ممکن ہے کہ زمین کی طرف زلزال کی اضافت استغراق کے لئے ہو۔ جتنا ہلنا اس کے لئے ممکن ہوگا ہلے گی۔

سوال: اللہ تعالیٰ نے کیسے فرمایا: "فَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَّرَهٗ وَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا يَّرَهٗ" (جو شخص ذرہ برابر بھی نیکی کریگا ضرور اس کو دیکھ لے گا۔ اور جو شخص ذرہ برابر بدی کریگا اس کو دیکھ لیگا) حالانکہ کافر کی نیکیاں اس کے کفر میں مستور ہیں اور مؤمن کے صغائر گناہ کبیرہ سے اجتناب کی وجہ سے معاف ہیں تو ہر عامل کا اپنے ہر عمل کو دیکھنا کیسے ثابت ہوگا۔؟

جواب: اس کا مطلب ہے۔ نیکیوں میں سے جو بھی نیکی کریگا قیامت کے روز اس کو دیکھے گا اور بدکاروں اور بدبختوں میں سے جو بھی ذرہ برابر بدی کریگا اسے دیکھے گا۔ اگلی آیت "يَصْدُرُ النَّاسُ اَشْتَاتًا" (اس دن لوگ متفرق ہوں گے) بھی اس پر دلالت کر رہی ہے۔ مقاتل نے کہا ہے کہ یہ آیت مدینہ کے دو اشخاص کے متعلق اتری ہے۔ ان میں سے ایک مستقل طور پر سائلوں کو کپڑے اور کھجوریں دیا کرتا تھا۔ اور کہا کرتا تھا کہ جو کچھ ہم خرچ کرتے ہیں اس کا بدلہ ہمیں ملیگا۔ اور ہم اس کو پسند کرتے ہیں۔ اور دوسرا شخص گناہ صغیرہ کو ہلکا سمجھتا تھا اور کہا کرتا تھا کہ اللہ تعالیٰ نے بڑے گناہوں پر عذاب کی وعید سنائی ہے چھوٹے گناہوں پر نہیں۔

## سورۃ العادیات

سوال: اللہ پاک نے کیسے فرمایا: "اِنَّ رَبَّهُمْ بِهِمْ يَوْمَئِذٍ لَّخَبِيْرٌ" (بے شک ان کا رب ان کے

حال سے اس روز بڑا ہی باخبر ہے) جبکہ اللہ تعالیٰ ان کے احوال سے ہر وقت باخبر ہے؟۔
جواب: آیت کا مطلب یہ ہے کہ اس روز اللہ تعالیٰ ان کو ان کے اعمال کی جزا اور بدلہ دیگا یہاں علم مجازاً بدلہ دینے کے معنی میں ہے۔ اس کی نظیر یہ آیت بھی ہے۔ "اُولٰئِکَ الَّذِیْنَ یَعْلَمُ اللّٰہُ مَا فِیْ قُلُوْبِہِمْ" یعنی جو کچھ ان کے دلوں میں ہے اللہ اس کی جزاء دیگا تو یعلم 'یجازی کے معنی میں ہے۔

# سورۃ القارعۃ

سوال: "وَاَمَّا مَنْ خَفَّتْ مَوَازِیْنُہٗ فَاُمُّہٗ ہَاوِیَۃٌ" (جس شخص کا (نیکیوں کا) پلہ ہلکا ہوگا تو بس اس کا ٹھکانہ ہاویہ ہوگا) یعنی جس کی برائیاں زیادہ ہوں گی اس کا ٹھکانہ جہنم ہے۔ حالانکہ اکثر مومنین کے سیئات ان کے حسنات سے زیادہ ہوں گے باوجود اس کے وہ جہنم میں ہمیشہ نہیں رہیں گے؟۔
جواب: "فامه هاوية" ان کے خلود فی النار پر دلالت نہیں کرتا۔ بلکہ مؤمن اپنے گناہوں کے بقدر جہنم میں رہیگا۔ پھر جہنم سے نکل کر جنت میں داخل ہوگا۔
بعض علماء کی رائے ہے (خَفَّتْ مَوَازِیْنُہٗ) سے مراد اعمال نامے کا نیکیوں سے خالی ہونا ہے۔ اور وہ کافروں کا اعمال نامہ ہی ہوسکتا ہے۔

# سورۃ التکاثر

سوال: "کَلَّا لَوْ تَعْلَمُوْنَ عِلْمَ الْیَقِیْنِ" میں "لَوْ تَعْلَمُوْنَ" کا جواب کہاں ہے؟
جواب: اس کا جواب محذوف ہے تقدیر عبارت اس طرح ہے "لو تعلمون الامر یقیناً لشغلکم عن التکاثر والتفاخر" (یعنی آخرت کے معاملے کا تمہیں علم و یقین ہوتو یقیناً تکاثر و تفاخر سے اعراض کرتے۔
سوال: "ثُمَّ لَتُسْئَلُنَّ یَوْمَئِذٍ عَنِ النَّعِیْمِ" (پھر اس دن تم سے نعمتوں کے متعلق پوچھا جائیگا) دنیا میں کوئی بھی انسان نعمت الٰہی سے خالی نہیں ہے۔ تو وہ کونسی نعمت ہے جس کے بارے میں قیامت کے دن پوچھا جائیگا؟۔
جواب: اس کے بارے سات اقوال ہیں۔ (۱) امن و سلامتی کی نعمت ہے۔ (۲) اس سے مراد ٹھنڈا پانی ہے (۳) اس سے مراد صحت و فراغت ہے (۴) لذیذ غذائیں اور مشروبات ہیں

(۵) اس سے مراد گیہوں کی روٹی اور میٹھا پانی ہے (٦) حاصل شدہ دنیاوی لذت ہے (۷) صبح وشام کے کھانے کا ہمیشہ میسر آنا ہے۔

بعض کہتے ہیں۔ یہ سوال خاص کافروں کے متعلق ہے۔ مگر صحیح قول یہ ہے یہ ہر انسان اور ہر نعمت کے متعلق ہے۔ کافر سے بطور زجر وتوبیخ اور مؤمن سے نعمت کے شکر کے متعلق سوال کیا جائیگا' اس کی تائید بھی ایک حدیث سے ہوتی ہے۔ آپ ﷺ کا ارشادِ گرامی ہے کہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں' کہ میں اپنے بندے سے تین چیزوں کے شکر کے متعلق نہیں پوچھوں گا۔ ان تین کے علاوہ نعمتوں کے متعلق سوال جواب ہوگا۔ وہ تین چیزیں یہ ہیں۔ گھر جسمیں وہ رہتا ہے۔ اس کی کمر کو سیدھا رکھنے والا طعام' اور اس کے ستر کو ڈھانپنے والا کپڑا۔

## سورة العصر

سوال: ''وَالْعَصْرِ میں اِلَّا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ'' کا استثناء ان مؤمنین موصوفین کے نفع میں ہونے پر دلالت نہیں کرتا۔ باوجودیکہ یہ استثنٰی ان کی مدح کے لئے ہے؟ آیت تو صرف ان صفات سے متصف لوگوں کے خسارے میں نہ ہونے پر دلالت کر رہی ہے؟۔

جواب: استثناء اگرچہ صراحۃً ان مؤمنین کے نفع میں ہونے پر دلالت تو نہیں کرتا لیکن ان کو عظیم صفات۔ (ایمان' عمل صالح' حق کی وصیت' صبر کی وصیت) سے متصف کرنا ان کے عظیم الشان فائدے میں ہونے پر دلالت کرتا ہے۔ اگر یہ بھی مان لیں کہ فائدہ میں نہیں ہیں لیکن خسارہ میں نہ ہونا کیا کچھ کم فائدہ ہے؟

## سورة الهمزة

سوال: هُمَزَةٍ اور لُمَزَةٍ میں کیا فرق ہے؟۔

جواب: دونوں ہم معنی ہیں ان میں کوئی فرق نہیں ہے۔ البتہ دوسرا پہلے کی تاکید ہے۔ بعض نے کہا: مختلف المعانی ہیں'' هُمَزَة '' غیبت کرنے والا اور اللمزة عیب لگانے والا۔ بعض نے کہا: همزة سامنے عیب لگانے والا۔ اور اللمزة پس پردہ عیب گو اور بقول بعض الهمزة لوگوں پر اور اللمزة لوگوں کے انساب پر عیب لگانے والا اور بعض کی رائے ہے: الهمزة آنکھ کے ذریعے عیب لگانے والا اور اللمزة زبان سے طعن وتشنیع کا عادی مراد ہے۔ بعض نے کہا کہ اس کا عکس ہے۔ یہ کل چھ اقوال ہوئے۔

# سورۃ الفیل

سوال: ابابیل کا کیا معنی ہے یہ جمع ہے یا مفرد؟۔

جواب: اس کا معنی ہے مختلف ٹولیوں پر مشتمل مختلف جماعتیں۔ بعض علماء کہتے ہیں کہ ''ابابیل'' یکے بعد دیگرے آنے والوں کو کہتے ہیں بعض نے اس کا معنی کثیرہ لیا ہے۔

امام فراء اور ابو عبیدہ کا کہنا ہے کہ یہ جمع ہے مگر اس کا واحد کوئی نہیں ہے۔ بعض نے کہا۔ اس کا واحد اباال' ابول اور ابیل ہے۔

# سورۃ قریش

سوال: ''لِاِیۡلٰفِ قُرَیۡشٍ ''میں ''لِاِیۡلٰفِ'' کے لام کا متعلق کیا ہے؟۔

جواب: سورۃ الفیل کا آخر اس کا متعلق ہے۔ یعنی ''فَجَعَلَهُمۡ كَعَصۡفٍ مَّاۡكُوۡلٍ'' یعنی قریش کی تالیف قلب کے لئے ہم نے ان (حملہ آوروں) کو کھاتے ہوئے بھس کی طرح کردیا۔ حضرت ابی بن کعبؓ کے مصحف سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے جس میں بغیر فصل کے ان دونوں کو ایک سورۃ شمار کیا گیا ہے۔

یعنی اہل قریش کی خواہش کے مطابق ان لوگوں کو ہلاک کردیا جن سے وہ خائف تھے۔ تاکہ آسانی کے ساتھ گرمی و سردی میں سفر کرسکیں۔ اور بقول بعض علماء اس کا تعلق ماقبل سورۃ سے نہیں بلکہ بعد والی آیت کے ساتھ ہے یعنی ''فَلۡيَعۡبُدُوۡا رَبَّ هٰذَا الۡبَيۡتِ'' اِيۡلٰفِهِمۡ رِحۡلَةَ الشِّتَآءِ وَالصَّيۡفِ' خلاصہ یہ کہ اللہ تعالیٰ کی نعمتیں ان پر بے شمار ہیں اگر دیگر نعمتوں کے شکرانے کے طور پر عبادت نہیں کرتے تو ان کو اس نعمت کے بدلے عبادت کرنی چاہیئے۔ اور بعض علماء نے کہا۔ یہ ''لام'' لام تعجب ہے یعنی قریش کے کردار پر تعجب!۔

قریش کا بغرضِ تجارت (جس پر ان کے معاش کا مدار تھا) سال میں دو سفر کرتے تھے موسم سرما میں یمن اور موسم گرما میں شام کا سفر کرتے تھے۔

بعض مفسرین فرماتے ہیں: یہاں ''ایلاف'' مصدر ہے إلف کے معنی میں ہے۔ اہل عرب کہتے ہیں الفته ایلا فامد کے ساتھ' الفته الفا بغیر کے یعنی قصر کے ساتھ۔ دونوں متعدی بیک مفعول ہیں۔ تو لایلاف قریش کا معنی لالف قریش ہے۔ یعنی قریش کی پسند کیلئے۔ اور بعض علماء کہتے ہیں الایلاف متعدی بدو مفعول ہے تو اس صورت میں آیت کا معنی ہوگا لایلاف اللہ

تعالٰی قریشا رحلتین) یعنی اللہ تعالٰی کا قریش کے لئے دوسفر پسند فرمانے کے لئے۔ "لِاِیْلٰفِ قُرَیْشٍ اٖلٰفِهِمْ" ایلافھم پہلے ایلاف سے بدل ہے۔ بعض نے پہلے ایلاف کی تاکید کہا ہے۔

## سورۃ الماعون

سوال: "فَوَیْلٌ لِّلْمُصَلِّیْنَ o الَّذِیْنَ هُمْ عَنْ صَلَاتِهِمْ سَاهُوْنَ" (سو بڑی ہی ہلاکت و بربادی ہے ان نماز پڑھنے والوں کے لئے جو اپنی نماز سے بے خبر ہیں) یہاں نماز بھولنے والے پر وعید آئی ہے حالانکہ حدیث شریف میں وارد ہے۔ آپ ﷺ فرماتے ہیں: "رفع عن امتی الخطاء والنسیان" میری امت سے خطاء اور بھول کا مواخذہ نہیں ہوگا' بظاہر آیت وحدیث میں تعارض ہے؟

جواب: یہاں آیت میں "ساهون" سے مراد غافلون ہے یعنی کاہلی اور سستی کرنے والے اور نماز کی طرف کم توجہ دینے والے لوگ مراد ہیں۔ یہ فعل یعنی نماز میں سستی منافقین یا فساق کا کام ہے۔ اس سے مراد کسی وجہ سے نماز میں بھولنا نہیں ہے' انسان شیطانی وسوسہ یا کسی اور کام میں مشغول ہونے کی وجہ سے بھول جاتا ہے جو غیر اختیاری ہے مراد نہیں ہے' حدیث میں رفع سے یہی بھول مراد ہے۔ اسی وجہ سے عَنْ صَلَاتِهِمْ فرمایا ہے فِیْ صَلَاتِهِمْ نہیں فرمایا۔ حضرت انسؓ فرمایا کرتے تھے کہ شکر ہے آیت میں فِیْ صَلَاتِهِمْ سَاهُوْنَ نہیں فرمایا گیا۔

## سورۃ الکوثر

سوال: کوثر کیا چیز ہے؟

جواب: اس میں دو قول ہیں: پہلا قول حضرت عبداللہ بن عباسؓ کا ہے۔ وہ فرماتے ہیں اس سے مراد خیر کثیر ہے۔ کثرت سے فوعل کے وزن پر ہے۔ جیسا کہ اہل عرب کہتے ہیں "رجل نوفل" یعنی زیادہ نفل والا۔ کسی شاعر کا شعر ہے۔

وانت کثیر یا ابن مروان طیب ☆ وکان ابوک ابن العقائل کوثرا

اے ابن مروان! تو بہت زیادہ پاکیزہ ہے' اور تیرا باپ ابن عقایل تو اس سے بھی بہت زیادہ پاکیزہ ہے

کسی دیہاتی عورت کا بیٹا سفر سے واپس آیا تو اس سے پوچھا گیا۔ کہ تیرا بیٹا کس طرح لوٹ کر آیا۔ تو جواب میں کہا' اب بکوثر "بہت خیر کثیر کے ساتھ واپس آیا' آپ ﷺ کو خیر کثیر اور حکمت عطاء ہوئی تھی۔ "وَمَنْ یُّؤْتَ الْحِکْمَةَ فَقَدْ اُوْتِیَ خَیْرًا کَثِیْرًا" بعض حضرات نے اس

خیر کثیر کی تفسیر نبوت سے کی ہے۔ بعض نے علم وحکمت سے اور بعض نے قرآن کریم سے۔
دوسرا قول یہ ہے کہ "الکوثر" جنت میں ایک نہر کا نام ہے۔ یہ اکثر مفسرین کی رائے ہے۔ آپ ﷺ کا ارشاد گرامی بھی ہے۔ آپ ﷺ فرماتے ہیں "کوثر جنت میں ایک نہر ہے جس کا اللہ تعالیٰ نے مجھ وعدہ سے فرمایا ہے۔ اس پر خیر کثیر ہے۔ قیامت کے دن میری امت وہاں پانی پینے کے لئے آئیگی۔ ایک اور حدیث میں ارشادِ گرامی ہے۔ جنت میں چلنے کے دوران ایک نہر سے گذر ہوا اس کے کنارے موتیوں سے مرصع تھے میں نے حضرت جبریل علیہ السلام سے پوچھا یہ کیا ہے؟ تو انہوں نے فرمایا! یہ وہ کوثر ہے جو آپ کے رب نے آپ کو عطاء کی ہے تو فرشتہ نے اس پر اپنا ہاتھ لگایا تو پتہ چلا اس کی مٹی مشک کی ہے۔ اس کی صفت کے متعلق روایات میں آتا ہے کہ وہ شیرینی میں شہد سے زیادہ میٹھی ہے۔ اور دودھ سے زیادہ سفید ہے برف سے زیادہ ٹھنڈی ہے اور مکھن سے زیادہ نرم ہے۔ اس کے آس پاس زبرجد لگے ہوئے ہیں اور اس کے برتن چاندی کے ہیں۔ ستاروں کی طرح کثیر ہیں۔ جو اس سے ایک مرتبہ پیئے گا تو وہ زندگی بھر پیاسا نہیں ہوگا۔

# سورۃ الکافرون

سوال: "وَلَا أَنْتُمْ عَابِدُونَ مَا أَعْبُدُ" (اور نہ ہی تم عبادت کرو گے اس معبود کی جس کی میں عبادت کرتا ہوں) "ما" غیر عاقل کے لئے استعمال ہوتا ہے۔ یہاں "ما" کے بجائے "من" ہونا چاہئے تھا؟ جو عاقل کے لئے مستعمل ہوتا ہے؟۔
جواب: اس میں دو وجہیں ہیں۔ پہلی وجہ: یہ ہے کہ "من" کے بجائے "ما" کا استعمال ماقبل جملہ "لَا أَعْبُدُ مَا تَعْبُدُونَ" کے ساتھ تقابل کی رعایت کی وجہ سے ہے۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ "ما" موصولہ نہیں ہے۔ بلکہ مصدریہ ہے جو اپنے مابعد کو مصدر کے معنی میں کر دیتا ہے۔
امام زمخشریؒ فرماتے ہیں: "ما" سے مراد صفت ہے یعنی میں باطل کی عبادت نہیں کرتا اور تم حق کی عبادت نہیں کرتے۔ ان کے علاوہ علماء کی رائے کے مطابق "ما" الذی کے معنی میں ہے۔ اور ضمیر عائد محذوف ہے۔
سوال: تکرار کا کیا فائدہ ہے؟
جواب: تکرار کی بھی دو وجہیں ہیں۔ ایک وجہ تو تاکید ہے اور کفار کے مطلوب کے طمع کی نفی ہے۔
دوسری وجہ یہ ہے کہ شروع کے دو جملے فی الحال عبادت کی نفی کے لئے ہیں اور بعد کے دو جملے

آئندہ عبادت کی نفی کے لئے ہیں تو اس صورت میں کوئی تکرار نہیں ہے۔ یہ قول امام ثعلب اور زجاج کا ہے۔

امام زمخشریؒ کہتے ہیں: شروع کے دو جملے مستقبل میں عبادت کی نفی کے لئے اور بعد کے دو جملے نفی عبادت فی الماضی کے لئے ہیں۔ اس لئے کہ لفظ لا ماضی پر داخل نہیں ہوتا وہ صرف مضارع پر داخل ہوتا ہے۔

سوال: ''وَلَآ اَنتُمْ عَابِدُوْنَ مَآ اَعْبُدُ'' کے بجائے ما عبدتُ صیغہ ماضی کے ساتھ کیوں نہ فرمایا۔ جیسا کہ ''وَلَآ اَنَا عَابِدٌ مَّا عَبَدْتُّمْ'' میں صیغہ ماضی استعمال کیا گیا؟

جواب: اس لئے کہ کفار آپ کی بعثت سے قبل بتوں کی عبادت کیا کرتے تھے۔ اور آپؐ بعثت سے قبل اللہ کی عبادت نہیں کرتے تھے بلکہ بعثت کے بعد عبادت شروع کی مگر اس جواب پر یہ اعتراض واقع ہوگا کہ تمام انبیاء کرام بعثت سے قبل توحید پر کاربند ہوتے ہیں۔ اور توحید عظیم عبادت ہے۔ بعض علماء کہتے ہیں: اس میں تکرار کفار کے سوال کی مطابقت کے لئے آیا ہے۔ چونکہ کفار کا سوال مکرر تھا اس لئے جواب بھی مکرر لایا گیا۔ کفار نے کہا تھا۔ محمد! تم ایک مدّت تک ہمارے معبودوں کی عبادت کرو ہم اتنی مدت تمہارے معبود کی عبادت کریں گے۔ پھر تم ہمارے معبودوں کی ایک مدت عبادت کرنا تو ہم ایک مدت تمہارے الٰہ کی عبادت کریں گے تو جواب بھی اس کے مطابق مکرر آیا۔ یہ بہت اچھا اور لطیف قول ہے۔

# سورۃ النّصر

سوال: ''فَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّکَ وَاسْتَغْفِرْہُ'' استغفار کا ماقبل کے ساتھ کیا ربط ہے۔ فتح نصیب ہونے اور نصرت الٰہی ملنے کے تو حمد و شکر مناسب ہے نہ کہ استغفار و توبہ؟۔

جواب: حضرت عبداللہ بن عباسؓ فرماتے ہیں: جب یہ سورۃ نازل ہوئی تو نبی اکرم ﷺ سمجھ گئے کہ آپ کے انتقال کا وقت قریب آ گیا۔ حضرت حسن بصریؒ فرماتے ہیں کہ آپ ﷺ سمجھ گئے کہ آپ کی اجل قریب آ گئی ہے آپ کو تسبیح، استغفار و توبہ کا حکم فرمایا گیا تا کہ آپؐ کی عمر شریف کا آخری حصہ عملِ صالح کی کثرت کے ساتھ گذر جائے۔ چنانچہ آپ ﷺ کثرت سے ''سبحانک اللّٰھم اغفر لی انک انت التوّاب الرّحیم'' پڑھا کرتے تھے۔ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ فرماتے ہیں: اس سورۃ کو سورۃ تودیع بھی کہتے ہیں۔ روایت میں آتا ہے۔ اس سورۃ کے نزول کے بعد آپ ﷺ دو سال تک حیات رہے۔

## سورۃ تبّت

سوال: ''تَبَّتْ يَدَآ اَبِیْ لَهَبٍ''''ابولہب کے دونوں ہاتھ ٹوٹ جائیں'' ابولہب کو کنیت کے ساتھ ذکر کیا گیا نام کے ساتھ کیوں ذکر نہیں کیا گیا؟۔

جواب: اس کی کئی وجہیں ہوسکتی ہیں۔ ممکن ہے کہ وہ نام سے معروف نہ ہو کنیت کے ساتھ زیادہ مشہور ہو۔ تو اس کی کنیت کے ساتھ ذکر کیا گیا تا کہ اس کی برائی میں زیادہ تشہیر ہو۔ دوسری وجہ یہ ہوسکتی ہے کہ اس کا نام تھا عبدالعزیز (عزیٰ کا بندہ) جبکہ وہ عزیٰ کا نہیں بلکہ اللہ کا بندہ تھا۔ اگر اس کو ان کے نام کے ساتھ ذکر کیا جاتا تو خلاف واقع ہوتا۔ تیسری وجہ یہ ہے کہ کنیت کے ساتھ ذکر اس لئے ہوا کہ اس کی حالت اس کی کنیت کے موافق ہے۔ اس کا ٹھکانہ نارِ ذات لہب ہے' ابولہب کنیت ہونے کی وجہ یہ تھی کہ اس کے رخسار (شعلہ کی طرح) زیادہ چمکدار تھے۔

## سورۃ الاخلاص

سوال: کلام عرب میں مشہور یہ ہے: کہ لفظ اَحَد نفی کے بعد اور لفظ'' واحد'' اثبات کے بعد استعمال ہوتا ہے۔ جیسا کہ اہل عرب کہتے ہیں: ''فی الدار واحد''''وما فی الدار احد'' ''جاء نی واحد''''ما جاء نی احد'' اس طرح فرمان الٰہی ہے ''وَاِلٰهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ'' اور ''الواحدُ القهّار''''لَا تَصِلُ عَلٰی اَحَدٍ مِّنْهُمْ''''لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْهُمْ''''لَسْتُنَّ كَاَحَدٍ''''فَمَا مِنْكُمْ مِّنْ اَحَدٍ'' وغیرہ ہے تو یہاں ''قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ'' میں احد کو اثبات کے بعد کیسے ذکر کیا گیا؟

جواب: حضرت عبداللہ بن عباسؓ فرماتے ہیں: ''الواحد اور الاحد'' میں معنوی اعتبار سے کوئی فرق نہیں ہے۔ ابوعبیدہ نے اس کو پسند کیا' قرآن کی آیت ''فَابْعَثُوْا اَحَدَكُمْ بِوَرِقِكُمْ'' سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے۔ تو جب ان کے درمیان کوئی فرق نہیں ہے تو یہ کسی کے ساتھ خاص نہیں ہوگا اگر چہ ایک کا استعمال نفی میں اور ایک اثبات میں زیادہ ہے مگر کسی کے ساتھ مختص نہیں ہے۔ غالب الاستعمال والے لفظ سے عدول کی وجہ لفظ الصمد کی رعایت بھی ہوسکتی ہے۔

## سورۃ الفلق

سوال: ''مِنْ شَرِّ مَا خَلَقَ'' لفظ من شر مابعد کو بھی شامل ہے تو مِنْ شَرِّ غَاسِقٍ' مِنْ شَرِّ

النّفّٰثٰتِ وَمِنْ شَرِّ حَاسِدٍ کو مکرر لانے کا کیا فائدہ؟۔
جواب: ان اشیاء کے شر کی بڑائی کو بیان کرنے کے لئے ہر ایک کے ساتھ اسے مکرر لایا گیا جیسا کہ عطف الخاص علی العام تعظیم وشرف کو بیان کرنے کے لئے ہوتا ہے۔ یا ہر ایک کے ساتھ ذکر کرنے کی وجہ ان اشیاء کے مکر کا مخفی ہونا ہے جو انسان کے ساتھ لاحق ہوتا ہے جس کا شعور بھی انسان کو نہیں ہوتا۔
سوال: "النّفّٰثٰتِ" کو معرفہ اور اس کے ماقبل اور مابعد کو نکرہ لانے کی کیا وجہ ہے۔
جواب: اس لئے کہ ہر نفاثہ شر ہے لیکن ہر غاسق (رات) شر نہیں ہے اور نہ ہی ہر حسد شر ہوتا ہے۔ بلکہ بعض حسد پسندیدہ بھی ہے۔ جیسا کہ نیکی کے کاموں میں حسد کرنا۔ جیسا کہ حدیث بھی ہے "لا حسد الافی اثنتین"۔
ابو تمام شاعر کہتا ہے وما حاسد فی المکرمات بحاسد۔

# سورۃ النّاس

سوال: "قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ النَّاسِ" خاص کر "الناس" کو ذکر کیوں کیا جبکہ اللہ تعالیٰ صرف انسانوں کا رب نہیں ہے بلکہ تمام مخلوقات کا رب ان کا مالک اور ان کا الٰہ ہے؟
جواب اوّل: الناس کو بطور خاص ذکر کرنے کی وجہ اس کی شرافت وتفضیل ہے۔
اس لئے کہ انسان صاحب عقل وتمیز ہے۔
جواب ثانی: جب انسان کو اس کے شر سے پناہ مانگنے کا حکم دیا تو اس کے ساتھ یہ بھی بیان کیا کہ انسان بھی صاحب شر ہے کہ انسان اپنے شر سے پناہ مانگتا ہے۔
سوال: کیا فرمان الٰہی "مِنَ الْجِنَّةِ وَالنَّاسِ" "اَلَّذِیْ یُوَسْوِسُ" کا بیان ہے کہ انسانوں کے سینوں میں وسوسہ ڈالنے والے شیطان دو طرح کے ہوتے ہیں۔ انسی شیطان اور جنی شیطان یا الناس کا بیان ہے جس کی طرف وسوسے کی نسبت کی گئی ہے؟
جواب: بعض مفسرین کا کہنا ہے کہ اس سے مراد معنی اول (یعنی شیطان کی تفسیر وقسمیں بیان کرنا ہے۔ گویا یوں فرمایا گیا۔ وسواس جنی کے شر اور وسواس انسی کے شر سے پناہ مانگتا ہوں یہ امام زجاج کا قول ہے۔ اس قول کے مطابق لفظ خناس کا اطلاق انسان پر ہوگا۔ حالانکہ منقول ہے کہ یہ جنی کا نام ہے۔ بقول بعض مفسرین اس سے مراد معنی ثانی ہے۔ گویا یوں فرمایا گیا اس وسواس جنی کے شر سے پناہ مانگتا ہوں جو الناس جنی، الناس انسی کے دلوں پر وسوسہ ڈالتا ہے۔ جنوں کو

الناس کہا جیسا کہ آیت "اَنَّهُ اسْتَمَعَ نَفَرٌ مِّنَ الْجِنِّ" اور آیت "وَيَعُوْذُوْنَ بِرِجَالٍ مِّنَ الْجِنِّ" میں جنوں کو نفر اور رجال کہا۔ تو یہ اس جنی وسواس سے خود کو اللہ کی پناہ میں دینا ہے جو جنوں کے دلوں میں وسوسہ ڈالتا ہے اسی طرح انسانوں کے قلوب پر بھی اثر انداز ہوتا ہے یہ امام فراءؒ کا اختیار کردہ قول ہے۔ مِنَ الْجِنَّةِ سے مراد پہلے قول کے مطابق شیاطین الجن اور دوسرے قول کے مطابق مطلق جن ہے۔ اس لئے کہ جن ہی وسوسہ ڈالتا ہے۔ خاص جن ہو یا مطلق۔ علامہ زمخشریؒ نے پہلے قول کو اختیار کیا ہے اور فرمایا ہے: کہ الناس جن مراد لینا بہتر نہیں ہے۔ اس لئے کہ جن کو جن اس کے مستور ہونے کی وجہ سے کہتے ہیں' انسان کو الناس سے اس کے ظہور کی وجہ سے کہتے ہیں جیسا کہ ان کو بشر ظہور بشرہ کی وجہ سے کہا جاتا ہے لہٰذا الناس سے جن مراد لینا فصاحت قرآن کے خلاف ہوگا۔

اور فرمایا: کہ بہتر تعبیر یہ ہے کہ پہلے "الناس" سے ناسی (بھولنے والا) مراد لیا جائے۔ جیسا کہ "یوم یدع الداع" سے الداعی مراد ہے' الناسی (بھولنے والے) میں ثقلان (جن وانسان) دونوں شامل ہیں۔ اس لئے کہ حقوق اللہ کے نسیان میں دونوں طبقے شامل ہیں۔ اور نسیان سے دونوں متصف ہیں۔ واللہ اعلم بالصواب۔

وَصَلَّى اللّٰهُ عَلٰى سَيِّدِنَا مُحَمَّدٍ وَّعَلٰى اٰلِهٖ وَصَحْبِهٖ وَسَلَّمَ